پیام تعلیم

پیام تعلیم

جلد ۱۲ (۱، ۳-۴، ۶-۷، ۹-۱۲) سنہ [illegible]ء

۱۲ (۲، ۵، ۸) گم ہیں

2/9/77

قارئین پیام تعلیم کو سال نو مبارک

ماہنامہ پیام تعلیم

نئی دِلّی ۵

جلد ۱۲ ۱

اڈیٹر
ولی شاہجہانپوری

معاون
صفیہ عثان

جنوری ۱۹۷۵ء

قیمت فی پرچہ ۷۰ پیسے

سالانہ چندہ سات روپے

پرنٹر پبلشر سید احمد ولی نے مکتبہ جامعہ لمیٹڈ
کے لیے جمال پرنٹنگ پریس دہلی میں
چھپوا کر جامعہ نگر نئی دِلّی ۲۵
سے شائع کیا

فہرست مضامین

بچوں کی کتابیں

مذہب

ارکانِ اسلام — مولانا اسلم جیراجپوری — ۔/۴۰
آں حضرت (اردو) — الیاس احمد مجیبی — ۔/۸۰
پاک کہانیاں (دو حصّوں میں) — مقبول احمد سیوہاروی — ۳/۔
چار یار — الیاس احمد مجیبی — ۲/۵۰
خلفائے اربعہ رضہ — خواجہ عبدالحیٔ فاروقی — ۲/۵۰
رسولِ پاک صلعم — عبدالواحد سندھی — ۲/۔
عقائدِ اسلام — مولانا اسلم جیراجپوری — ۔/۶۰
مسلمان بیبیاں — مولانا اعجاز الحق قدوسی — ۱/۔
نبیوں کے قصّے — خواجہ عبدالحی فاروقی — ۱/۵۰
ہمارے رسول — ” — ۲/۴۰
ہمارے نبی — [illegible] علی رضوی (اردو) ۱/۲۰ ہندی ۔/۴۰
سرکارِ دو عالم — [illegible]حسین حسان ندوی — ۳/۔

معلومات

آدمی کی کہانی — مشتاق احمد — ۲/۔
الوکھا عجائب خانہ — محمد حسین حسان (چار حصّے) — ۲/۔
بجلی کی کہانی — علی احمد خاں — ۔/۵۰
بڑے دادا کی کہانی — عبدالغفور — ۔/۸۰
تاریخِ ہند کی کہانیاں (اوّل) — خجستہ سلطان — ۱/۔
” ” ” (دوم) — ضیاء الرحمن — ۱/۲۰
” ” ” (سوم) — مشتاق احمد اعظمی — ۱/۔
” ” ” (چہارم) ” ” — ۱/۲۵
چٹانوں کی کہانی — محمد امین — ۲/۔
خیرسگالی کے طریقے — رفیعہ منظور الامین — ۱/۔
دنیا کے بچے — محمد حسین حسان ندوی — ۱/۲۵
دہلی — ڈاکٹر مجاہد حسین زیدی — ۲/۔
چچا غالب — مرتبہ: حسین حسان — ۲/۔
رابندر ناتھ ٹیگور — صفدر حسین — ۱/۲۵
سماجی زندگی (اوّل) — احمد جلیل و غلام ابرار — ۔/۵۶
” ” (دوم) ” ” ” ” — ۔/۸۱
” ” (سوم) ” ” ” — ۔/۸۱
سمندر کے کنارے — سلطانہ آصف فیضی — ۱/۵۰
” ” [illegible] ” ” — ۲/۵۰
قدرت کے کرشمے — ادارہ — ۔/۸۰
میر انیس — [illegible]حسین حسان ندوی — ۱/۲۵
ہماری پارلیمنٹ — کیلاش چندر — ۱/۲۵

کہانیاں، ڈرامے، ناول

جن حسن عبدالرحمان (ناول) (دو حصّے) — ۵/۔
اس نے کیا کرتا جاتا (کہانیاں) — آصفہ مجیب — ۔/۳۷
پریم کی جیت (ڈراما) — اسد اللہ کاظمی — ۔/۳۷
تانبیل خاں (کہانی) — محمد حسین حسان — ۔/۵۰
ترکوں کی کہانیاں (”) — مرتبہ: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ — ۔/۵۵
تیس مار خاں کے کارنامے (ناول) — م۔ ندیم — ۱/۵۵
تین اناڑی (”) — عصمت چغتائی — ۱/۵۰
چقماق کی ڈبیا (کہانی) — برکت علی فراق — ۔/۴۰
چمپاوت کا آدم خور شیر (سچی کہانی) — محمد معین — ۔/۳۵
چنبیلی — محمد حسین حسان — ۔/۵۰
ستاروں کی سیر (ناول) — کرشن چند — ۱/۷۵
کوے دادا (سچا ناول) — مجیب احمد خاں — ۲/۔
لال مرغی (کہانی) — عبدالواحد سندھی — ۔/۵۰
مزہ چکھائیں گے (”) — مرتبہ: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ — ۔/۳۵
مزہ دار پہیلیاں (پہیلیاں) — محمود علی خاں — ۔/۶۵
ننھا منھو (کہانی) — خورشید سلطان — ۔/۴۰

پتہ: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ جامعہ نگر نئی دہلی ۲۵

بچوں سے باتیں

پیامیوں کو عید الضحیٰ مبارک ہو

خدا سے دعا ہے کہ ۱۹۷۵ء خوشیوں اور برکتوں کا سال ثابت ہو۔ آمین

جانے والے سال نے بہت دُکھ پہنچائے۔ اسی سال کے جولائی کی ۱۲۔ تاریخ کو ہمارے پُرانے رفیق اور ساتھی، آپ کے پیام تعلیم کے سابق اڈیٹر محمد حسین حسّان صاحب کے انتقال نے ہمیں سوگوار بنایا اور چلتے چلتے ہمارے ایک اور رفیق اور مرحوم حسّان صاحب کے پڑوسی اور جگری دوست محمد حسین صاحب حیدرآبادی عرف ابّو کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ہم سے جدا کر دیا۔

حسین صاحب مرحوم نے جامعہ ملیہ اسلامیہ میں تعلیم پائی، جامعہ کے ہی مدرسۂ ابتدائی اور مدرسۂ ثانوی میں استاد کی حیثیت سے کام کرتے کرتے

۱۷۔ دسمبر کو تین بجے دن کے قریب اللہ کو پیارے ہو گئے۔

ہمیں یقین ہے کہ پیام تعلیم کے بہت سے پڑھنے والے ابّو مرحوم کی شاگردی کے مزے چکھ چکے ہوں گے۔ ادیب کی حیثیت سے تو نہیں لیکن اس اعتبار سے کئی بار مرحوم کا ذکر پیام تعلیم میں آیا ہے کہ مرحوم نے بہت سے خریدار بنا دیے اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے۔ آمین۔

حسین صاحب مرحوم بڑی خوبیوں کے مالک تھے۔ ۱۶۔ دسمبر تک اسکول گئے ــــ ۱۷۔ کو صرف کمزوری کی شکایت کی اور رخصت کی درخواست اسکول کو بھیج دی۔ ایک بجے کے لگ بھگ ڈاکٹر انھیں دیکھنے آئے تھے انھیں رخصت کرنے دروازے تک آئے اس کے بعد پلنگ پر لیٹ گئے اور تھوڑی ہی دیر

بعد روح قفسِ عنصری سے پرواز کر گئی۔ جس نے سُنا، پہلے تو اس خبر پر یقین کرنے سے انکار کیا۔ لیکن حقیقت بہ ہر حال حقیقت تھی تسلیم کرنی پڑی اور مکان پر لوگوں کا تانتا بندھ گیا۔ ان میں وہ بچے بھی تھے جنھوں نے کل تک مرحوم سے سبق پڑھا اور وہ بھی جن کا براہِ راست مرحوم سے کوئی تعلق نہ تھا۔ مگر جو انھیں احترام سے ابو کہا کرتے تھے اور ان کے اخلاق کے گرویدہ تھے۔ ساتھی اساتذہ بھی تھے اور پاس پڑوس کے لوگ بھی جن کے وہ کام آیا کرتے تھے۔

سب کی آنکھوں میں آنسو اور لبوں پر آہیں تھیں بے لوث، نیک، ملنسار اور غم گسار، انسان کی موت پر ایک بھی ایسا نہ تھا جو بے قرار نہ ہوتا۔ سب کے کام آنا، سب کی مدد کرنا۔ سب کے دُکھ درد میں شریک ہونا مرحوم کی فطرت میں شامل تھا۔ یہی وجہ تھی کہ کڑاکے کی سردی کے باوجود شب کو آٹھ بجے بھی اتنے لوگ دفن میں شریک ہوئے جتنے بہت کم دیکھے گئے۔

جامعہ ملیہ اسلامیہ کے طرز پر کراچی میں بھی ایک ادارہ مجلس تعلیم ملی کے نام سے قایم کیا گیا۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ کے جو چند اصحاب پاکستان گئے ان میں ماسٹر عبدالحی فاروقی بھی تھے جو قیامِ پاکستان کے تقریباً چار سال بعد کراچی چلے گئے تھے۔ جس محنت، لگن اور شوق کے ساتھ مرحوم نے جامعہ ملیہ اسلامیہ میں کم و بیش پچیس[۲۵] سال کام کیا تھا اسی تندہی اور جانفشانی سے کراچی میں مجلس تعلیم ملی کے سکریٹری کے فرائض انجام دے رہے تھے۔ ۲۔ دسمبر کو آپ بھی دل کا دورہ پڑنے کے بعد اپنے معبود حقیقی سے جاملے۔ اللہ تعالیٰ مرحوم کو اپنی آغوش رحمت میں رکھے آمین۔

جناب محمد شفیع الدین نیّر

بچّوں کا ترانہ

ہم نونہال پڑھ کر دنیا میں کیا کریں گے
خلق خدا کی خدمت دل سے کیا کریں گے

اللہ کے کرم پر اپنی نگاہ ہوگی
جو حکم اُس کا ہوگا اس پر چلا کریں گے

ہم راستی کی رہ پر بڑھتے ہی جائیں گے سب
دنیا کو نیکیوں سے ہم آشنا کر

جو بات بھی کہیں گے پورا اُسے کریں گے
وعدہ جو کرلیا ہے اُ

چھوٹوں پہ مہربانی اپنا شعار ہوگا
اپنے بڑوں کی با

ماں باپ کی اطاعت ہوگی ہماری عادت
اُستاد کی نصیحت

پائیں گے درد دکھ میں ہم مبتلا کسی کو
اس درد اور دُکھ کو

تن اپنا صاف ہوگا من اپنا صاف ہوگا
پاکیزہ خو رہیں یہ کو

باطل کے راستوں سے ہم دور ہی رہیں گے
جو حق کی راہ ہوگی ا

اس زندگی میں ہم کو محنت سے کام ہوگا
علم و ہنر کی راہیں ہم

سیدھا جو راستہ ہے اس پر ہمیں چلائے
اپنے خدا سے نیّر یہ التجا کریں گے

کہ مقدس موقع پر ہمارا فرض ہے کہ اس تہوار کی

ور ایثار و قربانی کی اہمیت کو پہچانیں۔

تقریبِ سعید پر انسانی ہمدردی، غم خواری

لے اعلیٰ مقاصد کو سامنے رکھتے ہوئے

وت و مساوات اور قومی یک جہتی کے

لنے کا عزم کریں۔

محترمہ صالحہ عابد حسین

قومی خدمت
بڑے آدمی
اور بچے

قومی خدمت کیا ہے ؟ کیا صرف بڑے بڑے لوگ ہی قوم کی خدمت کر سکتے ہیں ؟ — کیا بڑے بڑے کام ہی قوم کی خدمت کہلا سکتے ہیں؟

نہیں بھئی — چھوٹے سے چھوٹا کام بھی قوم کی خدمت کے لیے کیا جا سکتا ہے۔ ہاں اس میں سچا جذبہ ہونا چاہیے۔ کہ ہم دوسروں کی بھلائی کے لیے کام کر رہے ہیں۔ دراصل کوئی بھی کام جو خلوص، محبت اور لگن سے کیا جائے بڑا ہوتا ہے۔ قوم کی خدمت بڑی عمر کے لوگوں نے بھی کی ہے اور بچوں نے بھی۔ آیئے آج اس بارے میں کچھ باتیں کریں۔

قومی خدمت ان بڑے عظیم کاموں میں ہے جس سے انسان اپنی ساری قوم اور پورے ملک کا بھلا بھی کر سکتا ہے! یہ کوئی اچنبھے کی بات نہیں ننھے منے دوستو۔ دنیا میں ایسے بہت سے لوگ گزرے ہیں۔ جنھوں نے اپنی ساری زندگیاں قوم کی خدمت میں بسر کر دی ہیں۔ ان کی خدمت سے قوموں کی قسمتیں بدل گئی ہیں۔ جن کی وجہ سے غلامی کی زنجیریں ٹوٹی ہیں۔ آزادی کی دولت نصیب ہوئی ہے۔ غریبی اور گھٹی زندگی کو جن کی سچی لگن نے خوش و خرم اور خوش حال زندگی سے بدل دیا ہے۔

اور ہم فخر کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ خود ہمارے دیس میں بھی ہمیشہ ایسے لوگ رہتے آئے ہیں جن کے دل میں قوم کی خدمت کی سچی لگن تھی۔ دیس کی سیوا کا گہرا جذبہ تھا۔ جن کی ساری عمر اسی میں گزری کہ اپنے دیس اور قوم کی خدمت کریں۔ ان تھک خدمت بے لاگ سیوا۔ اور اس کی حالت بدل دیں!

ایک بات تمھیں بتا دوں! قوم کی خدمت کرنے والوں نے بچپن سے کوئی منصوبہ بنا کر پہلے سے سوچ سمجھ کر یہ کام نہیں شروع کیا تھا۔۔ ہاں بھلا بچے یہ سب باتیں کیا جانیں۔

بات تو یہ ہے کہ جب بڑے ہو کر جو قوم اور ملک کی

خدمت کے کام کرتے ہیں ان کے دل میں بچپن ہی سے اپنے دلیں سے لگاؤ کا جذبہ ہوتا ہے! ور لوگوں کی تکلیف اور دکھ کا وہ دوسروں سے زیادہ اثر لیتے ہیں۔ تم جانو، جو دوسروں کے درد کو سمجھنے کا جذبہ ہی نہ رکھے گا قوم کی خدمت کا جذبہ اس کے دل میں پیدا ہی کیسے ہو سکتا ہے۔

یوں تو کبھی ہر خدمت خدمت ہے۔ ہر کام جو دوسروں کی بھلائی کے لیے کیا جاتا ہے چاہے وہ کتنا ہی چھوٹے حلقے میں کیا جائے۔ خدمت کے جذبے ہی سے کیا جاتا ہے۔ اور سچ پوچھو تو بڑے بڑے کام تو تھوڑے ہی لوگ کرتے ہیں۔ چھوٹے چھوٹے کام کرنے والے بہت زیادہ ہوتے ہیں!

ہمارے دلیں میں یوں تو کبھی بہت سے لوگ گزرے ہیں جنھوں نے ہر میدان میں قوم کی خدمت کے کام انجام دیئے ہیں۔ مگر ہم اس وقت آپ کے سامنے مثال کے طور پر ان دو چار کا ذکر کریں گے جن کی کوشش سے ہندوستان نے آزادی کی دولت پائی۔ جنھوں نے خود مصیبتیں اٹھائیں اور اپنی قوم کے دکھوں کو دور کرنے کی زندگی بھر جدوجہد کی ہے!

باپو کو تو جانتے ہو نا! ـــــــ ارے تم ہنس رہے ہو کہ یہ کیسی بے وقوفی ہے! بھلا انھیں کون نہیں جانتا ہمارے پیارے باپو جنھیں ہندوستان کا راشٹر پتا کہا جاتا ہے اور جو مہاتما کے نام سے ساری دنیا میں یاد کئے جاتے ہیں۔ گاندھی جی ان کی بڑائی اور عظمت کی تو ساری دنیا گواہ ہے۔

ہم تو ہندوستانی بچے ہیں! ہم ہی انھیں نہ جانیں گے۔

لیکن یہ شہرت، یہ بزرگی یہ بڑائی انھیں ملی کیسے؟ قومی خدمت کرکے! یہ تو سبھی جانتے ہیں کہ وہ بچپن سے سچے تھے۔ دیانت دار تھے۔ نیک تھے۔ ماں باپ کی خدمت کرتے تھے۔ کمزوروں کی مدد کرتے تھے۔ محنتی تھے! تم جانو ان باتوں کے بغیر سچی کامیابی اور اصل شہرت تو کسی کو کبھی نہیں مل سکتی۔ مگر ان کا سب سے بڑا، سب سے گہرا۔ جذبہ کیا تھا۔ قومی خدمت کا جذبہ! پہلے تو وہ یہ سب جانتے تھے بس ایک اچھے آدمی بننا چاہتے تھے۔ ماں باپ کے سعادت مند بیٹے ـــ بیوی کے وفادار شوہر اور بچوں کے اچھے باپ، پڑوسیوں کے اچھے پڑوسی اور ایک کامیاب وکیل۔ انھوں نے اسی کی تعلیم حاصل کی مگر جیسے جیسے زمانہ گزرتا گیا۔ انھیں اپنی قوم کی بدحالی اور غلامی کی لعنت کا گہرا احساس ہوتا گیا اور وہ قومی خدمت میں لگ گئے، پہلے جنوبی افریقہ میں ہندوستانیوں کے ساتھ جو ظلم اور زیادتی ہوتی تھی اس کے خلاف آواز بلند کی۔ جیل گئے۔ لاٹھیاں اور گالیاں کھائیں۔ مگر قوم کی بھلائی کے کاموں میں لگے رہے۔

پھر ہندوستان آئے تو انھیں پورا اندازہ ہوا کہ یہاں تو بدیسی حاکم اور راجا، مہاراجا، اور رئیس وامیر اور اونچی ذات کے لوگ سبھی اپنے سے کمزور کو کچلتے، دباتے، ستاتے ہیں۔ ان کے حق مارتے ہیں اور ان کو اپنا چاکر اور غلام بنا رکھا ہے۔

تو گاندھی جی جٹ گئے اپنے ملک کی ناانصافیاں ختم کرانے میں۔ قوم کو بدیسی حکومت سے آزاد کرانے کے لیے۔ ہندوستان کو غلامی سے چھڑانے کے لیے۔ اور کبھی تم جانتے ہو گے کہ لگ بھگ تیس برس تک

گاندھی جی ان کے لیے دل و جان سے کام کرتے رہے۔ کتنا بڑا دل تھا ان کا، یہ کام کرنے کی کیسی لگن تھی ان کے دبلے پتلے، کمزور جسم میں، محبت کا کیسا دریا اس سینے میں موجیں مارتا تھا ــــ انھوں نے قوم کی خدمت کی خاطر دنیا کا کون سا دکھ تھا جو نہیں جھیلا ــــ جیلوں میں گئے، چکی پیسی، لاٹھیاں کھائیں، دکھ جھیلے، وہ کم سے کم کھاتے تھے۔ اپنے ہاتھ سے کاتے سوت کے موٹے جھوٹے کپڑے پہنتے تھے، جھونپڑی میں رہتے تھے اور قوم کی بھلائی کے کاموں میں دن رات لگے رہتے تھے ــــ اب ان کے کام کیا اتنے بہت سے اور اتنے عظیم ہیں کہ پچاسوں کتابیں ان پر لکھی جا چکی ہیں ــــ اتنا تم بھی جانتے ہی ہوگے کہ سو برس کی غلامی سے ہندوستان انھیں کی انتھک کوششوں سے آزاد ہوا ــــ ہندوستان سے چھوت چھات کی لعنت کو دور کرنے کے لیے انھوں نے بہت کچھ کیا، کمزوروں کو ان کے حق دلوائے ــــ تم بڑے ہوگے اور باپو کی زندگی کا زیادہ غور اور گہرائی سے مطالعہ کروگے تو تمھیں اندازہ ہوگا کہ ان کی قومی خدمت کا جذبہ کتنا گہرا تھا۔ اور اس میدان میں ان کو اتنی بڑی کامیابی حاصل ہوئی جو شاید ہی دنیا میں کسی کو ملی ہوگی۔

اور اپنے پیارے چاچا نہرو کو کون بچہ ہے نہیں جانتا ــــ ان کی ساری زندگی بھی قوم کی [خدم]ت کرتے ہی کٹی۔ تم جانتے ہو وہ بہت بڑے باپ کے بیٹے تھے۔ دولت۔ شہرت، عزت ان کے قدم چومتی تھی۔ دنیا کی سب راحتیں ان کو حاصل تھیں ــــ مگر انھوں نے یہ سب اپنی قوم کی خاطر چھوڑ دیا۔ وہ بیرسٹر بننے گئے اور قوم کے خادم بن کر واپس آئے۔ ان کے دل میں لگن تھی کہ قوم کی حالت سنواریں۔ ملک کو آزاد کرائیں۔ بڑے چھوٹے امیر و غریب کا فرق جتنا بھی مٹا سکتے ہوں مٹائیں۔ اور ہندوستان کو ایک ایسا دیس بنائیں جو دنیا کو امن اور شانتی کا پیغام دے سکے۔ انھوں نے وکالت کو چھوڑا۔ عیش و آرام کی زندگی کو تج دیا۔ گاندھی جی کے ساتھ قوم کی خدمت کے بڑے کام میں اپنے کو کھپا دیا ــــ وہ گاندھی جی کے سچے دل سے پیرو تھے اور ہندوستان اور ہندوستانی قوم سے ان کو گہرا پیار تھا۔ قومی خدمت کا جذبہ ان کی رگوں میں خون بن کر دوڑتا تھا ــــ اور تم جانتے ہی ہو کہ ان کی کوششیں سپھل ہوئیں۔ ہندوستان آزاد ہوا۔ بڑے چھوٹے۔ امیر غریب کا بھید بھاؤ کم ہوا اور انھوں نے اسے خوشحالی، کامیابی اور ترقی پر چلنے کا راستہ دکھایا۔ اتنی بڑی کامیابی کیسے ملی؟ سچے قومی خدمت کے جذبے سے جن کی خاطر انھوں نے بہت دکھ اٹھائے۔ بہت محنت کی، بہت کوشش کی! اور تم جانو محنت کے بعد راحت ملتی ہے۔ مقصد حاصل ہوتا ہے ــــ کامیابی کا راز وہ خوب جانتے تھے!

اور بھئی مولانا ابوالکلام آزاد کا نام بھی تم نے ضرور سنا ہوگا؟ وہ ایک بہت بڑے دین کے عالم کے بیٹے تھے اور خود بھی بہت بڑے عالم تھے۔ انھوں نے بہت سے مضامین اور کتابیں لکھی ہیں اور انھیں دنیا کے چند بہت بڑے لکھنے والوں میں گنا جاتا ہے۔

تم جانو مضمون اور کتابیں لکھنا اور اس کے

ذریعے لوگوں کے دل میں قوم کی خدمت کا جذبہ پیدا کرنا بھی بہت بڑا کام ہے۔ یہ کام بھی مولانا آزاد زندگی بھر کرتے رہے۔ سوتوں کو جگانے کا عظیم کام۔ مگر انھوں نے اسی پر بس نہیں کیا۔ ہندوستان کو آزادی دلانے کے لیے عملی جدوجہد میں بھی حصّہ لیا۔ بڑے بڑے جلسوں میں تقریریں کیں۔ لاٹھیاں کھائیں۔ جیل گئے ان کا کتب خانہ اور کتابیں تک ظالم جلا دیتے تھے۔ مگر وہ کسی کے سامنے جھکنے والے اور اپنی بات سے ہٹنے والے آدمی نہ تھے — خود اپنے لوگوں نے ان پر بہتان باندھے انھیں بُرا بھلا کہا مگر مولانا آزاد تو ایک پہاڑ تھے جو اپنے مقصد کے۔ سامنے ڈٹ جاتے دنیا کی کوئی طاقت اُسے ان کے راستے سے کیسے ہٹا سکتی ہے؟۔

اور کبھی آج کے زمانے میں آپ اپنے سامنے ایک مثال دیکھ سکتے ہیں۔ چاچا نہرو کی بیٹی اندرا جی کی اور اس میں تعجب کی بھی کیا بات ہے۔ انھوں نے تو قومی خدمت کا جذبہ ماں کے دودھ کے ساتھ پیا ہے باپ کے سایے میں یہ جذبہ پروان چڑھا ہے۔ وہ چھوٹی سی تھیں تبھی سے ملک کی آزادی کی جدوجہد میں حصّہ لینا شروع کر دیا تھا۔ انھوں نے آپ جیسے ننھے منّوں کی ایک فوج بنائی تھی۔ جو چھوٹے چھوٹے مگر اصل میں بڑے بڑے کام کرتی تھی۔ اور جب سے حکومت کی باگ ڈور انھوں نے سنبھالی ہے وہ تن من سے اپنے دیس اور قوم کی خدمت میں لگی ہوئی ہیں انھوں نے راتوں کی نیند دن کا چین، ہر راحت و آرام اس کے پیچھے تج دیا ہے۔ کہ ہندوستان کی آزادی قائم رہے، ہندوستانی قوم کو جن کٹھنائیوں کا سامنا ہے۔ وہ

دور ہوں۔ ملک سے غریبی دور ہو۔ بے کاری دور ہو۔ جھگڑے فساد مٹیں۔ امن و امان اور خوش حالی کا دور دورہ ہو!۔

بچّو! تم جانتے ہو۔ بچّے جلدی بات سمجھ جاتے ہیں نا!۔ کہ دنیا میں ہر کام مل جل کر ہوتا ہے۔ پنڈت نہرو، مولانا آزاد، گاندھی جی اسی لیے تو کامیاب ہوئے کہ لاکھوں کروڑوں لوگ ان کے ساتھ تھے۔ آج ہمارا اور ہم سے بھی زیادہ آپ لوگوں کا۔ ان لاکھوں نونہالوں کا جو کسی بھی دیش کی آشا یا امید ہوتے ہیں، یہ فرض ہے کہ وہ اپنے دیس کی بھلائی کا کام کریں قومی خدمت کا جذبہ ان کے دل میں رہے۔ صرف اپنا ہی بھلا نہ چاہیں۔ بلکہ ایسے کام کرنے کا عزم کریں جس سے آگے چل کر وہ اپنے دیس کی سچی خدمت کر سکیں۔

مگر اس وقت آپ کے سامنے سب سے بڑی خدمت یہ ہے کہ اپنے کردار کو بنائیں۔ اپنی تعلیم لگن سے حاصل کریں۔ جھگڑے فساد، ہنگاموں کی برائیوں سے بچیں آپ اچھے ہوں گے۔ سچّے ہوں گے۔ محبّت اور پیار سے ایک دوسرے کے ساتھ رہنا سیکھیں گے۔ دوسروں کے دُکھ کا احساس کریں گے۔ اور اس کے دور کرنے کا جذبہ آپ کے دل میں ہوگا۔ تو آپ کی قوم، آپ کا ملک محفوظ رہے گا دنیا کے سامنے اس کا سر اونچا رہے گا۔ کہ ایسے ہی بچّوں سے قوم اور ملک کی عزّت کی حفاظت ہوتی ہے

★

جناب جاوید احمد خاں

بھارت مرا وطن ہے

یاں سرو اور سمن ہے، یاں دلکشا چمن ہے نغموں سے گونجتی یا ہر صبح کو پون ہے
پربت ہمالیہ بھی۔ رفعت کا نعرہ زن ہے مدّاح ہوں میں اس کا، ایسا حسین چمن ہے
بھارت مرا وطن ہے
بھارت مرا وطن ہے

ہر شئے یہاں انوکھی طاقت لیے ہوئے ہے ذرہ ہر اک یہاں کا، راحت لیے ہوئے ہے
آنکھوں میں یاں نظارا، جنّت لیے ہوئے ہے اور آبِ رودِ گنگا عشرت میں نغمہ زن ہے
بھارت مرا وطن ہے
بھارت مرا وطن ہے

ہم نے ترقیوں کے سب راز پا لیے ہیں جس میں ہو سوز ڈوبا، وہ ساز پا لیے ہیں
پرواز کر کے اونچی، دمساز پا لیے ہیں ہے رات اپنی شاداں، اور صبح خندہ زن ہے
بھارت مرا وطن ہے
بھارت مرا وطن ہے

میرے چمن کے طائر دنیا میں چہچہائے یاں کے چراغ ساری دنیا میں جگمگائے
دنیا کو رہ دکھائی، ظلم و ستم مٹائے اپنے حسیں گگن میں، تاروں کی انجمن ہے
بھارت مرا وطن ہے
بھارت مرا وطن ہے

ہم نے کیا ہے زندہ گلشن کے رنگ و بو کو نہرو کی نیک خو کو گاندھی کی جستجو کو
ہم نے بڑھا دیا ہے ملّت کی آبرو کو سینے میں اپنے دریا عظمت کا موجزن ہے
بھارت مرا وطن ہے
بھارت مرا وطن ہے

جناب اسرار مروی

شہزادہ بے نظیر کی کہانی

آپ بیتی نہیں کہتا، سنی سنائی نہیں کہتا، کتاب کی دیکھی سناتا ہوں۔ آپ کی اسی دِلّی کے ایک تھے میر حسن۔ یہ اردو زبان کے بڑے شاعروں میں ہیں انھوں نے اتنی شاندار مثنویاں[1] لکھی ہیں۔ کہ بس پڑھا کیجیے۔ ان کی آخری مثنوی ہے "سحر البیان" اسے "مثنوی بے نظیر" بھی کہتے ہیں۔ اس مثنوی کی کہانی میں آپ کو سنا رہا ہوں۔ اس مثنوی میں بائیس سو (۲۲۰۰) شعر ہیں۔ یہ مثنوی سنہ ۱۷۸۵ء میں لکھی گئی۔ آج سنہ ۱۹۷۴ء ہے۔ یعنی یہ مثنوی آج سے ایک سو اسی (۱۸) سال پہلے تصنیف ہوئی۔ اسی کے بہت سے شعر محاورے بن کر ہماری آپ کی زبان پر رواں ہیں۔ جیسے :-

سدا عیش دوراں دکھاتا نہیں
گیا وقت پھر ہاتھ آتا نہیں

کسی پاس دولت یہ رہتی نہیں
سدا ناؤ کاغذ کی بہتی نہیں

کٹی رات حرف و حکایات میں
سحر ہو گئی بات کی بات میں

اب آگے کہانی کی ہے داستاں
ذرا سن لے دل دے کے اس کا بیاں

پہلی داستان

کسی شہر میں تھا کوئی بادشاہ

کسی ملک میں ایک بادشاہ تھا۔ بڑا امیر کبیر۔ اس کے پاس بہت بڑی فوج تھی۔ ان گنت، ہاتھی، گھوڑے تھے۔ دھن دولت کی بھی کمی نہ تھی۔ کئی بادشاہ اس کے ماتحت تھے اور اسے خراج[1] دیتے تھے۔ اس کا ملک خوش حال، رعایا خوش اور مطمئن تھی۔ کسی کو مفلسی کا ڈر تھا نہ چوری کا۔ بادشاہ بڑا فراخ دل تھا۔ اس کے دربار میں جو کوئی تباہ حال آیا، خوش حال گیا۔

شہر کے مکان، گلیاں، سڑکیں، جہاں تک نظر جاتی، پختہ اور صاف ستھری تھیں۔ جگہ جگہ حوض اور تالاب پڑے چھلک رہے تھے۔ شہر کے چوک بازار کی سجاوٹ ایسی تھی کہ ہزاروں بار دیکھنے کے بعد بھی دل نہ بھرے۔ راستے کے دونوں طرف گھاس کے تختے سجے تھے۔ ان میں طرح طرح کے پھول پودے اپنی بہار دکھلا رہے تھے۔ مکانوں کی سفیدی پر نگاہ نہ ٹھہرتی تھی۔ بادشاہ کے محل کا کیا کہنا وہ تو اتنا اونچا، اتنا اونچا تھا کہ پہاڑ بھی اس کے سامنے نیچا تھا۔ وہ ہمیشہ نوکروں چاکروں اور راگ رنگ کی آوازوں سے گونجا کرتا۔ محل کے اندر ہر دن عید اور ہر رات شب برات رہتی۔

لیکن میاں پھول کے ساتھ کانٹے بھی تو ہوتے ہیں۔

---

[1] مثنوی شاعری کی اس قسم کو کہتے ہیں۔ جس میں واقعے، قصے یا تاریخ کو نظم میں بیان کیا گیا ہو۔

[1] ٹیکس

بادشاہ کے دل میں بھی ایک کانٹا تھا۔

بادشاہ کے کوئی اولاد نہ تھی۔ وہ اولاد کے غم میں گھلا جا رہا تھا۔

سوچتے سوچتے اس نے ایک دن اپنے وزیروں کو بلایا اور کہا:

"میرے وفادار وزیرو! اب فقیری[1] کا خیال رکھتا ہوں۔ فقیر نہ ہوں تو کیا کروں یہ مال و دولت، یہ تخت، یہ تاج میرے کس کام کا۔ جوانی گئی بڑھاپا آیا اور اب تک

نہ پیدا ہوا وارثِ تخت و تاج

میں نے ناحق ملک و مال پر جان کھوئی اور دنیا کے پیچھے عمر گنوائی۔"

یہ سن کر وزیروں نے اُسے سمجھایا: "جہاں پناہ! خدا کی مہربانی سے مایوس نہ ہوں۔ دنیا چھوڑنا کوئی اچھا کام نہیں۔ دنیا میں رہ کر فقیری کرنا کمال ہے۔ رہا اولاد کا غم تو اس سے مایوس نہ ہوں۔ جس نے جہاں پناہ کو یہ سب کچھ دیا ہے وہ اولاد بھی دے گا۔ ہم ستارہ[2] شناسوں، رمالوں[3] اور پنڈتوں کو بلواتے ہیں۔ دیکھیں تقدیر میں کیا لکھا ہے۔ اس کی رحمت میں دیر کیوں ہے۔"

تو میاں، شاہی حکم سنتے ہی ایک سے ایک جغادری ستارہ شناس، رمال اور پنڈت اپنی اپنی پوتھی لے حاضر ہوئے۔ بادشاہ کو دعائیں دیں اور قرینے سے بیٹھ گئے۔

بادشاہ نے کہا "مجھے آپ لوگوں سے ایک کام ہے۔ آپ لوگ اپنے اپنے علم سے بتائیں کہ میرے نصیبوں میں اولاد ہے یا نہیں۔

یہ سن کر ستارہ شناس زائچے[4] کھینچنے لگے۔ رمالوں نے تختیاں رکھیں اور پانسے پھینکنے لگے۔ پنڈتوں نے پوتھیاں سنبھالیں۔ جب سب نے اچھی طرح دیکھ بھال لیا تو ستارہ شناسوں نے کہا۔

"جہاں پناہ! زحل[5] کا عمل ختم ہو چکا ہے۔ اب سبھی ستاروں کی نیک نظر جہاں پناہ پر ہے۔ ہمارا علم جلد ہی اولاد نرینہ[6] کی خبر دیتا ہے۔"

رمال کہنے لگے: "جہاں پناہ! ہم نے جب کبھی پانسا پھینکا۔ ایسی شکلیں بنیں جو جلد ہی دل کی مراد پوری ہونے کی خبر دیتی ہیں۔"

پنڈتوں نے کہا: "مہاراج! ہماری پوتھی[7] کہتی ہے کہ چندرماں[8] سا بالک تیرے ہووے گا۔ مہاراج! اگر میری یہ بات سچی نہ ہوئی تو ہم برہمن نہیں ... لیکن .... لیکن ......"

بادشاہ نے کہا: "ہاں ہاں۔ بتاؤ بتاؤ، ہم بدولت سب کچھ سننے کو تیار ہیں۔"

"مہاراج! لڑکا تو ضرور ہوگا لیکن بارھویں برس میں خطرہ نکلتا ہے۔ بارہ برس تک شہزادہ بلندی پر نہ جائے، میاں، ایسے اللہ آمین کا لڑکا۔ اور اس پر خطرہ آ جو

---

[1] دنیا چھوڑ دے گا۔
[2] ستاروں کی چال جاننے والے
[3] علم رمل جاننے والے

[4] وہ لکیریں جسے ستارہ شناس ستاروں کی چال معلوم کرنے کے لیے بناتے ہیں۔
[5] یہ منحوس ستارہ مانا گیا ہے۔
[6] لڑکا۔
[7] کتاب۔
[8] چاند کی طرح۔

گئے سو گھبرائے۔ بادشاہ نے گھبرا کر پوچھا "جان کا تو خطرہ نہیں؟"

پنڈتوں نے جواب دیا۔ "نہیں مہاراج، جان کی سب طرح خیر ہے۔ مگر دشت غربت[1] کی کچھ سیر ہے۔ کوئی پری[2] اسے پرستان[3] لے جائے گی۔"

یہ سُن کر بیچارہ بادشاہ کچھ خوش، کچھ اُداس محل میں گیا۔ اس نے سوچا یہ سب اٹکل بازیاں ہیں۔ کل کیا ہوگا کسے معلوم اور وہ خدا سے اپنی مراد مانگنے لگا۔ روزانہ مسجد میں چراغ رکھنے لگا۔ میاں اور پیر والے کو بخشش کرتے دیر نہیں لگتی جوں جوں دن بیتتے گئے بادشاہ کو یقین ہوتا گیا کہ تخت و تاج کا وارث آنے والا ہے۔

دوسری داستان

شاہزادہ بے نظیر کا پیدا ہونا

ایک دن بادشاہ دربار میں بیٹھا حکومت کے کام میں لگا تھا کہ محل میں مبارک سلامت کی دھوم مچی۔ خواصیں[4] دربار کی طرف دوڑیں اور بادشاہ سلامت کو شہزادے کی پیدائش کی خوش خبری سنائی۔ یہ خبر سنتے ہی بادشاہ دربار سے اٹھ گیا۔ اور سیدھا محل سرا[5] میں داخل ہوا۔ جانماز بچھائی اور خدا کا شکر ادا کرنے لگا۔

شہزادے کی پیدائش کی خبر منٹوں کی منٹ میں سارے شہر میں پھیل گئی۔ ہر طرف خوشی کے باجے بجنے لگے۔

"دوں دوں[1]" کی آواز سے جیسے سارا شہر جاگ اٹھا۔ دیوانِ عام[2] سے محل تک وہ بھیڑ لگ گئی کہ تل دھرنے کو جگہ نہ تھی۔ ایک طرف سے امیر وزیر نذریں لے کر جا رہے تھے، دوسری طرف سے لوگ انعام لے کر آ رہے تھے کسی کو جاگیریں ملیں کسی کو جوڑے کسی کو نقدی ملی۔ کسی کو گھوڑے۔ اسی طرح چھٹی تک محل میں دن ہولی اور رات دوالی رہتی۔

چھٹی کے روز لڑکے کا نام بے نظیر رکھا گیا۔ اس بچے کی دیکھ بھال کے لیے دودھ پلائیاں۔ انائیں اور مامائیں[3] بحال ہوئی۔ جب وہ ایک سال کا ہوا تو پھر اسی طرح سارے شہر میں جشن منایا گیا۔ چوتھے برس اس کا دودھ بڑھایا گیا۔ اور میاں، جب وہ پاؤں پاؤں چلنے لگا تو بادشاہ نے اس کے لیے محل کے اندر ایک باغ لگانے کا حکم دیا۔ حکم کی دیر تھی سیکڑوں آدمی باغ کی تیاری میں لگ گئے۔

باغ کیا تھا جنت کا ٹکڑا سمجھو۔ زمین پر گھاس اس طرح جمائی گئی تھی جیسے سبز مخمل کے ٹکڑے کاٹ کاٹ کر سجائے گئے ہوں۔ روش پر سنگِ مرمر بچھے تھے اس کے دونوں طرف سرو ہاتھ باندھے کھڑے تھے۔ کیاریوں میں کہیں گلاب اپنی بہار دکھلا رہے تھے، تو کہیں چنبیلی۔ کہیں موتیا۔ کہیں موگرا کہیں لالہ تو کہیں نرگس۔ خوشبوؤں سے سارا باغ بسا رہتا اس طرف سے اگر کوئی گزر جاتا تو خوشبوؤں سے بس جاتا۔

باغ کے ایک طرف ایک نہر تھی۔ نہر سے ذرا ہٹ کر جھاڑیاں سی بنی تھیں۔ جھاڑیوں میں پرندے شور

---

[1] غیر ملک۔
[2] ایک خیالی مخلوق
[3] پریوں کا دیس جس میں اب آدمی رہتے ہیں۔
[4] نوکرانیاں
[5] زنان خانہ

---

[1] ڈھول کی آواز
[2] عام دربار
[3] بچوں کو کھلانے والی ماما۔

مچایا کرتے۔ جگہ جگہ فوارے اور آبشار پانی اچھال رہے تھے۔ فواروں کے چھچھلے پانی میں پرندے کلیلیں کر رہے تھے۔ باغ کی دیکھ بھال کے لیے پچیسوں مالی بحالی تھے۔

باغ کے بیچ میں ایک چھوٹی سی بہت خوبصورت عمارت تھی۔ اس کے دروازوں اور کھڑکیوں پر قیمتی پردے اور چلمنیں لٹک رہی تھیں۔ یہ عمارت بے نظیر کے لیے بنوائی گئی تھی۔ وہ بڑے ناز و نعمت سے اسی عمارت میں پل رہا تھا۔

ایک دن اس کی مکتب کی رسم ادا ہوئی۔ بڑے بڑے عالم فاضل، منشی ادیب بلائے گئے۔ لڑکا بڑا محنتی اور تیز تھا۔ پڑھنے میں بہت دل لگاتا۔ تھوڑے ہی دنوں میں ان سے بہت سے علم اور فن سیکھ لیے۔ نام کا بے نظیر تو تھا ہی، سچ مچ بے نظیر بن گیا۔

بے نظیر جب بارہ سال کا ہوا تو ایک دن بادشاہ نے سرداروں کو حکم دیا کہ "شہر کو قرینے سے سجایا جائے۔ ہر طرح کی سواری کا انتظام کیا جائے۔ رعایا کی خوشی کے لیے کل شہزادہ بے نظیر شہر گھومنے نکلے گا!" حکم ہوتے ہی شہر میں ہر طرف تیاریاں شروع ہو گئیں۔ سواریوں کی بھی دیکھ بھال ہونے لگی۔

دوسرے دن صبح ہی سے محل میں ہل چل تھی۔ جب شہزادہ نہا دھو کر غسل خانے سے نکلا تو محل کے باہر نقارے بجنے لگے۔ نقاروں کی آواز سنتے ہی سواریوں کی قطاریں درست کی جانے لگیں۔ ہزاروں ہاتھی اور گھوڑے، پلٹن اور رسالے، نوبت نقارے بادشاہ اور شہزادے کا انتظار کرنے لگے۔

جوں ہی بادشاہ اور شہزادہ محل کے باہر آئے ان کے استقبال کی دھنیں بجنے لگیں۔ فوج نے سلامی دی۔ امیروں اور وزیروں نے نذریں پیش کیں۔ بادشاہ اور شہزادہ ایک سجے سجائے ہاتھی پر سوار ہوئے۔ آگے پیچھے پچیسوں ہاتھی۔ اس کے بعد سوار، پھر پلٹن اور پھر رسالے پھر بینڈ بجانے والے۔ آگے آگے چوب دار سنہری وردیاں پہنے، ہاتھ میں چاندی کا ڈنڈا لیے قدم بقدم پکارتے جا رہے تھے۔

"دولت زیادہ، قدم کشادہ، جوانوں بڑھے چلو، چلے چلو!"

محل سے شہر تک آدمی ہی آدمی نظر آ رہے تھے۔ دیکھنے والوں کی وہ بھیڑ تھی کہ لوگ ایک پر ایک ٹوٹے پڑتے تھے۔ رعایا بادشاہ کو جھک جھک کے سلام کر رہی تھی اور شہزادے کو دعائیں دے رہی تھی۔ چھتوں اور کوٹھوں سے پھول برس رہے تھے۔

"بادشاہ کو جھک جھک کے سلام کر رہی تھی اور شہزادے کو دعائیں دے رہی تھی۔ چھتوں اور کوٹھوں سے پھول برس رہے تھے۔" "بادشاہ و شہزادہ زندہ باد" کے نعروں کی آوازیں آسمان تک پہنچ رہی تھیں۔

شہر سے باہر بادشاہ کا ایک بہت بڑا باغ تھا۔ سیکڑوں مالی اس کی دیکھ بھال میں لگے تھے۔ بیچ باغ میں کئی درختوں کی ڈالیاں اس طرح تراشی گئی تھیں کہ ایک بڑا سا سبز گنبد بن گیا تھا۔ گنبد کے نیچے بڑا سا چبوترا تھا۔ چبوترے پر قالین بچھے تھے ——— قالین کے اوپر دو سنہری چھوٹی بڑی کرسیاں رکھی تھیں۔ بادشاہ اور شہزادہ کرسیوں پر جا بیٹھے۔ جلوس والوں نے بھی دوسری طرف ذرا دیر آرام کیا۔ پھر نقاروں پر چوب پڑی۔ کوچ کی تیاریاں ہونے لگیں۔ جلوس اسی شان سے محل کی طرف روانہ ہو گیا۔

باقی ص۳۴ پر

جناب ولی تنویر

نئی صبح

آج کی رات برسات کی ... ہے اندھیری اور خوف ناک رات ہے۔ رات کا سیاہ کاجل فضا میں بکھر چکا ہے۔ موسلا دھار بارش ہو رہی ہے۔ بادلوں کے دبیز پردے کائنات کو اپنی لپیٹ میں لے چکے ہیں۔ بادلوں کی گرج اور بجلی کی خوفناک چمک سے ماحول بڑا ہی دہشت ناک ہو گیا ہے۔ ہر طرف بارش کا شور اور اندھیرے کا سیاہ کاجل ہے۔ دُور دُور تک کوئی جاندار نظر نہیں آتا۔ شہر سونا سونا اور اداس ہو گیا ہے۔ ماحول پر نحوست برس رہی ہے۔ خاموشی اور نحوست کی چادر میں لپٹے ہوئے اس شہر کی آبادی سے دُور جنگل کے کنارے ایک چھوٹی سی بوسیدہ گھاس پھوس کی جھونپڑی واقع ہے۔ یہ پگڈنڈی جس پر میں چل رہا ہوں۔ اس خستہ حال جھونپڑی تک جا پہنچتی ہے پگڈنڈی کے اردگرد لمبی لمبی گھاس اُگ آئی ہے۔ اندھیرے میں راستہ سجھائی نہیں دیتا کبھی کبھی بجلی چمک جاتی ہے تو دور تک چلی گئی یہ سونی پگڈنڈی نظر آجاتی ہے۔ اور میں آہستہ آہستہ چلنے لگتا ہوں کس قدر دشوار گذار ہے یہ راستہ بے شمار کانٹے پڑے ہیں بے حد پتھریلی ہے یہ زمین!! میں بہت دیر سے اس راہ پہ چل رہا ہوں۔ میرے قدم نڈھال ہیں۔ میری منزل اب کچھ ہی دور کے فاصلے پر ہے۔ میں بڑی ہمت سے اپنے نڈھال اور لڑکھڑاتے قدموں کے ساتھ آگے بڑھ رہا ہوں۔ میرے کاندھوں پر کافی بوجھ ہے۔ اتنا بوجھ کہ اگر کوئی اور میری جگہ ہو تو شائد اس بوجھ تلے دب کر رہ جائے چلتے ہوئے کبھی میں چاہتا ہوں کہ اس بوجھ کو یہیں پھینک دوں اور اس دشوار گذار راہ سے کہیں دور بھاگ چلوں لیکن دوسرے ہی لمحے مجھے اس مقدس بوجھ کو سنبھال کر چلنے کی ذمہ داری کا احساس چونکا دیتا ہے۔ میری ہمت اور بھی بڑھ جاتی ہے اور میں پہلے سے بھی زیادہ جوش و خروش کے ساتھ اس پتھریلے راستے کو طے کرنے لگتا ہوں۔ تھوڑی دیر بعد پھر بجلی چمکتی ہے تو اس کی روشنی میں جھونپڑی کو اپنے بہت قریب پاتا ہوں میں جھونپڑی کے ٹین سے بنے ہوئے دروازے کو کھٹکھٹاتا ہوں۔

"کون ہے ... ؟ دروازہ کھلا ہے اندر چلے آؤ!"

اس کی بیمار اور نحیف آواز جھونپڑی کے اداس ماحول کو چیرتی ہوئی میرے کانوں سے ٹکراتی ہے اور میں ٹین کا دروازہ دھکیل کر اندر داخل ہو جاتا ہوں اندر بے حد اندھیرا ہے اور اس اندھیرے میں اس کے کراہنے کی دردناک آواز ابھر رہی ہے۔ تم جہاں کھڑے ہو وہیں پر محراب میں چراغ رکھا ہوا ہے روشن کر لو۔ وہ کراہوں کے درمیان کہتی ہے پاس رکھی ہوئی دیا سلائی جلا کر میں چراغ روشن کرتا ہوں چراغ کی مدھم روشنی جھونپڑی میں پھیل جاتی ہے

وہ قریب ہی ایک بوسیدہ چارپائی پر پڑی ھسّی درد سے
کراہ رہی ہے۔ میں اس کے پاس بیٹھ جاتا ہوں چراغ کی
ہلکی روشنی میں اس کا اداس اور مرجھایا ہوا چہرہ صاف
نظر آرہا ہے۔ اتنی سردی کے باوجود اس کے چہرے
پر پسینے کے قطرے نکل آئے ہیں۔ میں جب پسینہ
پونچھتا ہوں تو ششدر سا رہ جاتا ہوں۔ اس کا جسم
بخار کی شدّت سے بھٹی کی طرح جل رہا ہے۔ ایک
ساتھ کتنی بیماریاں اس پر ٹوٹ پڑی ہیں؟ وہ اب
اس قدر نحیف اور کمزور ہو چکی ہے کہ بات کرنا تک اس
کے لیے دشوار ہو گیا ہے۔ یہاں پر اس کا اپنا کوئی نہیں
ہے۔ یوں تو اس کے عاشقوں اور پرستاروں کی تعداد
ہزاروں اور لاکھوں میں ہے۔ سب ہی اس سے محبت
جتاتے ہیں۔ لیکن اب وہ یہاں اس بوسیدہ جھونپڑی
میں تن تنہا کس مپرسی کے عالم میں اپنی زندگی کے
دن کاٹ رہی ہے۔

پچھلے چند برسوں سے مجھے بھی اس سے محبت
ہو گئی ہے یوں تو میں اس کو بچپن سے ہی جانتا اور
چاہتا آیا ہوں اس سے ملنے اور بات چیت کرنے
سے پہلے میں نے اس کے بہت چرچے سنے تھے لوگوں
کی زبانی اس کی تندرستی، اس کی شرافت، انسانیت
رواداری، میل محبت کی تعریف کرتے نہ تھکتی تھی۔
جبھی تو مجھے بھی اس سے ملنے کا شوق ہوا اور یہی جذبہ
مجھے اس کے پاس کھینچ لایا تھا پہلی بار جب میں نے
اس کو دیکھا تھا تو اس کی حالت مجھ سے پہچانی نہیں
جاتی تھی۔ لوگوں کی جو رائے تھی۔ اس سے وہ بہت
مختلف تھی وہ یکسر بدل گئی تھی۔ میں اس سے
روز ملتا رہا۔ اس طرح دن گذرتے رہے۔ ایک دن
اس نے مجھے بتایا کہ وہ کسی زمانے میں واقعی بہت
تندرست اور جوان تھی۔ لوگ اس وقت اس کی
صحت اور شائستگی کی داستانیں بیان کیا کرتے۔ اس
سے لگاؤ اور محبت کے قصیدے پڑھتے۔ لیکن اب
یہ عالم ہے کہ اس کے عاشق اور پرستار اس سے ڈر کر
بھاگتے ہیں۔ اس نے گلوگیر آواز میں کہا: "مجھے سرِبازار
رسوا کیا جاتا ہے۔ میری جی بھر کر بے عزتی کی جاتی ہے
کوئی میری صورت تبدیل کرنا چاہتا ہے۔ کوئی میری
سیرت کے درپے ہے۔" یہ کہتے ہوئے اس کی آنکھیں
نم ہو گئیں۔

ایک دن میں اس سے اس کی پچھلی زندگی کے
بارے میں سوال کر بیٹھا۔ میرے سوال پر وہ بہت
غمگین ہو گئی۔ وہ مجھے پہلے تو ٹال دینا چاہتی تھی۔
کہنے لگی: "میری داستان سن کر تم کیا کرو گے۔
وہی لوگ کیا کر رہے ہیں۔ جو میری زندگی سے پہلے سے
واقف ہیں۔"

لیکن میں مصر تھا کہ وہ اپنی داستان مجھ سے بیان
کرے۔ تب اس نے کہنا شروع کیا۔

"سُنا ہے کہ میں نے دہلی یا دہلی کے آس پاس کے
کسی باعزّت گھرانے میں جنم لیا تھا۔ میں ابھی اپنے
بچپن کے دن ہی گذار رہی تھی کہ میرا وہ گھرانہ لٹ گیا
اور مجبور ہو کر مجھے لکھنؤ آنا پڑا تھا نے کچھ دن وہاں
پر گذارے۔ اب میں بچپن طے کر کے لڑکپن کی چوکھٹ
پر قدم رکھ رہی تھی مجھے یہاں تک پہنچتے پہنچتے بہت
سی مصیبتیں جھیلنی پڑیں۔ میری تندرستی، انسانیت
اور رواداری کے چرچے بھی ساتھ ساتھ ملک بھر میں
پھیل رہے تھے۔ اگر ایک طرف بہت سی مصیبتوں سے

...ہوتا پہنا تو دوسری طرف مجھے عزت و شہرت بھی بہت ملی۔ ہر کس و ناکس میری طرف بڑھنے لگا تھا۔ ہر کوئی مجھے اپنا لینا چاہتا تھا۔ اپنی جوانی کے کچھ دن میں نے لکھنؤ میں گزارے لکھنؤ کا گھر بھی مجھے راس نہ آیا۔ اس کو اتفاق ہی کہنا بہتر ہوگا کہ میری وضعداری، شائستگی اور انسانیت کے چرچوں سے نظام دکن کے کان بھی آشنا ہو گئے انھوں نے فوراً مجھے اپنے پاس بلا لیا۔ اور اپنی ریاست کی ملکہ بنا لیا۔ یہاں میری خوب خاطر ہونے لگی۔ خوب چاؤ ہونے لگے۔ وہ دن میری زندگی کے بہار کے دن تھے۔ نظام کی خاص توجہ سے ——————

—————— میری اچھی اچھی باتوں میں اور نکھار پیدا ہو گیا تھا۔ نظام نے مجھے الوٹ پیار دیا۔ میرے ہر سرد و گرم کا خیال رکھا..... ہمیشہ وہ میرے آرام اور آسائش کی طرف مائل رہتے مجھے زندہ اور پائندہ رکھنے کے لیے انھوں نے بہت کچھ کیا۔ کافی دولت خرچ کی محض میری خاطر ایک یونیورسٹی قائم کر ڈالی۔ جس کی دنیا بھر میں مثال نہیں۔ میں یہاں آکر بہت خوش تھی۔ بے حد مطمئن تھی۔ میری زندگی اب سکون سے گذر رہی تھی۔ اب مجھے شہرت کے ساتھ ساتھ اتنی عزت اور محبت ملی کہ میں بلا کسی جھجک کے اپنی ہم عمر سہیلیوں سے آنکھیں چار کر سکتی تھی۔" اتنا کہتے ہوئے اس کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے اور آواز بھاری ہو چلی تھی۔

اس نے پھر کہا۔ "لیکن میری اس بہار کی عمر بہت کم تھی۔ نظام کی حکومت ختم کیا ہوئی کہ میرا سہاگ لٹ گیا۔ بس یہیں سے میری زندگی کا تاریک باب شروع ہوتا ہے۔ اب میں معذور سی ہو کر رہ گئی۔

اب میری یہاں کوئی وقعت نہیں رہی۔ اس یونیورسٹی سے جو محض میرے لیے کھولی گئی تھی مجھے بڑی بے دردی اور بے رحمی کے ساتھ نکال دیا گیا۔ اب شہر میں داخلے پر بھی پابندی لگی ہوئی ہے۔ میں کس کو اپنا حال سناؤں میری اب کون سنتا ہے۔ میرے جلنے والے ہی خود مجھ سے اب ان جان بنے بیٹھے ہیں۔ میرے پرستار اب مجھ سے آنکھیں ملانے میں خوف محسوس کرنے لگے ہیں۔ اب مجھے اپنا کہتے ہوئے انھیں ڈر سا ہونے لگا ہے۔ وہ مجھے بدنام اور رسوا کرنے میں کوئی جھجک محسوس نہیں کرتے۔" یہ کہتے ہوئے وہ رنجیدہ ہو گئی اور آنکھیں پرنم ہو گئیں۔

میں نے اُسے دلاسا دیا۔ "یہ آپ کی پریشانی کی زندگی بھی باقی نہ رہے گی۔ آپ کی زندگی میں پھر بہار آئے گی۔ ضرور آئے گی دن پھر سنور جائیں گے!!"

تب اس نے ایک ٹھنڈی سانس لی اور کہا۔

"تم بھی عجیب باتیں کرتے ہو یہ سب خوش فہمیاں ہیں میرے دن کیسے بدل سکتے ہیں؟ یہ بات کہنے والے ساون کے اندھے ہیں انھیں ہرا بھرا ہی نظر آتا ہے!!"

اس دن ہم دیر تک باتیں کرتے رہے تھے میں ہر روز اس سے ملتا۔ دل بھر کر باتیں ہوا کرتی تھیں۔ اور دن گذرتے رہے۔ اور آج تو اس کی صحت بہت ہی خراب ہو گئی۔ شاید یہ رات اس کی زندگی کی آخری رات ہو۔ ابھی کچھ دیر پہلے اس کو دل کا دورہ پڑا تھا۔ درد کی شدت سے وہ تڑپ تڑپ گئی تھی۔ اور میں مجبور اور بے کس اس کو دیکھتا رہ گیا تھا۔ بے انتہا تکلیف کو برداشت کرتے ہوئے

اس نے بڑے بڑے درد بھرے انداز میں کھانستے ہوئے کہا، "میری زندگی بھی برسات کی اس اندھیری رات کی طرح خوفناک اور سرد ہے۔ میری زندگی کے تاریک آسمان پر غم کے بادل چھائے ہوئے ہیں۔ سکون چین اور آرام نام کا کوئی ستارہ نہیں چمکتا۔ ہر طرف اندھیرا ہی اندھیرا چھایا ہوا ہے۔ بجلی کی چمک اور بادلوں کی گرج سے دل دہل جاتا ہے۔ مجھے یقین ہے اب میں چند دن کی مہمان ہوں۔ میری زندگی کی اس تاریک رات کی کبھی سحر نہیں ہوگی۔ روشنی کی کوئی کرن نہ پھوٹے گی۔" یہ کہتے ہوئے وہ بُری طرح کھانسنے لگی۔ میں نے سہارا دے کر اس کو تھام لیا۔ اور دوا پلائی۔ دوا پلانے کے بعد اس کو قدرے سکون ملا تو میں نے اس سے کہا "آپ اس قدر ناامید کیوں ہوتی ہیں — آپ کی زندگی بہت قیمتی ہے۔ زندگی کی اس تاریک اور اندھیری رات کی ضرور صبح ہوگی۔ وہ زندگی کے تاریک آسمان کے کنارے پر ستارۂ سحر چمک اٹھا۔ ابھی کچھ دیر بعد شفق پھوٹے گی۔ اور ایک روشن تارا آپ کی زندگی کو منور کر دے گا۔ آپ پھر سے تندرست ہو جائیں گی۔ جوان لوگ پھر آپ سے محبت کرنے لگیں گے زندگی میں پھر سے بہار آ جائے گی۔ گزرے ہوئے دن لوٹ آئیں گے۔

ادھر دیکھیے! — دیکھیے! باہر بارش ختم ہو چکی ہے۔ افق کے کنارے اب رنگین ہونے لگے ہیں — ذرا دیکھیے تو...... ذرا غور سے سنیے ان آوازوں کو دور بہت دور شہر سے ابھرتی ہوئی ان آوازوں پر غور کیجیے...... غور سے سنیے!! وہ آوازیں آج کے بہادر نوجوانوں کی آوازیں ہیں۔

آج کے یہ نوجوان آپ کی زندگی میں دوبارہ نئی جان ڈالنے کا ارادہ کر چکے ہیں۔ یہ نوجوان اپنی دھن کے پکے ہیں۔ یہ آپ زندگی کو سنوار کر ہی دم لیں گے۔ یہ جوان آپ کو زندہ رکھنے کے لیے اپنی جان کی بازی لگا بیٹھے ہیں۔ انھیں پورا یقین ہے کہ وہ بہت جلد اپنے مقصد میں کامیاب ہو جائیں گے۔ وہ دیکھیے آوازیں آپ کی طرف بڑھ رہی ہیں۔ ارے وہ تو ایک قافلہ سا ہے۔ دیکھیے وہ قافلہ آپ کی طرف بڑھ رہا ہے۔ وہ بہت جلد پہنچ جائے گا۔ انھیں اپنی منزل مل جائے گی۔ ذرا ان کا جوش اور ولولہ دیکھیے وہ آپ کی خاطر اپنا سب کچھ قربان کر دینے کو تیار ہیں اور یہی لوگ شاید آپ کی زندگی کو نئے انداز میں سنوار سکیں گے۔

ارے یہ کیا؟ آپ تو مسکرا رہی ہیں۔ آپ کا مرض کدھر غائب ہو گیا۔ جیسے تندرستی پھر سے لوٹ آئی۔ سر کے بال بھی سیاہ اور چمکدار ہو گئے ہیں۔ اتنی جلد کس طرح بدل گئیں۔ کس قدر خوش نصیب ہیں آپ!!

"ٹرن" "ٹرن" "ٹرن" کال بل کی تیز آواز پر میں چونک چونک پڑا۔ آنکھ کھل گئی — "اخبار لے جاؤ" باہر دروازے پر اخبار والا پکار رہا تھا۔ صبح پوری طرح مسکرا چکی تھی۔ میں بستر سے فوراً اٹھا اور باہر کی طرف لپکا۔ اخبار والا آج کا تازہ اخبار ڈال کر بہت دور نکل گیا تھا۔ دور بہت دور سے اس کے پکارنے کی آواز آ رہی تھی "آج کی تازہ خبر طلبائے اردو کے مطالبات قبول کر لیے گئے۔ دو طلبا کی گیارہ روزہ بھوک ہڑتال کا کامیاب اختتام... آج کی تازہ خبر" اخبار کو اٹھا کر میں بے اختیار ہنسنے لگا۔

**

جناب شفیع تمنّا کلکتوی

ہم ہیں پہرے دار

ہمیں نہ غافل سمجھو ہم رہتے ہیں سدا ہشیار
ہم ہیں پہرے دار وطن کے ہم ہیں پہرے دار

ہم نے سیکھا نہیں کبھی بھی آپس میں ٹکرانا کام یہی ہے اپنا سب سے پیار بڑھاتے جانا

سارے جگ میں کریں گے بھائی چارے کا پرچار
ہم ہیں پہرے دار وطن کے ہم ہیں پہرے دار

جیسے دیش کی خاطر دی تھی "حمید" نے قربانی بھول نہیں سکتے ہیں جس کو ہم سب ہندوستانی
ہم بھی اپنے وطن پہ ویسے کریں گے جان نثار
ہم ہیں پہرے دار وطن کے ہم ہیں پہرے دار

بھید بھاؤ میں پھنس کر کیوں ہم اپنا وقت گنوائیں آؤ قدم سے قدم ملا کر آگے بڑھتے جائیں
تن من دھن سے وطن کی خاطر ہو جائیں تیار

ہم ہیں پہرے دار وطن کے ہم ہیں پہرے دار

نہرو بال پستکالیہ

ہندوستان کی اہم زبانوں اور انگریزی میں بچوں کے لیے بہترین اور سستی کتابیں شایع کرنے کے لیے کتابوں کے اس سلسلے کا آغاز کیا گیا ہے اس کا سب سے بڑا مقصد ہے کہ ہندوستان کے مختلف حصّوں میں بسنے والوں، مختلف زبانوں کے جاننے والوں کے لیے ایک ہی سا ادب پیش کیا جائے تاکہ وہ ایک دوسرے کے حالات سے واقف ہو سکیں اور اس سے قومی ایکتا مضبوط ہو۔

اب تک مندرجہ ذیل کتابیں شایع ہوئی ہیں جو اردو کے علاوہ انگریزی اور ہندوستان کی دوسری زبانوں میں بھی ملتی ہے ہر کتاب کی قیمت ایک روپیہ پچاس پیسے (۱/۵۰) ہے یہ سب کتابیں رنگین تصویروں کے ساتھ فوٹو آفسیٹ پر شایع ہوئی ہیں۔

(۱) باپو حصّہ اوّل مصنف: بسی فری ماس مترجم: صالحہ عابد حسین
(۲) باپو " دوم " : " " " " " "
(۳) کشمیر " : مالا سنگھ مترجم: خدیجہ بیگم تصویر: پرکاشند
(۴) پرندوں کی دنیا " : جمال آرا " : محمد شفیع الدین نیر
(۵) ہمالیہ کی چوٹیوں پہ " : بریگیڈیر گیان سنگھ " : محمد ذاکر
(۶) ہماری ندیوں کی کہانی " : لیلا مجمدار " : رضیہ سجاد ظہیر
(۷) جنّت کی سیر اور دوسری کہانیاں " : لیلا بھاگوت " : " "
(۸) آزادی کی کہانی (حصّہ اوّل) " : وشنو پربھاکر : انور کمال حسینی
(۹) رسیلی کہانیاں " : منوج داس " : صغرا مہدی
(۱۰) ہماری ریلیں " : جگجیت سنگھ " : عرش ملسیانی
(۱۱) ہندوستان میں غیر ملکی سیّاح " : کے سی کھنّہ تصاویر: کرشن کھنّہ
(۱۲) آؤ ناٹک کھیلیں " : اوما آنند مترجم: رفیعہ منظور الامین
(۱۳) خالہ بلّی کا خاندان " : منوہر داس چترویدی " : محمد شفیع الدین نیّر
(۱۴) بہت دن ہوئے (حصّہ اوّل) " : چوکسی بی ام جوشی " : رضیہ سجاد ظہیر
(۱۵) بہادروں کی کہانیاں " : راجندر اوستھی " : انور کمال حسینی
(۱۶) روہنت و نندیہ مصنف: کرشن چیتنیہ مترجم: انور کمال حسینی
(۱۷) سدا بہار کہانیاں " : شانتا رنگا چاری " : " "
(۱۸) ایجادیں جنھوں نے دنیا بدل ڈالی (حصّہ اوّل) " : مہر کچا بیت علی " : سیّد احسان
(۱۹) " " دوم " : " " : " "
(۲۰) بڑا پانی " : لیلا مجمدار " : صالحہ عابد حسین
(۲۱) مورا " : ملک راج آنند " : انور کمال حسینی
(۲۲) ہاکی کا کھیل " : سروبند رسانیال " : پریم لال

ذاکر صاحب سیریز

		قیمت
(۲۳) ابو خاں کی بکری	مصنف: ڈاکٹر ذاکر حسین	-/۱
(۲۴) انوکھی دوکان	" : تمنا زیدی	۲/۵۰
(۲۵) گلہری چوہیا اور بیر بڑا	" : "	-/۲
(۲۶) دنیا کے عجائب	" : "	۲/۵۰
(۲۷) راجہ رانی سونے کے	" : عرش ملسیانی (زیر طبع)	

جناب محمد امین

بڑے بچوں کے لیے

دریائے نائجر اور صحرائے اعظم

جرمنی کے ہمارے ملک کو طاقت پہنچاتے ہیں

عموماً غیر ترقی یافتہ ممالک صنعتی اور ترقی یافتہ ممالک کو خام اشیا فراہم کرتے رہے ہیں۔ لیکن اب اس بات کے بھی امکانات پیدا ہو رہے ہیں کہ صنعتی ممالک پچھڑے ملکوں سے پانی اور سورج کی دھوپ سے جو طاقت نکلتی ہے اس کو بھی درآمد کیا کریں گے تاکہ ان کی صنعتیں اور کارخانے چلتے رہیں۔ مغربی جرمنی کے ایک ادارے نے اس سلسلے میں تحقیق شروع کر دی۔ آخر کیوں؟ اس کی خاص وجہ؟ اس قسم کی تحقیق خاص طور سے اس لیے کی جا رہی ہے کہ کچھ عرصے کے بعد جب تیل کے کنویں خشک ہو جائیں گے تو کہیں ایسا نہ ہو کہ کارخانے بند ہو جائیں۔

اس سلسلہ میں دلچسپ بات یہ ہے کہ طاقت اور انرجی کے مسئلہ کو سلجھانے کے لیے جرمنی کو اپنے وسائل سے کام لینے کی ضرورت قطعی نہیں ہے۔ وہ قریب کے افریقی ملکوں سے فائدہ اٹھا سکتا ہے۔ وہاں کے دریاؤں میں پانی بہ فراوانی ہے اور صحرائے اعظم میں بے انتہا دھوپ اور اس کی طاقت۔

شمالی مغربی افریقہ میں ایک دریا ہے جس کا نام ہے "دریائے نائجر"۔ یہ دریا صحرائے اعظم کے ایک حصہ سے ہو کر بہتا ہے۔ اسی دریا پر جرمنی کی نظر ہے۔ اس کا پانی پائپ کے ذریعے صحرائے اعظم سے ہوتا ہوا اور بحرِ روم کو زمین دوز طریقے سے پار کرتا ہوا جرمنی لے جایا جائے گا۔ پائپ میں داخل ہونے سے پہلے دھوپ کی طاقت سے پہلے پانی گرم کیا جائے گا۔ اس کے بعد گرم اور کھولتا ہوا پانی کام میں لایا جائے گا۔ پائپ میں سے ہو کر بہتا ہوا اور گرما گرم پانی میلوں کی مسافت طے کرنے کے بعد جرمنی تک پہنچے گا۔ پھر اس گرم پانی اور اس کی بھاپ کو جرمنی کی صنعتوں اور کارخانوں میں استعمال کیا جائے گا۔ اس گرم پانی سے فائدہ اٹھا کر گرم علاقے کی فصلیں بھی وہاں اگائی جا سکیں گی۔ اور سردیوں میں سڑکوں پر جو برف جم جاتی ہے اُن کو پگھلا کر سڑکیں صاف کی جا سکتی ہیں۔

اگر یہ منصوبہ کامیاب ہو گیا تو ۱۹۸۵ء تک ۹۴ فیصدی طاقت پانی سے ملا کرے گی۔ اور جرمنی کی صنعتوں اور کارخانوں کا جو دار و مدار پٹرول اور تیل پر ہے وہ گھٹ کر بمشکل ۶ فیصدی محض باقی رہ جائے گا۔

دریائے نائجر کے کنارے صحرائے اعظم کے مغربی حصے میں ایک مشہور شہر ٹمبکٹو ہے۔ اس شہر کے مشرق

ـقے سے پانی لیا جائے گا اور ایک سیکنڈ میں ۸۳ عشاریہ
۲۴۲۶۳۸، کیوبک میٹر کی رفتار سے بہے گا۔ ساری
مسافت جو پانی کو طے کرنی پڑے گی وہ ۱۵۰۰ کلومیٹر
ہوگی۔ پائپ کی لمبائی بھی اتنی ہی رہے گی اور موٹائی
عشاریہ ۵ (۵ء۵) ہوگی۔

پائپ کا رنگ کالا رہے گا یعنی اس قسم کا رنگ
جس کی وجہ سے اس کے اندر دھوپ زیادہ سے زیادہ
جذب ہو۔ غرض پائپ پر دھوپ پڑتے ہی اندر پائپ
پانی گرم ہونا شروع ہو جائے گا اور صحرائے اعظم میں
داخل ہوتے ہوتے اس کا درجۂ حرارت ۲۵ ڈگری
سینٹی گریڈ سے بڑھ کر ۱۲۵ ڈگری سینٹی گریڈ تک پہنچ
جائے گا۔

صحرائے اعظم کے اندر ۱۴۴ مربع کلومیٹر کے علاقے
میں خاص قسم کے شیشے لگے ہوں گے جو سورج کی دھوپ کو
۱۴۴ مربع کلومیٹر کے رقبے سے گھیر کر پانی پر فوکس کریں گے
اور اس طرح پانی ۶۵۰ ڈگری سینٹی گریڈ تک گرم ہو جائے
اور پھر ۱۰ پونڈ کے دباؤ کے ساتھ یہ پانی پمپ کر کے
پائپ ہی کے ذریعہ جرمنی لیجایا جائے گا۔ اور پھر اسے صنعتوں
اور کارخانوں میں آسانی کے ساتھ استعمال کیا جائے گا۔

بھاپ سے چلنے والے خاص قسم کے انجن بھی الیکٹری
سٹی کی طرف سے فٹ کیے جائیں گے۔ اور پھر چھوٹے
چھوٹے پائپ کے ذریعہ سڑک پر بھاپ مہیا کی جائے گی۔
جس سے گاڑیاں اور بسیں چلا کریں گی۔

صنعتوں میں استعمال کرنے کے بعد پانی کا درجۂ حرارت
گھٹ کر محض ۱۰ ڈگری سینٹی گریڈ رہ جائے گا۔ اور پھر
یہ پانی ضائع ہونے دینے کے بجائے بڑی بڑی جھیلوں
میں جمع کیا جائے گا۔ ان جھیلوں سے نہریں نکالی جائیں گی
جن سے آب پاشی کا بہترین انتظام کیا جائے گا۔ اور پھر اس
گرم پانی سے گرم علاقے کی فصلیں جرمنی میں اگائی جا سکیں گی۔
آپ کو یاد ہوگا کہ جرمنی معتدل اور سرد خطے کا ایک ملک ہے
اور سردیوں میں جب شمال سے قطبی ہوائیں چلتی ہیں تو سارا
ملک برف کی لپیٹ میں آکر جمنے لگتا ہے۔ جھیل کی تہہ میں
جو پانی جمع ہوگا وہ ۱۰۰ ڈگری سینٹی گریڈ سے ذرا کم گرم
ہوگا۔ اس لیے اسے دوسرے پائپ کے ذریعے شہروں
اور قصبوں میں گھر کی ضرورتوں کے لیے استعمال کیا جائے
گا اور پھر اسی سے سڑکوں کے نیچے نیچے کام لے کر سردیوں
میں ان کو گرم رکھا جائے گا اور اس طرح سردیوں میں
برف نہیں جمنے پائے گی اور آمد و رفت نہایت اطمینان
بخش طریقے سے جاری رہے گی۔

آلپس کا پہاڑی سلسلہ بھی جرمنی کے جنوبی حصے
میں پھیلا ہوا ہے ———— اس حصے
میں جو وادیاں ہیں وہ اور سرد رہتی ہیں۔ ان وادیوں
میں ایٹم کی طاقت سے کام لے کر پانی کو ۶۵۰ ڈگری
تک گرم رکھا جائے گا۔ اور یہ پانی پائپ کے ذریعے
وادیوں کے اندر واقع شہروں، قصبوں اور گاؤں
میں بہم پہنچایا جائے گا اور اس طرح ان جگہوں
میں بہت آسانیاں ہو جائیں گی اور لوگ خوشگوار طریقے
سے زندگی گذار سکیں گے

دریائے نائجر سے درآمد کیا ہوا پانی آخیر میں معمولی
سا گرم رہ جائے گا یعنی محض ۴۲ ڈگری سینٹی گریڈ اور
پھر یہ پانی دوسری قسم کی فصلیں اگانے کے لیے کام میں لایا
جائے گا۔ اس پانی کی چونکہ ریل پیل ہوگی اس لیے فصلیں
جرمنی میں چاروں طرف اگائی جائیں گی۔ اور پیداوار میں
زبردست اضافہ ہو جائے گا۔

باقی صفحہ ۴۴ پر

جناب خلیل الرحمٰن (ویلور)

یادگارِ زمانہ ہیں یہ لوگ

(مختصر و ماخوذ از دربارِ اکبری)

ہمایوں (۱۵۳۰ء - ۱۵۵۶ء)

جب وہ تخت پر پہنچا تو اپنے ملازم سے کہا کہ یہاں کوئی کرہ (GLOBE) تلاش کرو۔ نورتن میں گرہ گھوڑے کے بچھڑے کو بھی کہتے ہیں۔ کم فہم ملازم نے آقا کے حکم کی تعمیل اس طرح کی کہ چند بچھڑے لے کر خدمت شاہی میں حاضر ہوا۔ ہمایوں اس کو دیکھ کر ہنس پڑا۔

شیر شاہ (۱۵۴۰ء - ۱۵۴۵ء)

شیر شاہ نے ترقی کی سیڑھیوں پر چڑھنے میں اتنا عرصہ کھینچا کہ تاج شاہی [illegible] آیا تو بڑھاپا آگیا۔ بادشاہ ہوا تو سر سفید [illegible] آنکھیں عینک کی محتاج [illegible] شاہی سمجھتا تو آئینہ سامنے دھرا ہوتا تھا [illegible] ہوتی مگر شام ہوتے ہوتے۔"

جہانگیر (۱۶۰۵ء - ۱۶۲۷ء)

جہانگیر نے ایک بار [illegible] کی بے ہودہ بولی پر خفا ہو کر حکم دیا کہ اسے ہاتھی کے پاؤں تلے پامال کریں۔ خانخاناں پاس کھڑا تھا۔ بھاٹ نے عرض کی حضور اس ناچیز کے لیے ہاتھی کیا کرے گا۔ ایک چوہے کا پاؤں بھی بہت ہے۔ ہاتھی کا پاؤں خانخاناں کے لیے چاہیے کہ بڑا آدمی ہے۔ جہانگیر نے ان کی طرف دیکھا کہ اس لفظ نے دل پر کیا اثر کیا۔ پوچھا "کیا کہتے ہو"

انھوں نے کہا "کچھ نہیں!"

داروغہ سے پوچھا کہ "تو بتا دے"

خانخاناں بولے کہ "حضور کے تصدق سے خدا نے مجھ ناچیز کو ایسا کیا کہ بڑا آدمی سمجھتا ہے۔ میں نے اسی وقت شکر کیا" اور کہا جب اس کی خطا معاف ہو تو ۵۰۰۰ روپے دے دینا۔ حضور کی جان و مال کو دعا دے گا۔"

شاہ فتح اللہ شیرازی مصاحب خاص

لڑائی کے عالم میں اکبر کو بہت خبر ہائے پریشان پہنچتی تھیں۔ ہر وقت اسی فکر میں رہتے تھے۔ میر فتح اللہ شیرازی سے سوال کیا کہ احمد آباد کی لڑائی کا انجام کیا ہوگا انھوں نے اصطرلاب لگا کر طالع وقت نکالا ستاروں کے مقام اور حرکات آسمان کو دیکھ کر حکم لگا دیا کہ دو جگہ میدانِ کارزار (جنگ) ہوگا اور دونوں جگہ حضور کو فتح ہوگی۔

شاہ عارف حسینی

ایک بزرگ تھے۔ لوگ ان کی بہت سی عجیب و غریب واقعات بیان کرتے ہیں۔ مثلاً ایک کاغذ کا گول گتا لگا کر جلتی انگیٹھی میں ڈال دیتے تھے اور اشرفیاں نکال کر بانٹنی شروع کر دیتے تھے۔ جتنے لوگ مجلس میں ہوں سب کو بچا دیتے تھے۔ اور یہ بھی کہتے ہیں۔ کہ انھیں حجرہ میں بند کر کے مقفل کر دیا جائے۔ اس میں سے وہ صاف نکل گئے۔ ایک دفعہ لاہور میں گجرات کے گرمی کے میوے جاڑے میں اور جاڑے میں گرمی کے منگائے اور لوگوں کو کھلائے۔ جب تبت میں تھے وہاں کے لوگوں کو خلاف قیاس تصرفات سے محو حیرت کر دیا۔ مثلاً جب وہ درخت کو ہلاتے تو اس میں سے روپے اشرفیاں جھڑتی تھیں۔

حضرت شیخ کمال بیابانی

جھگڑ میں آپ نے کہا کہ میں ابدال ہوں۔ جمعہ کی رات کو دکھا دیا۔ سر الگ ہاتھ اور پاؤں الگ

راجہ مان سنگھ سپہ سالار

وہ ہمیشہ فقرا کی خدمت میں حاضر ہوا کرتا تھا۔ بنگال کے سفر میں ایک مقام پر شاہ دولت کے اوصاف و کمالات سنے۔ خدمت میں حاضر ہوا۔ وہ بھی اس کی پاکیزہ اور سنجیدہ گفتگو سے بہت خوش ہوئے اور کہا مان سنگھ مسلمان کیوں نہیں ہو جاتے اس کے مسکرا کر کہا۔ ختم اللہ علیٰ قلوبہم
خدا کی مہر ہے۔ بندہ کیونکر اٹھائے۔ کہ یہ بے ادبی ہے۔

خواجہ عبدالصمد شیریں قلم

آپ نستعلیق کے استاد اور مقرر تھے۔ اکبر کے دربار میں ان کو چار صدی منصب عطا ہوا۔ فتح پور سیکری کی ٹکسال کے افسر اعلیٰ مقرر ہوئے۔ خشخاس کے دانے پر سورۂ اخلاص لکھی تھی۔

چاند بی بی:۔

چاند بی بی عالی جاہ شاہ بادشاہ بیجاپور سے منسوب تھی۔ عالی جاہ عادل شاہ۔ ابراہیم عادل شاہ کا بڑا بھائی تھا جو اس کے بعد تخت نشین ہوا۔ جب لشکر اکبری آیا تو بڑی ثابت اور حوصلہ سے اس کا مقابلہ کیا اور سب کی گردنیں خم ہو گئیں۔ جب غلہ ہو چکا اور رسد بند ہو گئی اور کہیں سے کمک نہ پہنچی تو اس نے لشکر بادشاہی پر چاندی سونے کے گولے ڈھال ڈھال کر مارنے شروع کر دیے۔

جانان بیگم (دانیال شہزادہ کی بیوہ)

جہاں گیر کہیں کے دورہ پر گئے۔ کل دربار اور لشکر سمیت بادشاہ کی ضیافت کی۔ اتفاق یہ ہوا کہ ان دنوں خزاں نے درختوں کے کپڑے اتار لیے تھے۔ جانان بیگم نے انھیں بھی خلعت لباس سے آراستہ کیا۔ دور دور سے مصور اور نقاش جمع کیے۔ کاغذ اور کپڑے کے پھول پتے کر۔ دا سے موم اور رنگ کی کے پھل تر شوائے۔ ان پر ایسا رنگ و روغن کیا کہ نقل اور اصل میں اصلا فرق نہ معلوم ہوتا تھا۔ جب بادشاہ آئے تو تمام درخت ہرے اور پھلوں سے دامن بھرے کھڑے تھے۔

جاڑوں کی چاندنی رات

جناب اعجاز عزیز

بوندوں کا عذاب کھو چکا ہے
پانی کا ثواب کھو چکا ہے
اب بہتی ہوائیں برف کے سے
کچھ ننھے سے ذرّے تیرتے ہیں

ہر سمت ہوا میں ٹھنڈکیں ہیں
دن بھر تو گھروں کے آنگنوں میں
ہم دھوپ کے ساتھ ساتھ کھیلے
اب رات کو کون گھر سے نکلے
جسموں پہ ہیں گرم گرم سے کوٹ
اور پھر بھی لحاف میں ہیں لپٹے
اور پھر بھی انگیٹھی پاس ہی ہے
نانی بی کہانی کہہ رہی ہیں
انجان زمیں کے باسیوں کی
اور ہم ہیں کہ ٹھنڈی رات میں بھی
اڑ اڑ کے وہاں پہنچ گئے ہیں
شہزادوں کے ساتھ کھیلتے ہیں
پریوں کے پروں میں چھپ گئے ہیں
سردی کا وہاں گذر نہیں ہے
سردی کا جہاں گذر نہیں ہے

نیا سال آیا

جناب شاغل ادیب (ایم اے)

نیا سال آیا دلوں کو لبھاتا
مسرت کی دُنیا میں ہلچل مچاتا

فلک جھوم اٹھا، زمیں جھومتی ہے
مسرت جہاں کے قدم چومتی ہے

لگے جھومنے ناچنے موربن میں
لگیں بلبلیں گیت گانے چمن میں

لگی ہونے خوشیوں کی برسات دیکھو
پرندوں چرندوں کی بارات دیکھو

نہیں آج کوئی یہاں غم کا مارا
مناتا ہے خوشیاں جہاں آج سارا

الم ہم بھی بچّو! بھلا کے پرانے
نئے سال کے آؤ گائیں ترانے

نیا سال آیا ترانے سناتا
غموں کو دکھوں کو دلوں سے مٹاتا

ترجمہ: م۔ ع۔ باسط

زمین کا اندرونی حصّہ

ہمارے سیارے کے اندرونی حصّہ میں کیا ہے؟ اس بات کو معلوم کرنے کے لیے مختلف طریقے اختیار کیے گئے ہیں۔ چونکہ اس سلسلہ میں براہ راست مشاہدات کرنا ممکن نہیں ہے۔ اس لیے اس سوال کا جواب معلوم کرنے کے لیے بالواسطہ طریقے اپنائے گئے ہیں۔ زمین کی قوت جاذبہ کا مطالعہ کرنے سے پتہ چلا ہے کہ زمین کی اوسط کثافت AVERAGE DENSITY تقریباً ۵،۲۵ ہے لیکن زمین ہر جگہ ایک سی نہیں ہے اس کی کثافت اس کی گہرائی کے ساتھ ساتھ بڑھتی جاتی ہے سطح زمین پر پائی جانے والی چٹانوں کی کثافت تقریباً ۸۔ سے ۷ کر دس تک ہوتی ہے۔

بورنگ کے ذریعے کیے ہوئے سوراخوں اور معدنی کانوں میں کیے جانے والے مشاہدات سے پتہ چلا ہے کہ گہرائی میں اضافہ کے ساتھ ساتھ تپش میں بھی اضافہ ہوتا ہے۔ ہر ۹ ۶ ۱ ۲ میٹر کی گہرائی کے بعد تپش اوسطاً ۷ درجہ سنٹی گریڈ بڑھتی ہے۔ لیکن تپش میں اضافہ کی شرح زمین کے مرکز تک ایک سی نہیں ہو سکتی۔ زمین کے اندرونی حصے سے نکلنے والی بعض گرم اشیا آتش فشانوں سے خارج ہونے والا گرم لاوا اور گیزر نامی چشموں میں نکلنے والا گرم پانی ہیں۔ وہ زمین کے اندرونی حصّہ کی گرمی کے ایک حصّہ کو خارج کرتی ہیں۔ باقی مقامات پر زمین کی ٹھوس پرت ایک بلینکٹ کا کام کرتی ہے۔ اور زمین کے اندرونی حصّہ کی تپش کو نکلنے نہیں دیتی اس لیے گہرائی میں اضافہ کے ساتھ ساتھ زمین کی ٹھنڈک کی شرح میں کمی ہوتی جاتی ہے۔

زلزلہ کی لہروں (SEISMIC VAVES) کے پھیلنے کی خصوصیات کے مطالعہ کے ذریعہ بھی زمین کے اندرونی حصّوں کے متعلق بہت سے انکشافات ہوئے ہیں۔ زلزلہ کی ذیلی لہروں (TRANS VERSE WAVES) کی ایک خاصیت یہ ہے کہ وہ مائع رقیق کے اندر سے گزر نہیں پاتیں۔ یہ دیکھا گیا ہے کہ یہ موجیں زمین کے اندر تقریباً دو ہزار نو سو کلومیٹر سے زیادہ گہرائی تک نہیں جاتیں۔ اگر سیارہ کی ساری زمین ٹھوس ہوتی تو یہ موجیں اس کی کسی بھی گہرائی تک پہنچ پاتی تھیں۔ اس بات کو پیش نظر رکھ کر ماہرین ارضیات GEOLOGISTS اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ زمین کے اندر دو ہزار نو سو کلومیٹر کی گہرائی پر ایک سیال طبقہ LIQVID ZONE بھی موجود ہے

زلزلہ کی موجوں کی رفتار میں واسطہ کی کثافت اور لچک کی خصوصیات سے متناسب ہوتی ہے جب یہ پہنچے

[illegible] تجربوں کے ذریعہ یہ بات معلوم کی گئی ہے کہ زمین کے زیادہ گہرے حصوں میں زیادہ رفتار کے ساتھ سفر کرتی ہیں۔ ان تجربوں سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ جیسے جیسے زمین کی گہرائی میں اضافہ ہوتا ہے۔ ویسے ویسے اس کی کثافت اور حرارت بھی بڑھتی جاتی ہے۔ زلزلوں کے پیدا ہونے کے اسباب اور اثرات کے مطالعہ سے حاصل ہونے والی شہادتوں کی بنا پر ہم اس نتیجے پر پہنچ جاتے ہیں۔ کہ تین سو کلو میٹر کی گہرائی پہ زمین کے اندر ایک مائع پرت پائی جاتی ہے جس کی کثافت بہت زیادہ ہوتی ہے۔

زمین کا نصف قطر تقریباً ۶۳۷۵ کلومیٹر ہے۔ زمین کے بیرونی حصہ جس کی گہرائی ۵ سے لے کر ۴۰ کلو میٹر تک ہوتی ہے قشر CRUST کہلاتا ہے۔ زمین کے قشر کی اوسط کثافت ۲ر۵ سے لے کر تین تک ہوتی ہے۔ قشر کے نیچے پایا جانے والا طبقہ زمین کا لبادہ MANTLE کہلاتا ہے۔ وہ وزنی چٹانوں پر مشتمل ہے اور اس کی موٹائی تقریباً دو ہزار نو سو کلو میٹر ہے۔ قشر اور زمینی لبادہ کو ایک دوسرے سے علیحدہ کرنے والا درمیانی طبقہ موہو MOHO کہلاتا ہے۔ لبادہ کے اندر لگ بھگ تین ہزار درجہ سنٹی گریڈ تپش پائی جاتی ہے اور وہاں دباؤ کسی قدر زیادہ ہوتا ہے۔ زمین کے کسی طبقے میں اسی پگھلے ہوئے مادے کے ذخائر پائے جاتے ہیں جو آتش فشانوں سے خارج ہوتا ہے۔ زلزلوں کے علم کے ماہرین SEISMOLOGISTS کا یہ خیال ہے کہ یہ طبقہ زمین کا وہ حصہ ہے جہاں سے زلزلے جنم لیتے ہیں۔

زمینی لبادہ کے نیچے ایک اور طبقہ پایا جاتا ہے جو زمین کا قلب CORE کہلاتا ہے۔ اندازہ لگایا گیا ہے کہ زمین کے قلب کا نصف قطر لگ بھگ ۳۴۵۰ کلو میٹر ہے۔ زمین کے قلب کے دو حصے اندرونی قلب اور بیرونی قلب ہیں۔ بیرونی قلب مائع حالت میں ہے۔ بیرونی قلب اور زمینی لبادہ کو ایک دوسرے سے علیحدہ کرنے والی پرت کا پتہ زلزلہ کی موجوں کے پھیلنے کے انداز سے بآسانی لگایا جا سکتا ہے۔ اس حصہ میں زلزلہ کی ذیلی موجوں کی رفتار اچانک ہی اور تیزی کے ساتھ گھٹ جاتی ہے۔ زمین کے اندرونی قلب کے بارے میں یہ سمجھا جاتا ہے کہ وہ ٹھوس ہے اور اس کے اہم اجزا لوہا اور نکل ہیں۔

جناب جوہر نوری آروی

شام

صبح رخصت ہوئی تو شام آئی
ساتھ اپنے نوید شب لائی

کام سے لوگ جی چرانے لگے
دل ہی دل میں خوشی منانے لگے

اس میں چھوٹے بڑے کی قید نہیں
سب کے دل میں ہے گھر کی فکر کہیں

ہے درختوں پہ جھنڈ چڑیوں کا
چہچہاہٹ سے جن کی شور بپا

دھیمے دھیمے سروں میں گاتی ہیں
خیر سب شام کی مناتی ہیں

باغباں جاکے باغ میں ٹھہرا
تاکہ شب میں وہ دے سکے پہرا

دشت و صحرا میں ہو کا منظر ہے
شام سے حال سب کا ابتر ہے

چپکے چپکے یہ عاجزی بندہ
کر رہا ہے خدا کی حمد و ثنا

الغرض جب پیام شام آیا
مژدۂ راحت آماں لایا

جناب محمد ایوب واقف

ہمارا وطن

ہمارا وطن ساز گنگ و جمن ہے
ہمارا وطن، لہلہاتا چمن ہے
ہمارا وطن، حسن کی انجمن ہے
ہمارا وطن، پھر ہمارا وطن ہے

جو دشمن کبھی ہوگا مد مقابل
تو ہوگی شکست اس کو میدان میں حاصل
ہمارا نشان قدم شمع منزل
ہمارے سفینے کا اشتاق ساحل

یہاں علم و دانش بھی ذوق نظر بھی
یہیں سے اٹھا ہے ہمالہ کا سر بھی
ہیں دامن میں اس کے یہ لعل و گہر بھی
کہ ہے یہ کرشن اور رادھا کا گھر بھی

یہ نہرو و آزاد کا گلستاں ہے
یہ تلسی و ٹیگور کا بوستاں ہے
یہاں باادب رہیے زنہار واقف
یہ غالب اور اقبال کا آستاں ہے

مرسلہ: ناصرہ شہلا

حاضر دماغی کی قیمت

(مرکزی خیال فارسی سے)

ایک دن ایک لومڑی ایک گاؤں کے پاس سے گذر رہی تھی۔ اس کی نظر ایک رنگ برنگے پروں والے مرغے پر پڑی۔ جو دانا چگ رہا تھا۔ اس کی لال کلغی دانا چگنے سے خوب ہل رہی تھی۔ وہ اپنے میں کھویا ہوا تھا۔ لومڑی اس کے سامنے گئی اور بہت ہی ادب سے جھک کر سلام کیا اور بولی۔ "دوست! میں تمہارے والد مرحوم کو بہت اچھی طرح سے جانتی ہوں۔ کیا اچھا گاتے تھے۔ کتنی میٹھی سریلی آواز تھی مرحوم کی۔ ان کے مقابلے کی آذان دینے والا کوئی بھی آس پاس نہ تھا۔ سن کر کانوں میں شہد گھل جاتا تھا۔ ان کی آواز کو سن کر فضا میں ہی کیا پیڑ پودے تک جھومنے لگتے تھے...... تم کیا گاتے ہو دوست؟"

مرغے نے ساری باتیں سنیں۔ آج تک اس کے والد کے بارے میں کسی نے اتنی تفصیل سے باتیں ہی نہ کی تھیں۔ صرف اس کو اتنا ہی معلوم تھا کہ کسی بڑی دعوت کے لیے انھوں نے اپنی جان گنوائی تھی۔ تب سے یتیم ماں کے ساتھ اپنا بچپنا کاٹا!۔ غرور سے تن گیا۔ بڑی ادا سے مسکرا کر بولا۔ "اچھا میرے والد میری ہی طرح اچھا گاتے تھے۔ مجھے آج ہی معلوم ہوا۔

لومڑی نے اپنی باتوں کے جال میں مرغے کو پھنستے دیکھا تو بولی "دوست عرصہ ہوگیا ہے مرحوم کی آواز سنے ہوئے۔ تم ہی کچھ سناؤ۔ تاکہ پرانی یادیں تازہ ہو جائیں۔"

مرغے نے بڑے تکلف سے پر پھڑ پھڑائے پھر آنکھیں بند کیں اور ایک لمبی تان لگائی۔ ابھی لمحہ بھر ہی ہوا تھا کہ لومڑی مرغے پر جھپٹی اور اس کو دانتوں میں دبا بھاگی۔

آس پاس چھ کتے جو رکھوالی کرتے تھے یہ دیکھتے ہی اس کے پیچھے بھاگے بے چاری لومڑی اس ناگہانی آفت سے گھبرا کر جھاڑیوں کی آڑ لے کر بھاگتی گئی۔ مرغے نے لومڑی کی گھبراہٹ دیکھ کر کہا "میری مانو تو تم کتوں سے چلا کر کہہ دو کہ میں نے تمہارا مرغا نہیں پکڑا ہے تو تم بچ جاؤ گی۔"

گھبراہٹ میں لومڑی کو مرغے کی بات مناسب لگی اور اس نے منہ کھولا۔ منہ کا کھلنا تھا کہ فوراً مرغا اڑا اور جھٹ پیڑ کی ایک شاخ پر جا کر بیٹھ گیا۔ یہ دیکھ کر لومڑی افسردہ ہوگئی۔ حسرت سے اپنے منہ سے چھنے نوالہ کی طرف دیکھ کر بولی "لعنت ہے اس منہ پر جو بے موقع کھلا۔" اوپر اطمینان سے بیٹھے مرغے نے جواب دیا "افسوس ہے ان آنکھوں پر جو بے موقع بند ہوگئی تھیں" اس لیے بچو! کبھی کسی کی جھوٹی تعریف پر یقین نہیں کرنا چاہیے۔

جناب مشرف عالم ذوقی آروی

چچا جان کے لطیفے

جناب حسان مرحوم بڑے ہی خوش مزاج انسان تھے۔ اُن کی باتیں اتنی دلچسپ ہوتی تھیں کہ بس مت پوچھیے۔ اتفاق کی بات ہے کہ ایک بار میں اپنے والد کے ساتھ دِلّی گھومنے آیا۔ راستے میں اس بڑی ہستی سے ہماری ملاقات ہوگئی

ہمارے ابا جان نے اِن کو دیکھا اور سلام کیا۔ پھر میری طرف مخاطب ہوکر بولے "دیکھو یہی پیام تعلیم کے اڈیٹر ہیں۔ میں بتا نہیں سکتا کہ ان کو دیکھ کر مجھے کتنی خوشی ہوئی۔ میں نے ان کو سلام کیا تو اُنھوں نے میرے سر پر ہاتھ رکھ کر شفقت سے کہا۔ "جیتے رہو۔ کھیلو پھولو!"

پھر وہ ہم کو لے کر اپنے گھر آئے۔ اور طرح طرح کی باتیں کرنے لگے۔ وقت کا کچھ پتہ نہ چلا۔ یکایک دیوار گھڑی نے رات کے نو بجائے۔ میں چونکہ اس وقت بہت چھوٹا تھا۔ اور مجھے رات میں کہانیاں سُننے کی عادت تھی۔ اس لیے میں نے اُن سے کہا "چچا جان بس اک کہانی!"

وہ مسکرائے اور بولے۔ کہانیاں تو تم نے بہت سُنی ہوں گی۔ اس لیے آج میں تمھیں اپنی زندگی کے کچھ لطیفے سناؤں گا۔

میں چونکہ اس وقت بہت چھوٹا تھا۔ اس لیے میں نے پوچھا "یہ لطیفہ کیا چیز ہے" انھوں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ۔ ۔ "مزاحیہ باتیں"

میں بتا نہیں سکتا کہ وہ رات کتنے مزے میں کٹی۔ وہ مجھے لطیفے سنا رہے تھے اور میں سوچ رہا تھا "کاش دن نہ ہو اور میں اسی طرح اپنے پیارے چچا سے لطیفے سنتا رہوں۔"

لیجیے ان کی زندگی کے کچھ لطیفے آپ بھی سُن لیجیے

لطیفے

(۱) ایک مرتبہ بچپن میں آپ کے اُستاد نے آپ سے پوچھا تھا کہ جہاں گرمی ہوتی ہے وہاں زیادہ کیا چیز ہوتی ہے تو آپ نے کہا "پنکھے"

(۲) ایک بار بچپن میں آپ کے دوست نے آپ سے پوچھا تھا کہ تمھیں سب سے زیادہ خوشی کب ہوتی ہے؟

آپ نے جواب دیا۔ "جب ماسٹر صاحب بیمار پڑتے ہیں۔"

(۳) ایک دن آپ کے والد نے آپ سے پوچھا کہ ڈاکٹر اور حکیم میں کیا فرق ہے آپ نے کہا حکیم داڑھی رکھتا ہے اور ڈاکٹر مونچھیں۔

(۴) ایک مرتبہ آپ اپنے دوست کے یہاں دعوت میں گئے۔ آپ کے دوست نے ایک سیاہ قلم آپ کو

باقی صفحہ پر

جناب عصمت ریاض بی اے

لوری

(ننھے فونی کے لیے)

شاعر کا تکلم لے کر
موجوں کا ترنم لے کر
کلیوں کا تبسم لے کر
اے چشمِ غزالاں سو جا
اے جانِ بہاراں سو جا

تکمیل تمنا تجھ سے
دل شاد ہمارا تجھ سے
اس گھر کا اُجالا تجھ سے
اے چشمِ غزالاں سو جا
اے جانِ بہاراں سو جا

تعبیر جوانی تو ہے
اُلفت کی کہانی تو ہے
گلزار کی رانی تو ہے
اے چشمِ غزالاں سو جا
اے جانِ بہاراں سو جا

بلبل کا ترانا تو ہے
رنگین فسانہ تو ہے
خوشیوں کا خزانہ تو ہے
اے چشمِ غزالاں سو جا
اے جانِ بہاراں سو جا

پریوں کی ادائیں لے کر
راحت کی صدائیں لے کر
گھر بھر کی دعائیں لے کر

اے چشمِ غزالاں سو جا
اے جانِ بہاراں سو جا

نیا راجہ

بہت پرانی بات ہے کہ دکھن امریکہ کے ایک چھوٹے شہر میں جون نام کا ایک بہادر انسان تھا۔ کشتی لڑنے، بندوق چلانے اور اس کے جیسا نشانہ باز اس علاقے میں کوئی نہ تھا۔ آس پاس کے ۲۰۰، ۰۰۰ میل تک کے سبھی بہادروں وغیرہ کو ہرا چکا تھا۔

اس کے پاس ایک بہت خوبصورت گھوڑا تھا جو اس کی انگلی کے اشارے پر ناچتا تھا وہ وفادار بھی اتنا ہی تھا۔

ایک دن جون گھوڑے پر سوار ہو کر کہیں جا رہے تھے۔ کہ راستے میں ایک بھالو ملا اس نے جون سے کہا ٹھہرو! تم کون ہو جو اس جنگل میں نڈر ہو کر گھوم رہے ہو۔

اس نے گھوڑا وہیں روک لیا اور کہا " میرا نام جون ہے۔ میں اس علاقہ کا راجہ ہوں تم روکنے والے کون؟"

اتنا سنتے ہی بھالو غصہ میں آگیا اور کہا "تم مجھے ہرائے بنا جنگل کے راجہ کیسے بن سکتے ہو۔" جون وہیں [illegible] لڑائی شروع ہو گئی۔ کافی وقت بیت گیا۔ لیکن وہ لوگ لڑتے [illegible] رہے آخر میں بھالو نے جون کو اپنے پنجے میں اس طرح پکڑ لیا کہ وہ پانی پانی ہو گیا۔ تب جھٹ سے اس نے اپنا چھرا نکالا اور بھالو کے سینے میں گھسا دیا۔ بھالو نے اس کے درد میں آکر جون کو چھوڑ دیا۔ اور جون [illegible] گھوڑے پر سوار ہو کر چل دیا۔

بھالو کے سینے سے خون بہہ رہا [illegible] خون کی مہک پا کر شیر بھی وہاں پہنچ گیا۔ اور [illegible] کہا: "اب تو میں تمھیں کھا جاؤں گا۔"

بھالو نے کہا: "ابھی تو اس علاقے کے [illegible] سے لڑ کر زخمی پڑا ہوں مجھ جیسے کو کھا جانے میں کیا بہادری ہے۔ اگر سچ بہادری ہے تو جس [illegible] نے مجھے زخمی کیا ہے اس سے لڑو۔"

شیر کو سنتے ہی غصہ آگیا۔ "جنگل کا راجہ تو میں ہوں دوسرا کون ہو سکتا ہے۔ مجھے فوراً بتاؤ میں ابھی اسے مار ڈالوں گا۔"

بھالو نے کہا: "یہیں انتظار کرو وہ خود لوٹ [illegible] اس طرف آئے گا۔" اسی وقت ہاتھی اس طرف سے [illegible] تو شیر نے پوچھا کیا یہ ہے۔ بھالو نہیں یہ نہیں ہے [illegible] طرح سے کتنے جانور جاتے رہے اور شیر پوچھتا [illegible] اور وہ بے صبری سے انتظار کر رہا تھا کہ اتنے میں [illegible] جون گھوڑے پر سوار آ رہا تھا۔ بھالو نے چیخ کر کہا: "ارے ارے ..... یہی ہے۔"

شیر بہت زور سے غرایا اور کہا "اس جنگل کا راجہ بننے کے لیے پہلے ہم سے لڑنا ہوگا۔"

جون گھوڑے سے اتر پڑا اور شیر سے کشتی

[illegible] دیا تھا

[illegible] آخر جمون نے تنگ

[illegible] کو زخمی کر دیا اور شیر جوتن کو

[illegible] اور اپنے پیارے دوست بھالو سے

[illegible] مار دیا۔ آج ہم نے جنگل کے نئے راجہ

[illegible] واقعی میں وہ بہت بہادر ہے اور مجھے

[illegible] ہو گیا۔ کہ طاقت کے ساتھ عقل بھی نہایت

[illegible] ہے۔

جناب اشرف اعظم خان سرور

بقیہ شہزادہ بے نظیر صفحہ ۱۵ سے

ایک رات بادشاہ کے محل میں بڑی چہل پہل تھی۔ سب کو اس بات کی خوشی تھی کہ بارھواں برس خیر یت کے ساتھ گزر گیا۔ اس رات چاند کی چودہ تاریخ تھی۔ چاند پورے آب تاب کے ساتھ آسمان پر چمک رہا تھا۔ چاندنی اتنی صاف تھی کہ سوئی گرے تو ڈھونڈ لو۔

شہزادے کے دل میں آیا کہ آج چاندنی کا مزہ لوٹا جائے۔ خواصوں کو حکم دیا کہ چھت پر سونے کا انتظام کیا جائے۔ خواصوں نے بادشاہ سے جاکر شہزادہ کی مرضی کہی۔ بادشاہ نے سوچا سب منحوس دن ٹل چکے ہیں۔ اگر شہزادے کی یہی مرضی ہے تو کیا برا ہے۔ اس نے اجازت دے دی لیکن حفاظت کی تاکید کر دی۔

(تیسری داستان اگلے شمارے میں پڑھیے)

بقیہ دریائے نائجر اللہ سے اہم صفحہ

ہمارے ملک میں بھی تو پانی کی کمی ہے اور نہ دھوپ کی۔ ہمالیہ پہاڑ سے نکلنے والے ایسے سینکڑوں دریا ہیں جو سال بھر رواں رہتے ہیں اور ان میں پانی لبریز رہتا ہے دھوپ کی بھی افراط ہے۔ کیوں نہ پھر اس سے فائدہ اٹھا کر ہمارے ملک کے سائنس داں طاقت کی کمی کے مسئلہ کو حل کرنے کا نیا راستہ ڈھونڈیں اور مٹی کے تیل اور پٹرول نے جو ہمارا ناطقہ بند کر رکھا ہے اس سے چھٹکارا پانے کا موقعہ نکالیں۔

بقیہ چچا جان کے لطیفے صفحہ ۳۱ سے

کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا " بالکل آپ کی طرح ہے۔

آپ نے کونے میں بندھے کتے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اپنے دوست سے کہا " وہ بالکل آپ کی طرح ہے۔"

بقیہ بندروں کی ہڑتال صفحہ ۱۲ سے

گئی ہے تو انھیں غصہ آ گیا۔ دوسرے دن جب بندروں کو کیلے دیے گئے تو انھوں نے انھیں توڑ کر کھا لیا۔ لیکن پیڑ پر وہ کسی طرح نہ چڑھے نہ چمکارنے سے راضی ہوئے اور نہ دھمکی اور مار کا اثر قبول کیا دلچسپ بات یہ ہے کہ اس طرح کی کارروائی ایک، دو بندروں نے نہیں بلکہ سات آٹھ جتنے بھی بندر اس باغ میں کام کرتے تھے سب نے ہی ایک ساتھ "ہڑتال" کر دی تھی۔ مالک کو جب اس ہڑتال کا علم ہوا تو گھبرا گیا۔ بھاگا بھاگا آیا اور اپنے پہلے فیصلے کو مسترد کرتے ہوئے فوراً حکم دیا کہ بندروں کی مزدوری کم نہ کی جائے۔ بندروں کو پہلے کی طرح جب اجرت ملنے لگی تو انھوں نے پہلے کی طرح کام کرنا شروع کر دیا۔

آدھی ملاقات

نومبر کا "پیام تعلیم" ملا۔ سرورق پر "حسین حسّان نمبر" دیکھ کر دل کو چوٹ سی لگی۔ وہ جو دوسروں کی یاد میں نمبر نکالا کرتا تھا۔ آج خود اس کی یاد میں یہ نمبر نکالا گیا ہے۔ تصویر پر غور کیجیے۔ وہ دیکھیے لب ہلے۔ صاف آواز آرہی ہے۔

ڈھونڈو گے اگر ملکوں ملکوں ملنے کے نہیں ،
نایاب ہیں ہم

ممکن ہے "نایاب" کے لفظ پر کسی کو اعتراض ہو۔ لیکن کم یاب ہونے میں کیسے اعتراض ہو سکتا ہے۔ اور یہ بھی کوئی معمولی بات نہیں۔

بھئی! آپ نے تو بھاگ دوڑ کر کے حقِ رفاقت ادا کر دیا ہے۔ مکتبہ نے بھی محترمہ صفیہ حسّان کو پیام تعلیم کی ادارت سے منسلک کر کے بڑی حد تک اپنا حساب چکا دیا۔ قلم والوں نے بھی قلم کا حق ادا کر دیا۔ اب یہاں فکر دامن گیر ہے کہ ہم "پیامی" اپنے اس محسن کے احسان کا قرض کیوں کر چکائیں۔

حسین صاحب کی برابر یہ تمنا رہی کہ "پیام تعلیم" کو ولایتی زبانوں کے معیاری رسالوں کی صف میں لا کھڑا کریں۔ زبان اور مضامین کے اعتبار سے وہ بڑی حد تک کامیاب رہے۔ لیکن رسالے کی ظاہری شکل و صورت کو وہ معیاری نہ بنا سکے۔ کیوں نہ اِس ادھورے کام کو ہم پورا کر کے اپنے محسن کی خواہش پوری کر دکھائیں؟ یہ تب ہی ممکن ہوگا کہ ہم میں کا ایک ایک پیامی اپنے رسالے کے لیے زیادہ سے زیادہ خریدار بنانے کا عہد کرے اور کام میں جٹ جائے۔

خدا کرے میرے پیامی بھائیوں اور بہنوں کو میری یہ تجویز پسند آئے اور آپ اور محترم منیجر صاحب بھی اس کا تہیہ کر لیں۔ ہم سب مل کر یہ دکھلا دیں کہ ہم اپنے محسنوں کی قدر کرنا جانتے ہیں۔

اسرار ندری (بسپورہ)

پیام تعلیم کا "حسین حسّان نمبر" ملا۔ اللہ جزا دے، خیر دے آپ کو بڑا پیارا نمبر ہے۔ مجھے اس کا دکھ ہے کہ میں اِس نمبر میں شامل نہ ہو سکی۔ ویسے سلیم صاحب نے مضمون لکھنے پر زور دیا تھا۔ پتہ نہیں بھیا جی کیا بات ہے کہ کسی کی موت پر میں نے بہت کم لکھا ہے۔ سلیم صاحب کا بھی یہی حال ہے۔ ذرا غم ہلکا ہو تو کچھ لکھا جا سکے۔ میں سوچتی ہوں کہ کاش حسّان بھائی جان زندہ ہوتے اور ان کی زندگی میں ان کی قدر دانی ہوتی۔ خاص نمبر شائع ہوتا۔ اور میں چھوٹی بہن کے ناتے شرارت سے بھرپور کوئی مضمون لکھتی اور بھیا کی اس شرارت پر ڈانٹ پڑتی۔

حسّان بھائی جان کے کئی دلچسپ خط محفوظ ہیں۔ مدیرہ "زیور" پٹنہ کی کوشش پسند آئی۔ زیور کا پتہ ضرور روانہ کیجیے۔ انشاء اللہ ایک مضمون آپ کی خدمت میں ضرور روانہ کروں گی۔ بھیا کی زندگی میں

...زندگی پر دیسی موت پر لکھنے کی ہمت ضرور ...ملی ۔ مجھے امید ہے کہ ان کی روح بارہا بار فرماتی ...میری تحریر کی تعریف کرتا، ہمت افزائی اور غلطیوں کی ...نشاندہی سارے باتیں یاد آرہی ہیں۔ آپ کے ایک خط ...(سلیم تمنائی صاحب) کے یہ الفاظ کہ حسین حسان ...صاحب آپ کو اور بیگم سلیم کو سلام کہتے ہیں اور شاکی ...ہیں کہ آپ لوگوں نے انھیں اور پیام تعلیم کو فراموش کر دیا " دل پر عجیب اثر چھوڑتے ہیں۔ سلیم صاحب معمول مطابق مصروف رہے اور میرے مزاج خراب رہے۔ اللہ میاں حسان بھیا کو کروٹ کروٹ جنت عطا فرمائے۔ سلیم صاحب نے مسجد میں باقاعدہ حسان بھیا کے لیے دعائے مغفرت کرائی۔ یہ سلیم صاحب کا خاص وصف ہے۔

سیدہ مجیب النساء سلیم (میسور)

پیام تعلیم کا حسین حسان نمبر ملا۔ اس کو پڑھنے کے بعد ہی مرحوم کی شخصیت کا صحیح اندازہ ہوا۔ یوں تو خط و کتابت کے ذریعہ آدھی ملاقات ہو جاتی تھی۔ مرحوم گزشتہ دفعہ غالباً کسی عزیز کی شادی میں حیدرآباد آئے تھے: تو بطور خاص ہم لوگوں کو یاد کر کے ملاقات کا موقعہ دیا تھا۔ میرے ساتھ سعادت نظر بھی تھے۔ وہی ان سے پہلی اور آخری ملاقات تھی۔ اور ایک آخری خط مجھے مرحوم گزشتہ سال شکایتی انداز میں یہ تھا کہ میں دلی آیا اور ان سے ملاقات کے بغیر واپس ہوا۔ تو از راہ خلوص لکھا ...اگر آپ کو فرصت نہ تھی تو مجھے لکھ دیتے۔ میں دلی میں ...پیام گاہ پر آکر ملتا " میں دل ہی دل میں بے حد ...شرمندہ ہوا کہ اتنے بڑے آدمی کسی محبت اور خلوص ...سے ہمیں یاد کرتے ہیں اور کتنے پیارے انداز میں ہمارے قصور ہمارے گلے باندھ دیتے ہیں —

بار بار یاد دلا کر مجھ سے بچوں کے لیے چند کہانیاں لکھوائی تھیں اور ہمت افزائی کے طور پر ان کو شائع بھی کر دیں۔

حیدرآباد میں ملاقات سے پہلے میرے ذہن میں مرحوم کی تصویر یہی تھی کہ کافی اونچے پورے اور بھاری بھرکم آدمی ہوں گے۔ اور دوران ملاقات اپنے کام کا اور اپنی خدمت گزاری کا خوب چرچا کریں گے اور اُسے بڑھا چڑھا کر بیان کریں گے (جیسا کہ دوسرے لوگ کرتے ہیں) اور اپنی شخصیت سے ملنے والوں کو متاثر کرنے کی کوشش کریں گے۔ لیکن جب ملاقات ہوئی تو معلوم ہوا کہ ہماری تصویر خیالی بالکل غلط تھی۔ وہ نحیف اور دُبلے پتلے انسان تھے۔ پیار بھری باتوں سے تھوڑی دیر میں ہمارے دلوں کو موہ لیا اور جتنی دیر بھی گفتگو رہی اس کا خلاصہ یہی نکلا کہ پیام تعلیم پہ وہ جان چھڑکتے ہیں اور اس کی بقا کی سعی ہی ان کی زندگی کا مقصود ہے۔ جب ہم جُدا ہونے کے لیے کھڑے ہوئے ہوئے تو کہا " پیام تعلیم آپ کا ہے اس کو زندہ رکھنا ہے تو اپنے دوست احباب کو بھی ترغیب دیجیے کہ زیادہ سے زیادہ تعداد میں اُسے خریدیں اور دوسروں کو بھی خریدار بنائیں " کتنی بڑی مروت کے انسان تھے اور وہ اُردو کی خدمت کی کتنی بڑی دھن تھی اُن کو — آج ان کے گزر جانے کے بعد ہمیں محسوس ہوتا ہے۔

خدا بخشے بہت سی خوبیاں تھیں مرنے والے میں

سیّد خواجہ معین الدین

★

اِدھر اُدھر سے

پانی کے جہاز خشکی پر

لینن گراد انسٹی ٹیوٹ برائے آبی نقل و حمل نے ایک ایسا جہاز تیار کیا ہے جو دریا میں چلتا ہوا جب کسی ڈیم کے نزدیک پہنچتا ہے تو رینگ کر پانی سے باہر نکل آتا ہے اور اتنا حصہ خشکی کے راستے پار کرتا ہے۔ پھر دوبارہ دریا میں اتر کر باقی فاصلہ پانی میں طے کرتا ہے۔ اسی طرح وہ ایک دریا سے نکل کر دوسرے قریبی دریا میں چلنے لگتا ہے۔ ہر طرح آبی نقل و حمل کو بہت کفایتی اور تیز رفتار بنا دیں گے کیونکہ اس طرح مال یا مسافروں کے لیے جہاز بدلنے کی ضرورت نہیں ہوگی۔

(سائنس کی دنیا)

انسان کا اولین مسکن - افریقہ یا ہندوستان

قدیم ترین انسان دس لاکھ سال پرانا جانا جاتا تھا۔ "پتھے کا نتھروپس" (آدم جا بندر) نہیں بلکہ ۲۶ لاکھ سال پرانا "ہوموہیلس" (کام کرنے کے قابل انسان) ہے جو مشرقی افریقہ میں پایا گیا ہے۔ یہ بے دم کا بندر نما انسان تھا۔ جس نے پتھر کے اوزار بنائے تھے اور جو بڑے جانوروں کا شکار کرتا تھا۔ اس کو آسٹرالوپی تھیکس بے دُما بندر اور انتہائی قدیم بے دُما بندر نما انسانوں مثلاً پیتھے کا نتھروپس، پیکنگ مین اور ہیڈلبرگ مین کی درمیانی کڑی کی حاصل تھی۔ چونکہ وہ ابتدائی قسم کے پتھر کے اوزار بنانے کے قابل تھا اس لئے اس کو انتہائی قدیم زمانے کا انسان کہا جا سکتا ہے جو جانور کی حالت سے ترقی کر چکا تھا اور جو جست لگا کر خود کو جانوروں کی دنیا سے الگ کر چکا تھا۔

انسان کے اولین مسکن سے متعلق ایک اور مسئلہ اتنا ہی اہم اور دلچسپ ہے کام کرنے کے قابل انسان (ہوموہیلس) کی باقیات صرف مشرقی افریقہ میں دریافت ہوئی تھیں۔ ایک اور قسم کے انسان کی جو لیکا ہرا نہی اقسام سے تعلق رکھتا ہے۔ ہڈیاں چاڈ اور جنوبی افریقہ میں دستیاب ہوئی ہیں۔ پیتھے کا نتھروپس کے مشابہ انسان کی پتھر میں دبی ہوئی باقیات الجیریا اور مراقش میں بھی ملی ہیں۔ ان تمام باتوں کی بنیاد پر بعض سائنسدانوں نے یہ فرض کیا ہے کہ انسان کا مسکن افریقہ تھا۔ مگر بے دما بندر نما انسان کی باقیات شمالی ہند اور پاکستان میں پتھروں میں دبی ہوئی دستیاب ہوئی ہیں۔ موجودہ نسل انسانی کی ابتدا غالباً اس سے ہوتی ہے۔

قدیم دنیا میں دوسرے مقامات پر بھی ایسی ہی دریافتیں عمل میں آئی ہیں۔ سوویت سائنسدانوں کو امید ہے کہ مزید کھدائیاں عمل میں لانے سے ان مسائل

...کے اور انسان کی اور انسانی سماج کی ابتدا کے بارے میں کئی دوسرے نزاعی امور کے حل میں بلا شبہ مدد ملے گی۔

پروفیسر پی۔ یورسکووسکی
(واقعات و تبصرے)

پرامی لیڈے

پرامی لیڈے کو "بینڈی کوٹ" بھی کہتے ہیں یہ لگ بھگ خرگوش کے برابر ہوتا ہے۔ لیکن اس کی اگلی اور پچھلی ٹانگوں میں لمبائی کے لحاظ سے فرق نہیں ہوتا۔ کان خرگوش کی طرح لمبے لمبے ہوتے ہیں۔ جسم کی لمبائی چودہ انچ اور دُم چھ انچ ہوتی ہے۔ پنجوں میں مضبوط ناخن ہوتے ہیں۔ جن سے یہ زمین کھود کر گڑھے کر لیتے ہیں اور اسی میں رہتے ہیں اس کی خوراک گھاس، جڑیں اور کیڑے مکوڑے ہیں!

بندر بھی ہڑتال کرنے لگے

ایک بہت پرانی کہاوت ہے ہم بھی سرکار کے اور ہمارے بھرے سقہ۔ بات ہے بھی ٹھیک۔ دنیا کا چلن تو یہی ہے کہ کام کرتے رہیں اور اپنا کام چلاتے رہیں۔ کوئی کسی کا ملازم اور کوئی کسی کا۔ اگر کسی کی ملازمت نہیں۔ بلکہ اپنا ہی کام ہے، تب بھی وہ ایک طرح کی ملازمت ہی ہے۔ پابندی تو وہاں بھی ہے نا۔

بہر حال پہلے زمانہ مالکوں کا ہوا کرتا تھا کہتے ہیں اب مزدوروں کا ہو گیا ہے۔ جہاں کوئی بات مرضی کے خلاف ہوئی ہڑتال کر دی۔ کام نہیں کریں گے۔ بے چارا مالک ... کام نہیں ہو گا تو فائدہ کہاں سے ہو گا۔ فائدہ نہیں ہو گا تو تنخواہ کہاں سے دی جائے گی، اپنا خرچہ کیسے نکالے گا۔

کہتے ہیں خربوزے کو دیکھ کر خربوزہ رنگ بدلتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اب انسانوں کو دیکھ کر جانوروں میں بھی ہڑتال کا رواج ہو گیا ہے۔ جو جانور انسانوں کی خدمت کرتے ہیں، ان کے اشاروں پر اچھلتے کودتے اور دوسرے کرتب دکھاتے ہیں، وہ بھی تو ایک طرح کے ملازم ہی تو ہیں۔ مثلاً آسام کے جنگلوں میں سینکڑوں کی تعداد میں ہاتھی مزدوری کرتے ہیں۔ انھیں باقاعدہ تنخواہ دی جاتی ہے۔ سالانہ ترقیاں ملتی ہیں۔ اچھے کام پر انعام ملتا ہے تو غلط کام کی سزا بھی۔

اسی طرح ملائشیا کے جنگلوں میں جہاں آسام کی طرح موٹے موٹے پیڑوں والے گھنے جنگلات نہیں ہیں، بلکہ اونچے اونچے ناریل کے درخت ہیں، وہاں بندر ملازم ہیں۔ آپ تو جانتے ہی ہیں۔ بندر پیڑوں پر چڑھنے میں بڑے استاد ہوتے ہیں۔ پلک جھپکتے ہی چوٹی پر نظر آتے ہیں۔ ان بندروں کے سپرد یہ خدمت ہے کہ وہ پیڑ پر چڑھ جائیں اور ناریل توڑ توڑ کر نیچے پھینکتے رہیں۔ مزدوری میں ۱۸ کیلے یومیہ ملتے ہیں کام اچھا کرنے پر انعام بھی ملتا ہے۔

پچھلے دنوں اسی طرح کے ناریل کے باغ کے مالک کے دل میں نہ جانے کیا سمائی کہ اس نے یک قلم فیصلہ دے دیا کہ آئندہ بندروں کو ۱۵ کیلے دیے جایا کریں۔ پانچ ناشتے کے وقت۔ پانچ دوپہر کے وقت اور پانچ رات کو۔ مالک صاحب نے شاید حساب لگایا ہو کہ اس طرح سالانہ ہزاروں روپے کی بچت ہو جائے گی۔ بندروں نے ایک دو دن تو کچھ کہا نہیں۔ لیکن جب دیکھا کہ ان کی مزدوری کم کر دی

پیام تعلیم کلینڈر

۱۹۷۵ء

ماہ	جنوری اکتوبر	فروری مارچ نومبر	اگست	مئی	اپریل جولائی	ستمبر دسمبر	جون
عدد	۵	۱	۷	۶	۴	۳	۲

سنہ ۱۹۷۵ء کے ۵ عدد

سنہ ۱۹۷۵ء کے سال بھر کی کسی بھی تاریخ کا دن معلوم کرنا مقصود ہو تو اس ماہ
کے عدد میں اسی تاریخ کے پورے عدد اور سنہ ۷۵ء کے ۵ عدد جمع کرکے
کل میزان (جمع) کو ۷ پر تقسیم کریں۔ تقسیم کے بعد اگر ایک باقی ہو تو
ہفتے کا پہلا روز اتوار ہوگا۔ دو باقی ہوں تو پیر۔ تین باقی رہیں تو منگل
چار باقی رہیں تو بدھ۔ پانچ باقی رہیں تو جمعرات۔ چھ باقی رہیں تو جمعہ
اور صفر باقی رہے تو ہفتہ۔ (سنیچر) ہوگا۔

پیامِ تعلیم کیلنڈر سنہ ۱۹۷۵ء

جناب عبد المجید آنیکل ضلع بنگلور

											فروری
						ستمبر	اپریل	جنوری			مارچ
					جون	دسمبر	جولائی	اکتوبر	مئی	اگست	نومبر
۲۹	۲۲	۱۵	۸	۱	اتوار	پیر	منگل	بدھ	جمعرات	جمعہ	ہفتہ
۳۰	۲۳	۱۶	۹	۲	پیر	منگل	بدھ	جمعرات	جمعہ	ہفتہ	اتوار
۳۱	۲۴	۱۷	۱۰	۳	منگل	بدھ	جمعرات	جمعہ	ہفتہ	اتوار	پیر
★	۲۵	۱۸	۱۱	۴	بدھ	جمعرات	جمعہ	ہفتہ	اتوار	پیر	منگل
★	۲۶	۱۹	۱۲	۵	جمعرات	جمعہ	ہفتہ	اتوار	پیر	منگل	بدھ
★	۲۷	۲۰	۱۳	۶	جمعہ	ہفتہ	اتوار	پیر	منگل	بدھ	جمعرات
★	۲۸	۲۱	۱۴	۷	ہفتہ	اتوار	پیر	منگل	بدھ	جمعرات	جمعہ

Regd. No. D.(S)-047

Jan 1975

PAYAM-I-TALEEM

NEW DELHI-110025

پیامِ تعلیم

نہرو بال پستکالیہ

ہندوستان کی اہم زبانوں اور انگریزی میں بچوں کے لیے بہترین اور سستی کتابیں شایع کرنے کے لیے کتابوں کا سلسلہ آغاز کیا گیا ہے۔ اس کا سب سے بڑا مقصد یہ ہے کہ ہندوستان کے مختلف حصوں میں بسنے والوں، مختلف زبانوں کے بولنے والوں کے لیے ایک ہی سا ادب پیش کیا جائے تاکہ وہ ایک دوسرے کے حالات سے واقف ہو سکیں اور اس سے قومی ایکتا مضبوط ہو۔

اب تک مندرجہ ذیل کتابیں شایع ہوئی ہیں جو اُردو کے علاوہ انگریزی اور ہندوستان کی دوسری زبانوں میں بھی چھپتی ہیں۔ ہر کتاب کی قیمت ایک روپیہ پچاس پیسے (۱/۵۰) ہے۔ یہ سب کتابیں رنگین تصویروں کے ساتھ فوٹو آفسٹ پر شایع ہوئی ہیں۔

- بابو (حصّہ اول و دوم) مصنف: سی فری ناس، مترجم: صالحہ عابد حسین
- سب کا ساتھی سب کا دوست ، اُماشنکر جوشی ، ، انور کمال حسینی
- کشمیر مصنف مالا سنگھ ، مترجم: خدیجہ بیگم ، تصویر: پریانند
- پرندوں کی دنیا مصنف: جمال آرا ، مترجم: محمد شفیع الدین نیّر
- ہمالیہ کی چوٹیوں پر ، بریگیڈیر گیان سنگھ، مترجم: محمد ذاکر
- ہماری ندیوں کی کہانی مصنف: لیلا مجمدار ، مترجم: رضیہ سجاد ظہیر
- جنت کی سیر اور دوسری کہانیاں ، : لیلا بھاگوت ، ، : رضیہ سجاد ظہیر
- رسیلی کہانیاں ، ، منوج داس ، ، : صغرا مہدی
- آزادی کی کہانی حصّہ اول و دوم ، : وشنو پربھاکر ، ، : انور کمال حسینی
- ہماری ریلیں ، ، جگ جیت سنگھ ، ، : عرش ملسیانی
- ہندوستان میں غیر ملکی سیاح ، ، : کے سی کھنہ ، تصاویر: کرشن کھنہ
- ... ناٹک کھیلیں ، : اوماننہ ، مترجم ، رفیعہ منظور الامین
- ... کا خاندان ، ، منوہر داس چترویدی ، : محمد شفیع الدین نیّر
- ... حصّہ اوّل ، ، جوکس بی۔ ام جوشی ، ، : رضیہ سجاد ظہیر
- ... کی کہانیاں ، مصنف: راجندر اوستھی ، مترجم: انور کمال حسینی
- ... و تمدن ، ، کرشن چیتنیہ ، ، ، ، ،
- ۱۷۔ سدا بہار کہانیاں ، ، شانتا رنگاچاری مترجم: انور کمال حسینی
- ۱۸۔ ایجادیں جنھوں نے دنیا بدل ڈالی (حصہ اول و دوم) ، : میر نجابت علی ، ، : سید احسان
- ۱۹۔ سونا کی سیر ، : تارا تیواڑی ، ، : انور کمال حسینی
- ۲۰۔ بڑا پانی مصنف: لیلا مجمدار ، مترجم: صالحہ عابد حسین
- ۲۱۔ مورا ، : ملک راج آنند ، ، : انور کمال حسینی
- ۲۲۔ ہاکی کا کھیل ، : سریندر سانیال ، : پریتم لال
- ۲۳۔ پھول اور شہد کی مکھی : اشوک داور ، : انور کمال حسینی

ذاکر حسین سیریز

۲۳۔ ابّو خاں کی بکری ، مصنف: ڈاکٹر ذاکر حسین	قیمت :	۲/۰۰
۲۴۔ انوکھی دُکان ، : قدسیہ زیدی ،		۲/۵۰
۲۵ گلابو چوہیا اور پری زاد ، ، ، ، ،		۲/۰۰
۲۶۔ دنیا کے جانور ، ، : ، ، ،		۲/۵۰
۲۷۔ راجہ رام موہن رائے ، : عرش ملسیانی		۴/۵۰
۲۸۔ خواجہ الطاف حسین حالی ، ، صالحہ عابد حسین		۶/۵۰
۲۹۔ سلطان زین العابدین "بڈشاہ" رضیہ سجاد ظہیر		۶/۵۰
۳۰۔ ذاکر صاحب کی کہانی : سعیدہ خورشید عالم		۶/۵۰

ملنے کا پتہ

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ جامعہ نگر نئی دہلی ۲۵ ، اردو بازار جامع مسجد دہلی ۶ ، پرنسس بلڈنگ بمبئی ۳

ماہنامہ

پیامِ تعلیم

نئی دہلی ۲۵

جلد ۱۲ شمارہ ۳

اڈیٹر

ولی شاہجہانپوری

معاون

صفیہ حسّان

مارچ ۱۹۷۵ء

قیمت ۷۰ پیسے

سالانہ چندہ سات روپے

فہرست مضامین

★

پرنٹر پبلشر سیّد احمد ولی نے مکتبہ جامعہ لمیٹڈ کے لیے جمال پرنٹنگ پریس دہلی میں چھپوا کر جامعہ نگر نئی دہلی ۲۵ سے شایع کیا

جناب عادل کھلگانوی

کورا کاغذ

سنا ہے مصوّر ہو تنویر تم　　بنا کر دکھا دو یہ تصویر تم

ہو تصویر میں گائے چرتی ہوتی　　ہری گھاس پہ چلتی پھرتی ہوئی"

یہ سن کر کہا اس نے "اچھا جناب　　بنا دیتا ہوں آپ کو میں شتاب"

پھر اس نے قلم اور کاغذ لیا　　لکھا اس پہ کچھ پھر مجھے دے دیا

جو دیکھا تو کاغذ پہ کچھ بھی نہ تھا　　لکیروں کا بھی کچھ نہیں تھا پتا

کہا میں نے "کاغذ تو کورا ہے یہ　　کہ آنکھوں کو بس ایک دھوکا ہے یہ؟"

وہ بولا کہ "گھاس اس میں تھی اتنی کم　　کہ اس گائے نے جلد کر دی ختم

جبھی تو نہیں گھاس تصویر میں　　نہیں کچھ خطا میری تحریر میں"

"مگر گائے بھی میں نہیں دیکھتا　　نشانی ہے اس کی نہ ہے کچھ پتا"

یہ سنتے ہی فوراً کہا اس نے یوں　　"شکم بھرنے کے بعد رہتی وہ کیوں؟

ہلاتی ہوئی دُم وہ چل دی کہیں　　اسے آپ اب دیکھ سکتے نہیں

کہا ہوتا پہلے ہی مجھ سے اگر　　کہ باندھی ہوئی گائے آئے نظر

تو کھونٹی میں ہوتی بندھی وہ ضرور

بھلا اس میں اب میرا کیا ہے قصور؟"

بچوں سے باتیں

ہمیں افسوس ہے کہ فروری کا پیام تعلیم آپ کو بہت دیر سے ملا آپ کو انتظار کی تکلیف اٹھانی پڑی۔ قصہ دراصل یہ ہوا کہ پرچہ تو بروقت چھپ گیا تھا مگر بیچارہ ننگا تھا۔ بغیر پوشاک کے اسے بھی آپ کے سامنے جاتے ہوئے شرم آتی اور کبھی ہم کو یہ کب گوارا ہوتا کہ اتنی اچھی اچھی کہانیوں، مضمونوں اور نظموں کا تحفہ لے کر وہ اس طرح آپ کے سامنے جائے کہ آپ دیکھتے ہی ناک بھوں چڑھالیں۔

ہمارے جنرل منیجر، جناب شاہد علی خاں کو بمبئی کا سفر درپیش ہوا۔ وہاں کا قیام کچھ طول پکڑ گیا۔ آج آتے ہیں اور کل آتے ہیں۔ سرورق کی طباعت ان کے بغیر ممکن نہیں تھی۔ انھیں یہ بھی پسند نہیں تھا کہ پرچہ بغیر ٹائیٹل کے شائع ہو۔

واپسی پر کچھ دن تو ضروری کاموں میں مصروف رہے اس کے بعد جب ٹائیٹل تیار ہو گیا تو جس علاقہ میں ہمارا پریس ہے وہاں کرفیو لگ گیا اور کرفیو میں آپ جانتے ہی ہوں گے کہ کوئی شخص گھر سے باہر نہیں نکل سکتا۔ آپ نے اخباروں میں پڑھا اور ریڈیو پر سنا ہی ہوگا کہ ۲۔ فروری کو جامع مسجد کے علاقے میں فساد پھوٹ پڑا جس میں دس گیارہ جانیں ضائع ہوئیں۔ لاکھوں کی جائیداد تباہ ہوئی اور سیکڑوں جیل خانوں میں بند ہو گئے۔

شکر ہے اس کا کہ یہ ہندو مسلم فساد نہیں تھا۔ افسوس یہ ہے کہ دونوں فریق مسلمان تھے (ایک فریق اور اس میں شامل ہو گیا یعنی پولیس) نتیجہ میں مسلمان ہی مارے گئے۔ مسلمان ہی کی دکانیں جلیں اور لٹیں اور مسلمان ہی گرفتار بھی ہوئے۔

غرض کہ جب کرفیو ختم ہوا، ٹائیٹل چھپ گیا تو ڈاکخانہ کے قانون نے ہاتھ پکڑا۔ روانگی کی جو تاریخ مقرر ہے اس کے بعد بغیر اعلیٰ افسروں کی اجازت کے ڈاکخانہ رسالے کو قبول نہیں کرتا۔ اس مرحلے سے نجات ملی اور ۱۷۔ فروری کو پرچہ ڈاکخانے بھیجا جا سکا۔

ہمیں یقین ہے کہ انتظار کی ساری کوفت ختم ہو گئی ہو گی جب پرچہ آپ نے دیکھا اور پھر پڑھا ہوگا۔ سچ سچ بتائیے ہے نہ یہ بات؟

اس مرتبہ بھی ہم نے کوشش کی ہے کہ آپ کی تفریح کے تمام سامان آپ تک پہنچائیں۔ سہیل عظیم آبادی صاحب کی کہانی "نیت کا پھل"، اسرار ندوی صاحب کی "شہزادہ بے نظیر کی کہانی" کی تیسری قسط، محمد امین صاحب کی "غدر کی نفاذ کا ہیرو" اور دانش آفاق صاحب کا "مکھیوں کی ڈبیا"، آپ کو ضرور پسند آئیں گی۔

اکرام احمد صاحب کا "سائنس کی دنیا"، اور ریحان

عباسی صاحب کا "جانور اور موسمی تبدیلیاں" دونوں بہت معلوماتی مضامین ہیں۔ جن سے آپ بہت کچھ جان سکیں گے۔ ڈاکٹر مشیر الحق کا "وہم کا علاج" بھی آپ کو ضرور پسند آئے گا۔

اس مرتبہ نظمیں زیادہ نہیں ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ "بڑے" ادھر توجہ نہیں کرتے (یہ رونا ہمیشہ کا ہے) "چھوٹے" جیسی نظمیں بھیجتے ہیں وہ اشاعت کے قابل نہیں ہوتیں۔ دونوں صورتیں افسوس ناک ہیں۔ اس پرچہ میں عادل کہلگانوی صاحب کی نظم "کورا کاغذ" سعید احمد قاسمی صاحب کی "میٹھی ہماری بولی" کے علاوہ مولانا نثار چنگیزی کی دو نظمیں آپ کو ضرور پسند آئیں گی۔

اور ہاں محمد شفیع الدین صاحب نیرؔ کی وہ تقریر پڑھنا نہ بھولیے گا۔ جو موصوف نے مراد آباد میں کی تھی۔ اس میں آپ کے لیے بھی کام کی باتیں ملیں گی اور آپ کے اساتذہ اور والدین کے لیے بھی۔

دِلّی کے شمال مغرب میں ایک ریاست ہے ہماچل پردیش۔ پچھلے دنوں اس ریاست کے کنورؔ ضلع کے کچھ گانوں میں زلزلہ آیا جس سے بڑا نقصان ہوا۔ یہ سلسلہ ابھی تک جاری ہے۔ قریب قریب روزانہ دو چار جھٹکے زلزلوں کے اس علاقے میں آہی جاتے ہیں۔ برف باری اور ٹھنڈی ہواؤں سے وہاں کے باشندے سخت عذاب میں مبتلا ہیں۔

ہماری درخواست پر محمد امین صاحب نے ایک بہت عمدہ مضمون زلزلوں سے متعلق تحریر کیا ہے۔ مضمون خاصا بڑا ہے۔ اس لیے کہ بہت معلوماتی ہے۔ خاص طور پر جغرافیہ کے طالب علم اسے پسند کریں گے۔

یہ مضمون آپ اپریل اور مئی کے شمارے میں پڑھیں گے۔

فارم IV حسب قاعدہ ۸

بابت "پیام تعلیم" نئی دِلّی

(۱) مقام اشاعت : جامعہ نگر نئی دہلی ۲۵
(۲) وقفہ اشاعت : ماہنامہ
(۳) پرنٹر کا نام : سیّد احمد ولی قومیت ہندوستانی
پتہ : جامعہ نگر۔ نئی دہلی ۲۵
(۴) پبلشر کا نام : سیّد احمد ولی۔ قومیت ہندوستانی
پتہ : جامعہ نگر۔ نئی دہلی ۲۵
(۵) اڈیٹر کا نام : سیّد احمد ولی۔ قومیت ہندوستانی
پتہ : جامعہ نگر۔ نئی دہلی ۲۵
مالکان
چیئرمین : پروفیسر محمد مجیب جامعہ نگر نئی دہلی ۲۵
ڈائرکٹرز : سید مجتبیٰ حسن زیدی جامعہ نگر نئی دہلی ۲۵
(۲) : ڈاکٹر عبد العلیم ویسٹرن کورٹ نئی دہلی
(۳) : ہز ہائنس نواب اقبال محمد خاں آف پالن پور کف پریڈ کولابہ بمبئی ۵۱
(۴) : کرنل بشیر حسین زیدی جامعہ نگر نئی دہلی ۲۵
(۵) : ضیاء الحسن فاروقی پرنسپل جامعہ کالج جامعہ نگر نئی دہلی ۲۵
(۶) : مالک رام بوہجہ ۳۹۶ ڈفنس کالونی نئی دہلی ۳
(۷) : کمپنی کے سرمایے کے ایک فی صدی سے زیادہ کے حصے دار جامعہ ملیہ اسلامیہ۔ جامعہ نگر نئی دہلی ۲۵
اسلامی جیم خانہ کنیڈی، سی فیس بمبئی ۷

میں سیّد احمد ولی تصدیق کرتا ہوں کہ مذکورہ بالا اطلاعات میرے علم و یقین کے مطابق درست ہیں۔

دستخط : سید احمد ولی پبلشر
۲۸۔ فروری ۱۹۷۵ء

اندرا گاندھی

جناب بزمی بھارتی

دادا نہرو کے گلستاں کی کلی
چاچا نہرو کی لاڈلی بیٹی

دھوپ میں تپ کے مسکراتی ہے
کالی راتوں میں جگمگاتی ہے

نفرتوں کا نہیں ہے دل میں داغ
ہر تعصب سے پاک جس کا دماغ

راج نیت اس کی نوکرانی ہے
اچھے اچھوں نے ہار مانی ہے

ظلم کا ہاتھ توڑ دیتی ہے
رخ ہواؤں کا موڑ دیتی ہے

وقت نے لاکھ ٹیڑھی چال چلی
مات اس نے مگر نہیں کھائی

جنگ بازوں کے منہ کو بند کیا
پرچم امن کو بلند کیا

حوصلہ مند جرأتوں کا ستون
میرے بھارت کی شیر دل خاتون

رن میں کودی تو اس طرح کودی
صنفِ نازک کی آبرو رکھ لی

ہوشیاری کا اک نمونہ ہے
بردباری کا اک نمونہ ہے

آپ اپنی مثال ہے بزمی
ساری دنیا میں دھاک ہے جس کی

دورِ حاضر کی لکشمی بائی
یعنی محترمہ اندرا گاندھی

جناب سہیل عظیم آبادی

نیت کا پھل

(جناب سہیل عظیم آبادی ملک کے عظیم ادیبوں میں ہیں۔ آج کل بہار اردو اکیڈمی کے سیکرٹری ہیں۔ دفتری مصروفیت بہت بڑھ گئی ہے۔ اور لکھنے پڑھنے کا وقت بہت کم ملتا ہے۔ ہم شکر گزار ہیں ان کے صاحبزادے شان الرحمٰن کے جن کو پیامِ تعلیم سے محبت ہے کہ یہ کہانی ان کی بدولت ہمیں مل سکی۔ (مدیر)

کسی زمانے میں عرب میں ایک غریب آدمی رہتا تھا۔ جس کا نام عمر تھا۔ اس کی بیوی کا نام کلثوم تھا۔ عمر دن بھر محنت مزدوری کرتا تو شام کو اپنے ساتھ بازار سے چیزیں خرید کر لیتا آتا۔ اس وقت اس کی بیوی کھانا بناتی۔ پھر رات گئے دونوں کھا پی کر سو جاتے۔ جس دن اسے کوئی مزدوری نہیں ملتی اس رات کھانا بھی نہیں بنتا اور دونوں بھوکے سو جاتے۔

جب کام میں کمی اور کھانے پینے میں تکلیف ہونے لگی تو کلثوم نے اپنے شوہر کو اکسانا شروع کیا کہ کہیں باہر چلو۔ پر عمر کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کہاں جائے اور باہر جا کر کیا کرے۔ اس بیچ کلثوم کے ایک بچہ پیدا ہوا اور کچھ دن دونوں کو گھر پر ہی رک جانا پڑا۔ اس دوران عمر کو اور بھی پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑا۔ اور اس نے لاچار ہو کر باہر جانے کی ٹھان لی۔

ان دنوں عرب میں بغداد بہت بڑا شہر تھا اور وہاں بہت بڑے بڑے [illegible] کا کاروبار تھا۔ عمر اور کلثوم نے سوچا کہ وہاں ان کے لائق بھی [illegible]۔ اور دونوں پیدل ہی چل پڑے۔ راستے میں محنت مزدوری کرتے، گھومتے گھامتے آخر دونوں بغداد پہنچے۔ عمر نے [illegible] کو سرائے میں چھوڑا اور خود مزدوری کی تلاش میں نکل پڑا۔ گھومتا پھرتا ایک ٹوٹے پھوٹے مکان میں پہنچا آواز دی تو ایک بوڑھی عورت باہر نکل آئی۔

عمر نے بوڑھی عورت کو اپنا سارا حال کہہ سنایا۔ بوڑھی غریب تھی اور ٹوٹے پھوٹے مکان میں گزارا کرتی تھی۔

اس نے عمر سے کہا۔ "اللہ تیرا بھلا کرے بیٹا۔ میں تیرا دکھ سمجھتی ہوں۔ اگر تم چاہو تو اپنی عورت (بیوی) اور بچے کو لے آؤ۔ اس گھر میں جگہ ہے۔ ایک کوٹھری میں رہو محنت مزدوری کر کے لاؤ اور کھاؤ پیو۔ میں غریب بڑھیا تمہاری اتنی ہی مدد کر سکتی ہوں۔"

پردیس میں بے چارے عمر کے لیے اتنا بھی بہت تھا۔ شام کے وقت وہ بیوی اور بچوں کو اس ٹوٹے پھوٹے مکان میں لے آیا اور اسی مکان میں رہنے لگا۔

[illegible] محلے میں عبداللہ نام کے سوداگر کا لڑکا علی رہتا تھا۔ جو باپ کے مرنے کے بعد دن رات عیش و آرام میں ڈوبا رہتا تھا۔ کھانا پینا۔ گانا بجانا۔ اور کھیل تماشے کے سوا اسے کوئی کام نہ تھا۔ اس کے یہاں بہت سے نوکر تھے۔ بوڑھی عورت نے عمر سے کہا کہ علی کے گھر جاؤ اور اس سے نوکر رکھنے کے لیے کہو۔ اس کے پاس بہت سے نوکر ہیں۔

دو تمہیں بھی ضرور نوکر رکھ لے گا۔

عمر اور کلثوم یہی باتیں کر رہے تھے۔ عمر کو یقین تھا کہ علی سوداگر کے گھر جانے سے اسے نوکری مل جائے گی اور وہ اپنی بیوی کو سمجھانا چاہتا تھا کہ اب دکھ کے دن تھوڑے ہی رہ گئے ہیں کہ اچانک ان کا چھوٹا بچہ چیختا ہوا آیا۔ دونوں نے دیکھا کہ اس کے ہاتھ میں روٹی کا چھوٹا سا ٹکڑا تھا۔ اسے بندر چھین کر لے گیا اور چھپر پر بیٹھا کھا رہا ہے۔ دونوں کو غصہ تو آیا لیکن وہ کر ہی کیا سکتے تھے۔ کلثوم نے بچے کو روٹی کا دوسرا ٹکڑا دیا اور یوں ہی بندر کی طرف دیکھ کر بولی "غریب کے بچے سے روٹی چھیننے سے کیا فائدہ؟ بہادری تو جب ہے کہ دوسرے گھر سے چیزیں لا کر غریب بچے کو دے دو۔"

بندر نے روٹی کا ٹکڑا منہ میں رکھا۔ پھر دانت دکھا کر دوسری چھت پر بھاگ گیا۔

وقت نکال کر عمر علی کے گھر پہنچا۔ اس نے دیکھا کہ سوداگر علی اپنی بارہ دری میں بیٹھا ہے۔ اس کے یار دوست اس کے ساتھ ہیں۔ کھانے پینے کا سامان سامنے ہے۔ اور گانا بجانا ہو رہا ہے۔ بہت سے نوکر ہاتھ باندھے کھڑے ہیں جیسے ہی عمر گھر کے اندر گیا۔ کتوں نے بھونکنا شروع کر دیا۔ اس نے پلٹ کر دیکھا۔ سات کتے چاندی کی موٹی موٹی زنجیروں میں بندھے ہیں۔ سب کے لیے الگ الگ لکڑی کی چوکیوں پر موٹے موٹے گدے بچھے ہیں اور سامنے سونے کے تھال ہیں۔ جن میں ان کا کھانا رکھا ہوا ہے۔ کسی نے کھایا ہے اور کسی نے نہیں۔ اسے بڑی حیرت ہوئی۔ مگر ساتھ ہی یقین ہو گیا کہ اسے بھی علی سوداگر کے یہاں نوکری مل جائے گی۔

جب کتوں نے بھونکنا شروع کیا تو لوگوں نے اس کی طرف پلٹ کر دیکھا۔ کون ہے جس پر کتے بھونک رہے ہیں اور گانے بجانے میں گڑبڑ ہو رہی ہے۔ نوکروں نے آکر عمر کو پکڑا اور مالک کے پاس لے گئے۔ عمر نے اپنا سارا حال کہہ سنایا اور بولا کہ نوکری چاہتا ہوں۔ اس نے نوکری دی ہی نہیں اوپر سے اس پر غصہ بھی بہت ہوا اور دھکے دے دے کر اسے باہر نکلوا دیا۔

عمر چپ چاپ وہاں سے نکلا اور دل ہی دل میں بولا "اے اللہ تیرا بھی کیا انصاف ہے۔ کسی کے کتے سونے کے برتن میں کھائیں اور کوئی روٹی کے ایک ٹکڑے کے لیے مارا مارا پھرے" وہ چپ چاپ بازار گیا۔ وہاں اسے کوئی مزدوری مل گئی۔ پھر آٹا اور ترکاری خرید کر گھر لوٹا۔ اس کی بیوی نے جلدی جلدی روٹی پکائی اور اسے کھانے کو دیا۔ لڑکا بھی پاس بیٹھا کھا رہا تھا۔ عمر نے اپنی بیوی سے سوداگر کے یہاں کا سارا حال کہہ سنایا۔

ابھی وہ سب کھانا کھا ہی رہے تھے۔ کہ وہ بندر کہیں سے اچھلتا کودتا آ گیا اور دور ہی سے دانت دکھانے لگا۔ لڑکے نے روٹی کا ایک ٹکڑا اٹھا کر اس کی طرف پھینک دیا بندر نے اٹھا کر کھانا شروع کیا۔ کلثوم نے بیٹے کو ڈانٹا تو عمر نے منع کیا اور کہا کہ یہ بھی دکھی اور بے سہارا معلوم ہوتا ہے جبھی اس طرح مارا مارا پھرتا ہے۔ اور اتنا کہہ کر آدھی روٹی توڑ کر بندر کی طرف پھینک دی۔

بندر برابر ہی آنے لگا۔ عمر برابر اسے روٹی کا ایک ٹکڑا دے دیتا۔ اب بندر بھی اس سے گھل مل گیا تھا۔ روز ایک نہ ایک بار آ جاتا اور روٹی کا ٹکڑا کھا کر چلا جاتا تھا

ایک دن ٹھیک کھانے کے وقت بندر پہنچا لیکن عمر کے گھر اس دن کھانے پینے کا سامان نہ رہنے کی وجہ سے فاقہ تھا۔ عمر نے ہنستے ہوئے کہا۔ "دوست آج تمہیں

...دھو۔ تم بھی بھوکے رہو۔"

بندر اچھلتا کودتا چھپر پر چلا گیا۔ پھر نہ جانے کہاں چلا گیا۔ پھر اچھلتا کودتا آدھمکا اور جھپاک سے ایک تھالی عمر کے سامنے پھینک دی۔ عمر نے اٹھا کر دیکھا۔ کھرے سونے کی تھالی تھی۔ بندر تھالی پھینک کر اچھلنے کودنے اور خوں خوں کرنے لگا جیسے وہ بہت خوش تھا۔ عمر کو یاد آیا کہ ایسی تھالی تو اس نے علی سوداگر کے کتوں کے سامنے دیکھی تھی، اسے خیال آیا کہ ضرور بندر وہیں سے اٹھا کر لایا ہے اس نے اپنی بیوی سے کہا، اور دونوں کی رائے ہوئی کہ تھالی لوٹا دی جائے۔

بندر کے جاتے ہی عمر تھالی لے کر اٹھا اور علی سوداگر کے گھر کی طرف چلا۔ دروازے پر ہی علی سوداگر کے نوکروں نے اسے پکڑ لیا۔ اس نے سارا حال کہہ سنایا لیکن سب نے اسے مارا پیٹا اور مالک کے پاس پکڑ کر لے گئے۔

علی سوداگر کے پاس پہنچ کر عمر نے ساری کہانی کہہ سنائی کہ اسے تھالی کیسے ملی۔ پر وہ بھی نہیں مانا اور اس کے کہنے پر پھر نوکروں نے اسے مارا پیٹا۔ اسے پکڑ کر قاضی کے پاس لے گئے۔

عمر بے چارا بڑا پریشان تھا اور دل ہی دل میں کہتا تھا کہ اگر بے ایمانی کر لیتا تو کسی کو خبر بھی نہ ہوتی پر اس نے ایمانداری کی راہ پکڑی تو اب یہ سب کچھ اسے بھگتنا پڑ رہا ہے۔ اسے یقین ہو گیا تھا کہ قاضی کے یہاں سے جیل کی سزا ہوگی۔ وہ اپنے آپ کو بے قصور کیسے ثابت کر سکے گا وہ ڈرتا تھا کہ اگر سزا ہو جائے گی تو اس کی بیوی اور بچے کا کیا حال ہوگا مگر کوئی چارہ ہی نہ تھا۔

جب وہ قاضی کے سامنے پہنچا تو نوکروں نے ایک من گھڑت کہانی سنائی۔ کہ اس نے تھالی چوری کی ہے۔ اور یہ بھی کہا کہ ایک تھالی اس سے پہلے بھی چوری گئی تھی اور آج پھر ایک چوری گئی ہے۔ اور یہ شخص اس کا پتہ نہیں بتاتا۔

قاضی نے علی سوداگر کے نوکروں کی بات سن لی۔ عمر نے بھی سارا قصہ کہہ سنایا اور کہا "مجھے تو یہ تھالی ایک بندر نے دی تھی لیکن میں دوسرے کی چیز رکھنا نہیں چاہتا تھا اور تھالی کو لوٹانے کے لیے گیا تھا کہ ان لوگوں نے مجھے پکڑ لیا اور مارا پیٹا۔ پھر سوداگر کے پاس لے گئے۔ اس نے بھی مارنے کا حکم دیا اور مار پیٹنے کے بعد آپ کے پاس فیصلے کے لیے بھیجا ہے۔ میں بھی انصاف چاہتا ہوں۔"

قاضی سوچ میں پڑ گیا۔ دونوں کی باتیں سن کر یہ بات اس کی سمجھ میں آ گئی تھی کہ عمر نے چوری نہیں کی ہے۔ اور وہ ایماندار آدمی ہے۔ لیکن اس کی صفائی کے لیے کوئی ثبوت نہیں تھا۔ قاضی سوچنے لگا کہ کیا فیصلہ کرے۔ بلا ثبوت کے چھوڑ دے تو اس کی بدنامی ہوگی اور عمر کو سزا دے تو بے قصور اور بے گناہ کو سزا ملے گی۔

وہ اسی سوچ میں تھا کہ جھن سے آواز آئی اور سونے کی ایک تھالی اس کے سامنے آ کر گری۔ پھر اس نے چاروں طرف دیکھنا شروع کیا۔ اس نے دیکھا کہ اجلاس کے سامنے ہی ایک پیڑ پر ایک بندر خوں خوں کر رہا ہے۔ قاضی نے تھالی اٹھا کر دیکھی۔ یہ تھالی بھی پہلی تھالی کی طرح تھی۔ بندر نے پھر اسی طرح ایک بعد دوسری تین تھالیاں قاضی کے سامنے پھینک دیں۔ قاضی کی سمجھ میں ساری باتیں آ گئیں۔ اور اس نے فیصلہ سنا دیا کہ عمر بالکل بے قصور ہے اور ایماندار آدمی ہے۔ تھالی اسے بندر ہی نے دی تھی اور وہ ضرور واپس کرنے گیا تھا لیکن علی سوداگر نے اسے اپنے نوکروں سے پٹوایا۔ اس لیے چاروں تھالیاں

عمر کو ملنی چاہئیں۔ علی سوداگر کو اپنے مال کی پرواہ نہیں۔ پھر اس نے جو مار پیٹ کی ہے اس کے بدلے میں علی سوداگر کو ہزار اشرفیاں دینی ہوں گی اور وہ اشرفیاں عمر کو دی جائیں۔

فیصلہ سُن کر علی سوداگر کے سارے نوکر دنگ رہ گئے۔ دوڑ کر اپنے مالک کے پاس پہنچ گئے۔ مگر کوئی چارہ نہیں تھا۔ قاضی کا حکم تھا۔ ہزار اشرفیاں اس نے فوراً ہی بھیج دیں۔ جو قاضی نے عمر کو دے دیں۔ اور کہا۔ "مجھے تمہارے ساتھ بہت ہمدردی ہے۔ اب یہ تھالیاں اور اشرفیاں لے جاؤ اور ان سے کوئی کاروبار کرو۔"

عمر ساری چیزیں لے کر گھر آیا اور سارا حال کہہ سنایا۔ پہلے تو وہ بہت روئی دھوئی۔ پھر بولی "اب اس شہر میں رہنا ٹھیک نہیں ہے۔ علی سوداگر آج نہیں تو کل ضرور دکھ پہنچائے گا۔ ہمیں دوسرے شہر میں چلے جانا چاہیے۔

دوسرے ہی دن وہ سب اونٹ کرائے پر لے کر دوسرے شہر میں چلے گئے۔ وہاں ایک مکان خریدا اور عمر کاروبار کرنے لگا۔ اب وہ بہت خوش تھا اور اس سے کاروبار کرنے والے لوگ بھی اس کی ایمانداری سے خوش تھے۔ عمر کا کاروبار بہت جلد ہی بڑھ گیا اور اس کا شمار بڑے سوداگروں میں ہونے لگا۔

چار پانچ سال کے بعد جب اس کے پاس بہت دولت ہو گئی تو اُسے خیال آیا کہ بغداد چل کر اس بوڑھی عورت کی مدد کرنی چاہیے۔ جس نے بُرے وقت میں اسے اپنے یہاں جگہ دی تھی اور علی سوداگر کی ہزار اشرفیاں اور سونے کی تھالیاں بھی لوٹا دینی چاہئیں۔ یہ سوچ کر وہ بیوی بچے کے ساتھ بغداد واپس آیا۔ لیکن بڑھیا مر چکی تھی۔ پھر وہ علی سوداگر کے گھر کی طرف چلا۔ لیکن وہاں بھی اب ٹوٹا پھوٹا کھنڈر ہی تھا۔ اس نے ایک آدمی سے حال پوچھا تو اس نے بتلایا کہ علی سوداگر نے ساری دولت اپنے یار دوستوں میں لٹا دی اور جب اس کے پاس کچھ بھی نہیں رہا تو سارے دوست نگاہیں بدل کر الگ ہو گئے۔ اب وہ غریب آدمی ہو گیا ہے اور دوسروں کی مدد پر جی رہا ہے۔

عمر کو یہ سب باتیں سن کر بہت دُکھ ہوا اور وہ سوچنے لگا کہ دنیا بھی کیا تماشہ ہے؟ کل کچھ آج کچھ! اسی درمیان ایک دُبلا پتلا کمزور ادھیڑ عمر کا آدمی اس کے پاس آیا اور بولا۔ "کیوں بھائی۔ کسے کھوجتے ہو — ؟ علی سوداگر کو کھوجتے ہو؟ علی تو میں ہی ہوں مگر اب سوداگر نہیں ہوں۔"

عمر اُس کے گلے لگ گیا پھر سارا حال کہہ سُنایا۔

دونوں کی آنکھوں سے آنسو نکل پڑے پھر عمر نے اس کے گھر کی مرمت کروائی اور اس کے لیے سوداگری کا سامان خرید دیا۔ اور علی سے کہا — "میرا کوئی بھائی نہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ تم میرے بھائی بن جاؤ۔"

دونوں بھائیوں کی طرح رہنے لگے۔

جناب اسرار ندوی

شہزادہ بے نظیر کی کہانی

تیسری قسط

پانچویں داستان

ماہ رُخ پری کا بے نظیر کو کنویں میں قید کرنا

میاں، ایک دن کیا ہوا کہ ایک دیو نے بے نظیر کو بدر منیر کے باغ میں ٹہلتے دیکھ لیا۔ بس غضب ہو گیا۔ وہ سیدھا ماہِ رُخ کے پاس پہنچا اور اس سے پوچھنے لگا۔

"تمھارا آدم زاد کہاں ہے ؟ میں کہتا نہ تھا آدم کا بچہ کبھی نہ سچا۔ اب وہ تمھارے ہاتھ سے گیا۔ بھئی! میں نے آج اسے ایک باغ میں آدم زادوں کے ساتھ سیر کرتے دیکھا ہے۔"

یہ سنتے ہی پری غصّے سے لال بھبوکا ہو گئی۔ اور کانپتی ہوئی دانت بھینچ کر کہنے لگی۔

"نمک حرام، جھوٹا، دغا باز ذرا سا چھوکرا اور مجھ سے اڑنے لگا۔ آئے تو میرے پاس قسم ہے حضرت سلیمان کی سے ایسا مزہ چکھاؤں گی کہ ساری عمر یاد کرے گا۔ بزرگوں نے ٹھیک ہی کہا ہے کہ آدم زاد بے وفا ہوتے ہیں۔ میں نے اس کو ہر طرح کا آرام دیا لیکن اس نے میرے ساتھ دغا کیا۔ مجھے دھوکے میں رکھ کر بھاگ نکلنے کا پروگرام اچھا!"

وہ غصّے کے مارے ٹہل رہی تھی کہ بے نظیر آتا دکھائی دیا۔ وہ ابھی گھوڑے سے اتر ہی رہا تھا کہ پری چیخ کر کہنے لگی۔

"او دغا باز! میں نے یہ گھوڑا تجھے سیر کے لیے دیا تھا اور تو نے میرے ساتھ دغا کیا۔ تو نے وعدہ کیا تھا کہ کہیں اترے گا نہیں۔ لیکن تو نے ہمیں دھوکا دیا۔ دیکھ اب میں تجھے کیسی سزا دیتی ہوں۔ تیری موت میری مٹھی میں ہے۔ لیکن میں تیری جان نہیں لوں گی۔ ایسی سزا دوں گی کہ عمر بھر روئے گا۔ اور کوئی تیری مدد کو نہیں پہنچ سکے گا!"

یہ کہہ کر ماہ رُخ نے تالی بجائی۔ ایک دیو سامنے آ کھڑا ہوا۔ اس کو حکم دیا کہ:

"تم اسے گھسیٹتے ہوئے لے جاؤ۔ کوہ قاف کے راستے میں ایک اندھا کنواں ہے۔ کنویں کے منہ پر بڑا سا پتھر رکھا ہے۔ اس کنویں میں اسے قید کر دو۔ چوبیس گھنٹوں میں بس ایک بار اسے کھانا اور پانی دیا جائے۔

دیکھو، اس پر کسی طرح کا رحم نہ کرنا!"

حکم سنتے ہی دیو نے بے نظیر کا ہاتھ پکڑا اور اوپر کو اٹھنے لگا۔ اڑتے اڑتے، اڑتے اڑتے اسی جگہ پہنچا جہاں کنواں تھا۔ بے چارہ بے نظیر بہت رویا، گڑگڑایا لیکن ظالم نے ایک نہ سنی۔ دیو نے پتھر ہٹایا اور بے نظیر کو اس میں ڈال کر پتھر سے منہ بند کر دیا

ایک آفت سے تو مر مر کے ہوا تھا جینا
پڑ گئی اور یہ کیسی مرے اللہ نئی

محلوں کا رہنے والا بے نظیر ایک کنویں میں قید تھا۔ وہ غریب کبھی کنویں سے سر ٹکراتا کبھی اپنے بال نوچتا۔ روتا روتا تھک جاتا تو گھٹنوں میں سر ڈال کے بیٹھ جاتا بیٹھا بیٹھا تھک جاتا تو کھڑا ہو جاتا۔ کبھی چیخیں مارتا۔ لیکن سناٹے کے سوا وہاں کون تھا۔ جو مدد کو آتا۔ اس نے کبھی اندھیرا دیکھا نہ تھا۔ آج اندھیرا ہی اس کا ساتھی تھا۔ دیو چوبیس گھنٹے میں ایک بار پتھر ہٹاتا۔ تھوڑا کھانا اور پانی لٹکا دیتا اور پھر کنویں کے منہ پر پتھر سرکا دیتا دھیرے دھیرے بے نظیر بھوک پیاس بھی بھول گیا کبھی دل چاہا تو کچھ کھا لیا۔ ورنہ یوں ہی ڈال دیا۔ جب نکلنے کی کوئی امید نہ رہی تو وہ تقدیر پر بھروسہ کر کے چپ ہو رہا۔

یہاں کی داستان یہیں چھوڑو۔ اب بدر منیر کا حال سنو۔ جب کئی دن گزر گئے اور بے نظیر نہیں آیا تو بدر منیر کو فکر ہونے لگی۔ بے نظیر اب کیوں نہیں آتا۔ کیا پری کو یہاں آنے کی سن گن مل گئی۔ یا اس نے بے نظیر کو گھر جانے کی اجازت دے دی۔ لیکن وہ اتنی مہربان کیوں ہونے لگی۔ سنا ہے پریاں بہت سخت دل اور غصہ ور ہوتی ہیں۔ ہو نہ ہو اس کو یہاں آنے کی خبر مل گئی ہے۔ اور وہ اس کے غصے میں گرفتار ہے۔

بدر منیر دن رات انھیں خیالوں میں الجھی رہتی — اس کو زیادہ افسوس اس کا تھا کہ اگر وہ پری کے غصے میں گرفتار ہے تو اس کو میری وجہ سے سزا بھگتنی پڑ رہی ہے میں نے ناحق اسے روز روز آنے کو کہا۔ یہ سوچ سوچ کر وہ کچھ کھوئی کھوئی سی رہنے لگی۔

نجم النساء اس کی خاص سہیلی تھی۔ ایک دن بدر منیر نے اس سے پوچھا۔ "نجم النساء تم بتاؤ، بے نظیر کے نہ آنے کی کیا وجہ ہو سکتی ہے؟"

نجم النساء نے کہا۔ "کیا بتاؤں شہزادی، میری سمجھ میں بھی کچھ نہیں آتا۔ لیکن اتنا جانتی ہوں کہ رمتا جوگی اور بہتا پانی کسی کے میت[۱] نہیں ہوتے۔ ان کا کیا۔ آج یہاں کل کہاں کون جانتے۔"

"نہیں نجم النساء، وہ جوگی کہاں ہے۔ جوگی تو اپنے من[۲] کا موجی[۳] ہوتا ہے۔ وہ غریب تو پری کا قید ہے۔ وہ کہیں گیا نہیں ہے۔ اگر کہیں جاتا تو ہم لوگوں سے ملنے ضرور آتا۔ یوں یکایک غائب نہ ہوتا۔ اور اس ظالم نے بھلا اسے جانے ہی کب دیا ہوگا۔ میں نے سنا ہے نجمو، اللہ شیطان کا کان دور رکھے پریاں جسے پکڑ لیتی ہیں۔ زندہ نہیں چھوڑتیں "کوہ قاف" کہیں ہے۔ اسی میں قید کر دیتی ہیں اور پھر اسے موا[۴] سمجھیے یا پھر کسی دیو کے منہ میں گیا سمجھیے،" بدر منیر نے جواب دیا۔

"توبہ توبہ شہزادی، ایسی باتیں نہ کرو....."

---

۱ دوست　　۲ دل، خواہش
۳ آزاد　　۴ مردہ

نجم النساء نے بدرمنیر کے منہ پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ "خدا خیریت ہی رکھے۔ جس کا کوئی مددگار نہیں ہوتا خدا اس کی مدد کرتا ہے۔ اللہ نے چاہا تو وہ صحیح سالم پھر آئے گا۔ تم پریشان نہ ہو۔ یہ بندی آخر کس دن کام آئے گی۔ وہ پورب، پچھم، اتر، دکھن، آسمان، زمین جہاں کہیں ہوگا۔ ڈھونڈ لاؤں گی۔ تم ذرا بھی فکر نہ کرو۔"

"نجمو! تیرے منہ میں گھی شکر، مجھے پریشانی اس کی ہے کہ اگر اس کو کچھ ہو گیا تو اس کا گناہ میرے سر رہے گا۔ میں نے ہی اسے روز آنے کی دعوت دے کر مصیبت میں گرفتار کرایا۔ اللہ اس کی مدد کرے۔" بدرمنیر نے کہا۔

ایک رات بدرمنیر خواب میں کیا دیکھتی ہے کہ ایک بہت بڑا سا میدان ہے، بالکل چٹیل۔ انسان نہ حیوان، کربلا سا بیابان۔ بیچ میدان میں ایک کنواں ہے۔ کنویں کے منہ پر ہزاروں من وزنی پتھر دھرا ہے کنویں کے اندر سے آواز آرہی ہے نکالو! نکالو!!

اس خواب نے اس کی نیند اڑا دی۔ آنکھ کھلی تو کچھ نہ تھا۔ اپنے خواب کو سوچ کر وہ بہت گھبرائی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔ صبح ہو ہی رہی تھی۔ یہ خواب ذرا کے ذرا میں سارے محل میں پھیل گیا۔ مامائیں اور سہیلیاں دوڑی آئیں۔ ماماؤں نے تسلی دینی شروع کی۔

"بی بی میں واری جاؤں۔ خواب کا اتنا خیال نہیں کرتے۔ خواب کہیں سچے ہوتے ہیں۔ آپ نے کسی کتاب میں ایسی بات پڑھی ہوگی۔ وہی موئی خواب میں آگئی۔ کتابوں میں بھی لوگ جانے کیا الا بلا لکھ دیتے ہیں۔"

سہیلیوں نے کچھ ہنسی مذاق کی بات کر کے اس کا دل بہلانے کی کوشش کی۔ لیکن بدرمنیر کا دل نہ بہلا۔ اس کو اپنے خواب کے سچے ہونے کا یقین تھا۔ اس نے ماماؤں کو جانے کا حکم دیدیا۔ لیکن نجم النساء بیٹھی رہی۔ جب سب جا چکیں تو بدرمنیر نے اُسے اپنا سارا خواب سنایا۔

نجم النساء بھی یہ خواب سن کر بے چین ہو گئی۔ کہنے لگی۔

شہزادی، گھبراؤ نہیں۔ میں بے نظیر کی خبر لانے نکلتی ہوں۔ میں جب تک اسے نہ ڈھونڈ نکالوں گی منہ نہ دکھاؤں گی۔ جنگل میدان، کوہ بیابان، جہاں کہیں بھی وہ ہوگا میں اُسے آزاد کرا کے لاؤں گی۔ اگر میں لا سکی تو انعام لوں گی۔ اگر مر گئی تو سمجھنا تم پر صدقے گئی——"

"ابھی دیوانی ہوئی ہے۔ جس کا کوئی پتہ ٹھکانا نہیں اسے تو کھوجنے کہاں جائے گی۔ پتہ نہیں وہ میدان کہاں ہے۔ پھر جنوں اور پریوں کے بیچ میں پڑنا خطرے سے خالی نہیں۔ اللہ تیری پناہ۔ اگر تجھے کچھ ہو گیا تو میں کیوں کر جیوں گی؟ تو نہ جا۔ خدا اُس کی مدد کرے"

چھٹی داستان

جوگی بن کے نکلنا نجم النسا کا اور ملنا جنوں کے شہزادے فیروز شاہ کا

نجم النساء اپنی شہزادی کو بہت مانتی تھی۔ وہ آسمان کے تارے لانے کو کہتی تو شاید اس کے لیے وہ تیار ہو جاتی۔ وہ نہ مانی اور سفر کی تیاریاں شروع

کردیں۔

اس نے جوگی کا سوانگ بھرا۔ ہاتھ اور چہرے پر بھبھوت[1] ملی۔ بڑا سا گیروا جھول پہنا۔ کان کی لو میں بالے پہنے۔ گلے میں کنٹھی ڈالی سر پر گیروے کپڑے کی پگڑی باندھ کر بالوں کو چھپایا۔ کندھے پر بین[2] رکھی۔ بغل میں مرگ چھالا[3] دبایا۔ ایک ہاتھ میں مالا لی دوسرے میں کنڈلی۔ پاؤں میں کھڑاؤں ڈالی اور آنکھوں کو لال لال کرکے ہو بہو جوگی بن گئی۔

غرض وہ ہر طرح سج دھج کر گھر والوں سے رخصت ہوکر بدر منیر اور سہیلیوں سے رخصت ہونے گئی۔ اس روپ[4] میں سہیلیاں اسے پہچان نہ سکیں، لیکن جب اس کو بدر منیر سے باتیں کرتے دیکھا تو سمجھ گئیں۔

نجم النساء نے چلنے کی اجازت چاہی۔ بدر منیر کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے اس نے کہا "جس طرح پیٹھ دکھا کر جاتی ہو اسی طرح آکر منہ دکھانا۔ خدا تمھاری مدد کرے" اور سہیلیوں نے بھی اسے خدا حافظ کہا۔ پھر نجم النساء نے سب سے کہا سنا معاف کرایا اور ایک طرف کو نکل گئی۔

وہ جنگل جنگل، صحرا صحرا[5] بین بجاتی گھوم رہی تھی کہ شائد کوئی ایسا شخص نکل آئے جو بے نظیر کا حال بتائے۔ ایک رات ایک میدان میں اس کا ٹھہرنا ہوا۔ ہر طرف سفید ریت پھیلی ہوئی تھی چودھویں کا چاند کھلا ہوا تھا۔ نجم النساء ایک درخت کے نیچے بیٹھ گئی۔ جب ستالی تو کھلے آسمان کے نیچے اس نے اپنا مرگ چھالا بچھایا اور آلتی پالتی مار کے بین بجانے لگی۔ وہ بڑے جوش سے بین بجا رہی تھی۔ اس کی آواز پر درخت کھڑے سر دھن رہے تھے۔ میدان کا سناٹا، بہتی چاندی کی طرح چاندنی۔ بین کی آواز، ہلکی ہوا یہ سب مل کر عجیب لطف پیدا کر رہے تھے۔ لگ بھگ آدھی رات کا عمل ہوگا کہ ایک طرف سے بڑے زور کی سن سناہٹ کی آواز آنے لگی۔ جیسے کوئی بہت بڑا پرندہ پر مارتا چلا آرہا ہو۔ نجم النساء پہلے تو اس آواز سے گھبرائی لیکن وہ تو جان کی بازی لگائے بیٹھی تھی سنبھل گئی اور اسی جوش سے بین بجاتی رہی۔

ذرا دیر میں کیا دیکھتی ہے کہ جنوں کا ایک تخت آسمان سے اترا۔ اس پر ایک نوجوان جن بیٹھا تھا۔ وہ تخت سے اتر کر جوگی جی کے پاس پیر موڑ کر ادب سے بیٹھ گیا۔ جوگی جی بین بجاتے رہے۔ آخر تھک کے بین بند کردی۔ جن نے کہا۔

"بابا، آپ کا کہاں سے آنا ہوا۔ آپ پر کیا ایسی آپڑی جو اس صحرا میں آ بیٹھے؟"

"ہرے ہرے[1]، بچہ" جوگیوں کا کیا پوچھتے ہو۔ سبھے بھومی گوپال کی[2]۔ جہاں سانجھ[3] وہاں سویرا۔ تم کون ہو بچہ؟" جوگی جی نے پوچھا۔

---

۱ راکھ ۲ ایک باجہ
۳ ہرن کی کھال ۴ شکل
۵ وہ میدان جس میں درخت نہ ہوں

۱ اللہ ہی اللہ
۲ ساری زمین خدا کی
۳ شام

"بابا، میں جنوں کے بادشاہ کا بیٹا ہوں۔ میرا نام فیروز شاہ ہے۔ میں اس چاندنی اور ٹھنڈی ہوا کی سیر کو نکلا تھا کہ آپ کی بین کی آواز ہمیں یہاں کھینچ لائی۔ آپ کی بین میں بڑا درد ہے۔ بابا، آپ کچھ دُکھی معلوم ہوتے ہیں۔ یہاں میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں۔ اگر آپ مجھ پر دَیا کریں اور میرے گھر چلیں تو آپ کا جو حکم ہوگا اس کے لیے میں حاضر ہوں۔" جنوں کے شہزادے فیروز شاہ نے کہا۔

نجم النساء نے سوچا خطرہ ضرور ہے۔ لیکن کام انھیں لوگوں سے نکلے گا۔ اس نے کہا۔

"بچہ، ہرے ہرے۔ ہم لوگوں کو دھن دولت اور کوٹھا[1] اٹاری سے کیا لینا دینا۔ مگر جب تیری مرضی یہی ہے تو چل۔ ہرے ہرے۔"

دونوں تخت پر بیٹھے اور ذرا دیر میں پرستان جا پہنچے۔ فیروز شاہ جوگی کو لے محل میں باپ کے پاس جا پہنچا اور کہنے لگا۔

"ابا جان، میری آپ سے ایک درخواست ہے۔ یہ بڑے کمال کے جوگی ہیں۔ آپ ان کی بین اور باتیں سنیے۔ آپ بہت خوش ہوں گے۔"

شاہ جن راگ راگنی کا بہت شوقین تھا۔ اس نے خوش ہو کر جوگی جی کو اپنے پاس بٹھایا۔ اور کہا۔

"ہماری قسمت کہ آپ کے درشن ہوئے۔ آپ کے قدم ہمارے سروں پر۔ یہ محل آپ کا ہے۔"

"بابا تمھارا محل آباد رہے۔ میں اسے لے کر کیا کروں گا۔ ایک جھونپڑی ہمیں دیدو جس میں ہری کا بھجن کرتا رہوں۔ ہرے ہرے۔" جوگی نے کہا۔

ساتویں داستان

دیکھ لینا جنوں کے شہزادے کا جوگی جی کو اصلی روپ میں

دوسری رات جنوں کے بادشاہ نے پرستان کے گانے بجانے کے استادوں کی مجلس بلائی۔ سب نے اپنا اپنا کمال دکھلایا۔ آخر میں جوگی جی سے درخواست کی گئی کہ آپ کی بین کے ہم لوگ مشتاق ہیں۔ جوگی جی نے کہا۔

"بچہ، گانا بجانا میرا کام نہیں مطلب ہری کے نام سے۔ بین تو ایک بہانا ہے۔ میں کسی کی فرمائش پر نہیں بجاتا۔ لیکن اب میں آپ کا قیدی ہوں حکم ماننا ہی ہوگا۔"

جنوں کے بادشاہ نے کہا: "نہیں بابا، ایسی بات نہیں۔ ہم پر آپ نے مہربانی کی جو یہاں تک آئے آپ کی مرضی نہ ہو تو نہ بجائیے پھر کبھی سہی۔ لیکن یہ لوگ آپ کی بین سننے آئے ہیں اس لیے آپ کو تکلیف دینی چاہی۔"

آخر جوگی جی نے اپنی بین سنبھالی۔ وہ بڑے جوش میں بین بجا رہے تھے سننے والے بے حال ہو رہے تھے۔ سب کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے سب ہی جوگی جی کا لوہا مان گئے۔ بادشاہ تو اس قدر خوش ہوا

---

[1] بالاخانہ

کر وہ کہنے لگا۔

"بابا، میں آپ کا غلام ہوں۔ یہ راج پاٹ آپ کا ہے جس چیز کی ضرورت ہو حکم دیجیے۔ میں سب کچھ دینے کو تیار ہوں۔"

"بچے تمہارا محل بھرا رہے۔ ہمیں کسی سے کچھ لینا دینا نہیں۔ سمے[1] کی بات ہے۔ جو ہم یہاں ہیں۔ ورنہ ہم کہاں اور تم کہاں۔ ہرے ہرے" کہتے ہوئے جوگی جی اپنے کمرے کی طرف چلے گئے۔

یہ کمرہ نجم النساء کو جنوں کے بادشاہ نے رہنے کو دیا تھا۔ اس کمرے میں آکر اس کی عجیب حالت تھی ـــ دل کہتا۔ "جب بادشاہ تیری ہر خواہش پوری کرنے کو تیار ہے تو تو، اس سے اپنا مطلب کیوں نہیں کہتی۔ کیوں دیر کر رہی ہے" دماغ کہتا۔ "نجم النساء! تو بتیس دانتوں میں ایک زبان ہے۔ خبردار، جلدی نہ کرنا۔ دھیرج رکھ پھر دیکھ خدا کیا کرتا ہے۔"

جوگی جی روزانہ ایک گھنٹہ رات گئے جنوں کے بادشاہ کے دربار میں جاتے کچھ دیر ادھر اُدھر کی باتیں کرتے پھر اپنی بین کا کمال دکھلا کر پھر رات گئے اپنے کمرے میں چلے آتے۔

جنوں کے بادشاہ کا لڑکا فیروز شاہ برابر جوگی جی کی خدمت میں لگا رہتا۔ ایک صبح کو کیا ہوا کہ نجم النساء اپنے کمرے کا کواڑ بند کرنا بھول گئی۔ وہ آئینے کے سامنے کھڑی اپنے بال جھاڑ رہی تھی کہ اُدھر سے فیروز شاہ آ نکلا۔ پہلے تو وہ جھجکا پھر چپ چاپ کھڑا دیکھا کیا۔ نجم النساء جو پلٹی تو اس نے فیروز شاہ کو کھڑا دیکھا۔ اس کے ہوش و حواس

جاتے رہے۔

فیروز شاہ کمرے میں داخل ہوا اور ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ وہ بڑا نیک دل شہزادہ تھا۔ اس نے نجم النساء کو تسلی دی اور وعدہ کیا کہ یہ راز کسی پر نہ کھولے گا۔ لیکن یہ بتاؤ کہ تم نے اتنا خطرناک راستہ کیوں اختیار کیا؟

فیروز شاہ کے وعدے پر نجم النساء کو تسلی ہوئی۔ اس نے کہنا شروع کیا۔

"ایک ملک ہے سراندیپ۔ وہاں کے بادشاہ کا نام مسعود شاہ ہے۔ میں اس کے وزیر کی لڑکی ہوں۔ میرا نام نجم النساء ہے بادشاہ کی ایک لڑکی ہے، اس کا نام بدر منیر ہے۔ میں بدر منیر کی سہیلی ہوں۔ میری سہیلی کا ایک دوست ہے، بے نظیر۔ یہ بڑا دکھیارا اور آفتوں کا مارا ہے۔

شہزادہ بے نظیر بھی ماں باپ کا اکیلا ہے۔ وہ ایک رات محل کی چھت پر سو رہا تھا کہ ایک پری اسے پرستان اڑا لے گئی شہزادے کا وہاں دل نہ لگا۔ پری نے اس کو کاٹھ کا ایک گھوڑا دیا۔ وہ روزانہ اُس گھوڑے سے اِدھر اُدھر کی سیر کرتا۔

وہ گھومتا پھرتا ایک دن بدر منیر کے باغ میں اترا۔ ہم لوگوں سے ملاقات ہوئی۔ پھر دوستی ہوگئی۔ ایک دن وہ نہ آیا۔ دو دن ہوئے۔ تیسرا دن بھی گزرا وہ نہ آیا۔ ایک ہفتہ بیت گیا وہ نہ آیا۔ اب بدر منیر بہت پریشان ہوئی۔ اس کی پریشانی سے ہم لوگ پریشان ہوئے..... "

"یعنی، آنے والے کی خوشی۔ اس میں پریشانی کی کیا بات ہوئی" فیروز شاہ بیچ میں بول اٹھا۔

باقی صفحہ ۴۳

[1] وقت

جناب سعید احمد قاسمی

میٹھی ہماری بولی ہے

ہم بچوں کی ایک زباں ہے
ہندو مسلم سکھ عیسائی
دنیا کی باتوں سے ہم کو
خوف کسی سے کیوں ہم کھائیں
روز ہماری عید، دیوالی

ایک ہماری بولی ہے
ایک ہماری ٹولی ہے
آج کوئی سردکار نہیں
ہم پر کچھ ادھیکار نہیں
روز ہماری ہولی ہے!
ہم بچوں کی ایک زباں ہے

بھید بھاؤ نہ ہم نے پالا
ایک کے ہاتھ میں گیتا قرآن
ایک زبان ہماری ہے

پنڈت ہویا کوئی لالا
کسی کے موتیوں کی مالا
ایک ہماری بولی ہے!
ہم بچوں کی ....!

دیش کی ہم تقدیر بنیں گے
کل کر جواں ہم ہی تو بنیں گے
ہم بچوں نے کھائی قسمیں

ہم سے روشن دیش کی ریکھا!
ہوگا پورا خواب جو دیکھا
ایک ہماری ٹولی ہے!
ہم بچوں کی ایک زباں ہے

ہم ہی کریں گے دیش کی رکشا
وقت پڑا تو جان بھی دیں گے
پاس ہمارے بم تو نہیں ہے

امن کے رکھوالے بن کے
ہم بھی [illegible] بن کے
بس اک میٹھی بولی ہے!

ہم بچوں کی ایک زباں ہے
ہندو مسلم سکھ عیسائی

ایک ہماری بولی ہے
ایک ہماری ٹولی ہے!

اکرام احمد، ٹیچرس کالج، جامعہ

سائنس کی دُنیا

نوٹ:۔ اس کا ایک حصہ آل انڈیا ریڈیو سے نشر کیا جا چکا ہے

محکمہ ڈاک و تار نے ۱۲ر دسمبر ۱۹۷۴ء کو وائرلیس ٹیلیگرافی کے موجد مارکونی کی سوویں سالگرہ پر ۲ روپے کا ایک ٹکٹ جاری کیا ہے

گلیلمو مارکونی Guglielmo Marconi کا نام سائنس کی دنیا میں تعارف کا محتاج نہیں ہے۔ ان کی پیدائش ۲۵ر اپریل ۱۸۷۴ء کو اٹلی میں ہوئی۔ انھوں نے باقاعدہ کسی یونیورسٹی میں داخلہ نہیں لیا۔ لیکن اٹلی کے مشہور پروفیسروں سے انھوں نے فزکس کی تعلیم حاصل کی۔ بیس سال کی عمر میں انھوں نے برقی مقناطیسی لہروں کا مطالعہ شروع کیا۔ جب ان کے ذہن میں یہ بات آئی کہ ان لہروں کو خبریں بھیجنے کے کام میں لایا جا سکتا ہے۔ اس سلسلے میں انھوں نے کئی قسم کے ریسیور اور ٹرانسمیٹر بنائے اور بالآخر ۱۸۹۵ء میں وہ چند میٹر کے فاصلے تک سگنل بھیجنے میں کامیاب ہو گئے۔ سن ۱۸۹۶ء میں انھوں نے ۹ میل کے فاصلے پر سگنل بھیجنے میں کامیابی حاصل کر لی۔ ۱۹ر صدی کے آخر تک برطانوی اور اٹلی کی بحری افواج نے وائرلیس ٹیلیگرافی کام کا نظام اپنا لیا۔ تجارتی جہازوں کے بیڑے نے بھی طوفانی موسم میں مدد کے لیے اس کو استعمال کرنا شروع کر دیا۔

۱۲ر دسمبر ۱۹۰۱ء کو انھوں نے یہ ثابت کیا کہ آواز کی لہروں کو ریڈیو لہروں کے ذریعہ دور دراز مقام تک بھیجا جا سکتا ہے۔ یہ گویا ریڈیو کی ایجاد تھی۔ ۱۹۰۴ء میں انھوں نے اس کا پہلا نمونہ عوام کے سامنے پیش کیا تھا۔ ۱۹۰۹ء میں ان کو فزکس میں نوبل پرائز عطا کیا گیا۔ انھوں نے اپنے تجربات جاری رکھے۔ شارٹ ویو ریڈیو کے ذریعہ پیغامات بھیجنے کا طریقہ دریافت کیا گیا۔ ریڈیو والو کے موجد ڈاکٹر فلیمنگ اور دیگر کئی سائنس دانوں کی ایجاد سے فائدہ اٹھا کر انھوں نے اٹلانٹک کے پار ہزاروں میل کے فاصلے تک وائرلیس کے ذریعہ خبریں بھیج کر اس نظام کو مقبولِ عام بنایا۔ انھیں کے کارناموں کے سبب ۱۹۲۲ء میں بی۔ بی۔ سی وجود میں آئی۔ اسی سال مارکونی نے مائیکرو ویو ٹیلی فون (Micro vave Telphone) نظام کی ابتدا کی۔ ۱۹۳۵ء میں انھوں نے ریڈار کے اصول کا تجربہ بھی پیش کیا۔

۲۰ر جولائی ۱۹۳۷ء کو اس عظیم سائنس دان کا روم میں انتقال ہوا۔ پوری دنیا نے ان کے ماتم میں دو منٹ کے لیے وائرلیس سروس روک کر خراجِ عقیدت پیش کیا۔

۲-۱ امریکہ کا پائیونیر گیارہ (Pionaer 11) نامی مصنوعی سیارچہ مشتری (Jupiter) سیارے کے قریب پہنچ گیا ہے۔ اس نے ۴۱،۰۰۰ کلو میٹر کے فاصلے سے وہاں کے فوٹو بھیجنے شروع کر دیے ہیں۔ یہ پہلا موقع ہے

Jupiter (مشتری) کی شعاعی پٹی کا مطالعہ کسی سیارچے [?] ۔ اس سیارچے نے جو فوٹو زمین کو بھیجے ہیں وہ نارنجی رنگ کے ہیں۔ سائنس دان ان تصاویر کے تجزیے میں مصروف ہیں۔ خیال کیا جاتا ہے کہ نارنجی رنگ (Organical Compound) عضوی مرکبات کی موجودگی کے سبب ہے۔

ایسے عضوی مرکب زمین پر چار ارب سال پہلے موجود تھے اور انھیں کی وجہ سے زمین پر زندگی وجود میں آئی۔

ان مرکبات کے نام ہیں:

ایمونیا میتھین۔ اور پانی۔ اگر نارنجی رنگ کی وجہ آرگینک مرکبات ہیں۔ تو اس بات کے امکان ہیں کہ (Jupiter) مشتری پر زندگی کی شکل موجود ہو۔

Pioneer کی پرواز جاری ہے۔ پروگرام کے مطابق Pioneer ، ۵، ستمبر ۱۹۷۹ء کو دوسرے سیارے زحل (Saturn) پر پہنچ جائے گا۔

۳۔ اِدھر روسی خلائی جہاز سویوز 16 کا تجربہ کامیاب رہا ہے۔ خلابازوں نے طبی اور حیاتی کئی قسم کے تجربات کیے۔ آپ کو یاد ہوگا۔ Soyuz—16 کی پرواز کا اہم مقصد ایسے نظام کی جانچ کرنا تھا۔ جس کے ذریعہ خلائی جہازوں کو آپس میں جوڑا جاسکے۔

اگلے سال روسی سویوز کو ایک دوسرے سے خلا میں جاکر ملنا ہے۔ اور دونوں جہازوں کے خلاباز ایک دوسرے کے جہاز میں جائیں گے۔ یہ پہلا موقع ہے جب روس اور امریکہ مل کر خلائی پروگرام تشکیل دے رہے ہیں۔

۴۔ آج ہر چیز کی کمی محسوس ہورہی ہے۔ پوری دنیا میں تیل کی کمی ہے کوئلے کی کمی ہے۔ بعض ملکوں میں خام اشیاء کی کمی ہے۔ ایسے بھی ملک ہیں جہاں پینے کے پانی کی کمی ہے کویت اور کئی ملکوں میں سمندر کے پانی کو ابال کر اور بھاپ بناکر پینے کے قابل بنایا جاتا ہے۔ یورپ میں صاف پانی کی آج تو کمی نہیں ہے۔ لیکن مستقبل میں جیسے جیسے کارخانوں کی تعداد بڑھتی جائے گی پانی کی کمی کا مسئلہ سنگین ہوتا جائے گا۔

اس لیے سائنس دان اسی دریافت میں مصروف ہیں کہ صاف پانی کس طرح سستے دام مل سکتا ہے۔ ایک تجویز یہ ہے کہ قطب شمالی اور قطب جنوبی کے برف کے خزانوں کو ایٹمی توانائی سے پگھلاکر وہاں سے صاف پانی کو پوری دنیا میں نلوں کے ذریعہ تقسیم کیا جائے۔ جس وقت اس پر عمل ہوسکےگا تو دنیا کے ریگستانی علاقے بھی سرسبز اور شاداب ہوجائیںگے۔

ہندوستان میں بھی کچھ ایسی ہی لائنوں پر کام شروع ہورہا ہے۔ شمالی ہند میں پینے کے اور آب پاشی کے لیے پانی کی کمی دور کرنے کے لیے جیولوجی کل سروے آف انڈیا (Geological Servay of India) کے سامنے ایک منصوبہ ہے۔ اس کے مطابق ہماچل پردیش کے کنور ضلع میں پائے جانے والے گیرا نامی گلیشیر کو پگھلایا جائے گا۔ اور اس سے حاصل شدہ پانی کو بھاکڑہ ڈیم میں دریائے ستلج کے ذریعہ پہنچایا جائے گا۔ اس وقت سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ ...۲ فٹ کی بلندی پر گلیشیر کنٹرول اسٹیشن کیسے بنایا جائے۔ اتنی اونچائی اور سردی میں رہنا اور کام کرنا تقریباً ناممکن ہے۔ دوسرا مسئلہ گلیشیر کو اس طرح پگھلانے کا ہے کہ ضرورت کے مطابق پانی مل سکے۔ زیادہ پگھل جانے پر سیلاب کا خطرہ ہے۔ امید ہے کہ ہمارے سائنس داں سورج اور زمین کی اندرونی حرارت کو استعمال کرکے اس گتھی کو سلجھالیں گے، جس روز گلیشیر کو پگھلانے کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ اسی روز غذا اور بجلی کا مسئلہ بھی شاید حل ہوجائے۔

۵۔ جدید سائنس اور ٹیکنولوجی نے جہاں ترقی کے عروج پر پہنچایا ہے۔ وہاں آلودگی (Pollution) کا مسئلہ بھی پیدا کردیا ہے۔ شہروں میں اور کارخانوں کے علاقوں میں ہوا کی گندگی زندگی کے لیے خطرہ بن گئی ہے۔

ہم روز جو کچھ کھاتے پیتے ہیں اس میں سائنس کے ذریعہ ہوا کی مقدار بہت اہم ہے۔ اس میں تقریباً فیصد مقدار ہوا کی ہوتی ہے۔ جس کا وزن فی دن ۱۶ کلوگرام ہوتا

ہے۔ سانس کا عمل ہر دم ہوتا رہتا ہے۔ ہم ایک دن میں ۰۰۰،۲۲ مرتبہ سانس لیتے ہیں۔ ہوا میں ملی دھول اور زہریلی گیس انسان اور پودوں دونوں کو نقصان پہنچاتی ہے۔

۶۔ دھول کے ذرات سے کھانسی، زکام اور الرجی بیماریاں ہوتی ہیں۔ چار بڑے شہروں میں سب سے زیادہ دھول دہلی میں ہوتی ہے۔ یہاں ایک مکعب میٹر جگہ میں ۷۰۰ مائیکروگرام دھول پائی جاتی ہے۔ جبکہ مغربی ملکوں کے شہروں میں یہ فی مکعب میٹر ۱۵۰ مائیکروگرام سے زیادہ نہیں پائی جاتی ہے۔ جن شہروں کے قریب پاور ہاؤس، پیٹرولیم کے کارخانے اور گندھک کے تیزاب کے کارخانے ہیں۔ وہاں کے ماحول میں سلفر ڈائی آکسائڈ گیس بہت پائی جاتی ہے۔ بمبئی اور کلکتے میں سلفر ڈائی آکسائڈ گیس کی مقدار بہت پائی جاتی ہے۔ خصوصاً شام کے وقت اس میں بہت اضافہ ہو جاتا ہے۔ اسی گیس سے دم گھٹنا، گلے میں خراش، آنکھوں میں جلن اور سانس کی دوسری بیماریاں پیدا ہوتی ہیں۔ بمبئی میں سب سے زیادہ کثافت بارک، باندرا، کلکٹر کالونی، چیمبور، چنچ پوکلی، دیونار، گھاٹ کوپر، کولی واڑہ، ماہول، منشگا پریل اور ورلی میں ناپی گئی ہے۔

ہندوستان میں گو موٹروں کی تعداد مغربی ممالک سے بہت کم ہے لیکن عموماً ان کے انجن خراب حالت میں ہوتے ہیں جس کی وجہ سے شور بہت ہوتا ہے اور دھواں پیدا ہوتا ہے۔ دھویں کے علاوہ جو گیس یہ خارج کرتے ہیں وہ کاربن مونو آکسائڈ ہے۔ امریکہ میں ایسی گاڑی جس سے ۵،۱ فی صدی سے زائد کاربن مونو آکسائڈ گیس خارج ہو ناقص قرار دی جاتی ہے۔ ہمارے یہاں عموماً ایک گاڑی ۵،۵ تا ۱۰ فی صدی تک یہ گیس خارج کرتی ہے۔ اکثر سننے میں آتا ہے کہ بند کمرے میں انگیٹھی جلائی اور موت واقع ہو گئی۔ یہ اسی گیس کا کرشمہ ہے یہ ایک زہریلی گیس ہے۔ بڑے شہروں کی ہوا میں اس کی مقدار دن بدن بڑھتی جا رہی ہے۔

گو حکومت اور پبلک ہیلتھ انجینیر ہوا کی کثافت کو کم کرنے کی کوشش میں معروف ہیں۔ لیکن یہ جب تک ممکن نہیں جب تک عوام اس سلسلے میں احتیاط نہ رکھیں، ایسی انجمنیں بنائیں جن کا کام لوگوں کو ایسی تعلیم دینا ہو جس سے فضا صاف ستھری رہ سکے۔

۷۔ توانائی کے اس بحرانی دور میں پیٹرول کے استعمال کو کم کرنے کے سلسلے میں مختلف تجربات کیے جا رہے ہیں۔ سان فرانسسکو سے ایک خبر ملی ہے کہ وہاں ایک ایسی موٹر سائیکل ایجاد کی گئی ہے۔ جس کو ہوا سے قوت ملتی ہے۔ اصل میں اس موٹر سائیکل میں دو بڑی بڑی بیٹریاں ہیں اور ان بیٹریوں کو ہر روز رات کو ہوائی پنکھے کی مدد سے چارج کر لیا جاتا ہے۔ یہ موٹر سائیکل ۴۰ کلومیٹر فی گھنٹہ کی رفتار سے بغیر کسی دشواری کے چلائی جا سکتی ہے۔ اسی قسم کی ایک خبر جرمنی سے بھی ملی ہے۔ وہاں بیٹری بسیں بنائی گئی ہیں۔ ان بسوں سے نہ دھواں نکلتا ہے نہ شور پیدا ہوتا ہے اور نہ ان کے لیے سڑکوں پر تار لگانے کی ضرورت ہے۔

ہندوستان میں بھی بیٹری سے چلنے والی گاڑیاں بنانے کی طرف توجہ دی جا رہی ہے۔ سائنس اور ٹیکنالوجی کے وزیر جناب سی۔ اے۔ پائی نے ایسی گاڑیاں بنانے پر زور دیا ہے۔ انجینیروں کا خیال ہے کہ ایسی گاڑیاں ہندوستان میں بنائی جا سکتی ہیں۔ چنانچہ Austin A-40 کو بیٹری گاڑی میں تبدیل کر کے تجربہ شروع کر دیا گیا ہے۔ اگر یہ گاڑیاں بن گئیں تو دھویں اور دوسری زہریلی گیسوں سے ہوا پاک ہو جائے گی۔

جناب محمد امین

ایتھوپیا کی سرزمین سے:

کہانی نمبر ۸

عدی نفاس کا ہیرو

ایری ٹریا کے صوبے میں ایک گانوئں ہے۔ اس کا نام عدی نفاس ہے۔ اس گانوئں سے ایک دن بارہ آدمی ایک ساتھ آٹا پسانے کے لیے قصبہ مائی عدی گا کی طرف چلے۔ وہاں پہنچنے کے بعد جلدی جلدی ان لوگوں نے اپنا کام ختم کیا اور گھر کی طرف لوٹ پڑے۔ وادی میں سے ہوکر لؤ فوربیا کے جنگل سے وہ گزرے۔ آٹے کی بوریاں ان کے کندھوں پر۔ معاً ایک ساتھی کو خیال آیا ذرا گن کر دیکھوں سب ساتھ ہیں یا نہیں؟ اس نے آواز دی کر رُک جاؤ۔ پھر اس نے گنا۔ اپنے آپ کو بھول کر اس نے گنا۔ کہ کل گیارہ آدمی ہیں۔

"خبردار کوتو" اس نے چیختے ہوئے کہا "کوئی کھو گیا ہے" دوسرے آدمی نے پوچھا۔ "کون کھو گیا؟"

"تمھیں گن کر دیکھو" پہلے آدمی نے کہا۔ دوسرے نے بھی گنا اور اس نے بھی اپنے آپ کو شامل نہیں کیا۔

"تم ٹھیک کہتے ہو۔ ہم کل گیارہ ہی آدمی ہیں۔ کوئی واقعی کھو گیا" اس نے کہا۔

تیسرے آدمی نے گنا۔ اس نے بھی کہ گیارہ ہی آدمی لائن میں کھڑے ہیں۔

"اوہ!" اس نے چیختے ہوئے کہا "ہم میں سے کوئی شاید بچھڑ گیا تھا اور اسے چیتے نے دبوچ لیا"

بارہ کے بارہ دیہاتیوں کو بڑا غم اور فکر کہ ان کے ساتھی کو چیتا نگل گیا۔ بادل نخواستہ وہ عدی نفاس کی طرف روانہ ہوئے۔ راستے میں برابر ان کو فکر اور پریشانی کہ مفت میں کسی کی جان چلی گئی۔

"ہم لوگوں نے اس کا خیال نہیں رکھا" ایک نے لاپروائی کی طرف اشارہ کیا۔

"ہاں ہمیں دیکھتے رہنا چاہیے تھا۔ کہ وہ پیچھے نہ رہ جاتا۔ بے چارہ کو خواہ مخواہ چیتے نے پکڑ لیا" دوسرے نے اپنی رائے ظاہر کی۔

"معلوم ہوتا ہے کہ چیتا بڑا زبردست تھا۔ تیسرے نے بات بنائی۔

"بڑا ہی نہیں بلکہ وہ خوفناک تھا اور شاید بڑا ہی چالاک اور شاطر تھا" چوتھے نے کہا۔

اور ہاں دیکھو تو! بے چارہ بہتا تھا لیکن اس نے کیسا مقابلہ کیا۔" پانچویں نے کہا۔ "وہ لڑا کو جوان تھا۔"

"ہمارے سارے علاقے میں کوئی اتنا بہادر نہیں ہوگا۔" چھٹے نے کہا۔ "اس پر خدا کبھی خوف طاری نہیں ہوا۔"

"اس کی بیوی بے چاری بیوہ ہوگئی۔ جب ہم اسے بتائیں گے کہ چیتوں نے تمہارے شوہر کو کھا لیا تو بھلا اس کا کیا حال ہوگا۔ ساتویں نے کہا۔

"بے چارے کا گھر تباہ ہو جائے گا اور ان پر پہلے ہی سے کیا کم مصیبت تھی،" آٹھویں نے ہمدردانہ لہجہ میں کہا۔

"وہ صرف بہادر نہیں تھا بلکہ سخاوت اور شرافت میں بھی اس کا کوئی جواب نہیں تھا۔" نویں دیہاتی نے کہا۔

اس طرح وہ اپنے کھوئے ہوئے ساتھی کا ماتم کرتے رہے۔ راستے بھر وہ پریشان اور فکرمند رہے آخرش وہ عدی نفاس پہنچ گئے۔ گانوں میں داخل ہوتے ہی سب کے سب ہائے ہائے کرکے اپنے سینے پیٹنے لگے۔ چیخنا چلانا سن کر گانوں کے لوگ دوڑ پڑے اور پوچھنے لگے کہ کیا معاملہ ہے۔

"کیا بتائیں کیا ہوا۔ مائی عدیگا سے واپس آرہے تھے کہ ایک سانحہ ہوگیا۔" آدمیوں نے کہا۔ پھر ان لوگوں نے گڑھ کر کہانی سنائی کہ ہمارے ساتھی پر چیتا جھپٹ پڑا تھا۔ وہ بہادری سے لڑا لیکن بے چارہ جان گنوا بیٹھا۔

یہ خبر سنسنی خیز تھی۔ منٹوں میں سارے گانوں میں پھیل گئی۔ ایک ہل چل سی مچ گئی رونا دھونا اور شور شرابا بپا ہوگیا۔ چھوٹے بڑے، مرد عورت پریشان

غرضکہ سارے گانوں میں ایک کہرام سا مچ گیا۔

اسی دوران ایک چھوکری اتفاق سے اس جگہ پہنچ گئی جہاں ان آدمیوں نے اپنی اپنی آٹے کی بوریاں زمین پر رکھ رکھی تھیں۔ اس نے ان بوریوں کو گنا۔ ان کی تعداد بارہ تھی "ماں" اس نے آواز دی "یہاں بوریاں تو کل بارہ ہیں۔"

"بیٹا تنگ نہ کرو۔ اس کی ماں نے جواب دیا۔ "بے چارہ شریف آدمی مر گیا۔" یہ کہہ کر وہ باتوں میں مصروف ہوگئی۔ "ماں" لڑکی نے پھر پکارا "دیکھو نا جب آٹے کی بوریاں ہیں تو آدمی بھی بارہ ہونے چاہئیں ماں نے گنا "بوریاں بارہ ہیں اس لیے آدمی بھی بارہ ہونے چاہئیں۔" وہ چیخ پڑی۔

گانوں کا سردار یعنی مکھیا بلایا گیا۔ اس نے خود ایک ایک کرکے آدمیوں کو گنا جو مائی عدیگا سے لوٹے تھے۔ "یہ تو بارہ ہیں۔" اس نے باآواز بلند کہا "معلوم ہوتا ہے کہ کھویا ہوا آدمی واپس آگیا۔"

سارے گانوں میں خوشی کی لہر دوڑ گئی "وہ کتنا بہادر تھا۔ چیتوں سے لڑ بھڑ کر وہ لوٹ آیا۔" "ایک مسافر نے کہا۔" وہ کتنا تھا اس کے باوجود اس نے چیتوں کو ختم کر دیا، دوسرے نے فخر سے کہا۔

"ہماری قسمت کتنی اچھی ہے کہ ایسا ہیرو یعنی بہادر نڈر انسان ہمارے گانوں میں رہتا ہے۔" اس طرح گانوں میں دعوت ہوئی جشن منایا گیا۔ ناچ اور گانا ہوا۔ اس کے بعد سالہا سال تک گانوں میں یہ کہانی مشہور رہی۔ اس کو دہرا کر اور یاد کرکے ہر ایک فخر کرتا تھا اور بہادری کے جوانوں کو بتایا جاتا تھا کہ اس بہادر کی وجہ سے گانوں کا نام کتنا اونچا ہے۔

جناب محمد شفیع الدین نیّر

ایک کار آمد تقریر

(بمقام فلاحِ دارین ہائر سکنڈری اسکول مراد آباد)

بزرگو اور دوستو!

میں آپ کا ممنون ہوں کہ آپ نے اپنے ادارے کی تقریبات میں شرکت کی دعوت دی اور خاص مقابلے کے مشاعرے کی صدارت کی خدمت تفویض فرماکر میری عزّت افزائی فرمائی۔

اس مقابلے اور مشاعرے کا تعلق اُس برگزیدہ ذات سے ہے جو جگرؔ کے شہرہ آفاق تخلص سے مشہور ہے۔ اس لیے اس تقریب کی اہمیت کا تقاضا یہ تھا کہ حضراتِ شعرا میں سے کسی بزرگ کو اس اعزاز کے لیے منتخب کیا جاتا۔ میں تو محض تعمیل ارشاد میں یہ سوچ کر حاضر ہو گیا ہوں کہ کیا عجب ہے کہ اُردو زبان اور بچوں کی تعلیمی ناچیز خدمات کی وجہ سے آپ کو میری حوصلہ افزائی منظور ہو۔

یہ مشاعرہ حضرت جگرؔ مراد آبادی کی یاد میں ہر سال منعقد ہوتا ہے اور اسکولوں کی اُونچی جماعتوں کے طلباءُ اور طالبات کو دعوت دی جاتی ہے کہ وہ اِس شعر گوئی اور شعر خوانی کی اس تقریب میں شریک ہوں۔ اس مقابلے کی دعوت کا مقصد یہ ہے کہ طلباء اور طالبات صلاحیتوں پر نظر ڈالیں اور اگر فطرت نے شعر و شاعری کا شعور اُن کو ودیعت کیا ہے تو وہ منظرِ عام پر آجائے، اور ان کی آئندہ زندگی میں یہ شعور ملک و ملّت کی خدمت کا ذریعہ بن سکے۔

جناب عتیق احمد صاحب نے جب اس ادارے اور اس کی مختلف جہتی خدمات کا تذکرہ کیا تو مجھے کچھ ایسا محسوس ہوا کہ اس ادارے کے سربراہ اور کارپرداز اشاعتِ تعلیم کے سلسلے میں مختلف النوع شعبوں کی تنظیم کر چکے ہیں اور اپنی خدمات کے دائرے کو وسیع کرنا چاہتے ہیں۔ اس میں ہماری بچیوں اور بہنوں کی تعلیم بھی شامل ہے تو مجھے اس اِدارے کی سرگرمیوں کو بچشم خود دیکھنے کا شوق پیدا ہوا۔ اور میں تعمیل ارشاد میں بطیب خاطر آمادہ ہو گیا تعلیم کا سلسلہ ایسا ہے جس کی ضرورت اور افادیت سے انکار نہیں۔ اس لیے میں اظہار خیال کے اس موقع کو غنیمت سمجھ کر مختصر طور پر چند امور آپ کی خدمت میں پیش کرنے کی اجازت چاہتا ہوں۔

اسیر جمع ہیں احباب حالِ دل کہہ لے
پھر التفاتِ دلِ دوستاں رہے نہ رہے

جب سے ہمارا ملک آزاد ہوا ہے۔ تعلیم کا دائرہ بہت وسیع ہو گیا ہے۔ اور اپنے رجحان کے مطابق مناسب اور کار آمد تعلیم سے فراغت حاصل کر لینے کے بعد زندگی

کو بہتر بنانے اور کسی مفید شغل میں لگے رہنے کے بے شمار مواقع پیدا ہو گئے ہیں۔ یوں تو ملک کے ہر فرد کے لیے تعلیم ضروری ہے۔ لیکن خاص کر مسلمانوں کی ہر جہتی تعلیم و تربیت کی ضرورت زیادہ ہے۔ اس لیے دوسرے فرقوں کے مقابلے میں انھیں زیادہ محنت کا عادی بننا ضروری ہے۔ مسلمان بچوں کو دنیا اور دین دونوں میدان سر کرنے ہیں۔ اس لیے ابتدائی دینی ضروری تعلیم کے بعد اتنا وقت انھیں ضرور بچانا ہے کہ آرٹ کی تعلیم ہو یا سائنس کی اگر کسی مقابلے میں وہ شریک ہونا چاہیں تو ہمت اور معلومات کی کمی اُن کے راستے میں حائل نہ ہو۔

ضرورت یہ ہے کہ زمانہ اور ملک کی روش سے بچے اور ان کے سرپرست بخوبی واقف ہوں اور ان کی نظر میں وہ سب تقاضے رہیں جن کا نظر انداز کرنا گویا اپنے پاؤں پر آپ کلہاڑی مارنا ہے۔

تعلیم کی طرف آپ کی توجہ ہے ہی۔ یہ بھی سوچ لیجیے کہ ثانوی تعلیم کی تکمیل کے بعد جس تعلیمی معیار کے نوجوان آجکل عام طور پر نکل رہے ہیں۔ کیا آپ اُن کی تعلیم اور تربیت سے مطمئن ہیں اگر مطمئن ہیں تو خیر، اگر مطمئن نہیں ہیں تو اچھے نتائج حاصل کرنے کے لیے ثانوی تعلیم کے علاوہ ہمیں ابتدائی تعلیم پر بھی غیر معمولی توجہ کرنی پڑے گی۔ ثانوی تعلیم کے بعد ہر طالب علم میں اتنی استعداد ہو کہ وہ اپنی آئندہ زندگی کے بارے میں کچھ نہ کچھ فیصلہ کر سکے۔ اس تعلیم میں بچوں کے ساتھ بچیوں کی بھی تعلیم و تربیت شامل ہے۔ اگر اس مدت میں کچھ اس قسم کا انتظام بھی ہو سکے کہ لڑکا ہو یا لڑکی کم سے کم کوئی ایک مفید اور کارآمد ہنر بھی اس معیار کا سیکھ لے کہ اپنی زندگی میں اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے کے قابل ہو جائے۔ ایسا ہو تو آپ کی کوششیں ایسے طلباء اور طالبات ہی کے لیے نہیں۔ بلکہ ملک و قوم کی بہتری کے لیے بھی خدا کی رحمت ثابت ہو سکتی ہیں۔

ہماری کوشش یہ بھی ہو کہ اس تعلیمی مدت کو طلباء ہوں یا طالبات صرف علم و ہنر کی تحصیل میں صرف کریں۔ اور خاص کر ثانوی تعلیم کی منزل تک کوئی تحریک اُن کی تعلیمی اور تربیتی مشاغل میں رخنہ انداز نہ ہونے پائے۔

یہ بات اُسی وقت ممکن ہے کہ اُستاد ہوں یا اُستانیاں وہ بھی قدرے کچھ ایثار سے کام لیں۔ زندگی کی ضروریات کا مہیا ہونا تو بہر حال ضروری ہے مطلب یہ ہے کہ ان ضرورتوں کو قومی بھلائی کے خیال سے قدرے گھٹایا بھی جا سکتا ہے۔ میرا مدعا بس یہ ہے کہ یہ ضرورتیں بچوں کی مسلسل تعلیم و تربیت میں حارج نہ ہوں اور بچے ان کی ہمدردانہ سرپرستی مربیانہ نگرانی سے اس امر کا بخوبی احساس کرلیں کہ پڑھنے لکھنے کے لیے پڑھنا لکھنا ضروری شرط ہے۔ اس میں ہر طالب علم اور ہر طالبہ کی اپنی کوشش اور محنت کا دخل ہونا چاہیے۔ محنت میں کمی کرنا، بزرگوں اور سرپرستوں کی سفارش پر تکیہ کرنا۔ استادوں کی مہربانی سے ناجائز فائدہ اٹھانا یا امتحان میں نقل کرنے تک پر اتر آنا۔ یہ باتیں نہایت ہی نقصان دہ ہیں۔ ترقی کا میدان کھلا ہوا ہے۔ علم و ہنر کی گیند حرکت میں ہے۔ ضرورت ہے کہ ترقی کے آرزو مند میدان میں آئیں اور اپنے بازوؤں کے بل اور اپنی جسمانی کاوش کے بوتے پر اس گیند کو قابو میں لا کر مقصد کے گول تک پہنچا دیں۔

[illegible] کی کافی مناقع نہیں فرماتا۔ اور جتنی سعی [illegible] اس کا اتنا ہی اجر ہمیں ضرور مل جاتا ہے۔

مشاعرے کے سلسلے میں میں نے جناب عتیق احمد صاحب کی خدمت میں یہ تجویز پیش کی تھی کہ مصرع طرح پر غزلیں لکھوانے کی جگہ اگر ادارہ طلبا عزے مختلف مناسب موضوعات پر نظمیں لکھوائے تو ذہنی اور تعلیمی اعتبار سے یہ بات زیادہ نتیجہ خیز ہوگی۔ غزل گوئی کا بھی ہمارے ادب میں ایک خاص مقام ہے۔ تاہم نظم کی افادیت سے بھی انکار ممکن نہیں ہم دیکھتے ہیں کہ خود جگر مرحوم نے اپنی پایانِ عمر میں نظم کی ضرورت کو محسوس فرمایا۔ اور ایسی موثر نظمیں لکھیں کہ یہ نظمیں اُن کی غزلوں سے کم اہمیت نہیں رکھتیں۔ اگر آپ کو میری یہ تجویز معقول معلوم ہو تو آئندہ اس قسم کے مقابلوں کے لیے اس پر غور فرمائیں۔

مقابلہ شروع ہونے سے قبل میں اس بات پر زور دینا چاہتا ہوں کہ یہ علمی اور ذہنی کاوش کا مقابلہ ہے اس لیے طالب علموں اور حاضرین کے ضبط کی آزمائش بھی ہے۔ اس تقریب کی سنجیدگی کا بھی یہی تقاضہ ہے کہ یہ مشاعرہ پورے نظم و ضبط کے ساتھ جاری رہ کر انجام کو پہنچے اس میں آپ سب حضرات کی اعانت مطلوب ہے۔

لے مشاعرہ بخیر و خوبی چلتا رہا اور پورے نظم و ضبط کے ساتھ انجام تک پہنچا۔ یہ دیکھ کر مجھے خوشی ہوئی۔
(نیر)

جناب ڈاکٹر مشیر الحق

وہم کا علاج

یہ تو ظاہر بات ہے کہ دنیا میں جتنے بھی مرض ہیں وہ سب ہم انسانوں ہی کے لئے ہیں۔ ہر شخص کبھی نہ کبھی بیمار پڑتا ہی رہتا ہے لیکن ہر وقت اس وہم میں مبتلا رہنا تو کوئی عقلمندی نہیں ہے کہ ٹھنڈی چیز نہ کھانی چاہیے۔ اس سے زکام ہو جائے گا اور اگر کچھ دنوں تک گرم چیزوں کا استعمال رہا تو تپ رہنے لگے گی۔ لیکن اب اسے کیا کیا جائے کہ اس دنیا میں ایسے لوگ بھی پڑے ہیں جنھیں یہ یقین ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جتنے بھی مرض پیدا کیے ہیں وہ سب کے سب صرف انھیں کے لیے ہیں۔ ایسے لوگ خود مریض بن جاتے ہیں اور خود ہی اپنا علاج کرتے ہیں پھر آہستہ آہستہ نوبت یہاں تک پہنچی ہے کہ وہ ہر آنے جانے والے کو بھی مختلف مرضوں کا مریض بتا کر مفت نسخے بتایا کرتے ہیں۔

ہمارے ایک دوست ہیں اس قسم کے۔ نام خیر ان کا بہت لمبا چوڑا ہے لیکن ان کے سب جان پہچان والے انھیں ننھے میاں کہتے ہیں ویسے وہ خود اپنی عمر کے حساب سے کئی ننھوں کے نانا ہوں گے۔ آپ ان سے جب کبھی ملیں ان کا ہاتھ نبض پر دکھائی دے گا۔ خیر سے انھیں کچھ اپنے بارے میں یہ غلط فہمی بھی ہے۔ وہ امراض کے پہچاننے میں ماہر ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ یا تو وہ اپنی نبض دیکھتے ہیں یا آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر زبان نکال کر مختلف زاویوں سے منہ بگاڑ بگاڑ کر اپنی شکل دیکھا کرتے ہیں۔ میں نے ان سے کتنی بار کہا کہ ننھے میاں یہ ضروری نہیں ہے کہ جتنی بیماریوں کے نام آپ کو یاد ہیں وہ سب آپ میں موجود بھی ہوں۔ لیکن اس بات کو وہ اپنی توہین سمجھتے ہیں کیوں کہ اس طرح ان کی مہارت پر حرف آتا ہے۔

ننھے میاں کے سب ہی دوست ان کی مجلس میں بیٹھنے سے گھبراتے ہیں کیونکہ ان کے یہاں یا تو بیماریوں کا ذکر رہتا ہے یا پھر ان کے خود تشخیص کیے ہوئے نسخوں کا۔ میں چونکہ ان پر یہ ظاہر نہیں ہونے دیتا کہ مجھے ان کے اس خبط سے نفرت ہے اس لیے وہ مجھے اپنا ہمدرد سمجھتے ہیں اور بہت ہی اعتماد کے ساتھ اپنی بے شمار بیماریوں کا ذکر کرتے رہتے ہیں۔ ابھی کل ہی کی بات ہے کہ انھوں نے بہت ہی رازدارانہ لہجے میں مجھ سے کہا۔

"سوچتا ہوں کہ یہ پڑوس میں جو ڈاکٹر صاحب ہیں ان کا ذرا امتحان لوں۔"

"کیا مطلب۔" میں نے پوچھا۔
"ارے بھئی! سنا ہے ڈاکٹر صاحب بہت قابل ہیں۔ ان کے نام کے ساتھ بے شمار ڈگریوں کا دم چھلا لگا ہوا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ اپنے کو انھیں دکھاؤں اور ان سے نسخہ تجویز کراؤں۔"
ننھے میاں جس ڈاکٹر کا تذکرہ کر رہے تھے وہ شہر کا مشہور ترین ڈاکٹر تھا۔ گھر پر آنے کی تو خیر سب ہی ڈاکٹر فیس لیتے ہیں یہ ڈاکٹر صاحب تو مطب میں بھی معائنہ کرنے کی فیس لیتے تھے۔ اس لیے میں نے کہا۔
"ننھے میاں، آپ میرے بزرگ ہیں۔ آپ کو مشورہ دینا چھوٹا منہ بڑی بات ہوگی، لیکن اتنا ضرور کہوں گا کہ بیٹھے بٹھائے کیوں مفت میں روپوں کا خون کرتے ہیں۔"
ننھے میاں حیرت سے منہ پھیلائے ہوئے مجھے دیکھتے رہے، جب میں چپ ہوا تو بولے۔
"میاں تمھاری بات تو میری سمجھ میں آئی نہیں۔ بھلا روپوں کے خون سے کیا مطلب ہے تمھارا؟"
اب میں نے صاف صاف کہا۔ "دیکھیے آپ کو کوئی مرض تو ہے نہیں۔ خواہ مخواہ وہم کا علاج کرانے کے لیے اتنے بڑے ڈاکٹر کے پاس جا رہے ہیں جس کی دوا لوگ کہتے ہیں لقمان کے پاس بھی نہیں تھی۔ بہرحال کوئی مرض ہو یا نہ ہو، علاج تو آپ خود اپنا ہی کریں گے، پھر مفت میں اسے فیس دینے سے کیا فائدہ؟"
انھوں نے بہت ہی تعجب سے کہا۔ "فیس کیسی فیس؟ کیا وہ مجھ سے فیس لے گا؟"
"ہاں کیوں نہیں۔ جب وہ آپ کا معائنہ کرے گا تو فیس نہیں لے گا؟" میں نے کہا۔
یہ بات سن کر ننھے میاں بہت زور سے ہنسے اور بولے "میاں تم بھی بچے ہی رہے۔ ارے بھئی میرے ایسا مریض ڈاکٹروں کو بھلا کہاں ملتا ہے۔ مجھے کچھ نزلہ زکام تو ہے نہیں کہ ڈاکٹر صاحب نے دوا لکھی اور فیس جیب میں ڈال لی۔ میرا معائنہ کر کے تو ڈاکٹر صاحب کے علم میں اضافہ ہوگا۔"
منہ پھیلا دینے کی اب میری باری تھی۔ میں نے کہا "حضرت آپ کی بات تو میری سمجھ میں آئی نہیں۔"
کہنے لگے۔ "بھئی مجھ میں ایک مرض تو ہے نہیں۔ ابھی ابھی ایک دوا خانے کا اشتہار دیکھ رہا تھا۔ اس میں مختلف مرضوں کی جو خاص خاص پہچان لکھی ہوئی تھی اسے جب میں نے اپنے حالات سے ملا کر دیکھا تو مجھے معلوم ہوا کہ مجھ میں تپ دق کا کچھ مادہ ہے۔ کچھ سرسامی کیفیت بھی ہے جنون کے بھی کچھ آثار پائے جاتے ہیں۔ ضعف معدہ اور اختلاج قلب تو خیر ہے ہی۔ اب تم ہی بتاؤ، ڈاکٹر صاحب کے پاس بھلا ایسا مریض کبھی کیوں آیا ہوگا جس میں اتنے مختلف قسم کے مرض پائے جاتے ہوں۔ میرا معائنہ کر کے ان کے علم میں کیا اضافہ نہ ہوگا۔ میں نے ایک اخبار میں پڑھا تھا کہ میڈیکل کالجوں میں پیسے دے دے کر خاص قسم کے مریضوں کو بلایا جاتا ہے اور لڑکوں کا تجربہ بڑھانے کے لیے ان کا معائنہ کرایا جاتا ہے۔ اب اگر ان ڈاکٹر صاحب کو گھر بیٹھے ایک ایسا مریض مل جاتا ہے جو کئی مریضوں کے برابر ہو تو پھر انھیں خدا کا شکر ادا کرنا چاہیے کہ گھر بیٹھے نعمت مل گئی۔
جب وہ چپ ہوئے تو میں نے کہا "یہ سب

صحیح ہے لیکن اب تو وہ طالب علم نہیں رہے۔ پورے ڈاکٹر ہو چکے ہیں۔ اس لیے اب وہ پیسے دئے کر نہیں پیسے لے کر معائنہ کرتے ہیں۔ اگر آپ اپنا معائنہ کرانے پر تلے ہی ہوئے ہیں تو پھر خدا کے واسطے فیس کے پیسے جیب میں ڈال کر چلئے۔ تاکہ اگر ڈاکٹر آپ کی منطق سے مطمئن نہ ہو سکے تو پھر بے عزتی نہ ہو۔"

حالانکہ ننھے میاں کی سمجھ میں میری بات نہیں آئی، لیکن پھر بھی میری خاطر انھوں نے کچھ روپے جیب میں رکھ لیے اور ہم دونوں ڈاکٹر صاحب کے مطب جا پہونچے۔

مطب میں پہنچ کر سب سے پہلا مسئلہ فیس ہی کا اٹھا۔ ڈاکٹر صاحب کے خاص کمرے کے باہر ان کا جو کلرک بیٹھا تھا اس نے بتایا کہ جب تک کوئی مریض فیس جمع نہیں کر دیتا اس وقت تک اس کی ملاقات ڈاکٹر سے نہیں ہو سکتی۔ ننھے میاں نے کلرک سے بحث شروع کی اور وہی باتیں دہرانے لگے جو وہ مجھ سے کہہ چکے تھے لیکن کلرک نے کوئی توجہ نہیں کی اور بہت ہی رکھائی سے بولا کہ اس کے پاس بیکار کی بحث کا وقت نہیں ہے۔ اگر ڈاکٹر صاحب سے ملاقات کرنی ہے تو فیس جمع کی جائے۔" بہر حال ننھے میاں نے فیس اس کے حوالے کی اور تھوڑی دیر بعد ہم دونوں ڈاکٹر صاحب کے پاس جا پہونچے۔

ڈاکٹر صاحب نے جب آپ کا معائنہ شروع کیا تو ننھے میاں نے خود ہی انھیں بتانا شروع کیا کہ وہ کتنے مختلف مرضوں کے مریض ہیں۔ ان کا خیال تھا کہ کبھی کبھی ان کے سر کے بائیں طرف بہت سخت درد اٹھتا ہے۔ جو ایک مشہور دواخانے کے فہرست ادویہ کے مطابق اس بات کا ثبوت ہے کہ ان کے سر میں ٹیومر ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ پیٹ کے بھی مریض ہیں۔ وہ عموماً مرغن غذا نہیں کھاتے لیکن اگر کبھی کھا لیتے ہیں تو اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ دوسرے وقت کھل کر بھوک نہیں لگتی۔ یہ ان کے خیال میں ضعف معدہ کی پہچان تھی۔ جب وہ سانس لیتے ہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے سانس کی نالی میں کوئی چیز اٹک سی رہی ہو۔ اس سے صاف ظاہر تھا کہ یا تو ان پہ ہارٹ اٹیک ہونے والا ہے یا پھر وہ ہائی بلڈ پریشر کے مریض ہیں۔ غرضیکہ وہ اسی طرح بہت دیر تک ڈاکٹر کو اپنے امراض کی فہرست گنواتے رہے اور ڈاکٹر صاحب چپ چاپ بیٹھے مسکراتے رہے۔ جب ننھے میاں بولنے سے تھک گئے تو ڈاکٹر صاحب نے کچھ دیر تک ان کا معائنہ کیا اور نسخہ پر چند سطریں گھسیٹ کر لکھ دیں۔ ہم دونوں مطب کے باہر آئے اور قریب کے کیمسٹ کے یہاں نسخہ دے دیا۔ کیمسٹ نے کچھ دیر تک نسخہ کو الٹ پلٹ کر دیکھا اور پھر یہ کہہ کر واپس کر دیا کہ اس کی دکان پر اس قسم کا سامان نہیں ملتا۔

"کیا مطلب" ننھے میاں بولے " سامان کی کیا بات ہے، مجھے تو دوائیں چاہئیں۔ کیا آپ کیمسٹ نہیں ہیں ؟"

"جی ہاں بدنصیبی سے میں کیمسٹ ہوں دودھ دہی کی دکان لے کر نہیں بیٹھا ہوں۔ آپ کسی دوسری دکان سے یہ سامان لے لیں۔"

اب تو ذرا میں بھی چکرایا۔ میں نے ننھے میاں کے ہاتھ سے نسخہ لے کر دیکھا۔ ڈاکٹروں کی تحریر پڑھنا آسان کام نہیں ہے —— لیکن جب ذرا غور

باقی صفحہ

جناب آفاق دانش

مکھیوں کی ڈبیا

ایک زمانہ کی بات ہے کہ فرانس کے ایک گالوؤں میں ایک جلاہا رہا کرتا تھا۔ جلاہے اور اس کی بیوی میں بڑی تو تو میں میں ہوا کرتی تھی۔ وہ اسے کاہل، نکھٹو اور نہ جانے کیا کیا کہا کرتی تھی۔ جلاہا بے چارہ سیدھا سادہ آدمی تھا۔ بیوی کی صلواتیں سنی ان سنی کر دیا کرتا تھا۔ اسے اپنی بیوی سے کوئی شکایت نہ تھی۔ اس لیے کہ وہ اس کی دال روٹی کا انتظام تو کرہی دیا کرتی تھی۔ بے چاری نہ جانے کیا کیا جتن کرتی تھی مگر شوہر کو بھوکا نہیں سلاتی تھی۔ اسے شوہر کی بے حسی اور بے کاری پر بہت غصہ آتا تھا۔ مگر تھی تو عورت ہی کرتی تو کیا کرتی۔ وہ اسے روزانہ سخت سست سنا کر کام کی تلاش میں روانہ کر دیتی۔ جلاہا جو کچھ روکھی سوکھی اپنے ساتھ لیجاتا اسے کھا کر واپس آجاتا۔

ایک دن کیا ہوا کہ اس کی بیوی بیمار ہو گئی۔ جلاہے کی ساری آئی بائی تیج گئی۔ وہ بہت پریشان تھا مگر کرتا تو کیا کرتا۔ اسے کھانا پکانے کا بھی ڈھنگ نہیں معلوم۔ اسے اپنی مہربان بیوی کی علالت کا دکھ بھی تھا۔ کھانے کو جب کچھ نہ بن پڑا تو وہ مجبور ہو کر گھر سے باہر چلا گیا۔ گالوں کے دوسرے کنارے پر ایک تالاب تھا اس کے کنارے ایک تناور درخت کی اوٹ لگا کر جلاہا چپ چاپ جا بیٹھا۔ کبھی کبھی ایک آدھ کنکری اٹھاتا اور خاموش پانی کی سطح کو لہروں کے چھلوں میں تبدیل کر دیتا۔ اس سے کوئی فائدہ تو تھا نہیں ہاں البتہ اس کا دھیان تھوڑی دیر کے لیے اپنی بھوک اور بیمار بیوی سے ہٹ جاتا تھا۔ چند لمحوں بعد اس کھیل میں اس کی دلچسپی نہیں رہی بھوک جب تیز لگی ہو تو تم ہی بتاؤ بھلا کون سا کام اچھا لگتا ہے۔ تھوڑی دیر وہ خاموش بیٹھا رہا۔ پھر یکایک ایک بڑا سا پتھر اٹھایا اور بہت زور سے اس تالاب کے اندر دے مارا۔ بڑی زور کا چھپا کا اٹھا۔ سارا تالاب اتھل پتھل ہو گیا۔ قریب میں بیٹھی چڑیاں شور مچانے لگیں۔ جلاہا ڈرا۔ کیا دیکھتا ہے کہ جہاں پتھر مارا تھا وہاں سے ایک سفید پوش جل پری نکل رہی ہے۔ وہ اتنی خوبصورت تھی کہ جلاہا اپنی بیوی اور بھوک دونوں کو بھول گیا۔ اس نے سمجھا کوئی شہزادی ہے وہ وہیں کھڑا رہا۔ جل پری نے پانی سے نکل کر جلاہے سے پوچھا: "تم یہاں کیسے آئے؟"

جلاہا بولا "حضور میں بے کار آدمی ہوں ویسے تو میں جلاہا ہوں۔ میرے باپ دادا کپڑا بن کر بازار میں بیچا کرتے تھے۔ مگر اب تو مشینوں کا زمانہ ہے۔

میرے ہاتھ کے کپڑے کیسے بھاتے ہیں۔

جل پری بولی "تم میرے لیے کپڑے بن سکتے ہو" جلاہا خوش ہو گیا۔ بولا "سرکار آپ کے لیے تو جان حاضر ہے" میں۔ میں۔ میں تو آپ کے۔ یعنی کے آپ کے لیے زندگی بھر کپڑا بننے کو تیار ہوں۔ مگر اس وقت مجھے بھوک بہت سخت لگی ہے۔ آپ مجھے کچھ کھلا دیں تو بڑی مہربانی ہوگی۔ جل پری کو جلاہے کی باتیں بہت پسند آئیں۔ اس نے پانی میں ہاتھ ڈالا۔ اور بھنی ہوئی مچھلیوں کا ایک ڈبہ جلاہے کے ہاتھوں میں پکڑا دیا۔ جلاہا مارے خوشی کے دیوانہ ہو گیا۔ جلدی جلدی اس نے دو چار ٹکڑے منہ میں رکھے۔ مچھلیاں بہت لذیذ تھیں۔ جلاہے کو کھاتے کھاتے اپنی بیوی کا خیال آیا۔ اس نے جل پری سے کہا۔ "سرکار اب آپ اجازت دیں تو اپنے گھر جاؤں میری بیوی بیمار ہے اور وہ بھی بے چاری بھوکی ہے۔"

جل پری نے کہا۔ "مگر ایک شرط ہے"

جلاہے نے پوچھا۔ "وہ کیا ہے؟"

جل پری بولی۔ "تم میرے لیے ایک خوب صورت دوپٹہ بن کر لاؤ گے۔ اور پھر اسی طرح ایک پتھر پانی میں پھینکو گے تو میں باہر آ کر تم سے ملوں گی۔ یہ کہہ کر پری غائب ہو گئی۔ جلاہا تلی ہوئی مچھلیاں لے کر گھر آیا بیوی کو مچھلیوں کا نذرانہ پیش کیا۔

بیوی بڑی حیران ہوئی۔ اس نے سوچا یہ کیا جادو کر لایا ہے۔ اپنے شوہر سے پوچھا "مچھلیاں کہاں سے لائے؟ کیا چوری کر کے لائے ہو؟"

جلاہا بولا۔ "مالک کی دین ہے۔ مجھے تو فرشتے نے لا کر دیا ہے۔ بیوی بولی "ایسے قابل ہوتے تو فاقوں پر بسر نہ ہوتی۔ جلاہا قسم کھانے لگا کہ اس نے چوری نہیں کی۔ خیر! بیوی نے مچھلی کھائی تو پیٹ کی آگ بھرا اور بیماری بھی دور بھاگی۔

دوسرے دن جلاہے نے اپنے باپ دادا کے پرانے کارخانہ کی لکڑیوں کو پھر درست کیا اور پرانے ہی ریشم کے تانے بانے لگا کر اس نے کام شروع کر دیا۔ بیوی کو سخت تعجب تھا کہ میاں نکھٹو کرگھے میں جا لگے۔ کہاوت ہونی سی بات لگ رہی تھی۔ مگر میاں نکھٹو کو تو پری سے ملنا تھا۔ اس کے لیے پہاڑ کھودنے کو تیار تھے۔ خدا خدا کر کے دوسرے دن وہ دوپٹہ نما کپڑا تیار کر اسی تالاب کے پاس جا پہنچے۔ پتھر مار کر جل پری کا انتظار کرنے لگے۔ یک بیک کنارے کے درختوں میں ایک آواز ہوئی۔ اور جل پری حاضر۔ جلاہے نے بڑے احترام سے سلام عرض کیا اور وہ دوپٹہ جل پری کو پیش کیا۔ جل پری کو جلاہے کی سچائی اور وعدہ پورے کرنے کے عزم کو دیکھ کر خوشی ہوئی۔ جل پری بولی۔

"تم بہت اچھے آدمی ہو تم میں محنت کرنے اور وعدہ پورا کرنے کی بہت بڑی خوبیاں موجود ہیں جو آج کے لوگوں میں بہت کم ملتی ہیں۔ ہم تمہارے عمل سے بہت متاثر ہیں۔ یہ کہہ کر جل پری تالاب کے کنول سے پانچ بڑی بڑی مکھیاں نکال کر جلاہے کے حوالے کیں۔ اور کہا کہ ان مکھیوں کو تم ایک چھوٹے سے بکس میں بند کر لینا اور جب تک یہ مکھیاں تمہارے ساتھ رہیں گی تمہارا سارا کام یہ مکھیاں کر دیا کریں گی۔ جلاہا بہت حیران تھا۔ مگر خوش بھی تھا وہ ان مکھیوں کو لے کر گھر آیا۔ بیوی سے چھپا کر اس نے ان مکھیوں کو ایک بکس میں رکھ دیا۔

جیسے ہی وہ مکھیاں بکس میں بند ہوگئیں۔ انھوں نے شور مچانا شروع کیا۔ اندر سے آواز آنے لگی۔ ڈبیا کھولو — ڈبیا کھولو — ڈبیا کھولو — جلاہا حیران تھا کہ یا اللہ یہ کیا تماشہ ہے۔ اس نے گھبرا کر ڈبیا کھول دی۔ مکھیاں باہر آگئیں۔ اور ایک زبان ہو کر سب کہنے لگیں "کام بتاؤ — کام بتاؤ — کام بتاؤ — جلدی کام بتاؤ — جلاہا چکرا گیا۔ اسے جب کچھ نہ سوجھی تو اس نے کہا۔ جاؤ ہمارے عمدہ ریشم کے دھاگے لاؤ۔" مکھیاں اڑ گئیں اور تھوڑی دیر میں انھوں نے ریشم کے ڈھیر لگا دیے۔ اور پھر بولیں: کام بتاؤ۔ کام بتاؤ۔ جلاہے نے کہا ان کے تانے بانے لگاؤ۔ پلک جھپکتے ہی وہ کام ہوگیا۔ پھر جلاہے نے سوچا کہ کیوں نہ انھیں سے کہوں کہ اب تم ہی سلک تیار کرو۔ یہ سوچ کر اس نے ان سے سلک بننے کو کہا۔ مکھیاں فوراً کام میں لگ گئیں۔ جلاہا کھڑا دیکھتا ہی رہا پورا تانا بانا سلک میں تبدیل ہوگیا۔ اب جب کہ وہ ہر طرح سے ان کو آزما چکا تو اسے بڑا اطمینان ہوا۔ اس کے بعد مکھیاں اور کام مانگنے لگیں تو اس نے کہا۔ "ڈبیا کے اندر جاؤ!" سب مکھیاں اندر چلی گئیں۔ جلاہے نے ڈبیا بند کر لی اور اسے جا کر اسی جل پری کے تالاب کے پاس پیڑ کے نیچے مٹی کھود کر گڑھے میں چھپا دیا۔

شام کو اس کی بیوی جو ادھر ادھر لوگوں کے گھروں میں کام کرنے جایا کرتی تھی۔ جب واپس آئی تو اس نے دیکھا کہ گھے پر بہت عمدہ قسم کی سلک تنی ہوئی ہے۔ وہ حیران تھی کہ ایسا کیسے ممکن ہو سکتا ہے۔ جلاہے نے بیوی کو دیکھا تو بناوٹی طریقہ پر اپنے بہت زیادہ تھکے ہونے کا اظہار کیا۔ وہ اس طرح ہاتھ پاؤں پھیلا کر جمہائیاں لینے لگا کہ مانو کام کرتے کرتے اس کی کمر ٹوٹ گئی ہو — بیوی نے مسکرا کر اس کی طرف دیکھا اور جھٹ جو کچھ لائی تھی اس کے سامنے رکھ دیا اور اس کے ہاتھ پیر دبانے لگی۔ جلاہا بڑا مست ہو رہا تھا۔ بیوی کو جو دیکھا ہوا تھا اس سے وہ بہت خوش تھا۔

دوسرے دن پھر وہ تالاب کے پاس گیا۔ مکھیوں کو نکالا اور انھیں لا کر پھر اسی طرح کام میں لگا دیا۔ اور خود سلک لے کر بازار چلا گیا۔ بڑے اچھے داموں بیچ کر واپس آیا تو یہاں دوسرا تھان تیار ہو چکا تھا۔ اس نے مکھیوں کو ڈبیا میں جانے کا حکم دیا اور پھر انھیں اسی پیڑ کے نیچے لے جا کر چھپا آیا۔ جب بیوی واپس آئی تو پھر اسی طرح اپنے تھکے ہارے ہونے کا تماشہ کیا۔ بیوی بہت خوش۔ وہ اپنے شوہر میں یہ تبدیلی دیکھ کر پھولی نہ سمائی اور فوراً ہی اسے خوبصورت گہنوں اور کپڑوں لدی دلھن جیسی اپنی صورت خیالوں میں پھرنے لگی۔ وہ اپنے خیالی پلاؤ پکانے لگی۔ جلاہے نے بیوی کی مسرت میں اور اضافہ کرنے کے لیے۔ روپوں کی تھیلی اس کے قدموں میں رکھ دی۔ جلاہن مارے خوشی کے ناچ اٹھی۔

کچھ ہی عرصہ میں جلاہا اپنے گانوں کا امیر ترین آدمی بن گیا۔ مگر مکھیوں کی جادوگری اور جل پری کی مہربانی کا کسی کو بھی علم نہ تھا۔ حتیٰ کہ خود اس کی بیوی کو بھی خبر نہ تھی۔ ایک دن جب جلاہا مکھیوں کو کام میں لگا کر سو رہا تھا۔ تو جلاہن کہیں سے آ نکلی۔ اس نے دیکھا کہ جلاہا تو سو رہا ہے۔ مکھیاں کپڑا تیار کر رہی ہیں وہ یہ تماشہ دیکھ کر دنگ رہ گئی۔ وہ وہیں کھڑی

ہی تھی۔ مکھیوں کا کام ختم ہو گیا اور مکھیاں چلانے
لیں : کام بتاؤ ـــــ کام بتاؤ ـــــ جلدی کام بتاؤ
یلاہا تو بے خبر سو رہا تھا۔ جلاہن اس راز کو جان چکی
نھی۔ اس نے مکھیوں سے کہا : گھر کی صفائی کرو۔ مکھیاں
و منٹ میں پھر جلاہن کے سر پر سوار۔ اور پھر وہی شور۔
ام بتاؤ۔ کام بتاؤ۔ دو منٹ میں سارے گھر کی صفائی
لمل۔ اب کیا تھا۔ جلاہن بولی۔ کھانا پکاؤ۔ ارے لو
ھانا بھی تیار! اب لو لو۔ اب کیا کروں۔ پھر جلاہن
بولی۔ جاؤ۔ دریا سے پانی لاؤ۔ پانی بھی آگیا۔ جلاہن
ب گھبرا سی گئی تھی۔ اس لیے کہ مکھیاں آناً فاناً کام ختم کر کے
اس کے سر پر منڈلانے لگیں تھیں۔ اور اسے ان کے
شور سے بہت الجھن ہونے لگی تھی۔ عاجز آکر اس نے
مکھیوں کو چھلنیاں تھما دیں اور ان سے کہا کہ جاؤ ان میں
بھر بھر کر دریا کا سارا پانی اٹھا لاؤ۔ مکھیاں کام میں لگ
گئیں۔ مگر بھلا چھلنیوں میں کہیں پانی رکتا ہے مکھیاں
پانی گرنے سے تیز رفتار ہو گئیں۔ اب جب وہ چھلنیاں لے کر
چلتیں تو پانی راستہ میں گرتا آتا پھر جا کر لاتیں اور
پھر سارا پانی راستہ میں گر جاتا۔ اس طرح وہ دن رات
جائیں اور آئیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ پانی سارے راستہ میں
بھر گیا اور ایسا لگنے لگا۔ کہ سیلاب آ گیا ہو۔ مکھیاں اپنا
کام کرتی رہیں نہ دریا کا پانی ختم ہوا اور نہ کام۔ مگر اب تو
اندیشہ تھا کہ گاؤں ڈوب جائے گا۔ سارے کھیت
بھر گئے۔ مکانوں میں پانی بھرنے لگا۔ لوگ چلانے لگے۔
جلاہے کے گھر میں پانی گھس گیا۔ وہ بھی جاگ اٹھا ـــ
اس نے دیکھا تو اس کی بیوی اٹاری پر چڑھی ہوئی
چلا رہی۔ "ارے بس کرو۔ بس کرو۔ خدا کے لیے رک
جاؤ" مگر مکھیاں تو کام ختم کر کے ہی رکتی تھیں۔

وہ بھلا ابھی کب رکنے والی تھیں۔ وہ پانی لاتی رہیں۔

جلاہا ہوشیار تھا۔ اس نے جب یہ اندھیر دیکھا تو
جلدی سے مکھیوں کو آواز دی کہ یہ سارا پانی واپس لے
جاؤ۔ یہ حکم سنتے ہی مکھیاں پانی واپس لے جانے
لگیں۔ چند ہی لمحوں میں پھر سارا گاؤں پانی سے خالی
ہو گیا، اور مکھیاں جلاہے کے پاس واپس آ کر کام
کا تقاضہ کرنے لگیں۔ جلاہا اب ان مکھیوں کو اپنے پاس
رکھنے کو خطرہ سے خالی نہیں سمجھتا تھا۔ مکھیوں کا علم
اب چونکہ اس کی بیوی کو ہو چکا۔ جلاہا اس کا انجام بھی
دیکھ چکا تھا۔ اس نے خیریت اسی میں سمجھی کہ ان مکھیوں
کو جل پری کو واپس کر دے۔ ویسے وہ اب کافی دولت
مند ہو چکا تھا۔ ہر طرح کے آرام آسائش اسے حاصل
تھا۔ جلاہے نے مکھیوں کو ڈبیا میں جانے کا حکم دیا۔
مکھیاں جب ڈبیا کے اندر چلی گئیں تو وہ اسے بند کر کے
پھر تالاب کے پاس گیا۔ پہلے کی طرح اس نے تالاب میں
پتھر پھینکا۔ جل پری باہر آئی۔ اس نے جلاہے کو
دیکھ کر سمجھا کہ وہ اس سے کچھ اور مانگنے کی غرض سے آیا
ہے۔ لیکن جب جلاہے نے بہت شکریہ کے ساتھ جل
پری کو مکھیوں کی ڈبیا واپس کی تو اس نے اس کا
سبب پوچھا۔ جلاہا بولا۔ آپ کا بہت بہت شکریہ!
میں نے ان مکھیوں کو اب تک اپنی بیوی سے دور رکھا
تھا مگر اب میری بیوی کو ان کا علم ہو گیا ہے۔ اس نے
تو پورے گاؤں کو ہی ڈبا دیا ہوتا وہ تو کہیے میری
آنکھ کھل گئی اور سارا گاؤں ڈوبتے ڈوبتے بچ گیا۔
میں اب ان مکھیوں کو آپ کے حوالے کرنے کے بعد ہی
سکھ کی نیند سو سکوں گا۔ مجھے اب سب کچھ حاصل ہے۔
جل پری یہ بات سن کر مطمئن ہو گئی۔

★★

جناب نثار چنگیزی

سیکھو

(ننھے بچوں کے لیے)

پڑھنا لکھنا گانا سیکھو ۔ سر اور تال ملانا سیکھو
لہرانا بل کھانا سیکھو ۔ شرمانا اٹھلانا سیکھو
سچی بات بتانا سیکھو ۔ اچھی راہ دکھانا سیکھو
ڈٹ کر پینا کھانا سیکھو ۔ صحت ٹھیک بنانا سیکھو
علم کی شمع جلانا سیکھو ۔ اجیارا پھیلانا سیکھو
وقت پہ مکتب جانا سیکھو ۔ پڑھ لکھ کر بڑھ جانا سیکھو
سب کو گلے لگانا سیکھو ۔ نفرت، بغض، مٹانا سیکھو
محفل کو گرمانا سیکھو ۔ دل میں پیار بسانا سیکھو
جھوٹا مت کہلانا سیکھو ۔ وعدہ کر کے نبھانا سیکھو

مشکل میں کام آنا سیکھو
سب کا ہاتھ بٹانا سیکھو

★

بچو!

خودی کے گیت گاتے جاؤ بچو ۔ زمانے کو سناتے جاؤ بچو
سکوں کی بانسری پہ پیار کی دھن ۔ بجاؤ اور بجاتے جاؤ بچو
رہِ انسانیت راہ وفا میں ۔ قدم آگے بڑھاتے جاؤ بچو
وطن کا نام روشن کرتے جاؤ ۔ ہر اک کے کام آتے جاؤ بچو
خوشی دے دو دلِ انسانیت کو ۔ خلوصِ دل لٹاتے جاؤ بچو
یہاں تقدیر بنتی ہے عمل سے ۔ مقدر آزماتے جاؤ بچو
جہاں کو علم و فن سے روشنی دو ۔ جہالت کو مٹاتے جاؤ بچو
کھلو تم اس چمن میں پھول بن کر ۔ سدا ہنستے ہنساتے جاؤ بچو
دکھاؤ شوخ اور چنچل ادائیں ۔ دلوں میں گھر بناتے جاؤ بچو
جہاں تک ہو سکے دامن کو اپنے ۔ گناہوں سے بچاتے جاؤ بچو

نثارِ خستہ کی تم بات مانو
خدا سے لو لگاتے جاؤ بچو

★

جناب ریحان احمد عباسی

جانور اور موسمی تبدیلیاں

"یہ آکاش وانی ہے - اب آپ ..... سے
موسم کا حال سنیے۔ پچھلے ۲۴ گھنٹوں کا تاپ مان
اس پر وار رہا۔ آدھک تم تاپ مان ..... ڈگری
سنٹی گریڈ اور نیون تم ..... ڈگری سنٹی گریڈ۔
اگلے ۲۴ گھنٹوں میں موسم میں کوئی ورشیش پری
ورتن نہیں ہوگا۔ آج رات میں کسی سمے گرج چمک
کے ساتھ بوندا باندی ہونا کا سمبھاونا ہے ..."

آپ نے ریڈیو پر اس طرح کے اعلانات ضرور
سنے ہوں گے جن میں گرمی سردی کا حال، درجۂ
حرارت اور متوقع آندھی بارش وغیرہ کے بارے
میں بتایا جاتا ہے۔ شہروں میں رہنے والوں کو اور
وہ بھی ایسے شہروں میں جہاں موسم میں ایک دم
کوئی بڑی تبدیلی نہیں آتی، اس طرح کی موسمی معلومات
کی طرف کوئی خاص توجہ نہیں دی جاتی لیکن دیہاتوں
میں رہنے والے کسانوں اور ان علاقوں میں
جہاں طوفان وغیرہ بھی آتے رہتے ہیں، موسمی
تبدیلیوں کے بارے میں یہ پیش گی اطلاع بڑی
اہمیت رکھتی ہے اور وہ اپنے کھیتوں کی جتائی،
بوائی، سنچائی یا کٹائی وغیرہ کا کام کو مناسب وقت
میں پورا کر لیتے ہیں یا اگر طوفان آنے کی خبر ہو تو
اس سے بچاؤ کے لیے ضروری انتظامات کی طرف
توجہ دیتے ہیں اور دور دراز کا سفر بھی اختیار نہیں کرتے۔
محکمہ موسمیات کی طرف سے یہ پیش گوئیاں یوں ہی
اندازاً نہیں کر دی جاتیں بلکہ اس کام کے لیے بڑی بڑی
مشینوں اور آلات سے مدد لی جاتی ہے، چارٹ دیکھے
جاتے ہیں۔ تب جاکر حساب کتاب کے بعد یہ معلومات
یکجا ہوا کرتی ہے۔ لیکن انسان ہوں یا حیوان، سردی،
گرمی اور برسات تو سبھی کے لیے آتی ہے اور ہر جاندار
کو ان سے فائدہ اٹھانے یا بچاؤ کرنے کی فکر رہتی
ہے۔ انسانوں نے تو بہرحال اپنی عقل سے یہ باتیں
جاننے کی راہ نکال ہی لی۔ لیکن آپ کو یہ جان کر حیرت
ہوگی کہ انسانوں جیسی عقل نہ رکھنے کے باوجود تقریباً
تمام چرند اور پرند موسمی تبدیلیوں کے بارے میں پہلے
سے جان لینے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ خاص طور پر
برسات کے مختلف جانوروں کی مختلف حرکات سے
بارش کے بارے میں اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ بارش
ہوگی یا نہیں۔ چونکہ دیہاتوں میں رہنے والوں کو قدرتی
ماحول اور فضا میں رہنے اور ان کا [illegible] کرنے کا مواقع
زیادہ ملتے ہیں۔ اس لیے عموماً شہر والوں کی بہ نسبت
دیہات کے لوگوں کو ان تبدیلیوں اور معاملات کا
زیادہ ہی علم رہتا ہے۔ مثال کے طور پر جب ایک
کسان یہ دیکھتا ہے کہ اس کی گھوڑی کا بچہ زمین پر

وں میں لوٹنے کے بجائے، پیٹھ کے بل لیٹ گیا ہے تو وہ فوراً جان لیتا ہے کہ بارش ہونے والی ہے۔ اگر بلی، چوہے یا انگیٹھی کے پاس آکر اپنی پیٹھ پھیلے اور بار بار اپنا منہ صاف کرے تو سمجھ لیجیے کہ بارش ضرور ہوگی۔ کتا بھی بارش ہونے سے پہلے بے چینی کا اظہار کرتا ہے اور اسے کھلی جگہ میں باندھ دیا جائے تو وہ چلاتا اور رونا شروع کر دیتا ہے۔ ایسے میں کتے کو اگر کھلا چھوڑ دیا جائے تو وہ باہر جا کر گھاس کھانے لگ جاتا ہے۔

پالتو بطخیں بھی بارش آنے سے پہلے قیں قیں کر کے بڑا شور مچاتی ہیں۔ وہ زور زور سے پر پھڑپھڑاتی ہیں اور ہوا میں بھدے طریقے سے آسنے کی کوشش کرتی ہیں۔ مرغا اگر بارش ہو رہی ہو اور مرغیاں برسات میں چگتی نظر آئیں تو سمجھ لینا چاہیے کہ بارش جاری رہے گی، اور اگر دوران بارش مرغیاں کسی جگہ پناہ لینے کے لیے آکر کھڑی ہو جائیں تو سمجھ جائیے کہ بارش بہت جلد ختم ہو جائے گی۔ بارش ہونے سے پہلے مرغیاں کبھی کسی پناہ کی جگہ آکر کھڑی نہیں ہوں گی، یہاں تک کہ بارش شروع ہو جائے۔ مرغ بھی بارش سے پہلے اپنے پر سنوارا کرتے ہیں۔ جب بارش ہونے والی ہو تو کوے بھی ایک خاص قسم کی آواز نکالتے ہیں جو ان کی معمولی کی آواز سے مختلف ہوتی ہے۔ برسات کا موسم شروع ہوتے ہی ابابیلیں بھی آسمان پر پرواز کرتی دکھائی دینے لگتی ہیں، [illegible] شر کر دیتے ہیں اور تو اور سیدھی سادی بلکہ بے وقوف سی دکھائی دینے والی بھیڑیں بھی بارش سے پہلے رات میں خود بخود زور زور سے بھیں بھیں شروع کر دیتی ہیں جنہیں سن کر گڈریا سمجھ جاتا ہے کہ صبح تک بارش ضرور ہوگی۔

صرف چرند اور پرند ہی برسات کی آمد کی پیش گوئی نہیں کرتے بلکہ پانی میں رہنے والی مچھلیاں بھی برسات شروع ہونے سے پہلے خوشی کا اظہار کرتی ہیں اور اچھل اچھل کر ہوا میں مکھیاں اور مچھر پکڑتی ہیں۔

مینڈکوں کے بارے میں تو سبھی جانتے ہیں۔ کہ وہ نہ صرف برسات میں خوب ٹرّاتے ہیں بلکہ برسات شروع ہونے سے چند دن پہلے سے ہی ان کا ٹرک ٹرک کر ٹرّانا شروع ہو جاتا ہے۔

اسی طرح راتوں کو جگنوؤں کا چمکنا اور جھینگروں کی جھائیں جھائیں۔ یہ بھی تو برسات کی علامتیں ہیں۔

★★

بقیہ شہزادہ بے نظیر صفحہ ۱۵ سے

پریشانی کی وجہ یہ ہے کہ ایک رات شہزادی نے ایک چٹیل میدان کے کنویں میں بے نظیر کو قید میں دیکھا۔ وہ مدد کے لیے ہم لوگوں کو پکار رہا تھا۔ اس خواب نے شہزادی کا سکھ چین حرام کر دیا۔ وہ اس فکر میں گھلنے لگی کہ وہ میری وجہ سے سزا بھگت رہا ہے۔ اگر اس کو کچھ ہو گیا تو اس کا گناہ میرے سر جائے گا۔

مجھ سے شہزادی کی پریشانی نہ دیکھی گئی۔ میں نے ایک دن بیڑا اٹھایا۔ میں بے نظیر کو قید سے چھڑاؤں گی یا کہیں مر کھپ جاؤں گی۔ تب میں نے جوگی کا روپ لیا اور گھر سے نکل پڑی۔ شہزادے! پری آپ کی حکومت سے باہر نہیں اگر آپ میری مدد کریں تو میرا کام ہو اور آپ کا نام ہو۔ بندی عمر بھر آپ کا احسان مانے گی۔"

کسان کی کہانی اسی کی زبانی

میں کسان ہوں، گاؤں میں میرا گھر ہوتا ہے کچا۔ میرے گھر میں نہ بجلی کا بلب ہوتا ہے نہ پنکھا گرمیوں میں میں خس کی ٹٹیوں کا استعمال نہیں کرتا۔ گھر کے آگے ورانڈے کے نام پر ایک چھپر ہوتا ہے۔ جس پر کبھی کبھی پھوس ہوتا ہے کبھی نہیں۔

آندھی طوفان آتے ہیں اور ساتھ میں میرے چھپر کو بھی اڑا کر لے جاتے ہیں۔ میرے دن اور راتیں قدرت کے کھلے آنگن میں جہاں صاف ہوا اور لہلہاتی فصل، سرسوں کے مہکتے پھولتے کھیت، پرندوں کی میٹھی آواز، جس کے لیے شاعر لوگ اپنا تصوّر لٹاتے ہیں۔ وہ سب کچھ میرے کھیتوں پر ملتا ہے وہیں کٹتے ہیں میرے دن رات۔ ملک میں میری برادری کے پچھتر فیصدی لوگ بستے ہیں اور میرے ہی وجہ سے ہندوستان کو دنیا میں کھیتی باڑی والا ملک ہونے کا درجہ حاصل ہے۔

کپکپاتے جاڑے کی راتیں جب کہ مارے ٹھنڈ کے ہڈیاں تک کانپنے لگتی ہیں۔ بستر چھوڑنے کو جی نہیں کرتا۔ لوگ بند کمروں میں نرم نرم گدّوں پر چین کی نیند سوتے ہیں تب میں ایک گاڑھے کی چادر اوڑھے، ننگے پیر، کندھے پر پھاوڑا رکھ کے اپنے کھیتوں کی سینچائی کرتا ہوتا ہوں۔ نیچے ٹھنڈا پانی اوپر سے پالا اور چاروں طرف سے سنسناتی ہوا بھی میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتی۔ مئی جون کی جھلسا دینے والی گرمی میں لوگ خس کی ٹٹیوں کی اوٹ میں، بجلی کے پنکھوں کے نیچے آرام کرتے ہوتے ہیں تب میں میری بیوی، بچے اور میرے بیل۔ کھلیان، اناج اکٹھا کرتے ہیں۔ دلّی میں ذرا سی لو لگ جانے پر لوگوں کی موت ہو جاتی ہے۔ مگر چلچلاتی دھوپ اور مئی جون کی دوپہری کی بھائیں بھائیں کرتی لو بھی میرا کچھ نہیں بگاڑ پاتی۔

لوگ مجھے ان داتا کہتے ہیں۔ مگر قسمت کی ستم ظریفی دیکھیے کہ جو سب کے لیے اناج پیدا کرتا ہے۔ اسی کے بچے اکثر بھوکے رہتے ہیں جو دوسروں کے جسم کو ڈھکنے کے لیے کپاس

جاتا ہے اُسے اپنا جسم چھپانے کے لیے کپڑے کم ہی
ملتے ہیں۔ میں سبزی اگاتا ہوں مگر میری بدنصیبی دیکھیے
کہ لال مرچ کی چٹنی اور پیاز کے علاوہ مجھے روٹی
کے ساتھ کھانے کے لیے اور کچھ نہیں ملتا۔ میری گائے
بھینس دودھ دیتی ہیں اسے بھی شہر کے بچوں کے
لیے بھجوا دیتا ہوں۔ جب میں اپنا اناج گاڑی میں
بھر کر شہر لے جاتا ہوں تو لالہ لوگ میری بڑی آؤ بھگت
کرتے ہیں۔ اس وقت مجھے نمبردار اور چودھری کہہ کر پکارا جاتا ہے میرے
ہاتھ میں بیڑی دے کر مجھے گاڑی سے دور بٹھا دیا جاتا ہے لالہ لوگ آکر
میرے اناج کو اچھال اچھال دیکھتے ہیں اور منہ بچکا کر چلے جاتے ہیں
شام کو دس پانچ بیوپاری اناج کے ڈھیر کے ادھر اُدھر کھڑے ہو کر بولی
بولتے ہیں میری نرم دلی دیکھیے کہ میں اپنے مال کو بیچنے کا حق
دوسروں کو سونپ دیتا ہوں۔ تیس روپے من کی بولی
بول کر وہ میرے اناج کو اپنے آپ تول کرے جاتے
ہیں۔ میری رقم میں سے دھرمادا۔ چنگی۔ آڑھت اور
دلالی کے پیسے کاٹ کر تیس میں سے اٹھائیس کے
بھاؤ کے دام میرے ہاتھ میں تھما دیے جاتے ہیں۔
میں رقم لے کر گھر چلا آتا ہوں۔ مگر سال کے آخر میں
جب میں اسی اناج کو خریدنے جاتا ہوں تو مجھے ساٹھ
ستر کے بھاؤ میں ملتا ہے۔ مجھے صدیوں کی اپنی اس
تپسیا پر بھروسہ ہو چلا ہے کہ دنیا کے تمام کام میری
تپسیا کی وجہ سے چل رہے ہیں اور جس دن میں اپنے
راستے سے ہٹ جاؤں گا۔ اس دن دنیا میں قیامت
آ جائے گی۔ میری نرم دلی کی یہ مثال کیا کم ہے کہ میں دوسروں
کو گیہوں کھلا کر خود مٹر اور باجرے کی روٹیاں کھاتا
ہوں۔

میں لوگوں کے لیے یہ سب کچھ کرتا ہوں۔ مگر میں اُن
سے کبھی نہیں پوچھتا کہ وہ میرے لیے کیا کرتے ہیں میں
اپنی خدمات کے بدلے میں کبھی کچھ مانگتا نہیں۔ اس پر
بھی لوگ مجھے بیوقوف، گنوار اور نہ جانے کیا کیا کہتے
ہیں۔ مگر میں اس پر بھی کچھ نہیں کہتا میں سمجھتا ہوں کہ
میری قسمت ہی خراب ہے۔

پارلیمنٹ میں کبھی کبھی میرے بارے میں بڑی
گرماگرم بحث ہوتی ہے وہاں بھی مجھے غیر تعلیم یافتہ
اور لکیر کا فقیر کہا جاتا ہے۔ اخباروں میں اعلان کیا
جاتا ہے کہ اس سال کسانوں کو فلاں سہولیات دی
جائیں گی۔ میں اُن سہولیات کا انتظار کرتا رہتا ہوں
کہ مجھے نئے بیج اور نئے اوزار لیکن مجھے کچھ بھی نہیں مل
پاتا کہ میں اپنے پرانے اوزار لے کر لکیر کا فقیر بننے کے لیے
مجبور ہو جاتا ہوں۔ ہاں لگان ہر سال ضرور بڑھا دیا جاتا ہے۔

ہنسیا اور پھاوڑی میرے اور میری بیوی کے
ساتھی ہیں اور ہنسیا ہاتھ میں لیے ہوئے میری فوٹو
کبھی اخبار میں کبھی نہیں چھپتی۔ میری بیوی دوپہر
میں کھیتوں میں کام کرتی ہے مگر اس کی فوٹو بھی
کبھی اخبار میں نہیں آتی۔ لیکن اگر کبھی ہماری وزیر
اعظم یا اور کوئی وزیر ہنسیا ہاتھ میں لے لیں تو فوراً
اُن کی تصویروں سے اخبار بھر جاتے ہیں۔ ہاں
کبھی کبھی بھولے بھٹکے کسی آرٹسٹ کو میرے اوپر
ضرور رحم آ جاتا ہے

میرے اوپر صرف آدمی ہی ظلم نہیں کرتے بلکہ
چرندے پرندے اور درندے بھی مجھے ہی ستاتے
ہیں۔ گیدڑ اور آوارہ جانور میری کھڑی فصل کو
چوپٹ کر جاتے ہیں۔ پکی فصل میں کوؤں اور طوطوں
کو اڑاتے اڑاتے میرا گلا پک جاتا ہے نہ صرف جانور

بلکہ قدرت بھی مجھے ستانے سے نہیں چوکتی بارش نہ ہونے پر میرے لہلہاتے کھیت خاک میں مل جاتے ہیں زیادہ بارش میری کھڑی فصل کو بہا کر لے جاتی ہے آندھی طوفان میرا حصہ ہے، اناج اور چھپر تک اڑا کر اپنے ساتھ لے جاتے ہیں۔ اولے اور برف باری بھی میرے ہی لیے تباہی کا باعث بنتے ہیں۔

طالب علم، مزدور، ٹیچر اور سبھی طبقے کے لوگ ذرا ذرا سی باتوں پر ہڑتال کر بیٹھتے ہیں۔ یہاں تک کہ ہندوستان میں سادھو لوگ بھی فساد پر آمادہ ہو جاتے ہیں۔ سب لوگ سرکار کو پریشان کرتے رہتے ہیں۔ ملک میں آئے دن لاٹھی چارج، توڑ پھوڑ اور آنسو گیس کے استعمال کی خبریں ملتی رہتی ہیں۔ لیکن میں نہ کبھی فساد کرتا ہوں اور نہ ہڑتال اور نہ ہی کسی منسٹر کی کوٹھی کے آگے دھرنا دیتا ہوں۔

ہندوستانی ہوں

تمنا کلکتہ

چینی، روسی، امریکی ہوں اور نہ پاکستانی ہوں
بچو! مجھ کو ناز ہے اس پر میں تو ہندوستانی ہوں

آج اگر ہم بچے ہیں تو غم کیوں اس کا آخر
ہم ہی تو اک روز بنیں گے "گاندھی" "اور جواہر"

دیش کی شان بڑھائے جو ہم ایک ایسی کہانی ہوں
بچو! مجھ کو ناز ہے اس پر میں تو ہندوستانی ہوں

کوئی تو اپنے "ایٹم بم" پر بنا ہے اب مغرور
اور کوئی "راکٹ" کے نشہ میں بزم جہاں میں چور

ہیں ہم بھی "پنج شیلا" کی ہی طاقت میں لاثانی ہوں
بچو! مجھ کو ناز ہے اس پر میں تو ہندوستانی ہوں

سمجھے جو کمزور مجھے وہ ہے تمنا ناداں
تن من دھن "دے کر رکھوں گا اپنے دیش کی شان

"حمید" اور "رانا" جیسے ویروں کی میں بھی نشانی ہوں
بچو! مجھ کو ناز ہے اس پر میں تو ہندوستانی ہوں

شگوفے

(۱) استاد:- فرید اس محاورے کا کیا مطلب ہے
پھل دار درخت جھکے ہوئے ہوتے ہیں۔
فرید: سر اس کا مطلب ہے عقلمند آدمی جھک کر چلتے ہیں۔

(۲) باپ: کیوں بیٹے تم نے تاریخ کا سبق یاد کر لیا؟
بیٹا: ہاں ابا آج ۲۵- فروری ۱۹۶۵ء ہے۔

(۳) خالد: اگر ایک میز پر ۱۵ مکھیاں بیٹھی ہوئی ہوں اور ان میں سے ایک مر جائے تو کتنی بچ جائیں گی؟
ماجد:- صرف ایک کیونکہ جو مر جائے گی وہی تو رہ جائے گی۔ بقیہ تو اڑ جائیں گی۔

جناب نثار احمد انجم قاسمی

بقیہ وہم کا علاج صکا سے

زور لگایا تو معلوم ہوا کہ وہ نسخہ کس قسم کا تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے لکھا تھا۔

"آپ کو وہم کا مرض ہے۔ اس کا بہترین علاج یہ ہے کہ جو جی میں آئے وہ کھائیے۔ خوب سیر و تفریح کیجیے۔ شام کو سونے سے پہلے دودھ پیا کیجیے۔ پھلوں کا استعمال جی کھول کر کیجیے۔ لیکن خدا کے واسطے آئندہ سے نہ تو دواؤں کے اشتہارات پڑھیے اور نہ کسی دوا خانے کا لٹریچر دیکھئے۔ یہ دونوں آپ کی صحت کے لیے سخت مضر ہیں۔

اِدھر اُدھر سے

فون کرنے والے طوطے

کارنوال کے ایک سجے سجائے ڈرائنگ روم میں فون کی گھنٹی مسلسل بج رہی تھی گھر میں کوئی شخص موجود نہ تھا اچانک ایک بڑا سا طوطا اڑتا ہوا آیا اور اپنے پنجے سے رسیور اٹھالیا۔ "ہیلو کون صاحب بول رہے ہیں؟" طوطا باریک سی آواز میں بولا۔ "کیا مسٹر مائیکل گھر پر ہیں؟"

"مسٹر مائیکل گھر پر نہیں ہیں وہ دوپہر ایک بجے آئیں گے" یہ کہہ کر طوطے نے فون بند کردیا۔

کارنوال کے علاوہ دوسرے شہروں میں بھی کئی ایسے طوطے موجود ہیں جو بآسانی فون پر بات چیت کرسکتے ہیں۔ ولورہمپٹن میں ایک اسکول ہے جہاں پر طوطے فون سننے کی تربیت حاصل کرتے ہیں۔ عام طور پر اس مقصد کے لیے بجری گر طوطے پالے جاتے ہیں طوطے کی یہ خاص قسم اپنے ہم جنسوں کے مقابلے میں نہایت ذہین اور محنتی ہے اور بہت جلد بات چیت کرنا سیکھ لیتی ہے۔ بجری گر طوطوں کی آواز بھی نسبتاً بلند اور واضح ہوتی ہے۔ ولورہمپٹن کے استادوں کا کہنا ہے کہ بجری گر اس وقت تک بات نہیں کرتے جب تک انھیں ایک دوسرے سے علیحدہ نہ رکھا جائے۔ اگر کسی بجری گر طوطے کے ساتھ اس کے ہم جنس موجود ہوں تو وہ انسانی بول چال سیکھنے پر آمادہ نہیں ہوتا۔ چنانچہ اسکول میں انھیں الگ الگ کمروں میں رکھا جاتا ہے کورس کی تکمیل پر ان طوطوں کو باقاعدہ اسناد ملتی ہیں۔ تانبے کے چھوٹے چھوٹے میڈل ان کے گلوں میں لٹکا دیے جاتے ہیں۔ ہر میڈل پر اسکول اور طوطے کا نام لکھ دیا جاتا ہے۔ عام طور پر بجری گر طوطوں کی قیمت دو سے پانچ پونڈ تک ہوتی ہے۔ لوگ بازار سے اپنی پسند کا طوطا خرید کر ولورہمپٹن کے اسکول میں بھیج دیتے ہیں ہر ماہ اس کی فیس ادا کرنی پڑتی ہے۔ بعض طوطے جلد تعلیم حاصل کرلیتے ہیں بعض بھسڈی ثابت ہوتے ہیں اور امتحان میں فیل ہوجاتے ہیں۔

عام طور پر بجری گر طوطے سرخ اور سبز رنگ کے ہوتے ہیں پروں پر سیاہ چتیاں ہوتی ہیں بعض قسمیں سفید، پیلی اور نیلی بھی دیکھی گئی ہیں۔

بجری گر طوطوں کی باقاعدہ نمائش لگتی ہیں جہاں بعض طوطے بڑی بڑی قیمتیں پاتے ہیں حال ہی میں ایک نمائش میں برطانیہ کی ملکہ ایلزبتھ نے بھی چند طوطے بھیجے تھے۔ اس نمائش میں بجری گر طوطوں کا ایک جوڑا تین سو پونڈ میں فروخت ہوا۔ ایک اور طوطے کی قیمت دو سو پونڈ تھی۔ یہ طوطا نہ صرف فون سن سکتا تھا بلکہ ڈائل گھما کر ایک خاص نمبر پر فون بھی کرسکتا تھا۔

فون سننے والے پرندوں کو چھوٹے چھوٹے جملے خاص طور پر یاد کرا دیئے جاتے ہیں ہیں مثلاً

... ہیں صاحب گھر پر نہیں ہیں۔
... کر دیں گے وغیرہ وغیرہ۔ بعض طوطوں کو
... فون نمبر بھی یاد کرایا جاتا ہے۔ چنانچہ ہنگامی
... کے وقت وہ ڈائل گھما کر مالک کو بلا سکتے ہیں
... مقصد کے لیے وہ صرف یہ جملہ ادا کر سکتے ہیں
"جلد پہنچو"
یہ سن کر مالک دفتر یا دکان سے فوراً گھر پہنچ جاتا ہے۔
(مارچ دہلی)

ایک لڑکے کی ریچھ سے جنگ

ریاست تری پورہ کے ایک گاؤں میں کچھ لوگ جنگل جلانے کی لکڑیاں کاٹ رہے تھے کہ اچانک ایک ریچھ اُدھر آ نکلا۔ ریچھ کو دیکھ کر سب لوگ بھاگ گئے۔ ایک لڑکا رہ گیا جس پر ریچھ نے حملہ کر دیا۔ لڑکا بھی ہمت نہیں ہارا، وہ ریچھ کا مقابلہ کرتا رہا۔ یہاں تک کہ گاؤں کے لوگ یہ سمجھ کر آ گئے کہ لڑکے کی لاش لے جائیں۔ آنے والوں کو دیکھ کر جانور بھاگ گیا۔ اور لڑکا بے ہوش ہو کر گر پڑا۔ اس کا سارا جسم زخموں سے چھلنی تھا۔ ریچھ نے اپنے ناخنوں سے لڑکے کی ایک آنکھ بھی نکال لی۔

اس بہادر بچے کا نام دیو برمن ہے وہ ہسپتال میں زیرِ علاج ہے۔
(ہندوستان ٹائمز)

سمندر میں مچھلیوں کی گنتی

سوویٹ یونین نے بحیرہ اسود میں ڈولفن مچھلیوں کی جو گنتی شروع کی تھی وہ مکمل ہو گئی ہے۔ ماہرین کے مطابق اس سمندر میں تقریباً ۹۰ ہزار ڈولفن مچھلیاں موجود ہیں۔ یاد رہے کہ سوویت یونین نے ۱۹۶۶ء میں ڈولفن کے شکار پر پابندی عائد کر دی تھی۔ اس کے بعد سے ان کی تعداد میں قابلِ قدر اضافہ ہوا ہے۔ ماہی شمارہ کی اس مہم میں بلغاریہ، کیوبا، یوگوسلاویہ، اٹلی، فرانس اور امریکہ کے سائنسداں شامل ہوئے تھے۔

بچوں کی کتابیں

مذہب

کتاب	مصنف	قیمت
ارکانِ اسلام	مولانا اسلم جیراجپوری	۱/۶۰
آں حضرتؐ	الیاس احمد مجیبی (اردو)	۰/۸۰
آں حضرتؐ	الیاس مجیبی (ہندی)	۰/۶۰
پاک کہانیاں (دو حصّوں میں)	مقبول احمد سیوہاروی	۴/۰۰
چار یار	الیاس احمد مجیبی	۲/۵۰
خلفائے اربعہؓ	خواجہ عبدالحیٔ فاروقی	۳/۰۰
رسولِ پاکؐ	عبدالواحد سندھی	۲/۰۰
عقائدِ اسلام	مولانا اسلم جیراجپوری	۰/۶۰
مسلمان بیبیاں	مولانا اعجاز الحق قدوسی	۱/۰۰
نبیوں کے قصّے	خواجہ عبدالحیٔ فاروقی	۱/۵۰
ہمارے رسول	〃 〃 〃	۲/۴۰
ہمارے نبی (اردو)	سید نواب علی رضوی	۱/۲۰
ہمارے نبی (ہندی)	سید نواب علی رضوی	۰/۴۰
سرکارِ دو عالم	محمد حسین حسان ندوی	۳/۰۰

معلومات

کتاب	مصنف	قیمت
آدمی کی کہانی	مشتاق احمد	۲/۰۰
انوکھا عجائب خانہ (چار حصّے)	محمد حسین حسان ندوی (چار حصّے)	۲/۰۰
بجلی کی کہانی	علی احمد خاں	۰/۵۰
پردادا کی کہانی	محمد عبدالغفور	۰/۸۰
تاریخ ہند کی کہانیاں (اوّل)	خجستہ سلطان	۱/۰۰
〃 〃 〃 (دوم)	ضیاء الرحمٰن	۱/۲۰
〃 〃 〃 (سوم)	مشتاق احمد اعظمی	۱/۰۰
〃 〃 〃 (چہارم)	〃 〃 〃	۱/۲۵
خبر رسانی کے طریقے	رفیعہ منظور الامین	۱/۰۰
دنیا کے بچے	محمد حسین حسان ندوی	۱/۲۵
دہلی	ڈاکٹر مجاہد حسین زیدی	۲/۰۰

کتاب	مصنف	قیمت
رابندر ناتھ ٹیگور	صفدر حسین	[illegible]
سماجی زندگی (چار حصّے)	احمد پٹیل و غلام ابرار	[illegible]
قدرت کے کرشمے	(مرتبہ) مکتبہ جامعہ لمیٹڈ	[illegible]
سمندر کے کنارے	سلطانہ آصف فیضی	۱/۰۰
سمندر کے نیچے	〃 〃 〃	[illegible]
میرا نیس	محمد حسین حسان ندوی	۱/۲۵
ہماری پارلیمنٹ	کیلاش چندر	۱/۲۵

کہانیاں، ڈرامے، ناول

کتاب	مصنف	قیمت
جن حسن عبدالرحمٰن (ناول) دو حصّے		۵/۰۰
اس نے کیا کردہ جانا (کہانیاں)	آصف مجیب	۰/۳۷
پریم کی جیت (ڈراما)	اسد اللہ کاظمی	۰/۳۷
تانیل خاں (کہانی)	محمد حسین حسان ندوی	۰/۵۰
ترکوں کی کہانیاں (کہانی)	مرتبہ: مکتبہ جامعہ لیمٹڈ	۰/۵۵
تیس مار خاں کے کارنامے (ناول)	م۔ ندیم	۱/۵۰
تین اناڑی (ناول)	عصمت چغتائی (زیر طبع)	
چپاوت کا آدم خور شیر (سچی کہانی)	محمد معین	۰/۳۵
چھوٹی لالٹین	مشتاق احمد	۰/۳۵
چقماق کی ڈبیا	برکت علی فراق	۰/۴۰
خربوزہ شہزادے کا سر بن گیا	کوثر بانو	۰/۴۰
شیدلا	پروفیسر محمد مجیب	۰/۵۰
چنبیلی	محمد حسین حسان ندوی	۰/۵۰
ستاروں کی سیر (ناول)	کرشن چندر	۲/۰۰
کوے دادا (سچی کہانی)	مجیب احمد خاں	۴/۰۰
لال مرغی (کہانی)	عبدالواحد سندھی	۰/۵۰
مزہ چکھائیں گے (〃)	مرتبہ: مکتبہ جامعہ لیمٹڈ	۰/۳۵
مزے دار پہیلیاں	(مرتبہ) محمود علی خاں (زیر طبع)	
ننھا ٹٹو (کہانی)	خورشید سلطان	۰/۳۰

No. D(S)-097

March, 1978

PAYAM-I-TALEEM

NEW DELHI-110025.

پیام تعلیم

بچوں کی کتابیں

مذہب

کتاب	مصنف	قیمت
اسلام	مولانا اسلم جیراجپوری	۱/۶۰
حضرت	الیاس احمد مجیبی (اردو)	۰/۸۰
حضرت	الیاس مجیبی (ہندی)	۰/۶۰
کہانیاں (دو حصوں میں)	مقبول احمد سیوہاروی	۳/۰۰
یار	الیاس احمد مجیبی	۲/۵۰
ے اربعہ	خواجہ عبدالحئی فاروقی	۳/۰۰
لہک	عبدالواحد سندھی	۲/۰۰
اسلام	مولانا اسلم جیراجپوری	۰/۶۰
مسلمان بیبیاں	مولانا اعجاز الحق قدوسی	۱/۰۰
ں کے قصے	خواجہ عبدالحئی فاروقی	۱/۵
ے رسول	〃 〃 〃	۲/۴۰
ے نبی (اردو)	سید نواب علی رضوی	۱/۲۰
ے نبی (ہندی)	سید نواب علی رضوی	۰/۴۰
سرکار دو عالم	محمد حسین حسان ندوی	۳/۰۰

معلومات

کتاب	مصنف	قیمت
آدمی کی کہانی	مشتاق احمد	۲/۰۰
دکھا عجائب خانہ (چار حصے)	محمد حسین حسان ندوی (چار حصے)	۲/۰۰
بجلی کی کہانی	علی احمد خاں	۰/۵۰
پڑدادا کی کہانی	محمد عبدالغفور	۰/۸۰
تاریخ ہند کی کہانیاں (اول)	خجستہ سلطان	۱/۰۰
〃 〃 〃 (دوم)	ضیاء الرحمٰن	۱/۲۰
〃 〃 〃 (سوم)	مشتاق احمد اعظمی	۱/۰۰
〃 〃 〃 (چہارم)	〃 〃 〃	۱/۲۵
سال کے طریقے	زرینہ منظور سالامین	۱/۰۰
ے بچے	محمد حسین حسان ندوی	۱/۲۵
	ڈاکٹر مجاہد حسین زیدی	۲/۰۰

کتاب	مصنف	قیمت
رابندر ناتھ ٹیگور	صفدر حسین	[illegible]
سماجی زندگی (چار حصے)	احمد جلیل و غلام [illegible]	[illegible]
قدرت کے کرشمے	(مرتبہ) مکتبہ جامعہ لمیٹڈ	[illegible]
سمندر کے کنارے	سلطانہ آصف فیضی	۱/۰۰
سمندر کے نیچے	〃 〃	۲/۰۰
میرانیس	محمد حسین حسان ندوی	۱/۲۵
ہماری پارلیمنٹ	کیلاش چندر	۱/۲۵

کہانیاں، ڈرامے، ناول

کتاب	مصنف	قیمت
جن حسن عبدالرحمٰن (ناول) دو حصے		۵/۰۰
اس نے کیا کر دہ جانا (کہانیاں)	آصف مجیب	۰/۳۷
پریم کی جیت (ڈراما)	اسد اللہ کاظمی	۰/۳۷
نانیل خاں (کہانی)	محمد حسین حسان ندوی	۰/۵۰
ترکوں کی کہانیاں (کہانی)	مرتبہ: مکتبہ جامعہ لیٹڈ	۰/۵۵
تیس مار خاں کے کارنامے (ناول)	م۔ ندیم	۱/۵۰
تین اناڑی (ناول)	عصمت چغتائی [illegible]	[illegible]
چھپاوت کا آدم خور شیر (کہانی)	محمد معین	۰/۳۵
چھوٹی لالٹین	مشتاق احمد	۰/۳۵
چقماق کی ڈبیا	برکت علی فراق	۰/۳۰
خربوزہ شہزادے کا سر بن گیا	کوثر بانو	۰/۴۰
شیدا	پروفیسر محمد مجیب	۰/۵۰
چنبیلی	محمد حسین حسان ندوی	۰/۵۰
ستاروں کی سیر (ناول)	کرشن چندر	۲/۰۰
کوے دادا (سچی کہانی)	مجیب احمد خاں	۲/۰۰
لال مرغی (کہانی)	عبدالواحد سندھی	۰/۵۰
مزہ چکھائیں گے (〃)	مرتبہ: مکتبہ جامعہ لیٹڈ	۰/۲۵
مزے دار پہیلیاں	(مرتبہ) محمود علی خاں (زیر طبع)	
ننھا ٹٹو (کہانی)	خورشید سلطان	[illegible]

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵

ماھنامہ

پیام تعلیم

نئی دلی ۲۵

جلد ۱۲ شمارہ ۴

اڈیٹر

ولی شاہجہانپوری

معاون

شفیعہ حسان

اپریل ۱۹۷۵ء

قیمت - فی پرچہ :- ۷۰ پیسے

سالانہ چندہ :- سات روپے

پرنٹر پبلشر سید احمد ولی نے مکتبہ جامعہ لمیٹڈ کے لیے جمال پرنٹنگ پریس دہلی میں چھپوا کر جامعہ نگر نئی دلی ۲۵ سے شایع کیا۔

فہرست مضامین

ہمارا گھر

جناب علقمہ شبلی

آؤ طارق ، آؤ للّو
آؤ ڈیوڈ ، آؤ ہپّو

ہم سب مِل کر دریا کنارے
مٹّی کا گھر ایک بنائیں
سامنے اک پھلواری بھی ہو
گھونگھے لائیں ، پتّھر لائیں
پھلواری کو ان سے سجائیں
ہو اک کمرہ صاف اور ستھرا
سوئیں جس میں سب مِل جل کر
ہو اک کمرہ پڑھنے کا بھی
کھلتا سا اور روشن روشن

ہندوستان بھی گھر ہے ہمارا
ہم ہیں اس کے رہنے والے
اس کو بھی ہم لوگ نبھائیں
مِل جُل کر ہم اس کو سجائیں
اس میں ایسے پھول کھلائیں
جس کی خوشبو جگ میں پھیلے
رنگ پہ جس کے ہر دل صدقے
بھارت سے ہے نام ہمارا
ہم سے ہے بھارت کی شوبھا

آؤ ڈیوڈ ، آؤ ہپّو
آؤ طارق ، آؤ للّو

بچوں سے باتیں

کہیے، مارچ کا پیام تعلیم تو آپ کو وقت پر مل گیا نا! پسند بھی آیا؟ کبھی ہم تو یہی کوشش کرتے ہیں کہ پرچہ آپ کو پسند آئے اور آپ کی معلومات میں اضافہ ہو۔ معلوم نہیں آپ کا کیا خیال ہے۔

ہم تو چاہتے ہیں کہ آپ ہمیں لکھیں کہ کیا چیز آپ کو پسند آئی یا کون سا مضمون آپ نے پسند نہیں کیا۔ مگر ہاں، یہ دھیان رہے کہ اتنا لکھنے سے کام نہیں چلے گا کہ فلاں مضمون اچھا ہے یا فلاں نظم آپ کو پسند نہیں آئی۔ ہمیں تو یہ بتائیے کہ آپ نے کسی مضمون یا کہانی کو کیوں ناپسند یا پسند کیا۔ تب ہی ہم یہ کوشش کر سکیں گے کہ پرچہ زیادہ سے زیادہ بچوں کی پسند کے مطابق ہو۔

جیسا کہ ہم نے لکھا تھا، محمد امین صاحب کا زلزلوں سے متعلق مضمون اس مرتبہ شائع کر رہے ہیں۔ محمد امین صاحب جغرافیہ کے استاد ہیں۔ انھوں نے اور بھی بہت دلچسپ اور معلوماتی مضمون عنایت کیا ہے جو بہت جلد اور شاید اگلے پرچے میں ہی آپ پڑھ سکیں۔

محترم غلام ربانی صاحب کا مضمون "چاندی کا تاج" بہت سے پیامیوں نے پسند کیا تھا۔ آپ نے ازراہِ کرم ایک اور معلوماتی مضمون مرحمت فرمایا ہے جو آئندہ شمارے میں پڑھ سکیں گے۔ ہم محترم غلام ربانی صاحب کے شکر گزار ہیں کہ اس (۸۴) سال کی عمر میں بھی آپ بچوں کو نہیں بھولے اور پیام تعلیم کی سرپرستی فرما رہے ہیں۔ ربانی صاحب بڑوں کے لیے لکھتے رہتے ہیں۔ مگر بچوں کا خیال بھی رکھتے ہیں، یہ بڑی بات ہے اور ہم سب کو ان کا احسان مند ہونا چاہیے۔

اسرار ندوی کے "شہزادہ بے نظیر" کو سب ہی نے پسند کیا۔ اس شمارے میں یہ کہانی ختم ہو رہی ہے۔ کئی پیامیوں کا اصرار ہے کہ اسرار صاحب ایسی ہی کوئی اور مزے دار کہانی سنائیں۔

جیسا کہ ہم نے پہلے کہا تھا "بڑے ادیب" بچوں کے لیے لکھنا کسرِ شان سمجھتے ہیں۔ حالانکہ ان میں سے بہت سے ایسے ہیں جنھوں نے بچوں کے اخبار اور رسائل کے ذریعہ ادب کی دنیا میں قدم رکھا اور جب مشقِ سخن بڑھی تو بچوں کو بھول گئے۔ یہی حال شاعر حضرات کا ہے۔

شاعروں کی بات چلی تو محترم محمد شفیع الدین نیّر صاحب یاد آئے۔ موصوف نے وعدہ کیا تھا کہ جلد ہی کوئی نظم عنایت فرمائیں گے۔ ہماری بدقسمتی سے وہ بیمار ہو گئے۔ اس سے قبل بھی معیادی بخار انھیں خاصا پریشان کر چکا ہے بہت کمزور ہو گئے تھے۔ اچھی طرح صحت بحال بھی نہیں ہوئی تھی کہ پھر طبیعت خراب ہو گئی۔ ہم بھی دعا کرتے ہیں اور پیامی بچے اور بچیاں بھی دعا کریں کہ خدا نیّر صاحب کو جلد صحتِ کلی عطا فرمائے۔

آج کل تقریباً تمام پیامی بھائی بہن اپنے اپنے امتحانوں کی تیاری میں مصروف ہوں گے۔ خدا ان سب کی محنت کا اچھا صلہ دے۔

**

جناب ظہیر کرناٹکی

لالچ کا انجام

اک لوبھی نے مرغی پالی
پیاری پیاری بھولی بھالی

مرغی روز اک انڈا دیتی
انڈا تازہ اچھا دیتی

انڈے بیچا کرتا لوبھی
اور گذارا کرتا لوبھی

اک دن یہ سوچا لوبھی نے
گھنٹوں گھر میں بیٹھے بیٹھے

مرغی میں ہیں ڈھیروں انڈے
سارے انڈے پاؤں کیسے

سارے انڈے اک دم لے لوں
تب ان کو لے جا کر بیچوں

دولت والا بن جاؤں میں
عزت والا بن جاؤں میں

جھٹ سے جا کر چاقو لایا
مرغی کو پاؤں میں دبایا

ڈالا چاقو پیٹ میں اس کے
خون لگا مرغی کا بہنے

مر گئی مرغی پھڑ پھڑا کر کے
پڑ گئی اس کے سامنے مر کے

انڈا اس میں ایک نہ پایا
تب لوبھی کو رونا آیا

مرغی کی بھی جان گنوائی
دولت پھر بھی ہاتھ نہ آئی

لالچ کا انجام برا ہے
بچو لالچ بری بلا ہے

بھولے سے لالچ مت کرنا
بچو یاد ہمیشہ رکھنا

★

جناب اکرام احمد جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی

سائنس کی دنیا

(یہ مضمون آکاش وانی سے اردو مجلس پروگرام میں ۲۰ مارچ ۷۵ء کو نشر کیا جاچکا ہے)

(۱) انسانی غذا میں پروٹین کی موجودگی بہت ضروری ہے۔ جسم کے بڑھنے، رگ پٹھے بنانے اور ہڈیاں مضبوط کرنے کے لیے ضروری ہے۔ اس کی کمی سے بچوں کی جسمانی اور دماغی ترقی رُک جاتی ہے۔ ہندوستان کی آبادی کا ۱۵ فیصدی حصّہ ۵ سال سے کم عمر کے بچے ہیں۔ ایک سروے کے مطابق ہندوستان میں غریب گھرانوں کے بچوں کا وزن اور قد دوسرے ملکوں کے بچوں سے ۱۰ فیصد کم ہے، اور اس کی بڑی وجہ ہے مناسب مقدار میں پروٹین کا نہ ملنا۔ چھوٹے بچوں میں پروٹین کی کمی کے باعث طرح طرح کی بیماریاں پیدا ہو جاتی ہیں۔ بچوں کے ہاتھ پاؤں سوکھ جاتے ہیں۔ آنکھوں کی چمک ختم ہو جاتی ہے۔ پیٹ پھول جاتا ہے، بالوں کا رنگ ہلکا پڑ جاتا ہے۔ چہرہ سپاٹ اور کھال بے رونق ہو جاتی ہے۔ پروٹین کی مستقل کمی کی وجہ سے خون کے سرخ ذرّات کم ہو جاتے ہیں۔ بخار رہنے لگتا ہے اور انیمیا (ANAEMIA) نام کی بیماری ہو جاتی ہے۔ چھوٹے بچوں میں یہ بیماری ہندوستان میں عام ہے۔ تقریباً ۵۰ فیصدی بچے پروٹین کی کمی کے باعث کسی نہ کسی بیماری کا شکار ہیں۔ جسم کمزور ہونے کے باعث دوسری بیماریوں کے جراثیم بچوں پر آسانی سے حملہ کر سکتے ہیں۔ جنوبی اور مشرقی ہندوستان کے چاول کھانے والے علاقوں میں پروٹین کی کمی کی وجہ سے کواشیورکر (KWASHIORKAR) نامی بیماری عام ہے۔

پروٹین کی کمی سے جہاں ایک طرف جسم اور دماغ کمزور ہوتا ہے وہاں ایک اور خطرہ بھی ہے۔ پروٹین کی کمی سے عورتوں میں زرخیزیت بڑھ جاتی ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ غریب گھروں میں اولاد نمو ماً زیادہ ہوتی ہے۔

ہندوستان میں یوروپی ملکوں کے مقابلے میں پروٹین آدھی مقدار میں میسر ہے۔ اس میں سے بھی تقریباً ۸۸ فیصدی پودوں کی پروٹین اور صرف ۱۲ فیصدی جانوروں کی پروٹین لی جاتی ہے۔ ہندوستان میں روزانہ ایک آدمی اوسطاً ۷ گرام پروٹین کھاتا ہے جب کہ امریکا میں ایک آدمی ۷۲ گرام پروٹین روزانہ کھاتا ہے۔ اِس وقت سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ کس طرح

زیادہ مقدار میں سستی پروٹین لوگوں کو مہیا کی جائے زیادہ آبادی
سبزی خور ہے اسی لیے پودوں کی پروٹین پر خاص دھیان
دیا جا رہا ہے۔ تلہن، بنولے۔ کائی اور مختلف پودوں کی
پتیوں سے کھانے لائق پروٹین بنانے کی کوشش کی جا رہی
ہے۔ بلکہ بعض سائنسدان تو اس فکر میں ہیں کہ بیکار کاغذ
سے بھی پروٹین بنائی جائے۔ لیکن ان تمام کوششوں میں
سب سے زیادہ کامیابی سویابین سے ملی ہے۔ یہ لوبیے
کی شکل کی ایک دال ہے۔ پتہ لگایا گیا ہے کہ نباتاتی پروٹین
کا سب سے سستا اور بھرپور ذریعہ سویابین ہے۔ جن اشیا
سے عام طور پر ہم پروٹین پاتے ہیں ان کے نام ہیں دودھ
چاول، گیہوں، انڈا۔ مچھلی، گوشت اور مونگ پھلی۔ ان
میں سب سے کم پروٹین دودھ، چاول اور گیہوں میں
پائی جاتی ہے۔ انڈا، مچھلی۔ گوشت اور مونگ پھلی
میں پروٹین کی کافی مقدار پائی جاتی ہے۔ لیکن سب سے
زیادہ پروٹین سویابین میں ہوتی ہے۔ سائنسدانوں نے
دریافت کیا ہے کہ ایک کلوگرام سویابین اتنی پروٹین جتنی
دو کلو گوشت یا مچھلی میں یا تین کلو انڈوں میں یا ڈیڑھ
کلو مونگ پھلی میں یا ۱۲ کلو دودھ میں۔ ایک آدمی کو ضروری
مقدار میں پروٹین کھانے کے لیے روزانہ ۷۵ گرام گوشت
یا ۳۰۰ گرام دودھ یا دو انڈے کھانے چاہئیں۔ اگر ان
کی قیمت نکالیں تو ایک آدمی ہر روز کا خرچ اس طرح
آئے گا۔ ۷۵ پیسے کا گوشت یا ۶۶ پیسے کا دودھ یا
۸۰ پیسے کے دو انڈے۔ لیکن سویابین پر روزانہ صرف
۱۸ پیسے خرچ ہوں گے۔ سویابین نہ صرف سستی ہے
بلکہ اس میں پائی جانے والی پروٹین اعلیٰ کوالٹی کی بھی
ہے اس میں لیسائن (LYSINE) نامی جز سب
سے زیادہ ہوتا ہے۔ یہ قوت بخشنے والا ایک ضروری
جز ہوتا ہے۔ اگر گیہوں کے آٹے میں ۲۰ فیصدی سویابین
کا آٹا شامل کر دیا جائے تو آٹے کی غذائی قوت دوگنا ہو
جاتی ہے جو لوگ ذیابیطس (DIABETES) اور
اعصابی بیماریوں کے مریض ہوں ان کے لیے سویابین
کا آٹا بہترین ہے۔

سویابین سے کئی قسم کی کھانے کی چیزیں بنائی جا رہی
ہیں:-

پنت نگر فارم یونیورسٹی نے سویابین سے دودھ
تیار کیا ہے اس کا نام انھوں نے "سویا دودھ" رکھا
ہے۔ یہ دیکھنے میں بالکل دودھ جیسا ہے۔ لیکن اس
میں عام دودھ سے کم شکر اور چکنائی ہوتی ہے۔ لیکن
پروٹین اصل دودھ کے برابر ہوتی ہے۔ جو لوگ شکر
اور چکنائی سے پرہیز کرتے ہیں۔ ان کے لیے سویا دودھ
عام دودھ سے بہتر ہے۔

پنت یونیورسٹی نے ایک اور غذا تیار کی ہے۔
اس کا نام انھوں نے نٹری نگٹ (NUTRI NUGGET)
رکھا ہے اس میں بکری کے گوشت سے تقریباً تین گنا
پروٹین پائی جاتی ہے۔ اس کے علاوہ اس میں نمکیات
اور وٹامن بھی کافی ہوتے ہیں۔ اس لیے اس کو "مصنوعی
گوشت" بھی کہا جاتا۔

ان کے لیے کئی اور قسم کی کھانے کی اشیا بھی سویابین
سے تیار کی گئی ہیں جیسے پروٹین پلس (PROTIEN PLUS)
اور پروٹیسنیک (PROTESNAG) وغیرہ

غرض سویابین ہندوستان کے لیے ایک بڑی نعمت
ہے۔ اس کے روزانہ استعمال سے سستی اور اچھی خوراک
مل سکتی ہے۔

(۲) بوسٹن یونیورسٹی کے میڈیکل سنٹر نے ایک مقالہ شائع

کیا ہے اس میں بتایا گیا ہے کہ کافی پینے والوں کو ہارٹ اٹیک (HEART ATTACK) کا زیادہ ہوتا ہے۔

۱۲،۷۵۹ مریضوں کا ایک سروے کیا گیا جس سے معلوم ہوا کہ کافی پینے والوں میں زیادہ تر دل کے مریض تھے۔ جو لوگ ایک دن میں ۵ پیالی تک کافی پیتے ہیں اُن میں ۶۰٪ پر دل کا دورہ پڑنے کا اندیشہ ہے جو ۶ سے زیادہ پیالیاں روزانہ پیتے ہیں ان میں اس بیماری کا ۱۰۰٪ ڈر رہتا ہے ایک اطمینان بخش انکشاف یہ بھی ہوا کہ چائے پینے والوں کو دل کے مرض کا کوئی خطرہ نہیں۔ کافی اور چائے دونوں ہی میں کیفین (CAFFEINE) نامی زہر پایا جاتا ہے۔ پھر چائے اور کافی میں اتنا فرق کیوں ہے؟ اس کا ابھی کوئی جواب نہیں مل سکا۔ لیکن سائنسدانوں کا خیال ہے کہ کافی میں کوئی اور زہر بھی ضرور ہوتا ہے جس کے باعث ہارٹ اٹیک (HEART ATTACK) ہوتا ہے۔ اس زہر کا پتہ لگانے میں سائنسدان مصروف ہیں۔

(۳) زمین کے اندر معدنیات کا پتہ لگانے کے مختلف سائنسی طریقے ہیں لیکن کیا پودوں کے ذریعہ بھی یہ کام کیا جا سکتا ہے؟ جی ہاں' ساگر یونیورسٹی کے دو ماہرین ارضیات نے زمین میں پوشیدہ معدنیات کا پتہ لگانے کا ایک نیا اور آسان طریقہ دریافت کیا ہے۔ انھوں نے ایک ایسا پودا تلاش کیا ہے۔ جس کے ذریعہ تانبا، جست رانگ کے ذخائر معلوم کیے جا سکتے ہیں۔ اس پودے کو شمالی حصّہ میں (KHIDHERDHI) کدھر دہی اور جنوبی ہند میں (NALLAQANDA) نالاگنڈا کہتے ہیں اس پر چھوٹے رنگ کے پھول لگتے ہیں۔ دونوں سائنسدانوں کا کہنا ہے کہ جس علاقے میں یہ پودا پایا جائے گا وہاں تانبا، جست اور رانگ موجود ہو سکتے ہیں۔

تامل ناڈو کے (ARCOT) ارکوٹ ضلع کے (MA MUNDUR) مامندور علاقے میں نالاگنڈا پودے کثرت سے پائے جاتے ہیں۔ ان پودوں کو جلا کر راکھ کا جب تجزیہ کیا گیا تو اس میں مٹی کے مقابلے میں ساڑھے پانچ گنا تانبا اور چار گنا جست پایا گیا۔ مامندور میں تانبے کے ذخائر ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کے نالاگنڈا پودے کی نشو و نما کے لیے تانبا، رانگ اور جست بنیادی دھاتیں ہیں۔ ممکن ہے دوسرے پودوں کو بھی کسی نہ کسی دھات کی ضرورت ہوتی ہو اور اُن کے ذریعہ ان دھاتوں کا سراغ لگایا جا سکے اگر ایسا ہو گیا۔ تو پھر زمین کے خزانے کو آسانی سے تلاش کیا جا سکے گا۔ اور پودوں کے ذریعہ معدنیات کا پتہ لگانے کا یہ طریقہ بہت سستا بھی ہوگا۔

(۴) آپ کو یاد ہوگا ۴۔ دسمبر ۱۹۷۴ء کو پایونیر گیارہ (PIONEER-11) سب سے بڑے سیارے زحل (SATURN) کے ۴۱،۰۰۰ کلومیٹر قریب تک پہنچ گیا تھا۔ اس سے ایک سال پہلے پایونیر دس (PIONEER-10) بھی زحل کے قریب پہنچ گیا تھا لیکن اس وقت اس کا فاصلہ زحل سے ۱،۲۰،۰۰۰ کلومیٹر تھا۔ اب خبر ملی ہے کہ میرینر دس (MARINER 10) مرکری (MERCURY) کے قریب پہنچ گیا ہے۔ ۱۶۔ مارچ ۱۹۷۵ء کو یہ مرکری کے شمالی قطب سے صرف ۲۱۰ کلومیٹر کے فاصلے سے گزرا اس نے جو فوٹو بھیجے ہیں اس سے ہم کو اس سیارے کے مقناطیسی میدان کے بارے میں مفید معلومات مل سکیں گی۔

باقی صفحہ ۲۵ پر

محترمہ ناصرہ شرما

نیکی کیا ہے!

ایک بوڑھا بہت دنوں سے بیمار تھا۔ ایک دن جب اس کی حالت بہت خراب ہو گئی تو اس کے تینوں بیٹے اس کے گرد بیٹھ گئے اور رونے پیٹنے لگے۔ بوڑھے نے کہا "میرے جگر کے ٹکڑو! میں ابھی نہیں مروں گا۔ میرے پاس تمھاری ماں کی آخری نشانی ان کا ایک زیور ہے میں اس کے تین حصے نہیں کرنا چاہتا اس لیے میری دلی خواہش ہے کہ تم ایسے نیک کام کرو کہ تم میں سب سے بہتر کام کرنے والے کو یہ زیور انعام میں دوں اور سکون سے مر سکوں۔ میں اپنے فرض سے سبکدوش ہونا چاہتا ہوں یہی میری خواہش ہے"

تینوں بیٹے اپنے راستہ نکل گئے۔ کچھ دنوں بعد تینوں جمع ہوئے اور بڑے بیٹے نے باپ سے کہا۔ "مہربانی کر کے مجھے وہ زیور عنایت کیجیے کیونکہ میں ہی انعام کا حق دار ہوں"

"وہ کیسے" باپ نے پوچھا

"ایک دن میں ندی کے کنارے ٹہل رہا تھا کہ مجھے ایک ڈوبتا آدمی دکھائی دیا۔ فوراً اپنی جان خطرہ میں ڈال ندی میں کود پڑا اور بڑی کوشش سے اسے باہر نکالا اور اس کی جان بچائی۔ کتنا اچھا کام کیا ہے"

باپ نے کچھ جواب نہیں دیا خاموش رہا۔

دوسرے بیٹے نے کہا "یہ کون سا بڑا کام کیا ہے تم نے۔ میری سنو۔ ایک مہینہ پہلے میں نے ایک شخص سے پانچ دیناریں لیں تھیں۔ وہ بھول گیا تھا۔ کل جب میں نے اسکو واپس کیا تو وہ حیرت میں پڑ گیا اور بعد میں بڑا خوش ہوا۔ میں چاہتا تو واپس نہ کرتا کتنا بڑا کام ہے یہ"

باپ تب بھی خاموش رہا۔ چھوٹے بیٹے نے آگے بڑھ کر سر خم کیا اور اپنی داستان سنانے کی اجازت چاہی۔

وہ بولا "چند سال پہلے ایک شخص نے میرے ساتھ ایسا خراب کام کیا تھا کہ میری موت بھی واقع ہو سکتی تھی اور عزت بھی ختم ہو سکتی تھی۔ کل میں جب پہاڑ پر گھومنے گیا تو دیکھا وہ عرصہ بعد سوتے ہوئے ہ وہ ایک بڑے پتھر پر سو رہا تھا اور جب اس نے کروٹ بدلی تو ایک دم کنارے پر پہنچ گیا۔ میں چاہتا تو اسے مرنے دیتا۔ مگر میرے ضمیر نے مجھے مجبور کیا اور میں خاموشی سے بنا آواز کیے اس کے پاس پہنچا اور آہستہ آہستہ اس کو بیچ پتھر تک سرکالا اور وہ سوتا رہا اس کو معلوم نہ ہو سکا کہ سوتے میں اس کے ساتھ کیا ہوا۔

باقی صفحہ ۳۸ پر

جناب احمد خالد ندیم

سچا دوست

آئینہ پر آخری نظر ڈالنے کے لیے آصف مڑا اور اپنے آپ کا جائزہ لینے لگا۔ کالے نیکر پر آسمانی رنگ کی دھاری دار قمیض اس کے اوپر خوب کھل رہی تھی۔ اس نے ایک بار پھر اپنے آپ کو داد دی اور سنگھار میز پر سے کنگھی اٹھا کر اپنے چمکیلے بالوں پر پھیرنے لگا۔ آصف نے بڑی احتیاط سے بالوں کی ایک لٹ اپنی بالوں پر گرائی اور مسکرا دیا، اس نے ایک فلم دیکھ کر ہی اس طرح پیشانی پر بال گرانا سیکھا تھا اور اس کے دوست اسلم کو اس کا یہ روپ بہت پسند تھا۔ آئینہ چھوڑنے کو اس کا جی نہیں چاہ رہا تھا۔ لیکن گھڑی میں ساڑھے دس بج گئے تھے اور اُسے ابھی اسکول جانا تھا۔ جوتوں کے تسمے باندھ کر وہ کچن میں آیا جہاں امی جان اس کے لیے ناشتہ تیار کر رہی تھیں۔ آصف کو دیکھتے ہی امی بول پڑیں۔

"کہو آصف! تیار ہو گئے۔؟"

"جی امی! لائیے ناشتہ ـــ" اس نے مسکرا کر کہا
امی جان نے ناشتہ میز پر لگا دیا اور وہ کھانے میں جٹ گیا۔

"امی! ـــ وہ ہسٹری کی کتاب خریدنی ہے روپے دے دیجیے" پراٹھے کا لقمہ منہ میں ڈالتے ہوئے آصف بولا۔

"ماسٹر جی نے ہوم ورک دیا ہے۔"

"ہسٹری کی کتاب تو تم خرید لائے تھے" امی نے چونک کر پوچھا۔

"جج ..... جی ...." آصف ہچکچاتے ہوئے بولا۔ "وہ دراصل چوری ہو گئی امی۔"

"پچھلے ہی ہفتہ تمھاری دو کتابیں چوری ہو چکی ہیں اور آج پھر گنوا آئے۔ میں کہتی ہوں تم کلاس میں سوتے رہتے ہو کیا۔؟" امی جھنجھلا گئیں۔ لیکن آصف جب ناشتہ کر چکا تو امی نے اسے روپے دے ہی دیے۔

آصف سیٹی بجاتے ہوئے خوشی سے جھومتا ہوا کاندھوں پر کتابوں کا بیگ لٹکائے ہوئے اسکول پہنچا، گیٹ پر ہی اس کی ملاقات اسلم سے ہو گئی۔ دونوں ایک دوسرے کو دیکھ کر مسکرانے لگے۔

ان دونوں میں بہت گہری دوستی تھی۔ کلاس میں اسلم اور آصف کو لڑکے "ڈبل اے" کہا کرتے تھے، ہر جگہ وہ ہمیشہ ایک ساتھ نظر آتے تھے ـــ دونوں ایک دوسرے کے گھر بھی آیا جایا کرتے تھے۔

آصف کے ابو ایک سرکاری ادارے میں جونیر افسر تھے۔ وہ اُسے بہت چاہتے تھے اور اسلم کے ابا کپڑے کی تجارت کرتے تھے۔ اس کے ابا مذہبی اصولوں کے بہت پابند تھے۔ لیکن اسلم کو سینما

کی رنگین تصویروں سے عشق ہوگیا تھا۔ سینما جاتے وقت وہ اس گلی یا سڑک سے ہرگز نہ گذرتا جس پر کوئی مسجد واقع ہوتی، کیونکہ اسے وہاں ابّا حضور کے موجود ہونے کا ڈر رہتا تھا۔

اسلم کو جو کچھ بھی جیب خرچ گھر سے ملتا تھا وہ اس سے سینما دیکھا کرتا تھا۔ اور ساتھ میں آصف کو بھی لیجاتا تھا۔ آصف اس کے اس روّیہ سے بہت خوش تھا کہ وہ اسے ہر دفعہ اپنے ساتھ سینما لیجاتا تھا۔ اس کے نزدیک اسلم اس کا سچا دوست تھا۔

سینما کی رنگین تصویروں نے ان دونوں کا دل اپنی طرف ایسا کھینچا کہ وہ کلاس چھوڑ کر سینما دیکھنے جانے لگے اکثر کلاس سے غیر حاضر رہنے کی وجہ سے دونوں پڑھائی میں پچھڑتے چلے جا رہے تھے۔ آصف کی نظر میں اسلم دوستی کا فرض نبھا رہا تھا لیکن وہ خود اسلم کو سینما نہیں دکھاتا تھا۔ اس بات کا اسے بہت دکھ تھا۔ آصف نے اپنا جیب خرچ جمع کرنا شروع کر دیا اور جب دو چار روپے جمع ہو جاتے تو وہ بھی اسلم کو سینما دیکھنے کی دعوت دے ڈالتا اب آصف کو سینما کا رنگ روپ ایسا بھایا کہ روزانہ نہیں تو کم از کم ہر تیسرے دن ایک شو ضرور دیکھنا چاہتا تھا۔ لیکن آمدنی اس کی اجازت نہیں دیتی تھی اسی لیے اس نے اس مسئلے کو اسلم کی مدد سے سلجھانا چاہا ــ "اسلم! جیب خرچ سے تو گذارہ مشکل ہے۔ اب میں کیا کروں؟ چوری کرتے ڈر لگتا ہے کیونکہ گھر میں میرے سوا کوئی دوسرا نہیں ہے۔ ابّو برابر باہر ہی رہتے ہیں۔ پھر اگر ایک پیسہ غائب ہو تو میں دھر لیا جاؤں گا۔"

"فکر نہ کرو۔" اسلم نے آنکھیں نچاتے ہوئے کہا: "سنو۔ تم ہر تیسرے دن اپنی ایک دو کتابیں بازار میں بیچ دیا کرو اور گھر میں کہہ دیا کرنا کہ چوری ہوگئی تاکہ تمھیں کتابیں خریدنے کے لیے پھر روپے مل جائیں میں بھی اس ترکیب کو آزما چکا ہوں۔"

اسے اسلم کی یہ ترکیب بہت پسند آئی اور وہ اس کے دماغ کی تعریف کیے بغیر نہ رہ سکا۔ اور اس طرح اس نے خود اپنے پیروں پر کلہاڑی مارنا شروع کر دیا۔ اور کتابوں کی سنگت سے دور ہوتا گیا۔

لیکن اب اس کی امّی جان کتابوں کی چوری سے عاجز آ چکی تھیں اور انھوں نے اب مزید روپے دینے سے انکار کر دیا تھا۔ آصف کی حالت خراب ہونے لگی پیسوں کی کمی کی وجہ سے اس نے اسلم کو سینما دکھانا بند کر دیا کیونکہ اب وہ خود کئی کئی دن تک سینما دیکھنے کے لیے ترستا تھا۔ لیکن اس کا خرچ پھر کبھی پورا نہ ہو سکا۔ آصف کی عادت اتنی بگڑ چکی تھی کہ پیسوں کی کمی اسے پریشان کرنے لگی۔

ایک دن عاجز آ کر اس نے اپنے دوست اسلم ہی کی دو کتابیں اس کے بیگ سے غائب کر دیں۔ لیکن دوسرے دن وہ اپنے بیگ سے دو کتابیں غائب دیکھ کر سکتے میں آ گیا۔ اس نے بھرپور نظروں سے اسلم کو دیکھا۔ اس نے بھی آصف کو گھورنا شروع کر دیا، آصف اس کی نظروں کی تاب نہ لا سکا، دونوں کے دل دھڑک رہے تھے دونوں چور تھے لیکن ایک دوسرے کو الزام نہیں دے سکتے تھے۔

کتابوں کی دوری نے آصف کو پڑھائی میں چوپٹ کر کے رکھ دیا تھا ششماہی امتحان میں وہ کئی مضامین میں فیل ہو گیا تھا اور اب سالانہ امتحان قریب تھا لیکن اس کی پڑھائی بالکل نہیں ہو رہی تھی۔ ایک بار اس نے امی سے رو کر کہا کہ وہ اسے کتابوں کے لیے

روپے دے دیں ورنہ وہ پاس نہ ہوسکے گا۔ امی نے اس کی درخواست پر غور کیا۔ لیکن ایک شرط لگادی۔

"میں خود چل کر کتابیں خریدوں گی۔" ان کی شرط نے آصف کو بوکھلا دیا۔ اسے خوف تھا کہیں امّی اسی دکان پر نہ پہنچ جائیں جہاں وہ کتابیں بیچا کرتا تھا۔

اس نے امی کے ساتھ نہ جانے کے لیے بہت بہانے تراشے لیکن وہ نہیں مانیں، آخر اُسے ان کے ساتھ جانا ہی پڑا۔ وہ امّی کو اس دکان پر نہیں لیجانا چاہتا تھا اس لیے وہ انہیں دوسری دکانوں پر لے گیا لیکن وہاں کتابیں نہ مل سکیں۔ اب آصف اپنا بھید کھل جانے کے ڈر سے پریشان تھا اور خوف سے اس کا چہرہ پیلا پڑا جا رہا تھا۔

اس دکان پر مالک کو موجود نہ پاکر آصف کے کچھ جان آئی لیکن ابھی خطرہ پوری طرح ٹلا نہیں تھا کیونکہ دوکان پر جو نوکر تھا۔ اس نے آصف کو کئی بار دیکھا۔ نوکر نے امّی کو کتابیں دکھادیں اتفاق سے ان کتابوں میں آصف کی بیچی ہوئی کتاب بھی شامل تھی۔ امی آصف کی کتابیں دیکھ کر حیران رہ گئیں ــــ انھوں نے نوکر سے پوچھا۔

"یہ کتابیں کون بیچنے آیا تھا؟"

امّی جان کا یہ سوال آصف پر بجلی بن کر گرا وہ بدحواس ہوا جا رہا تھا نوکر سے نظریں ملاتے ہوئے اسے خوف محسوس ہو رہا تھا اس لیے وہ سڑک کی طرف منھ کر کے کھڑا ہوگیا، لیکن اس کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ اسے لگا جیسے کوئی چیخ چیخ کر کہہ رہا تھا: "یہی ہے وہ جو کتابیں بیچنے آیا تھا۔ یہی لڑکا ــ ہاں جو آپ کے ساتھ ہے۔ آپ کا اپنا بیٹا...... چور...... چور...."

آصف نے انجانے خوف سے اپنے کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیں اور آنکھیں بند کر کے دل ہی دل میں خدا سے گڑگڑانے لگا۔ "میرے اللہ! مجھ سے سخت غلطی ہوئی ہے میں تجھ سے سچے دل سے معافی مانگتا ہوں مجھے رسوا ہونے سے بچالے میرے مالک...."

"پتہ نہیں میم صاحب بے شمار لڑکے کتابیں بیچنے آتے ہیں، اب کس کس کی صورت یاد رکھوں؟" نوکر کے جواب نے آصف کو جیسے قبر سے باہر کھینچ لیا تھا لیکن دوکان کی طرف مڑنے کی ہمّت اب بھی اس میں نہ ہوئی امی نے اسے کانوں میں انگلیاں ٹھونسے دیکھا تو مسکرادیں۔

"یہ کان کیوں بند کر رکھے ہیں آصف؟"

"بہت شور ہے امی ــــ دیکھیے نا، بسیں چیخ رہی ہیں، کاروں کے ہارن سے کان کے پردے پھٹے جا رہے ہیں۔" آصف نے سنبھلتے ہوئے پھیکی مسکراہٹ کے ساتھ جواب دیا۔

گھر پہنچ کر اس نے سب سے پہلے تمام کتابوں کو اپنے سینے سے چمٹالیا اور رونے لگا جیسے کوئی اپنے بچھڑے بھائی سے ملنے کے بعد روتا ہے۔ کتابوں کو پھر سے پا جانے کی خوشی میں وہ دیوانہ ہوا جا رہا تھا۔

آصف نے دن رات سخت محنت کی اور اپنا ادھورا کورس مکمل کیا۔ امتحان میں وہ اچھے نمبروں سے کامیاب ہوا تھا۔ ایک بار اس نے پھر اپنی کتابوں کو پیار سے چوما، اس کی آنکھوں میں آنسو چھلک آئے اب اسے معلوم ہو چکا تھا کہ اسلم اس کا سچا دوست ہرگز نہیں تھا، یہی کتابیں اس کی رفیق تھیں جنھوں نے اسے ڈوبنے سے بچایا تھا۔ کیونکہ سچے دوست ہی مصیبت میں کام آتے ہیں۔

★ ★

جناب شکیل فرحت انصاری

جاوید نے جس دن سے اسکول میں داخلہ لیا تھا اسی دن سے وہ پرویز کے طنز بھرے جملوں اور اس کی آئے دن کی شرارتوں کا نشانہ بنتا آیا تھا۔ پرویز اپنے دوستوں کے ساتھ مل کر جاوید کی لنگڑی ٹانگ کا مذاق اڑاتا اور قہقہے لگاتا۔

"کبھی جب یہ لولے لنگڑے ہی پڑھنے لگیں گے تو اپنی سب کی تو چھٹی ہو جائے گی۔"

وہ ہنس کے اپنے دوستوں سے کہتا۔ کبھی جاوید کو مخاطب کر کے کہتا۔

"لنگڑو میاں چھوڑو یہ پڑھنا لکھنا، تعلیم تمہارے کس کام کی پڑھ لکھ کر تم سے نوکری کے لیے در در کی خاک بھی چھانی نہ جائے گی اور پھر لنگڑے اپاہج کو نوکری بھی کون دے گا" وہ ہمیشہ اسے لنگڑو میاں ہی کہہ کر مخاطب کرتا۔

کبھی کہتا "لنگڑو میاں تمہارا مستقبل اندھا کنواں ہے۔ طالب علم تو قوم کے مستقبل کے معمار ہوتے ہیں اور جو خود اپنے پیروں پر کھڑا نہیں ہو سکتا وہ قوم کے لیے کیا کرے گا۔"

کبھی وہ بڑی بیدردی سے کہتا "لنگڑو میاں تمہاری زندگی بیکار ہے، کسی مصرف کی نہیں، تم زمین پر بوجھ ہو۔ جس کار سے تمہاری ٹانگ ٹوٹی ہے اسی سے تم مر بھی گئے ہوتے تو زمین کا بوجھ ہلکا ہو گیا ہوتا۔"

جاوید کے دل میں پرویز کے طنز اور حقارت بھرے جملے تیر کی طرح چبھتے لیکن واہ رے ضبط۔ جاوید پرویز کو ایک لفظ نہیں کہتا۔ اس کے خلاف کبھی لفظ شکایت زباں پر نہ لاتا۔ پرویز سے انتقام لینے کا جذبہ اس کے دل میں کبھی نہیں ابھرتا۔ اس کی نظر میں دشمن کو معاف کر دینا ہی بہتر انتقام تھا اور اس قول پر عمل بھی کرتا۔

ایک دن اس نے پرویز سے کہا "پرویز آخر میں نے تمہارا کیا بگاڑا ہے جو تم ہاتھ دھو کر میرے پیچھے پڑے ہو۔ ایک کلاس میں پڑھنے والے سبھی لڑکے آپس میں دوست ہوتے ہیں۔ پھر تم مجھے اپنا دوست کیوں نہیں سمجھتے۔"

"میں ایسے ٹوٹے پھوٹوں کو دوست نہیں بناتا" پرویز نے حقارت سے کہا۔

"لیکن پرویز" جاوید کا لہجہ جذباتی ہو گیا "میں تمہیں اپنا دوست سمجھتا ہوں اور انشاءاللہ ایک دن اس دوستی کا حق بھی ادا کر دوں گا۔"

جاوید ایک یتیم اور اپاہج لڑکا تھا۔ ایک کار کے
حادثے نے اس کی ایک ٹانگ اس سے جدا کر دی تھی۔
وہ بیساکھی کا سہارا لیکر چلتا تھا۔ اسے تعلیم حاصل کرنے
کا بیحد شوق تھا۔ وہ بہت ذہین اور محنتی لڑکا تھا اس
نے تھوڑے ہی دنوں میں اپنی ذہانت کا لوہا منوا لیا تھا
پرویز اسی سبب سے اس سے جلنے لگا تھا۔

پرویز شہر کے معزز اور امیر ترین بزنس مین سیٹھ
درانی کا لاڈ پیار میں پلا اکلوتا بیٹا تھا۔ اس کے والد
اسکول کمیٹی کے سیکریٹری بھی تھے۔ اس لیے اسکول کا
اسٹاف اس کی شرارتوں سے تنگ آکر بھی اس کے خلاف کوئی
کاروائی نہیں کرتا تھا۔ وہ پورے اسکول میں شرارتی مشہور
تھا سارے لڑکے بھی اس کی شرارتوں سے عاجز تھے
لیکن وہ پھر بھی پرویز اور اس کے ساتھیوں سے ڈرتے
تھے۔ اسکول میں ایک تقریری مقابلہ ہوا جس میں جاوید
اور پرویز نے بھی حصہ لیا۔ جاوید کی تقریر بے حد
پسند کی گئی اسے فرسٹ پرائز سے نوازا گیا۔ پرویز
کی تقریر کسی نے توجہ سے سنی بھی نہیں۔ ہوٹنگ کے درمیان
پرویز اپنی تقریر ادھوری چھوڑ کر اپنی جگہ پر بیٹھ گیا اور
جب جاوید کو پہلا انعام ملا تو وہ جل کے رہ گیا۔

ایک تحریری مقابلے میں بھی جاوید کو پہلا انعام ملا
اس طرح ہر مقابلوں میں جاوید فرسٹ سیکنڈ انعام پاتا
رہا اور پرویز اس کی کامیابی دیکھ دیکھ کر حسد کی آگ
میں جلتا رہا۔ سلگتا رہا۔ اس نے اپنی شرارتوں میں اضافہ
کر دیا لیکن مجال ہے جو جاوید کی پیشانی پر شکن تک
آجائے۔

نویں جماعت کے امتحان میں جاوید اپنی محنت
کے بل پر پورے اسکول میں فرسٹ آیا اور پرویز بھی
اپنی دولت کے بل پر پاس ہو گیا اور اس کی کامیابی پر
اسے اپنے والد کی طرف سے کار انعام میں ملی۔ اب وہ
کار میں اسکول آنے جانے لگا۔

جاوید اب تمام ٹیچروں کا منظور نظر تھا۔ اسکول
کے تمام لڑکوں میں بھی ہر دلعزیز تھا۔ وہ جادو بیان
مقرر اور بہترین طالب علم تھا۔ اسکول کمیٹی کی طرف
سے اس کا وظیفہ مقرر تھا فیس معاف تھی۔ اسکول
نے اسے کاپیاں، کتابیں بھی مفت میں دی تھیں۔

اس کے علاوہ وہ اپنے اخلاق اور حسن سلوک
کی وجہ سے بھی مشہور تھا جو بھی لڑکا اس کے پاس
اپنی ڈفیکلٹیز لے کر جاتا وہ اسے حل کر دیتا

اور پرویز اس کی مسلسل کامیابیوں کو دیکھ
دیکھ کر حسد کی آگ میں جلتا رہا۔

ایک دن پرویز نے اپنے دوستوں کے ساتھ
مل کر جاوید کو جان سے ہی ختم کرنے کا پلان بنایا۔

پلان کے مطابق دوسرے دن چھٹی ہونے پر ایک
لڑکا کسی بہانے سے جاوید کو اسکول کے پیچھے والے گراؤنڈ
میں لے گیا۔ جہاں پرویز اور اس کے ساتھی منتظر تھے۔
جاوید کو دیکھتے ہی وہ اس پر پل پڑے۔ انھوں نے اپاہج
جاوید کو مار مار کر بیہوش کر دیا۔ ان کا پلان جاوید کو مار
کر قریب ہی جو کنواں تھا اس میں ڈال دینے کا تھا لیکن
جس وقت وہ جاوید کو اٹھا کر کنویں میں ڈالنے لے
جا رہے تھے اس وقت ادھر اسکول کے ہیڈ ماسٹر
آنکلے انھیں دیکھ کر پرویز اور ساتھی بدحواس ہو گئے۔
جاوید کو چھوڑ کر وہ بھاگے اور پرویز کی کار میں بیٹھ
گئے۔ پرویز نے کار اسٹارٹ کی اور فل اسپیڈ پر
چھوڑ دی بدحواسی میں کار ایک پیڑ سے ٹکرا دی

اور بیہوش ہوگیا۔

پرویز کو جب ہوش آیا تو آنکھوں کے سامنے اندھیرا سا چھایا ہوا تھا۔ اس نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھا دھندلے دھندلے سایوں کے سوا اسے کچھ نظر نہ آیا۔ اس کی دنیا اندھیری ہوگئی۔ وہ زور زور سے رونے لگا۔ اس کی امی، اس کے پاپا نے اور ڈاکٹر نے اسے یقین دلایا کہ ابھی زخم تازہ ہیں جس سے اسے نظر نہیں آرہا ہے ایک دو دن میں آنکھیں ٹھیک ہو جائیں گی۔ جس سے اسے ڈھارس بندھی۔

سیٹھ درانی صاحب نے پرویز کے علاج پر روپیہ پانی کی طرح بہایا۔ ڈاکٹروں نے اس کی زندگی میں پھر اجالوں کو واپس لانے کی جان توڑ کوشش کی لیکن آپریشن ناکام رہا۔ پرویز نے پہلے آپریشن کے ناکام ہونے پر ڈاکٹروں کی آواز میں چھپی بے بسی سے بھری سرگوشی سنی تھی۔ صرف ایک ہی راستہ ہے کہ آنکھیں تبدیل کرائی جائیں۔ ڈاکٹر کی سرگوشی کا ایک ایک لفظ اس پر کتنا بڑا بوجھ بن گیا تھا۔ اس کی امید کا ٹمٹماتا ہوا آخری دیا بھی بجھ گیا تھا۔ اس نے جاوید کو کوسا۔ کیونکہ شاید اسی کی بددعاؤں سے وہ آج اس حالت کو پہنچا تھا۔

پرویز نے سوچا اس کو اپنی عزیز آنکھیں کون دے گا۔ کون ہوگا جو اپنی زندگی اندھیری کرکے اس کی زندگی کو روشن کرے گا۔ کوئی نہیں۔ کوئی نہیں۔ دوست تو سب اچھے وقت کے ساتھی رہتے ہیں۔ مصیبت آنے پر سب منھ پھیر لیتے ہیں۔

درانی صاحب بھی اپنی بے پناہ دولت سے اپنے نور نظر کے لیے دو آنکھیں نہیں خرید سکے۔

پرویز کا دوسرا آپریشن کیا گیا۔ آپریشن کامیاب تھا آنکھوں کی تبدیلی۔ پرویز کو یہ نہیں بتایا گیا تھا اسے کس نے اپنی آنکھیں دی تھی۔ اسے بتایا گیا تھا کہ جب وہ خود دیکھنے لگے گا۔ تب اپنے محسن کو بھی دیکھ لے گا۔

اور آج اس کی پٹیاں کھلنے والی تھیں۔ ایک تو پھر سے آنکھیں واپس آجانے کی خوشی دوسری خوشی پرویز کو اپنے محسن کے دیکھنے کی تھی جس نے اپنی دنیا اندھیری کرکے اس کی زندگی میں اجالے ہی اجالے بھر دیے تھے۔

جب پٹیاں کھلیں تو وہ خوشی سے پاگلوں کی طرح ہر چیز کو دیکھ دیکھ کر چلانے لگا۔

"ڈاکٹر! ڈاکٹر!! دیکھو مجھے سب نظر آرہا ہے امّی، پاپا سب نظر آرہے ہیں" اس کے امّی، پاپا نے اسے گلے لگالیا۔ پھر اس کے پاپا نے کہا۔

"لو بیٹا اب اپنے محسن سے ملو" پرویز نے اب دیکھا کہ اس کے پاپا کے ساتھ کوئی اور بھی ہے۔

"جاوید؟" ہاں اس کے سامنے جاوید ہی اپنی بیساکھیوں کے سہارے منھ پھیرے کھڑا تھا۔ اپنا نام سن کر جب وہ پلٹا تو پرویز کی چیخ نکل گئی۔ جاوید کی آنکھوں کی جگہ وہ تاریک اور بے نور گڑھے تھے۔

لطیفہ

پریم داس:- آج اسکول کی بلڈنگ میں آگ لگ گئی۔ چلو پڑھائی سے چھٹی ملی۔

موہن داس:- (منھ بسورتے ہوئے) ارے اسکول جل گیا تو کیا ہوا ماسٹر صاحب تو بچ ہی گئے۔

بچوں کی کوشش

رُوح غالب سے معذرت کے ساتھ

رہیے اب ایسی جگہ چل کر جہاں ہوں جانور
سبزہ ہی سبزہ اُگا ہو ہر در، دیوار پر
گھر بنالیں ہم وہاں پر ایک کچا سا اگر
اور جب آئیں درندے بھاگ لیں ہم دیکھ کر
بے کواڑوں کی ہو کھڑکی جس سے آئے روشنی
تاکہ چندھیا جائیں آنکھیں دوپہر سے پیشتر
اور جب ہو شام ہم ہو جائیں چمگادڑ کی طرح
گھونسلے میں جائیں الو، کے بے خوف وخطر
خوب، ہل جانے سے دو دیوالوں کے گزرے گی شب
کون چاہے گا وہاں ہونا، قیامت کی سحر؟

سیّد منوّر باسط کھیری

اُردو زباں

اُردو زباں ہماری
سارے جہاں سے نیاری
پروانے ہم ہیں اس کے
یہ روشنی ہماری
ہر حرف پھول سا ہے
ہر لفظ ایک کیاری
ہر بول میں ہے جادو
تن من ہے اس پہ واری
دیوی ہے یہ ہماری
ہم اس کے ہیں پجاری
ہر بول اس زباں کا
کرتا ہے وجد طاری
ہیں اور بھی زبانیں
پر ایسی ہیں وہ ساری
پڑھنے میں ہے یہ میٹھی
لکھنے میں پیاری پیاری
فیروز کی دُعا ہے
جگ جگ میں ہو یہ جاری

سیّد محمّد فیروز بخت احمد

جناب محمد امین

زلزلے اور اُن کی کہانی

زلزلہ کسے کہتے ہیں؟ یہ تو تم کو معلوم ہی ہے۔ بس اتنا سمجھ لو کہ جنبش یا ہلنے کو زلزلہ کہتے ہیں۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ ہر قسم کی جنبش یا ہلنے کو زلزلہ کہتے ہیں۔ یہاں زمین کا ہلنا یا جنبش کرنا مقصود ہے۔ ہوتا یہ ہے کہ زمین کے اندر کچھ تبدیلیاں آتی ہیں اور اس کے اندرونی حصے کی چٹانیں اِدھر اُدھر کھسکتی ہیں یہ سب اتنے زوردار طریقے سے اور اتنے بڑے پیمانے پر ہوتا ہے کہ اس کی وجہ سے زمین کا وہ خاص حصہ اور اس کے آس پاس کے علاقے ہل جاتے ہیں جسے ہم کہتے ہیں کہ جھٹکا آگیا یا زلزلہ آگیا۔ کبھی کبھی یہ جھٹکا زوردار ہوتا ہے۔ کبھی ہلکا اور کبھی مسلسل کئی جھٹکے آجاتے اس طرح لوگ دہل اٹھتے ہیں اور خوف و ہراس کی وجہ سے سمجھتے کہ خدا کا قہر نازل ہوگیا۔

اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ بظاہر تو ہمیں صاف دکھائی دیتا ہے کہ زمین جس پر ہم چلتے پھرتے ہیں، دوڑتے ہیں، کھیلتے ہیں ٹھوس ہے پھر ایسی ٹھوس چیز کا ہلنا کیا معنی لیکن یہ تمہاری نظر کا دھوکہ ہے۔ زمین اوپر اوپر جیسی دکھائی دیتی ہے ویسی نیچے، گہرائی میں اور اندر کی طرف نہیں ہے۔ اصل بناوٹ اور ساخت کے لحاظ سے اس کی تین قسم کی پرتیں ہیں۔ سب سے نیچے اور سیلوں گہرائی میں جو پرت ہے وہ بہت موٹی، ٹھوس اور لوہے کی طرح اٹل ہے۔ اسی لیے اس کو زمین کا دل بھی کہتے ہیں۔ اس کے اوپر درمیانی حصہ ہے جو پگھلے ہوئے مادے کی طرح گولائی میں پھیلا ہوا ہے۔ سب سے اوپر یعنی سطح پر جو پرت ہے وہ سب سے پتلی پرت ہے۔ یہ زیادہ تر مختلف قسم کی چٹانوں[1] کی بنی ہے۔ اس حصے میں سمندر، میدان اور پہاڑ بھی ہیں۔ پہاڑیوں تو کئی قسم کے ہوتے ہیں۔ لیکن سب سے نمایاں اور شاندار قسم کے پہاڑ وہ ہیں جن کو نئے پرت دار قسم کے پہاڑ کہتے ہیں جیسے ہمارا ہمالہ، کراکورم، ہندوکش، یورپ کا آلپس، شمالی امریکا کا راکی، جنوبی امریکا کا انڈیز وغیرہ ان سارے پہاڑوں کا پورا خط دنیا میں اوپری پرت پر پھیلا ہوا ہے اور ان کے سلسلے سمندروں میں بھی چلے گئے ہیں۔

علم طبقات الارض یعنی چٹان اور زمین کی جو خاص سائنس ہے اس کے لحاظ سے اور جغرافیہ کے لحاظ سے دنیا کا سب سے کمزور خطہ وہ ہے جس پر پہاڑوں کے سلسلے پھیلے ہوئے ہیں۔ اسے سیسمک بلٹ یعنی زلزلوں کے لحاظ سے سب سے خطرناک خطہ بھی کہا جاتا ہے۔ ان پہاڑوں کے نیچے چٹانوں کے دباؤ اور بوجھ کی وجہ سے تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں۔ زمین کی شکل و صورت کو بدلنے والے

---

[1] چٹانوں کی نوعیت، بناوٹ اور ان کی اہمیت کے متعلق ہماری خاص قسم کی مطبوعہ کتاب **چٹانوں کی کہانی** : مصنف محمد امین صاحب ضرور پڑھیے۔

و نام ہیں جیسے گلیشیر، بہتا ہوا پانی یہ بھی چٹانوں کو کاٹ کر، گھس کر ادھر اُدھر کھسکاتے ہیں اور لڑھکاتے رہتے ہیں۔ اس طرح چٹانوں کا بوجھ نیچے کی پرتوں پر کہیں گھٹ جاتا ہے اور کہیں بڑھ جاتا ہے۔ نیچے کی پرتیں یا چٹانوں کی تہیں جب بوجھ اور دباؤ کی تاب نہیں لا سکتیں تو وہ یا تو خود دھنس جاتی ہیں یا ادھر اُدھر کھسک جاتی ہیں۔ اُن کے دھنسنے یا کھسکنے کی وجہ سے زمین ہل جاتی ہے۔ اسی وجہ سے گڑگڑاہٹ بھی ہوتی ہے اور جتنی دیر تک چٹانوں کی تہیں اور تہیں سیٹ نہیں ہو پاتیں وہ اپنی طاقت اور جنبش سے آس پاس کے علاقوں اور بستیوں کو ہلا کر رکھ دیتی ہیں۔

ابھی حال میں پاکستان میں جو زلزلہ آیا ہے وہ اسی نوعیت کا ہے۔ آؤ دیکھیں کہ اس زلزلے کی کیا تفصیلات ہیں۔

۲۸۔ دسمبر ۱۹۷۴ء کو پاکستان کے شمالی حصے میں ایک زبردست زلزلہ آیا اور کئی گاؤں اس کی لپیٹ میں آکر تباہ و برباد ہو گئے۔ زلزلے کی پہلی جنبش ہفتہ کے روز ۱۲ بج کر ۱۵ منٹ پر شام کو محسوس ہوئی اور یہ طے ہے کہ یہ جنبش سب سے خطرناک اور تباہ کن تھی اس لیے کہ اس وقت شام ہو چلی تھی اور گاؤں کے باشندے اپنے اپنے گھروں میں اور جھونپڑوں میں باہر کی سخت سردی سے بچنے کے لیے پناہ لیے ہوئے تھے۔ ستم پر ستم یہ کہ اس کے بعد زلزلہ ختم نہیں ہوا بلکہ ۲۸۔ دسمبر کی رات کو رات بھر دس دس اور پندرہ پندرہ منٹ کے بعد کئی بار جھٹکے محسوس کیے گیے۔

ایک ماہر امریکن سائنس داں نے زلزلے والے علاقوں کا دورہ کیا ہے۔ اس نے یہ کہا ہے کہ پہاڑ کے دامن میں جو کھائیاں اور وادیاں ہیں جن میں کئی گاؤں بسے ہوئے ہیں ان میں مزید جھٹکے اور زلزلے آنے کے خطرات ہیں اسی سائنس داں نے یہ بھی کہا ہے کہ ۲۸۔ دسمبر ۱۹۷۴ء کی خطرناک رات میں جھٹکے ان گنت بار آئے تھے اور کم سے کم ۱۰۰۰ (ایک ہزار) بار تو ضرور یہ محسوس کیے گئے ہوں گے۔

زلزلے نے سب سے زیادہ مصیبت کراکورم پہاڑ کے علاقے میں ڈھائی ہے۔ اس کی لمبائی ۱۰۵ کلومیٹر ہے اس وادی میں جتنے بھی گاؤں آباد تھے ان میں ۹۰ فیصدی تباہ ہو گئے۔ زلزلے نے کیا کم تباہی مچائی تھی کہ گرنے والی چٹانوں نے اور قیامت برپا کر دی۔ زمین ایک دم ہل جانے کی وجہ سے ہزاروں ٹن پہاڑوں کی چٹانیں ٹوٹ ٹوٹ کر نیچے گرتی رہیں اور انھوں نے اپنی مار، بوجھ اور دباؤ کی وجہ سے ہر چیز کو چکنا چور کر کے رکھ دیا۔ کئی گاؤں تو کئی میٹر نیچے دب گئے اور چٹانوں کے ملبے نے ان میں رہنے والوں کو اُٹھنے اور سانس لینے کی مہلت ہی نہیں دی۔ کراکورم کی شاہراہ جو چین کی سرحد تک جاتی ہے اس پر برف اور چٹانوں کے بڑے بڑے تودے ٹوٹ ٹوٹ کر ڈھیر پڑے تھے اور جگہ جگہ سڑک بند ہو گئی تھی۔ پلوں اور پلیوں کا بھی تہس نہس ہو گیا تھا اور ان کی وجہ سے بنی بنائی شاہراہ ۴۵ میل تک بے کار ہو گئی تھی۔

زلزلے کے علاقے سے کراکورم کی شاہراہ گذرنے کے باوجود جن جگہوں میں واقعتاً زلزلہ آیا تھا وہ بہت دور پہاڑی اور کوردہ علاقے میں بسے ہوئے تھے اس لیے تباہی اور صحیح صورت حال کا اندازہ فوراً نہیں ہو سکا۔

بہر حال امداد کے لیے پاکستان کی فوج نے فوراً کام سنبھال لیا اور ہیلی کوپٹروں سے زلزلے کے مصیبت زدہ لوگوں کو سہارا دینے کے لیے اس نے عملی قدم

اٹھایا۔ سب سے پہلے زخمی لوگوں کو ہیلی کوپٹروں سے اٹھا اٹھا کر راولپنڈی کے اسپتالوں میں پہنچایا گیا۔ ان زخمی لوگوں میں ۲۴ سال کا نوجوان قیمہ خاں بھی تھا۔ یہ پاٹن گانوں کا رہنے والا تھا جو راولپنڈی کے شمال میں ۲۱۶ کلو میٹر دور کراکورم کی اسی وادی میں واقع تھا۔ راولپنڈی کے اسپتال میں اپنے بستر پر لیٹے لیٹے زلزلے کی مصیبت کا جو تجربہ اسے ہوا تھا اس کے متعلق اس نے یہ بیان دیا: "میں اپنے مکان کے اندر بیٹھا ہوا تھا کہ زلزلہ آ گیا۔ سارا مکان میرے اوپر ڈھہ پڑا لیکن قسمت اچھی تھی بال بال بچ گیا لیکن میرے تین اعزا میری چچی، میری بہن اور ایک آدمی اور یہ تینوں نہ بچ سکے اور ملبہ میں دب کر ختم ہو گئے۔ ہمارا گانوں بھی سارا کا سارا تباہ ہو گیا تھا۔"

جن لوگوں نے زلزلہ کی ساری کیفیت اپنی آنکھوں سے دیکھی ہے ان میں ایک محمد حسین بھی تھا اس نے اسپتال کے اپنے بستر علالت سے بیان دیا کہ زلزلہ آتے ہی چٹان کے بھاری بھاری ٹکڑے اور پتھر پہاڑوں سے ٹوٹ ٹوٹ کر گرنے لگے اور نیچے وادی میں ان کی ڈھیر لگ گئی۔ اس طرح بہت سے آدمی دب دبا کر مر گئے۔ اس نے یہ بھی کہا کہ زلزلہ ایک بار نہیں بلکہ بار بار اور کئی بار آیا تھا۔

دوسرے زخمی مریضوں نے یہ رپورٹ دی کہ زلزلہ آنے کی خبر سرحد کے قصبہ الوپتائی کو بالکل نہیں معلوم ہوتی تھی اور وہاں کے لوگ اس سے بالکل بے خبر تھے۔ چونکہ گھنٹے کے بعد موت کے گھاٹ اترنے سے جو لوگ بچ گئے تھے ان میں سے کچھ لوگ ڈر کر، جان بچانے کے لیے بھاگے اور اس طرح کافی دیر کے بعد باہر کے لوگوں کو اس قہر کا علم ہوا۔

پاٹن کے تباہی والے علاقے سے انگریزی اخبار ڈیلی ٹیلی گراف کے اخباری نمائندے نے اپنی رپورٹ میں کہا ہے کہ پاکستان سے ہو کر جانے والی چوڑی اہم قسم کی کراکورم کی شاہراہ چین بنا رہا ہے زلزلہ کی وجہ سے اس کا کام ٹھپ ہو گیا ہے۔ یہ شاہراہ چینی سرحد سے ۱۵۰ میل تک پاکستان کے اندر مکمل ہو چکی تھی اور چین کے ۱۱ انجینیر، ماہرین اور مزدور جنرل ٹکا خاں کی ہدایت کے مطابق وہاں موجود تھے۔ دونوں ملکوں کی ماہرین کی ٹیمیں یہ کوشش کر رہی تھیں کہ کراکورم کی شاہراہ کو دونوں طرف سے آمد و رفت کے لیے خوب چوڑی سڑک بنا دی جائے لیکن ان کی بدقسمتی کہ اسی وقت زلزلہ کی بلا نازل ہو گئی۔ پاکستانی فوج کے دس افسران زلزلہ کی وجہ سے مر گئے اور ۵۰ زخمی ہو گئے۔ چین کے محض تین ہی فوجی افسر مرے تھے۔ ان کے نقصانات اس لیے کم ہوئے کہ یہ لوگ خیموں میں پڑاؤ ڈال کر رہتے تھے نہ کہ کھوں اور چٹانوں کے بنے ہوئے مکانوں میں۔

۴۵ میل کی لمبائی تک کراکورم کی شاہراہ جگہ جگہ سے ٹوٹ گئی ہے۔ اس پر چٹانوں کے ڈھیر کے ڈھیر پہاڑوں سے ڈھہ کر گر پڑے ہیں۔ پُل اور پُلیاں جو بنی تھیں وہ سب ستیاناس ہو کر رہ گئی ہیں۔ اب سب سے پہلے گانوں کو جو تباہ و برباد ہو گئے ہیں ہر طرح کی امداد پہنچائی جا رہی ہے۔ اس کے بعد کراکورم کی شاہراہ کو درست کیا جائے گا۔ اور جہاں جہاں سے یہ ٹوٹ گئی ہے اسے ٹھیک کیا جائے گا۔ چینی بھی امداد پہنچانے میں ہاتھ بٹا رہے ہیں اور پناہ گزینوں کو ہر طرح کی امداد بہم پہنچا رہے ہیں۔

چین کراکورم کی شاہراہ کو بہت اہمیت دے رہا ہے خاص طور سے اس لیے اور کہ روس سے وہ گھبراتا ہے۔

روسیوں نے پہلے ہی سے افغانستان میں قریب قریب
پاکستانی اور چینی سرحد تک ہر موسم میں کام دینے والی ایک
اچھی اور نئی سڑک بنا رکھی ہے جو ہندوکش پہاڑ میں سے
ہو کر افغانستان سے روس کے علاقے میں چلی گئی ہے۔

زلزلہ ایک قسم کی بلا ہیں اور یہ جب کبھی آتے ہیں تو
خدا کا قہر بن کر نازل ہوتے ہیں اور تباہی اور بربادی کے
انبار لگا دیتے ہیں۔ پچھلے پانچ سالوں میں زلزلوں نے کم سے
کم ایک لاکھ انسانوں کو غارت کر دیا ہے۔ خصوصاً چین،
ترکی، پیرو، ایران، نکاراگوا اور میکسیکو میں۔

ریڈیو پاکستان کی خبر کے مطابق زلزلے کی وجہ سے
نہ صرف سوات کے علاقے بلکہ ہزارا اور کوہستان کے علاقوں
میں بھی بری طرح نقصان پہنچا ہے۔ بی۔ بی۔ سی یعنی انگلستان
کے ریڈیو کی خبر کے مطابق مرنے والوں کی تعداد دس ہزار
تک پہنچ سکتی ہے اور ۲۱ گاؤں یا تو بالکل تباہ ہو گئے
یا زلزلے نے ان کا نام و نشان مٹا دیا ہے اور بیس ہزار
انسان جو بچ گئے ہیں وہ بری طرح زخمی ہیں اور ان کی
حالت بڑی ابتر بتائی جاتی ہے۔

امداد پہنچانے والے فوجی اور دوسرے رضاکاروں
نے سیکڑوں مردہ پڑی ہوئی لاشوں کو دفن کر دیا تاکہ کوئی
وبا نہ پھیلنے پائے۔ طبی امداد پہنچانے والوں نے زلزلے
سے متاثر ہونے والے علاقے کی سرحدوں پر عارضی اور
ادھر سے ادھر منتقل ہونے والے اسپتال کھول دیئے
ہیں اور فوج کے ۱۵ ہیلی کوپٹر راولپنڈی سے دوائیں، غذا
اور کھانے پینے کے دوسرے سامان اور کمبل وغیرہ برابر
پہنچا رہے ہیں اور جو لوگ بہت زیادہ زخمی ہیں ان کو
نکال کر راولپنڈی واپس لا رہے ہیں اور توجہ سے ان
کا علاج کرانے اور دیکھ بھال کے لیے راولپنڈی کے
اسپتال میں ان کو داخل کر رہے ہیں۔

ادھر ادھر کی خبروں سے پتہ چلتا ہے کہ راولپنڈی
کے شمال مشرق میں ۲۰۰ کلومیٹر دور "پختونستان" سے
متصل پولاس کا علاقہ ہے۔ زلزلے نے سب سے زیادہ نقصان
یہاں پہنچایا ہے اور محض اس علاقے میں ۱۵۰۰ آدمی ہلاک
ہو گئے ہیں اور ۳۰۰۰ زخمی ہیں پولاس کے علاقے سے
تھوڑا اور شمال میں شوری گراہ نام کا ایک گاؤں ہے۔ اس
کی آبادی دس ہزار تھی۔ اس میں سے ۵۰۰ آدمی زلزلے
کی وجہ سے ختم ہو گئے اور ۲۰۰۰ زخمی ہیں۔ دوسرا اور
جلائی گاؤں کی آبادی بیس ہزار تھی۔ ان میں مرنے والوں
کی تعداد ایک ہزار ہے اور زخمی لوگوں کی چار ہزار۔ شروع
میں یہ سمجھا جاتا تھا۔ کہ محض پاٹن نام کے قصبہ کو بھاری نقصان
پہنچا ہے لیکن زلزلے کا اثر اور گاؤں میں بھی بہت ہے
پاٹن میں محض پانچ سو آدمی ہی مرے ہیں اور دو ہزار
زخمی ہیں۔ دوسرے گاؤں اور بستیاں جن پر زلزلے
کاری ضرب لگائی ہے یہ ہیں: کیال، کیرو، مندوزا اور
زبیدخار۔ علاوہ ان گاؤں کے کراکورم کے پہاڑی علاقے
میں ایک ہزار فارم بھی ہیں۔ ان میں کیا نقصان پہنچا
ہے کسی کو نہیں معلوم اگرچہ یہ طے ہے کہ یہ بھی زلزلے
کی لپیٹ میں ضرور آئے ہیں۔ برف باری کی وجہ سے
گاؤں سے رابطہ قایم نہیں ہو سکا تھا اس کے بعد ان
سے جو رابطہ قایم ہوا تو زلزلہ سے مرنے والوں کی تعداد
بڑھ کر کل ۵۲۰۰ تک پہنچ گئی ہے اور سولہ ہزار سے
زیادہ لوگ زخمی ہیں۔

تند، تیز اور برفیلی ہوا اور طوفان کا مقابلہ کرتے
ہوئے کئی دن کے بعد لدے پھندے تین ہیلی کوپٹر دوائیں
خیمے اور کمبل لے کر بڑی مشکلوں سے بشام پہنچے۔ دراصل

انھیں پاٹن جاتا تھا جو کہ بی شم سے ۵۴ کلو میٹر اور شمال
میں دریائے سندھ کی تنگ اور نوکیلی وادی میں واقع
ہے لیکن باوجود کوشش کے وہ آگے نہ بڑھ سکے۔ تند اور
برفیلی ہواؤں کا زور اور بڑھ گیا اور تنگ گھاٹی کے اوپر
سے ہو کر اڑنا بڑا ہی خطرناک تھا۔ خاص قسم کا ایک فرانسیسی
ہیلی کوپٹر بڑی مشکلوں سے اور بڑی جدوجہد کے بعد پاٹن
تک جا سکا۔ اس ہیلی کوپٹر میں چینی سفیر لووی چاؤ صاحب
تشریف فرما تھے ظاہر ہے کہ زلزلہ کے اس علاقہ میں
چینیوں کا اپنا مطلب اور مفاد ہے اس لیے اور کرا کورم
کی شاہراہ بنانے میں وہ پورا پورا تعاون اور مدد دے
رہے ہیں جو کہ شمال میں چینی سرحد پار کر کے سنکیانگ کے
صوبے تک چلی گئی ہے۔

پاکستان کے وزیر اعظم ذوالفقار علی بھٹو خود امداد کے
سارے انتظامات کی نگرانی کر رہے ہیں۔ فوری امداد کے لیے
انھوں نے حکومت پاکستان کی طرف سے تین لاکھ ڈالر (ایک
ڈالر تقریباً آٹھ روپے کے برابر ہوتا ہے) کی منظوری
دی ہے۔

زلزلہ کی وجہ سے بڑا بھاری نقصان ہوا ہے۔
تعجب نہیں کہ یہ کروڑوں تک پہنچ جائے۔

بین الاقوامی ادارے (یو۔ این۔ او) کے سکریٹری
جنرل کرٹ والڈ ہائم کی ہدایت کے مطابق اسلام آباد
میں یو۔ این۔ او۔ کا امداد پہنچانے والا شعبہ ہے اس
نے زلزلے کے مصیبت زدہ لوگوں کی ہر طرح کی امداد بہم
پہنچانے کا بیڑا فوراً اٹھا لیا ہے۔ پاکستان کی فوج کے
افسران اور سپاہیوں کے ساتھ وہ تعاون کر رہا ہے۔

اسی دوران ہماری محبوب وزیر اعظم مسز اندرا گاندھی
نے پاکستان کے وزیر اعظم کو ہمدردی کا پیغام بھیجا ہے
اور امداد کے لیے انھوں نے دو ہزار کمبل بھیجے ہیں۔

یکم جنوری ۱۹۷۵ء کو سعودی عرب کی حکومت نے
اعلان کیا ہے کہ زلزلہ کے مصیبت زدہ لوگوں کی امداد
کے لیے وہ پاکستان کو دس ملین ڈالر (ایک کروڑ روپے)
دے گا۔ لیبیا نے ۱۶ عشاریہ ۸ ملین ڈالر (ایک کروڑ
ساٹھ لاکھ ۸۰ ہزار روپے) کی امداد دی ہے۔ امریکا نے
۲۵ ہزار ڈالر۔ کناڈا نے دس ہزار ڈالر، برطانیہ نے
۲۴ ہزار ڈالر اور آسٹریلیا نے ۲۵ ہزار ڈالر کی امداد
دینے کا اعلان کیا ہے۔

۷۔ جنوری ۱۹۷۵ء کو یو این او نے ۵۶۹،۲۰۰
ڈالر کی قیمت کی غذا اور خوراک فوری طور سے پناہ
گزینوں کو بہم پہنچائی ہے۔

موجودہ دس سال کا زمانہ سب سے خطرناک ثابت ہوا

۱۹۷۴ء کا سال جاتے جاتے ہمیں کافی دکھ اور پریشانی
دے گیا۔ جیسے ہی یہ ختم ہونے کو آیا تھا کہ خطرناک اور
بڑے ہی تباہ کن زلزلے نے ہمارے برصغیر کو ہلا کر
رکھ دیا اگرچہ اس کا مقابلہ اگر ہم کوئٹہ کے ۳۱ مئی ۱۹۳۵ء
کے زلزلے سے کریں تو اس کے نقصانات اس وقت
کے نقصانات کے مقابلے میں بہت کم ہیں۔ اس زلزلے
سے ۵۲۰۰ آدمی مرے ہیں جبکہ کوئٹہ کے زلزلے
سے ۶۰،۰۰۰ آدمی ہلاک ہوئے تھے۔

پچھلا خطرناک اور بہت بڑا زلزلہ ۲۲۔ مئی ۱۹۶۰ء
کو چلی کے اندر آیا تھا جہاں جھٹکے کی لہروں کی لپیٹ
میں ہزاروں آدمی آگئے تھے۔ ۵۰۰۰ تو اسی وقت
ختم ہو گئے تھے ۵۰،۰۰۰ زخمی تھے اور آٹھ لاکھ
آدمی بے گھر ہو گئے تھے۔

چار سال پہلے ۲۸- مارچ سے ۳۱- مارچ تک لگاتار زلزلے پہ زلزلے آتے رہے اور ترکی کے شہر گدیز اور غمت کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔ ان جھٹکوں کی وجہ سے بارہ ہزار آدمی مر گئے تھے اور نوے ہزار بے گھر ہو گئے تھے۔

۱۹۷۲ء میں ایران میں زلزلہ آیا تھا۔ اس کے صوبۂ فارس کے جنوبی حصّہ میں جو پاٹن سے بہت دور نہیں ہے زبردست جھٹکے آئے تھے اور پچاس گاؤں کو انھوں نے دہلا دیا تھا۔ اس طرح ۵ ہزار آدمی مر گئے تھے اور ایک ہزار پانچسو زخمی ہو گئے تھے۔

۱۹۷۲ء ہی میں وسطی امریکہ کے ایک ملک نکاراگوا میں زلزلہ آیا تھا اور جھٹکوں کی وجہ سے اس کی راجدھانی مناگوا تباہ ہو گئی تھی۔ نقصانات کا اندازہ پوری طرح نہ ہو سکا لیکن نکاراگوا کی وزارتِ اطلاعات نے اعلان کیا تھا کہ بارہ ہزار مردہ لاشوں کو دفن کیا گیا تھا اور مناگوا کی تین لاکھ آبادی میں سے آدھی سے زیادہ آبادی بے گھر ہو گئی تھی اور ۷۵ فیصدی عمارتیں یا تو ڈھے گئی تھیں یا ٹوٹ پھوٹ کر بے کار ہو گئی تھیں۔

بہر حال جہاں تک ہماری یادداشت کام کرتی ہے۔ حال میں سب سے خطرناک زلزلہ ۲۴ جنوری ۱۹۵۶ء کو چین کے شنسی صوبے میں آیا تھا اس کے بہت خطرناک ہونے کا ثبوت اس بات سے ملتا ہے کہ اس زلزلے کی لپیٹ میں آکر ۸ لاکھ تیس ہزار آدمی مر گئے تھے۔ اتنا بھاری جانی نقصان بہت کم زلزلوں سے اٹھایا ہوتا ہے۔

اسی طرح ۱۱- اکتوبر ۱۷۳۷ء کو ایک بھیانک زلزلہ کلکتہ میں بھی آیا تھا۔ جس کی وجہ سے تین لاکھ آدمی ہلاک ہو گئے تھے۔

کراکورم کے پہاڑی سلسلے میں واقع پاٹن اور اس کے قرب و جوار کے علاقوں میں ۲- جنوری ۱۹۷۵ء کو صبح ہوتے ہوتے کئی جھٹکے محسوس کیے گئے۔ اس طرح ایک بار پھر بھگدڑ مچ گئی تھی لیکن خدا کا شکر ہے کہ اب کی بار کوئی نقصان نہیں ہوا۔

۲۱- دسمبر ۱۹۷۴ء کو کابل اور اس کے گرد و نواح کے علاقے میں بھی زلزلہ آیا تھا۔ اس کے جھٹکے ہلکے تھے اس لیے کابل ریڈیو کے اعلان کے مطابق کسی قسم کا جانی اور مالی نقصان نہیں ہوا تھا۔ اس زلزلہ کا مرکزی نقطہ (جہاں سے زلزلہ ابھرتا ہے یا شروع ہوتا ہے) کابل سے ۱۴۵ کلومیٹر دور شمال مغرب میں واقع تھا۔

یکم جنوری ۱۹۷۵ء کو ترکی میں بھی زلزلہ آیا تھا اور اس کے جھٹکے جنوب مشرق میں عدانا کے شہر میں صبح سویرے محسوس کئے گئے تھے ڈر کے مارے بہت سے شہری اپنے اپنے مکانات خالی کر کے گلیوں میں اور سڑکوں پر نکل آئے تھے اس شہر کی آبادی ۲ لاکھ ۵۰ ہزار ہے لیکن خدا کا شکر ہے کہ کسی قسم کا کوئی جانی اور مالی نقصان نہیں ہوا۔

۱۹- جنوری ۱۹۷۵ء کو ڈیڑھ بجے دوپہر کے بعد ہمارے ملک کے ہماچل پردیش کے دو ضلعوں یعنی لاہل اسپتی اور کینور میں سخت قسم کا زلزلہ آگیا۔ ۲۰ جنوری کو بھی پانچ بار اور جھٹکے محسوس کیے گئے۔

جس علاقے میں زلزلہ آیا ہے اس کی اونچائی تین ہزار میٹر تھی اور بلندی کی وجہ سے زیادہ تر وہ علاقے برف کے نیچے ڈھکے ہوئے تھے اس لیے

امداد پہنچانا مشکل تھا۔ اس کے باوجود کوشش کرکے دہلی کو شہر سے کمبل، کھانے کا سامان اور طبی امداد کے ٹرک اور ڈاکٹروں کی ٹیمیں بھی طبی امداد کے لیے بھیج گئی ہیں۔ ہماچل کی حکومت نے اپنے افسران کو ہدایت کردی ہے کہ زخمی لوگوں کی ہر طرح امداد کی جائے نیز پردیش کی حکومت کے ساتھ فوج کے جوان اور افسران بھی ہاتھ بٹا رہے ہیں۔ اس زلزلے کا فی نقصان پہنچایا ہے۔ اس میں فوج کے کئی جوان بھی شکار ہوگئے ہیں۔ سات گاؤں بالکل تباہ ہوگئے اور ۳۰ آدمی یعنی عام شہری مر گئے ہیں۔ سروے کے مطابق ۱۴ کلومیٹر کا علاقہ جس میں لی یو، کورک، سمدھو ـ ہرلنگ، اگوئی۔ چینگو اور شلکاؤ کے گاؤں ہیں ان کو بری طرح نقصان پہنچا ہے۔ تبت جانے والی سڑک جگہ جگہ چٹان کے تودوں اور ٹکڑوں سے اٹی پڑی ہے۔ ہماری سرحد کے دوسری طرف یعنی چین کے علاقے تبت میں اس زلزلے کا مرکزی نقطہ ہے اس لئے تبت میں نقصان بہت زیادہ ہوا ہے۔ لوگوں نے خصوصاً ہماری فوج کے جوانوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے کہ ڈھیروں پہاڑ کی چٹانیں ٹوٹ ٹوٹ کر تبت میں گری تھیں۔

۲۲۔ جنوری کی صبح کو لاہل اسپتی اور کینور کے ضلعوں میں پھر جھٹکا آیا اور مصیبت زدہ لوگوں کو ایک بار پھر زلزلہ نے پریشان کردیا۔ پاکستان کے شمالی حصہ میں ایبٹ آباد اور اس کے گرد و نواح کے علاقے میں بھی ۲۲۔ جنوری کو زلزلہ آیا۔ ۲۱۔ جنوری کی رات میں کراچی میں بھی ہلکا سا زلزلہ آیا تھا۔ اور ۲۲۔ جنوری ۱۹۷۵ء کی رات میں دس بجے کے قریب ہماری راجدھانی دہلی میں بھی ہلکا سا جھٹکا آچکا ہے۔ راجستھان میں بھی لوگوں نے اسے محسوس کیا یعنی یہی جھٹکا تھا ہے۔ ان سب کا مرکزی نقطہ دور ہمالیہ میں [illegible] ہے۔

۲۸۔ دسمبر ۱۹۷۴ء سے اب تک برصغیر پاک و ہند میں جتنے زلزلے آئے ہیں وہ اور ہمارے پڑوسی کے ملکوں میں جیسے افغانستان، تبت اور ترکی وغیرہ میں یہ سب ایک ہی سلسلے کی کڑیاں ہیں۔ ان کا ہر ایک کا مرکزی نقطہ مغربی ہمالہ اور کراکورم ہندوکش سے کوہ قاف ہے اور کوہ قاف اور مغربی ہمالہ کے درمیان جتنے بھی پہاڑی سلسلے ہیں ان میں نئی دراڑیں پڑ رہی ہیں۔ چٹانوں کی ساخت، ان کی تہوں میں تھوڑی تھوڑی الٹ پلٹ پیچ و خم اور نئے نئے بل پڑ رہے ہیں۔ فوج کے افسران نے زلزلے سے متاثر ہونے والے علاقوں کا ہوائی جہاز سے مشاہدہ کرکے ان تبدیلیوں کی تصدیق کی ہے اور پیشین گوئی کی ہے کہ ابھی مزید زلزلے آسکتے ہیں۔

زلزلوں کی پیشین گوئی

برصغیر ہند و پاک، ہمارے پڑوسی ملک اور دنیا کے دوسرے حصوں میں جتنے بھی زلزلے آتے ہیں خواہ بڑے ہوں یا اوسط درجے یا معمولی قسم کے، ان میں سے ہر ایک کے متعلق سب سے زیادہ پریشان کن بات یہی ہے کہ وہ بلا آگاہ کیے ہوئے آناً فاناً آجاتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ لوگ جوان علاقوں میں یا ان کے قرب و جوار میں رہتے ہیں وہ ایک دم پریشان ہو اٹھتے ہیں اور زلزلے کی یکایک آفت آجانے کی وجہ سے اتنا وقت بھی نہیں ہوتا کہ لوگ بچ نکلیں۔

روس کے سائنس داں اور زلزلے کے ماہرین عرصے سے زلزلے کی تباہی سے بچنے کے لیے اس بات کی تحقیقات کرتے رہے ہیں کہ کس طرح زلزلوں پر قابو حاصل کیا جائے۔ مشاہدے تجربے اور مسلسل چھان بین کے بعد انھوں نے اب ایک ایسا طریقہ

نکالا ہے کہ زلزلوں کی پیشین گوئی کی جا سکتی ہے۔ روس کے سائنس داں موسم کی پیشین گوئی کی طرح دو یا تین دن پہلے یہ بتا دیتے ہیں کہ زلزلہ آنے والا ہے۔ ہوشیار اور اپنے اپنے بچاؤ کی صورت نکال لو۔

کیا تم نے تاشقند کا نام سنا ہے؟ آبادی کے لحاظ سے روس کا یہ چوتھے نمبر کا شہر ہے۔ یہ وسط ایشیا میں واقع ہے اور تمھیں یاد ہوگا کہ ہمارے سابق محبوب وزیر اعظم لال بہادر شاستری، ہندوستان اور پاکستان کے تنازعہ کو سلجھانے کے بعد تاشقند ہی میں اللہ کو پیارے ہو گئے تھے۔ ہاں تو تاشقند میں ۱۹۶۶ء میں ایک خاصا بڑا زلزلہ آیا تھا۔ اس کی وجہ سے سارا شہر اس کی لپیٹ میں آ گیا تھا۔ شہر ایک تہائی حصہ تو بالکل تباہ و برباد ہو گیا تھا اور ۰۰۰،۰۰ ۳،۴ آدمی بے گھر ہو گئے تھے۔

اس کے بعد ۱۹۷۲ء میں یعنی پچھلے سال چار جھٹکے لگے لیکن ان کی وجہ سے وہاں کے عوام پریشان نہیں ہوئے۔ نہ ان پر کسی قسم کی ہیبت طاری ہوئی۔ اس کی وجہ؟۔ وجہ یہ ہے کہ ہر موقع پر جھٹکے اور زلزلے کی طاقت اور جھٹکے لگنے یا شروع ہونے کی پہلے سے پیشین گوئی کر دی گئی تھی۔ زمین کے ماہرین اور زلزلے کی نوعیت سمجھنے والے حضرات نے ۴۸ گھنٹے سے ۹۰ گھنٹے پہلے زلزلے کے بارے میں صاف صاف بتا دیا تھا۔ یہ پیشین گوئی نہ صرف ہر اعتبار سے صحیح تھی بلکہ ماہرین نے یہ تک بتا دیا تھا کہ زلزلہ کس وقت آئے گا، کہاں سے شروع ہوگا اور کتنی طاقت کا ہوگا۔

تاشقند کے زلزلے کے انسٹی ٹیوٹ میں کام کرنے والے ایک سے ایک اعلیٰ دماغ ماہرین کام کر رہے ہیں۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر سلطان خودزیوف اور ان کی ٹیم خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ اب سوال یہ ہے کہ ان لوگوں نے تاشقند کے زمین دوز پانی کے ذخیرہ کا مطالعہ کیا۔ زمین کی سطح کے نیچے یعنی تقریباً آٹھ ہزار فٹ کی گہرائی میں جو پانی ملتا ہے اس کی کیمیائی ساخت پر توجہ دی۔ چٹانوں کی مختلف تہوں اور پرتوں کو بورنگ مشین سے کاٹ کر تاشقند کی زمین کے نیچے اور گہرائی تک پندرہ خاص قسم کے سوراخ کیے ان سوراخوں میں سے کھینچ کر پانی کے ان پندرہ نمونوں کو بار بار پرکھ کر اور جانچ کر دیکھا گیا۔ بلکہ اب بھی وقتاً فوقتاً پانی کے نمونے خاص خاص وقفے سے نکالے جاتے ہیں اور ان کا باقاعدہ معائنہ کیا جاتا ہے۔ تاشقند میں زلزلوں کے انسٹی ٹیوٹ کے ڈائرکٹر ڈاکٹر موسے لیناف کا کہنا ہے کہ جب زلزلہ کا وقت قریب آتا ہے تو پانی کی رنگت بدلنے لگتی ہے اور بہت کافی حد تک پرکھ کر یہ تبدیلی دیکھی جا سکتی ہے ابھی بالکل سو فیصدی یہ اندازہ نہیں ہو سکتا ہے کہ پانی کی رنگت میں خاص قسم کی کیا تبدیلی واقع ہوتی ہے لیکن انسٹی ٹیوٹ کے ڈائرکٹر کا کہنا ہے "کہ ہم نے جتنا بھی فائدہ مطالعہ، معائنہ، مشاہدہ اور تجربے سے حاصل کیا ہے یہ زلزلوں کو پیشین گوئی کے سلسلے میں ایک زبردست اور اہم قسم کی کامیابی ہے اور دنیا میں زلزلوں کا جو خطہ ہے اس کے اندر کے جو لوگ بھی یا جس ملک کے ماہرین بھی ہم سے معلومات فراہم کرنا چاہیں تو ہم ان کو بتانے کے لیے تیار ہیں۔

تاشقند میں ایک نمایاں کام یہ بھی ہوا ہے کہ ۱۹۶۶ء میں سخت ترین زلزلہ آنے کے بعد تاشقند کو فن تعمیر کے ماہرین نے یہ طے کیا کہ تاشقند کی از سر نو تعمیر میں عمارتیں اس قسم کی بنائی جائیں جو کہ زلزلہ سے

باقی صفحہ پر

جناب شاہد سہسرامی

چالاک بھائی

کسی شہر میں ایک کسان رہتا تھا اس کے دو بیٹے تھے۔

جب کسان مرا تو اس نے صرف تین چیزیں چھوڑیں تھیں۔ ۱۔ گائے ۲۔ تاڑ ۳۔ کمبل

بڑا بھائی بہت چالاک تھا۔ اُس نے چھوٹے بھائی سے گائے بٹوارے کے لیے کہا۔ چھوٹا راضی ہو گیا۔

بڑا بھائی بولا۔ گائے کا "پچھلا حصّہ میں لوں گا اور اگلا تم لے لو" چھوٹے بھائی نے کہا "ٹھیک ہے۔"

روز صبح بڑا بھائی گائے کا دودھ نکال کر پیتا۔ اور چھوٹا بھائی مُنہ تکتا رہ جاتا۔ اس کو بڑے بھائی کی حرکت پر بہت غصّہ آیا۔ وہ اپنے دوست حجّام کے پاس گیا اور سارا قصّہ سنایا تب حجّام نے اسے ایک ترکیب بتائی کہ جب بڑا بھائی دودھ نکالے۔ اس وقت گائے کے مُنہ پر لات مارنا

اگلے دن جب بڑا بھائی دودھ نکالنے لگا تو چھوٹا بھائی حجام کی بتائی ہوئی ترکیب پر عمل کرنے لگا۔ جس سے گائے نے پیر ٹپکا اور دودھ بھری بالٹی گر گئی۔ یہ دیکھ کر بڑا بھائی غصّے سے بولا۔ کمبخت! تو نے یہ کیا کیا۔؟

چھوٹا بھائی نرمی سے بولا۔ یہ تو میرا حصّہ ہے۔ اس کو میں جو کروں تم کو کیا ہوتا ہے؟ اور پھر گائے کو مارنے لگتا ہے۔

بڑا بھائی اُسے سمجھانے بجھانے لگا تو وہ مان گیا۔ مگر وہ ہمیشہ دودھ کا آدھا حصّہ لیا کرتا۔ اس طرح گائے کا معاملہ سُلجھ گیا۔ پھر تاڑ کا بٹوارا کس طرح ہوا سنئے

تاڑ کے بٹوارہ میں بڑے بھائی نے اوپری اور چھوٹے بھائی نے نچلا حصّہ لیا۔ بڑا بھائی روز پھل کھاتا اور چھوٹا بھائی پانی روکتا۔ مگر بیچارے سے رہا نہیں گیا۔ پھر دوست حجّام کے پاس گیا۔ اور ساری کہانی سُنا ڈالی۔

حجام بولا۔ جب تمھارا بھائی تاڑ پر چڑھے تم نیچے والے حصّہ کو کاٹنا شروع کر دو۔ اس کا جو انجام ہو گا تم وہیں دیکھ لو گے۔

اگلے دن بھائی (بڑا) پیڑ پر چڑھا۔ تو چھوٹے بھائی نے نیچے سے کاٹنا شروع کیا۔ بڑا بھائی ڈر گیا اور اوپر سے تھرتھراتی آواز میں بولا۔ ا...... رے۔ بھئی ..... مت ..... مت ..... کا ..... ٹو۔

چھوٹے بھائی نے نیچے سے کہا۔ ہمیں روز پھل دو گے۔

بڑا بھائی بولا۔ ج ... رور (ضرور) دوں گا۔

چھوٹے بھائی نے کاٹنا بند کر دیا۔ پھر بڑا بھائی اتر گیا۔

باقی ۳۸ پر

جناب جوہر جام نیری

بچوں کا ترانہ

ہند کے ہم ہیں پیارے بچے — سارے جہاں سے نیارے بچے
ہند کے راج دلارے بچے — اچھے بچے پیارے بچے
اچھے اچھے کام کریں گے — اپنے وطن کا نام کریں گے
ہم نہ کسی سے پیچھے رہیں گے — بڑھتے رہیں گے بڑھتے چلیں گے
جب بھی کہیں گے حق کی کہیں گے — سچ کہنے سے ہم نہ ڈریں گے
ظلم و ستم کا منہ ہو کالا — جگ میں امن کا پھیلے اجالا

دیس پہ قربان جاں ہو جوہر
اونچی وطن کی شان ہو جوہر

ادب

ادب! ایک معقول، عنوان ہے! — ادب اک شرافت کی پہچان ہے
ادب! ایک زیور ہے انسان کا! — یہ مرکز ہے ہر عزت و شان کا
یہ تہذیب و اخلاق کا رہنما! — تمدن، کی کشتی کا یہ ناخدا
سحابِ فضائل کی یہ برق ہے! — ضیا اس کی از غرب تا شرق ہے
یہ بے شبہ، دشمن جہالت کا ہے! — یقیناً یہ قاتل ضلالت کا ہے
اسی کی چمک سے منور ہیں دل! — نہیں جس میں یہ، وہ ذلیل و خجل
یہ ہے پیکرِ آدمیت کی روح! — جہاں میں اسی کو ہیں حاصل فتوح
کرو، اپنے چھوٹوں پہ لطف و کرم! — کہو! انس چھوٹے بڑوں میں بہم

سنیں! اہلِ دانش ضیاؔ کی یہ بات
"ادب" ہے جہاں میں بڑی "کائنات"

جناب اسرار ندوی

شہزادہ بے نظیر کی کہانی

پانچوین قسط

آٹھویں داستان

خط لکھنا فیروز شاہ کا ماہِ رخ پری کو اور نکالنا بے نظیر کو کنوئیں سے

نجم النساء دوسرے نے بے موت کے منہ میں گھسی تھی اس بات کا شہزادے کے دل پر بڑا اثر ہوا۔ اس کے دل میں نجم النساء کے لیے عزت ہوگئی۔ اس کو پری پر بڑا غصہ آیا۔ اس نے منہ پھاڑ کر ایسی آواز نکالی جیسے شیر دہاڑ رہے۔ کیا دیکھتے ہیں کہ منٹوں کے منٹ میں ہر طرف سے دیو ہی دیو چلے آرہے ہیں شہزادے نے سب کو حکم دیا:

"دیکھو پرستان کے کسی کنوئیں میں ایک آدم زاد قید ہے۔ ایک ایک کونا چھان مارو۔ جو کوئی اس کی خبر لائے گا۔ اس کے پر جواہرات کے لگا دیے جائیں گے۔ خبردار کوئی جگہ چھوٹنے نہ پائے۔"

اپنے شہزادہ کا حکم سنتے ہی تم جانو سارے دیو دم مارتے ادھر ادھر کا چکر لگانے لگے۔ ڈھونڈتے ڈھونڈتے ایک دیو کو ایک دور میدان میں ملا جس میں کنواں تھا۔ کنواں بھی جلدی ہی مل گیا۔ کان لگایا تو اندر سے کسی کی مہین سی رونے کی آواز سنائی دی اس کو یقین ہو گیا کہ ماہ رخ کا قیدی ہو نہ ہو اسی کنوئیں میں بند ہے۔

سفید دیو مارے خوشی کے ناچنے لگا۔ پھر تیزی سے شہزادے کی طرف اڑ گیا۔ پہنچ کر پہلے سلام کیا پھر جو کچھ دیکھا تھا بیان کیا۔ اس خبر سے فیروز شاہ کو بہت خوشی ہوئی۔ انعام میں سفید دیو کے پر جواہرات کے لگوا دیے اور عہدہ اونچا کر دیا۔

دیووں کو رخصت کرنے کے بعد اس نے ماہ رخ پری کو ایک خط لکھا۔

۳۰۔ اردی بہشت ۱۱۹۹ سنہ سلیمانی

ماہ رُخ پری کو شہزادہ فیروز شاہ کی دعا۔

تم نے ایک آدم زاد کو قید کر کے حکومت کے قانون کو توڑا ہے۔ اگر جان کی خیر چاہتی ہو تو اسے رہا کرو۔ ورنہ میں تم کو جلا کر خاک کر دوں گا۔ تم جانتی ہو میں "نہیں" سننے کا عادی نہیں۔

فیروز شاہ

یہ خط اس نے کالے دیو کو بلا کر دیا۔ خط ملتے ہی کالے دیو نے زمین پر پر مارا اور فضا میں اڑ گیا۔ جیسے کالے بادل کا بڑا سا ٹکڑا اڑا جا رہا ہو۔

کالا دیو تھوڑی ہی دیر میں ماہ رخ کے محل میں جا پہنچا۔ ماہ رُخ اپنے باغ میں سیر کر رہی تھی۔ دیو نے پہنچتے ہی سلام کیا۔ پھر اس کو شاہ جن کے بیٹے کا خط دیا۔ پری خط پڑھ کے بہت گھبرائی تھوڑی دیر کچھ سوچتی رہی پھر جواب لکھنے بیٹھی۔ اس نے لکھا۔

۳۰۔ اردی بہشت ۱۹۹ء سلیمانی

پرستان۔ باغ نمبر ۸

شہزادہ عالی جاہ کو ماہ رخ پری کا آداب

بندی کی کیا مجال کہ شہزادہ عالی جاہ کا حکم ٹالے آپ کا حکم سر آنکھوں پر۔ بندی اپنی غلطی پر معافی چاہتی ہے۔ ساتھ ہی یہ درخواست ہے کہ یہ بات میرے ماں باپ تک نہ پہنچائی جائے۔ میں وعدہ کرتی ہوں کہ پھر کبھی اس کا پیچھا نہ کروں گی۔ وہ کوہ قاف کے کنویں میں ہے منگوا لیا جائے۔

آپ کی بندی

ماہ رخ

ماہ رُخ کا جواب ملتے ہی شہزادہ فیروز شاہ کئی دیوؤں کے ساتھ کوہ قاف کی طرف روانہ ہو گیا۔ سفید دیو نے اس کنویں کا پتہ بتلایا کچھ دیر میں سب کے سب وہاں پہنچ گئے۔ شہزادہ نے پتھر ہٹانے کا حکم دیا۔ دیوؤں نے ہزاروں من وزنی پتھر کو تنکے کی طرح اٹھا کر پھینک دیا۔

شہزادے نے جھانک کے دیکھا تو اس میں ایک بہت ہی دُبلا پتلا، ادھ موا سا آدم زاد کھڑا دکھائی دیا۔ اس نے ایک دیو کو اشارہ کیا۔ دیو نے کنویں میں جھانکا اور دھم سے کود گیا۔ پلک جھپکتے میں وہ بے نظیر کو گود میں لیے اس طرح باہر نکلا جیسے فوّارہ پانی کو اچھالے۔

نویں داستان

پہنچنا بے نظیر کا بدرِ منیر کے محل میں

میاں، بے نظیر جب کنویں سے نکلا تو کیا بتاؤں اس کا کیا حال تھا۔ بس ہڈیوں کی مالا سمجھو۔ جیسے برسوں کا گڑا انسانی پتلا نکالا گیا ہو۔ نہ وہ آنکھیں تھیں نہ وہ رنگ۔ سرخ و سفید بدن اُجلا کپاس ہو گیا تھا۔ رگیں ایک ایک گن لو۔ ناخن بڑھے ہوئے سر کے بال جیسے اُلجھی ہوئی ڈور۔

بے نظیر کو اس حال میں دیکھ کر فیروز شاہ کو ترس آ گیا۔ اس نے اپنا تخت منگایا اس پر اس کو لٹایا اور اپنے محل لے آیا۔ جوگی جی کو خبر ہوئی تو وہ دوڑے آئے۔ فیروز شاہ نے بے نظیر کو ایک کمرے میں چھپا دیا تھا۔ وہ اسی کے ہاتھ جوڑنے لگے کہ ہمیں جلدی دکھاؤ۔ فیروز شاہ نے سوچا اچانک بے نظیر کو اس حال میں دیکھ کر یہ کہیں پاگل نہ ہو جائے۔ اس سے اپنے سفر کا حال، نکالنے کی ترکیب اور اس کی صورت شکل بیان کرنے لگا۔ لیکن نجم النساء اس کو اپنی آنکھوں سے دیکھنے کے لیے بے قرار تھی۔ فیروز شاہ کو مجبوراً اٹھنا پڑا۔ وہ اس کو لیے ہوئے بے نظیر کے پاس گیا۔

"یہی بے نظیر ہے نا" فیروز شاہ نے پوچھا نجم النساء نے سر ہلا کر ہاں کا اشارہ دیا۔ اور بے نظیر کو دیکھ کر زار زار رونے لگی۔ بے نظیر نے نجم النساء کو پہچان لیا۔ اس نے پوچھا۔ "تم اس لباس میں؟ ہم لوگ کہاں ہیں؟"

...بدر منیر کا خواب دیکھنا۔ اپنا جوگی بن کے ...فیروز شاہ کا ملنا۔ مدد کی امید میں اس کے ...رآنا۔ اپنی بین کا کمال۔ ایک دن اچانک فیروز شاہ ...اس کو اصلی روپ میں دیکھ لینا۔ ماہ رخ کو خط لکھنا۔ فیروز شاہ کا اس کو کنویں سے نکال کر لانا ساری باتیں نجم النساء نے اسے کہہ سنائیں۔

یہ معلوم کر کے بے نظیر نے فیروز شاہ کو سلام کیا اور بہت بہت شکریہ ادا کیا پھر اس نے نجم النساء کو اپنا حال سنایا

بے نظیر اب بدر منیر اور اپنے ماں باپ سے جلد سے جلد ملنا چاہتا تھا۔ فیروز شاہ نے دو ایک دن اور رکنے کو کہا۔ لیکن آپ جانتے ہیں کہ دودھ کا جلا میٹھا بھی پھونک پھونک کر پیتا ہے۔ بے نظیر نے سوچا ان ...ک زادوں کا کیا ٹھیک ذرے میں پانی ذرے میں آگ ...ابھی مہربان ہے۔ دو گھڑی بعد کیا ہو گیا پتہ۔ اس لیے ...اس جنجال سے وہ جلد سے جلد نکلنا چاہتا تھا۔ اس نے فیروز شاہ سے معافی چاہی اور گھر پہنچوانے کی درخواست کی۔ دوسرے دن شام کے قریب چلنے کی تیاری ہوئی ...فیروز شاہ نے اپنا تخت منگوایا۔ تینوں اس پر بیٹھے تخت فضا میں اڑنے لگا۔ نجم النساء راستہ بتاتی رہی۔

اڑتے اڑتے، اڑتے اڑتے تخت بدر منیر کے ...کے اوپر پہنچا۔ نجم النساء نے اتارنے کا اشارہ ...تخت اتر گیا۔ نجم النساء نے بے نظیر اور فیروز شاہ ...ایک درخت کے نیچے مونڈھوں پر بٹھایا۔ خود ...کی طرف چلنے لگی کہ فیروز شاہ نے اپنے گھر واپس ...کی اجازت چاہی۔ پھر بے نظیر سے ہاتھ ملایا ...ملنے کا وعدہ کر کے تخت پر بیٹھ گیا۔ زور کی گھن گھناہٹ ہوئی اور بڑی سی چیل آسمان میں تیرنے لگی۔

نجم النساء نے دیکھا کہ محل میں سناٹا چھایا ہوا ہے۔ نہ وہ قہقہے ہیں نہ وہ چہچہے۔ وہ سیدھی بدر منیر کے کمرے کی طرف بڑھی اور اس کے قدموں پہ جا گری رات کا وقت تھا۔ بدر منیر ڈر گئی۔ پھر جب پہچان لیا تو "ارے، میری نجمی!" کہہ کر لپٹ گئی۔ دونوں نے خوشی کے آنسو بہائے۔ پھر بدر منیر کہنے لگی۔

"نجمو، تمھاری فکر مجھے کھائے جا رہی تھی۔ اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ اس نے تمھارا چہرہ دکھلایا۔"

نجم النساء نے بدر منیر کی بلائیں لیں اور کہنے لگی۔

"میں آپ کے واری جاؤں۔ یہ آپ نے کیا شکل بنا رکھی ہے۔ میں ایک کیا ایک سو نجم النساء بھی آپ پر قربان ہو جائیں تو بھی حق نمک ادا نہ ہو گا۔"

ذرا دیر میں نجم النساء کے واپس آنے کی محل میں دھوم مچ گئی۔ ایک نے ایک سے خبر سنی اور بدر منیر کے کمرے میں بھیڑ لگ گئی کوئی ادھر سے آنکلی کوئی ادھر سے۔ مبارک سلامت چلنے لگی۔ کوئی کلی کی طرح کھل اٹھی۔ کوئی دوڑ کے گلے ملی۔ کسی نے پیسے صدقے کئے۔ کسی نے اناج اچھال کر خیرات کیا۔ کسی نے سفر کا حال پوچھا۔ کسی نے بے نظیر کو پوچھا۔ خیریت خیر صلا کے بعد نجم النساء نے کہا۔

"بی بیو میں آج بہت تھکی ہوئی ہوں۔ برا نہ مانو تو تم لوگ اس وقت آرام کرو۔ صبح میں سفر کی کہانی سناؤں گی۔"

جب سب اپنی اپنی جگہ چلی گئیں تو نجم النساء نے، بے نظیر کو قید سے چھڑا لانے کی خوش خبری

سنائی۔ بدر منیر کو یقین نہ آیا۔ اس نے پوچھا "سچ
سچ؟" نجم النسانے اس کے سر کی قسم کھائی۔ بدر منیر نے
پوچھا "اچھا تو وہ ہے کہاں؟"
"خوشی کی خبریں دمڑی کی نہیں سنایا کرتے۔ وہ
جو مولسری کے پیڑ ہیں نا؟ اس کے نیچے مونڈھے
پر بٹھا دیا ہے۔" نجم النساء نے کہا۔
"اچھا اچھا زیادہ باتیں نہ بناؤ۔ جو بات ہے
سچ سچ کہو۔" بدر منیر نے ہنستے ہوئے پوچھا۔
"شہزادی، ہاتھ کنگن کو آرسی کیا ہے۔ چل کے
دیکھو کیوں نہیں لیتیں۔" نجم النساء نے اپنی بات پر زور
دیا۔
"اچھا چلتی ہوں۔ اگر نہ ہوا تو جو سزا چور کی سو
تیری۔" بدر منیر نے کہا
"منظور۔ لیکن اگر میری بات سچی ہوئی تو منہ
مانگا انعام لوں گی۔" نجم النساء نے شرط لگائی۔
"منظور۔" بدر منیر نے ہاتھ پہ مارا اور چوم لیا۔
دونوں باغ کی طرف روانہ ہوئیں۔ لیکن نجم النساء
کو جیسے کچھ یاد آگیا وہ ذرا دیر کے لیے پیچھے پلٹی۔ ایک
ماما سے کچھ کہا اور لپک کر پھر ساتھ ہو گئی۔
بدر منیر جب باغ میں پہنچی تو اس نے دیکھا
کہ سچ مچ بے نظیر بیٹھا ہے لیکن جیسے مہینوں کا مریض
ہو۔ بالکل دبلا پتلا۔ وہ لپک کے بے نظیر کے پاس
پہنچی۔ دونوں نے ایک دوسرے کو سلام کیا۔ ہاتھ
ملایا۔ پھر بدر منیر نے رہائی پر مبارک باد دی۔
بے نظیر نے رہا کروانے کا شکریہ ادا کیا۔ اتنے
میں ماما طشت بھر ہار، پھول، عطر دانی۔ گلاب
پاش لے کر پہنچی۔ نجم النساء نے گلاب چھڑکا۔
تینوں نے ایک دوسرے کو ہار پہنائے۔ پھر سب نے
پھول اچھالے۔ عطر لگائے۔ اور ہاتھوں میں ہاتھ
ڈالے محل کی طرف چل دیے۔

دسویں داستان

خط لکھنا بے نظیر کا شاہ مسعود کو

جب بے نظیر تندرست ہو گیا تو اس نے ایک روز
کھانے پر بدر منیر اور نجم النساء سے اپنے گھر جانے کی خواہش
ظاہر کی۔ بدر منیر کہنے لگی۔
"خوب، ابھی کل آئے اور آج چلے۔ جائیے گا۔ لیکن
ایسی بھی جلدی کیا ہے۔"
"شاید یہ پری سے ڈر رہے ہیں۔ اطمینان رکھیے وہ
اب آپ کا پیچھا نہیں کرے گی۔" نجم النساء نے مذاق کیا
تینوں ہنس پڑے۔
ایک رات نجم النساء بے نظیر کے کمرے میں گئی۔ وہ
لیٹا لیٹا کوئی کتاب پڑھ رہا تھا۔ نجم النساء کو جو دیکھا تو
اٹھ بیٹھا۔ "یہ بے وقت کیسے آنا ہوا،" بے نظیر نے تعجب
سے پوچھا۔
ارے، آپ اب تک سوئے نہیں؟ نجم النساء
نے بھی سوال کر دیا۔
"سو جاتا تو ملاقات کیسے ہوتی؟" بے نظیر نے
ہنستے ہوئے جواب دیا۔
"اچھا جی، تو آپ میرے آنے کو جان رہے تھے؟"
نجم النسا نے اسی انداز میں کہا۔
"اور نہیں تو کیا۔" بے نظیر نے کہا۔
"پری کی قید میں رہنے کا ایک فائدہ تو ہوا کہ آپ

...کی باتیں جاننے لگے۔ اچھا چھوڑیے ان باتوں کو۔ یہ بتائیے کہ آپ اتنی جلدی کیوں جانا چاہ رہے ہیں۔ کیا یہاں کوئی تکلیف ہوئی؟" نجم النساء نے پوچھا۔

"تم اس کو جلدی کہتی ہو نجم النساء؟ سوچو تو میں کب ماں باپ سے الگ ہوا تھا۔ پتہ نہیں ان بے چاروں نے رو رو کر اپنا کیا حال کر لیا ہو گا۔" بے نظیر روہانسا ہو کر بولا۔

"ہاں، اس سے کون انکار کر سکتا ہے۔ ماں باپ سب سے بڑی دولت ہیں۔ خدا خیریت ہی رکھے۔ لیکن ہمیں افسوس اس کا ہے کہ آپ ہم لوگوں سے چھوٹ جائیں گے۔" نجم النساء نے کہا۔

"ایسی باتیں نہ کیجیے۔ آپ لوگوں نے مجھے قبر سے نکالا ہے۔ مردہ جسم میں جان ڈالی ہے۔ بھلا میں کبھی بھول سکتا ہوں۔ آپ لوگوں کا نام میرے دل میں کھدا ہوا ہے۔ میں ملنے برابر آتا رہوں گا۔" بے نظیر نے تسلی دی۔

"آپ شہزادہ ٹھہرے۔ آج کے گئے کل آنا نہ آنا آپ کے ہاتھ میں نہ ہو گا۔ خدا وہ دن جلد لائے جب آپ بادشاہ بنیں پھر آپ کہاں اور ہم غریب کہاں۔" نجم النساء نے اداس ہو کر کہا۔

"خیر، میں اتنا رذیل نہیں کہ اپنے احسان کرنے والوں کو بھلا دوں۔ اب آپ زیادہ پہیلیاں نہ بجھائیے جو آپ کہنا چاہ رہی ہیں سمجھ رہا ہوں۔ مگر یہ کیسے ہو گا؟" بے نظیر نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"اوہو، آپ تو سچ مچ غیب کی باتیں جاننے لگے۔" نجم النساء بہت خوش ہوئی۔ پھر اپنی بات پوری کرتے ہوئے کہنے لگی۔ "یہ ایسے ہو گا کہ میں کل پاس کے جنگل میں خیمے گڑوا دیتی ہوں۔ آپ وہاں شکار میں آئے ہوئے شہزادے کی طرح رہیے۔ تمام ضروری کام اور سامان میرے ذمہ۔ آج جمعہ ہے آج کے آٹھویں دن بادشاہ کو اس مطلب کا خط لکھیے۔ ہمیں پوری امید ہے کہ آپ کی بات مان لی جائے گی۔" نجم النساء نے چٹکی بجاتے ہوئے اپنی بات ختم کی۔

"کسی کو عقل لینی ہو تو آپ سے لے۔" بے نظیر نے نجم النساء کی سوجھ بوجھ کی داد دی۔

"دونوں ہنسنے لگے۔" نجم النساء نے اٹھتے ہوئے کہا۔ "اب رات زیادہ ہو گئی سو جائیے۔ کل سے ہمارا کام شروع ہو جائے گا۔"

نجم النساء کے جانے کے بعد بے نظیر سوچنے لگا۔ یہ نجم النساء غضب کی لڑکی ہے۔ اپنی شہزادی کی کتنی وفادار ہے۔ اس نے کیسے کیسے جوکھم کے کام کیے۔ اتنے میں بارہ کا گھنٹہ بجا۔ بے نظیر نے کتابیں میز پر رکھیں اور لیٹ گیا۔

دوسرے دن آدھی رات گئے بے نظیر شکاریوں کے لباس میں تلوار لٹکائے گھوڑے پر سوار کچھ اور سواروں کے ساتھ خیمے کی طرف روانہ ہوا۔

ٹھیک ایک ہفتے بعد بے نظیر نے بدر منیر کے باپ بادشاہ مسعود کو خط لکھا۔ اس میں بادشاہ اور اس کے خاندان والوں کی بڑی تعریف کی پھر اپنے باپ کی بادشاہت اور شان و شوکت کا ذکر کیا پھر خط لکھنے کا مقصد لکھا۔ اور بات نہ ماننے کی صورت میں جنگ کی دھمکی دی۔

گیارہویں داستان

شادی ہوئی بے نظیر کی بدر منیر کے ساتھ

سراندیپ کے بادشاہ مسعود شاہ کو بے نظیر کا جو خط

باتو وہ آگ بگولا ہوگیا۔ اس کو اپنے بڈھے وزیر پر بہت بھروسا تھا۔ ہر بات میں وہ اس سے مشورہ ضرور لیتا۔ بڈھے وزیر بلائے گئے۔ بادشاہ نے ان کی طرف خط بڑھا دیا۔ وزیر نے بڑی حکمت سے بادشاہ کو نرم کیا۔ جب بادشاہ کا غصہ ٹھنڈا ہوا تو انھوں نے لکھا۔

عزیز شہزادے۔ تمھارا اقبال بڑھے۔

تمھارا مہر بند لفافہ ہمیں ملا۔ تم ابھی بچوں کی طرح گھر سے کھیلتے نکلے ہو۔ دولت پہ گھمنڈ نہ کرو۔ یہ سدا کسی کے پاس نہیں رہی۔ فوج کا غرور بھی اک دھوکا ہے لیکن میں ناحق خون خرابا نہیں چاہتا۔

ہاں میں شریعت کے سامنے سر جھکاتا ہوں۔ پھر رسم دنیا بھی ہے۔ میں نے تمھارے اخلاق اور سخاوت کی باتیں سنی ہیں۔ خوشی ہوئی۔ کوئی مناسب تاریخ کا پتہ لگا کر مطلع کرو۔

تمھارا دعا گو

مسعود شاہ

شادی کی خبر خوشبو بن کر پورے محل میں پھیل گئی۔ جس سے سنو شادی کا ذکر۔ بدر منیر کے محل میں بڑے زوروں پہ تیاریاں شروع ہوگئیں۔ گیت ڈھول کی آواز سے محل گونجنے لگا۔ ہر طرف سجاوٹ ہونے لگی۔ نقار خانے بجائے گئے کام کرنے والوں میں جیسے پر لگ گئے۔

انتظار میں ایک ایک دن پہاڑ ہو رہا تھا۔ آخر وہ دن آیا جس کا سب کو انتظار تھا۔ بے نظیر سہرا باندھے گھوڑے پر سوار ہوا۔ نقارے اور شہنائیاں بجنے لگیں ہر طرف ہل چل مچ گئی۔ کوئی اپنا گھوڑا لانے دوڑا۔ کوئی ہاتھیوں کو سجانے لگا۔ کسی نے رتھ والے کو پکارا کسی نے دیر کرنے پہ میانے والے کو مارا۔ کوئی پالکی میں بیٹھ چلا۔ کسی نے [illegible]۔

طبلوں کی تھاپ اور شہنائی کی دھنوں سے کان پڑی بات نہیں پڑ رہی تھی۔ نقاروں کی آواز سے آسمان دھمک رہا تھا۔ نوشاہ کا گھوڑا سنبھل سنبھل کر چل رہا تھا دو سائیس سنہرے لباس میں دونوں طرف ساتھ ساتھ چل رہے تھے۔ دو آدمی مورچھل ہلا رہے تھے۔ طرح طرح کی روشنیاں رات کو دن بنا رہی تھیں۔ روشنی کا پھاٹک لگائے بازاری اپنی دکان سجائے ہوئے تھے۔ کوئی پان بیچ رہا تھا کوئی دال موٹھ۔ لوگ پتنگوں کی طرح بارات کا تماشہ دیکھنے کے لیے ٹوٹے پڑ رہے تھے۔

آتش بازیوں کی بہار بھی کچھ کم نہ تھی۔ کہیں انار داغے جا رہے تھے۔ کہیں ستارے اڑائے جا رہے تھے۔ کہیں مہتاب چھوٹ رہی تھی۔ دھوئیں سے نزدیک والوں کے دم گھٹ رہے تھے۔

غرض بڑے دھوم دھام سے بارات پہنچی۔ وہاں کا کیا سماں بتاؤں۔ ہر طرف بڑے بڑے شامیانے کھڑے تھے۔ شامیانوں میں دریاں اور سفید سفید جاجم بچھے تھے۔ قالین اور مسند لگے تھے۔ عود و عنبر کی خوشبو دور دور تک پھیل رہی تھی۔ جگہ جگہ بلور کے شمع دان رکھے تھے۔ ہر میں چار چار موم بتیاں لگی تھیں۔

تو وہ دولہا محفل میں آ بیٹھا۔ قاضی صاحب تشریف لائے۔ انھوں نے کیا کہا۔ کیا کہلوایا۔ میاں ہم کیا جانیں۔ یہ تو قاضی صاحب جانیں یا دولہا میاں جانیں۔ ہم قاضی نہ دولہا۔ ہمیں مٹھائی ملی تو جانا نکاح ہوگیا۔ براتی کو اور کیا چاہیے؟ ہر طرف مبارک سلامت ہونے لگی۔ گلاب اور کیوڑے کے فوارے چھوٹنے لگے۔ ہار پان تقسیم ہوئے۔

ساری رات لوگ اِدھر سے اُدھر اور اُدھر سے اِدھر آتے جاتے رہے۔ صبح ہوئی تو بدر منیر اپنے باغ والے محل میں ماں باپ سے رخصت ہو کر آئی۔

بارھویں داستان

بے نظیر کا بدر منیر کو اپنے گھر لے جانا

اور ملنا اپنے ماں باپ سے

بے نظیر اپنے ماں باپ سے ملنے کے لیے بے قرار ہو رہا تھا۔ لیکن نجم النساء کی شادی کی وجہ سے چند دن اور ٹھہرنا پڑا۔ اس کی شادی بھی انجام پا گئی۔ اب بے نظیر کسی طرح رُکنے کو تیار نہ تھا۔ اس نے سفر کی تیاریاں شروع کر دیں۔ جب ہر طرح تیاری پوری ہو گئی تو ایک دن سب سے رخصت ہو کر گھر کے لیے روانہ ہوا

میاں گھنٹے دو گھنٹے کا تو سفر تھا نہیں۔ کئی دن کی بات تھی۔ بادشاہ نے خیمے اور سوار بھی ساتھ کر دیے تھے یہ قافلہ چلتے ٹھہرتے، منزل بہ منزل چلا جا رہا تھا۔ چلا چل چلا چل۔ جب وہ اپنے شہر کے قریب پہنچا تو ایک نہر کنارے گھوڑے سے اتر گیا اور وہیں خیمہ ڈالنے کا حکم دیا۔ بات کی بات میں خیمے کھڑے ہو گئے۔ سونا جنگل جاگ اٹھا۔

شہر والوں نے جو اپنی سرحد پر خیمہ اور پلٹن دیکھا تو ڈر گئے گھبرائے ایک کان دو کان بیاباں۔ سارے شہر میں بات پھیل گئی۔ آخر پتا چلا کہ یہ شہزادہ بے نظیر ہے۔ پھر تو سارے شہر میں دھوم مچ گئی کہ شہزادہ بے نظیر آ گیا۔ جب یہ خبر ماں باپ تک پہنچی تو ان کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ کچھ سمجھ میں نہ آیا۔ کیا کریں۔ دونوں رونے لگے کہ لوگو! ہمیں اعتبار نہیں آتا ہمارے ایسے نصیب کہاں کہ بے نظیر مل جائے۔ شاید کسی دشمن نے حملے کی تیاری کی ہے۔

لیکن جب بار بار امیروں وزیروں نے آ آ کر بادشاہ کو یقین دلایا کہ شہنشاہ! آپ چل کے تو دیکھیے۔ شہزادہ آیا ہے، بے نظیر۔ جب بادشاہ نے لوگوں کے منہ سے بار بار بے نظیر کا نام سُنا تو محل سے ننگے پاؤں چل پڑا۔

اُدھر سے بے نظیر آ رہا تھا کہ اس کی نظر باپ پر پڑی وہ گھوڑے سے کود پڑا اور باپ کے قدموں آ گرا۔ باپ نے اٹھا کر سینے سے لگا لیا۔ دونوں اسقدر روئے کہ سب کے آنسو نکل پڑے۔ سارے شہر میں عید کی سی خوشیاں منائی جانے لگیں۔ شہر سے دربار تک لوگوں کا تانتا بندھ گیا۔ بادشاہ نے مٹھی بھر بھر اشرفیاں لٹائیں

بے نظیر، بدر منیر لوٹے محل میں داخل ہوا۔ کیا دیکھتا ہے کہ راستے میں ماں کھڑی ہے۔ وہ فوراً ماں کے قدموں سے جا لگا۔ ماں نے دونوں کو سینے سے لگا لیا۔ اور اس قدر روئی کہ ہچکیاں بندھ گئیں۔ جب دل ہلکا ہوا تو اس نے پانی مانگا اور دونوں پر وار کر پیا۔

ماں باپ کو بے نظیر کے سہرے کا ارمان تھا بڑے دھوم دھام سے دونوں نے پھر بے نظیر اور بدر منیر کی شادی رچائی۔ بے نظیر کا محل کب سے سونا پڑا تھا گونج اٹھا۔

★★

• وقت کا ہاتھ بڑی بڑی عمارتوں کو خاک میں ملا دیتا ہے لیکن ایک اچھی کتاب کا وجود کوئی طاقت نا پید نہیں کر سکتی۔ (نرولوہیا)

جناب اعجاز شہید

شیشے کی دنیا

ایک شہر میں ایک بچی اور اس کے ماں باپ رہتے تھے مگر اس سے پہلے تم کو یہ بھی تو بتاتا چلوں کہ یہ کس زمانے کا ذکر ہے سچ پوچھو تو یہ کسی بھی زمانے کا ذکر ہو سکتا ہے۔ آج کا بھی۔ کئی سو سال پہلے کا بھی اور کئی سو سال بعد کا بھی۔ بہر حال اس زمانے میں جب کہ میں یہ کہانی سنا رہا ہوں، خوب لڑائیاں ہو رہی تھیں۔ ذرا سوچو تو تم کو پتہ چلے گا کہ یہ دیسوں کی آپس کی لڑائیاں کتنی بیکار سی چیزیں ہیں۔ کتنے لوگ اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھتے ہیں۔ کتنے لوگ اپنے ہاتھ پیر سے معذور ہو جاتے ہیں۔ خوش قسمت ہوتے ہیں وہ لوگ جو فوج میں شامل ہو کر لڑنے کے باوجود صحیح سلامت واپس آجاتے ہیں اور پھر لڑائیوں میں حکومتوں کی کتنی دولت بھی خرچ ہوتی ہے ان سب سے فائدہ؟

یہ بات تو بیچ میں ہی نکل آئی ورنہ میں تو تم کو کہانی سنا رہا تھا کہ ایسی ہی لڑائی کے زمانے میں ایک شہر میں ایک پیاری سی بھولی بھالی بچی اور اس کے سیدھے سادے ماں باپ رہتے تھے۔ ان سب کو لڑائی سے بڑی نفرت تھی اور یہ تینوں لڑائی سے ڈرتے بھی بہت تھے۔

جس شہر میں یہ بچی اور اس کے ماں باپ رہتے تھے جب اس شہر میں بھی لڑائی چھڑ گئی تو یہ تینوں ڈر کے مارے ایک ٹوٹے پھوٹے مکان میں جا کر رہنے لگے جو شہر سے بہت دور تھا۔ مگر اس سنسان جگہ میں بھی وہ فوج کے سپاہیوں سے بڑے ڈرتے رہتے تھے کہ پتہ نہیں وہ کب ادھر سے گذریں اور ان کو مار ڈالیں۔

تو بھئی یہ تینوں اپنے اس کھنڈر میں رہ رہے تھے کہ ایک رات کو ان کے دروازے پر دستک ہوئی۔ سب ڈر گئے آخر ہمت کر کے بچی کے والد دروازے پر پہنچے۔ دیکھا تو ایک بوڑھا اجنبی آدمی کھڑا تھا۔ بڑے میاں نے سوچا کہ ہو نہ ہو یہ اجنبی شخص دشمن کا کوئی جاسوس ہے اور ہم لوگوں کا بھید لینے آیا ہے۔ یا پھر یہ ہم کو مارنے آیا ہے۔ مگر بوڑھے آدمی نے گڑگڑا کر کہا۔

"مجھے رات بھر کا ٹھکانہ دے دو۔ بڑی دور سے تھکا ہوا آرہا ہوں۔ صبح ہوتے ہی پھر چل دوں گا۔" بڑے میاں یعنی بچی کے ابا میاں کو بے چارے پر ترس آگیا اور وہ اُسے اپنے گھر کے اندر بلا لائے مگر اس بچی کی امی کو یقین تھا کہ دشمنوں کا جاسوس ہم لوگوں کو مارنے آیا ہے۔ انھوں نے بڑے میاں سے کہا کہ جب یہ اجنبی سو جائیگا تو ہم اُسے مار دیں گے۔ بہر حال اس بوڑھے آدمی کو دونوں میاں بیوی نے پہلے تو کھانا کھلا دیا اور پھر

[illegible] سو جائے۔ بڑے میاں نے اپنی [illegible] کہا اور اجنبی کے سونے کا انتظار [illegible] ہیں سویا ہے تھا کہ بڑی بی چاقو کو تیز کر [illegible] یہ دونوں بڑے میاں اور بڑی بی بڑے [illegible] سادے شریف لوگ تھے۔ بیچاروں نے کبھی [illegible] آتو نہیں تھا۔ اس لیے مارے گھبراہٹ کے [illegible] کے ہاتھ سے چاقو گر گیا اور اس کی آواز سے اجنبی [illegible] مگر بڑے میاں — وہ تو اجنبی کے سونے [illegible] ایسے بے خبر سو گئے تھے کہ چاقو گرنے [illegible] سے بھی آنکھ نہیں کھلی تب بڑی بی نے سوچا کہ اب [illegible] اجنبی سوئے گا تو وہ خود ہی اسے مار دیں گی۔

تم سوچ رہے ہو گے کہ کہانی کے شروع میں تو ہم نے ایک بھولی بھالی بچی کا نام لیا تھا۔ بھلا وہ کہاں گئی کہو یہی [illegible] رہے تھے نا۔؟ ارے بھئی اتنی رات گئے کہیں [illegible] جاگتے ہوتے ہیں۔ وہ تو بڑے آرام سے میٹھی [illegible] تھی اور شاید پریوں کے خواب دیکھ رہی ہوگی۔

ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ اب بڑی بی نے سوچا کہ اس اجنبی کو خود ہی قتل کر دیں۔ اس لیے وہ چاقو لیے اجنبی کے سونے کے انتظار کرتی رہی۔ مگر خود بھی سو گئیں اور اس طرح اس بے چارے کی جان بچ گئی۔ تم نے سنا [illegible] جسے اللہ رکھے اسے کون چکھے۔

یہ دونوں یعنی بڑے میاں اور بڑی بی ابھی سو ہی رہے [illegible] سویرے اٹھ بیٹھی اچھے بچے جلدی سوتے اور [illegible] گئی تھی اور بڑے سو رہے تھے وہ اجنبی بھی جاگ [illegible] جلدی تھی مگر اس نے بڑے میاں اور بڑی بی کو [illegible] سب نہیں سمجھا اور اس بچی سے کہا۔
[illegible] ابا سے میری طرف سے شکریہ کہہ دینا،

اور اسے پیار کرتے ہوئے ایک شیشے کی گیند [illegible] اور اپنے سفر پر روانہ ہو گیا تھوڑی دیر بعد جب بڑے میاں اور بڑی بی کی آنکھ کھلی تو ان کو بڑا افسوس ہوا کہ یہ بچارہ تو بڑا بھلا آدمی تھا ناحق وہ اسے قتل کرنے کی سوچ رہے تھے۔

اب کچھ دن بعد یہ ہوا کہ فوج کے سپاہی اس علاقے میں آ ہی گئے مگر اس عرصے میں اس بچی کو یہ پتہ چل گیا تھا کہ یہ شیشے کی گیند دراصل جادو کی ہے اور اس میں جب چاہیں ننھے منے بن کر اندر گھسا جا سکتا ہے وہ کئی بار ننھی سی گڑیا بن کر اس شیشے کی دنیا کی سیر کر آئی تھی جو اس گیند کے اندر آباد تھی۔

جب وہ سپاہی اس کھنڈر کے قریب آئے تو بڑے میاں اور بڑی بی بہت ڈرے مگر بچی نے ان کو سمجھایا کہ جلدی سے وہ سب ننھے منے بن کر اس شیشے کی گیند میں گھس جائیں۔ یہ تینوں بہت چھوٹے چھوٹے ہو کر اس گیند میں داخل ہوئے اور وہاں جا کر بڑے میاں اور بڑی بی کو پتہ چلا کہ اس گیند میں تو پورا ایک دیس آباد تھا۔ پوری دنیا بسی ہوئی تھی۔ ادھر سپاہیوں نے اُن کے گھر یعنی اس کھنڈر میں رات گذاری اور صبح ایک سپاہی نے یوں ہی کھیل کھیل میں وہ گیند اچھالی اور یہ کھنڈر پہاڑ پر بنا ہوا تھا اس لیے وہ شیشے کی گیند اچھل کر نیچے بہت نیچے جا کر گر گئی اور ٹوٹ گئی اور اس کے ٹوٹتے ہی اس میں تین ننھے منے آدمیوں یعنی بچی اور اس کے بوڑھے ماں باپ کے علاوہ جو دنیا بسی ہوئی تھی سب بکھر گئی اور پھر دھیرے دھیرے یہ دُنیا بڑھنے لگی۔ کچھ ہی سیکنڈ بعد یہ دنیا مینڈک کے برابر ہو گئی اور دو تین منٹ بعد ہم۔ تم فٹ بال

جڑی ہوگئی۔ کوئی ایک گھنٹہ کے بعد تو وہ ہاتھی کے برابر ہوگئی اور پھر یہ دنیا روز بروز بڑھتی جا رہی تھی اس میں موجود آدمی بھی بڑے ہوتے جا رہے تھے جب یہ دنیا اتنی بڑی ہوگئی جیسے کہ شہروں میں پارک ہوتے ہیں۔ تو ایک زخمی سپاہی دوڑتا ہوا قریب سے گزرا اس کے پیچھے ایک دوسرا سپاہی ہاتھ میں تلوار لیے دوڑ رہا تھا۔ وہ بچی بڑی مہربان تھی اس نے جلدی سے اس زخمی سپاہی کو اپنی دنیا میں بلا لیا اور دوسرے سپاہی نے اس شیشے کی دنیا میں داخل ہونے کی کوشش کی تو وہ داخل ہی نہیں ہو سکا اور یہی یہ زخمی سپاہی وہ اجنبی بوڑھا آدمی تھا جس سے یہ شیشے کی گیند دی تھی۔ اس دنیا میں آتے ہی اس کے سارے زخم ٹھیک ہوگئے اور اس نے بچی کو پیار کیا اور بتایا کہ یہ دنیا جو شیشے کی گیند میں بند تھی امن کی دنیا تھی۔ اور اب یہ آزاد ہوگئی ہے اور اس میں لڑائی کرنے والے بالکل نہیں داخل ہو سکتے۔

اور یہ تو میں کہہ چکا ہوں کہ شیشے کی یہ دنیا روز بروز بڑھتی جا رہی تھی اور جب یہ دنیا [illegible] سارے برِ اعظم پر چھا گئی تو ساری لڑنے والی [illegible] سمندر میں گر گئیں تو اس بچی نے تالیاں بجاتے ہوئے کہا۔ "اب یہاں کوئی لڑنے والا نہیں۔ میں اس [illegible] کی دنیا کی شہزادی ہوں اور میری امی [illegible] اس دیس کے راجا رانی اور اب میں اس اجنبی سے شادی کروں گی جس نے مجھے شیشے کی وہ جادو کی گیند دی تھی!"

سب نے اس اجنبی کو بہت ڈھونڈا مگر [illegible] شیشے کی دنیا میں کہیں پتہ ہی نہ تھا اس کا [illegible] وہ کہاں چلا گیا تھا اور وہ بڑے میاں [illegible] نہیں بھی اب تو وہ راجا رانی تھے۔ [illegible] کر انھوں نے ایسے شریف آدمی کو مار ڈالا [illegible] تھی۔

(خیال [illegible])

مہر رودولوی

بے ہنر کی زندگی بیکار ہے

بہت زمانہ پہلے کی بات ہے کہ پنجاب میں ایک پنڈت جی رہتے تھے انھوں نے بارہ سال تک تعلیم حاصل کی اس کے بعد انھوں نے کاشی میں آکر علم شاعری، ویدک شاشتر وغیرہ حاصل کیا اور بڑا پنڈت بن گیا۔ وہ اپنے علم پر بڑا مغرور ہو گیا اور خود کو بڑا سمجھنے لگا۔ اور جو بے علم تھے انھیں حقارت کی نظر سے دیکھتے وہ ہر بے علم سے کہتا تھا کہ بغیر علم کے زندگی بیکار ہے۔

اپنی تعلیم پوری کرنے کے بعد پنڈت جی نے اپنے گھر لوٹنے کا ارادہ کیا ان دنوں ریل گاڑی تو تھی نہیں اس لیے وہ پیدل ہی روانہ ہوئے چلتے چلتے وہ ایک دریا کے کنارے پہنچے اس جگہ دریا کافی گہرا تھا۔ گھاٹ پر صرف ایک ناؤ (کشتی) تھی وہاں مانجھی کے سوا دوسرا کوئی نہ تھا۔ پنڈت جی ناؤ پر بیٹھ گئے۔ مانجھی ناؤ کھینے لگا۔ باتوں باتوں میں پنڈت جی نے مانجھی سے پوچھا کیوں بھائی مانجھی تم نے گیتا پڑھی ہے؟

مانجھی نے کہا۔ نہیں مہاراج ہم گنوار لوگ بھلا کیسے پڑھ سکتے ہیں؟ ہماری ساری عمر تو [illegible] میں بیت [illegible] ہے۔

پنڈت جی [illegible] رسے تو تمھاری ایک تہائی زندگی بیکار گئی بے چارا مانجھی چپ ہو گیا۔ تھوڑی دیر بعد پنڈت جی نے مانجھی سے پھر پوچھا۔ اچھا شاکنتل ناٹک تو تم نے پڑھا ہوگا؟

مانجھی بولا — شاکنتل میں نے تو یہ نام بھی کبھی نہیں سنا۔ ہم ان پڑھ آدمی گرنتھ کہاں پڑھ سکتے ہیں۔

پنڈت جی نے حیرت سے دیکھا اور کہا شاکنتل بھی نہیں پڑھا تو پھر تمھاری دو تہائی زندگی بیکار گئی۔ اتنے میں ہوا زور سے چلنے لگی۔ چاروں طرف سے بادل گھر آئے اور ناؤ ڈانواڈول ہونے لگی۔

مانجھی نے اوپر دیکھ کر کہا۔ مہاراج طوفان آرہا ہے اور مجھے ڈر ہے کہ شاید اپنی ناؤ ڈوب جائے گی آپ کو تیرنا آتا ہی ہوگا۔

پنڈت جی سٹپٹا گئے اور بولے نا بھائی مجھے تیرنا ویرنا نہیں آتا۔

مانجھی نے تعجب سے کہا کیا تیرنا نہیں آتا تو مہاراج آپ کی ساری زندگی بیکار گئی اب رام کا نام لیجئے تھوڑی ہی دیر میں آندھی آگئی اور بادل زور سے برسنے لگے۔ جلد ہی طوفان کے تھپیڑوں سے ناؤ الٹ کر ڈوب گئی۔

باقی صفحہ ۳۹ پر

جناب خلیل الرحمٰن (دہلی)

مصلح اعظم

شیخ سعدی علیہ الرحمہ ایک جید عالم اور فارسی کے بلند پایہ شاعر تھے۔ اعلیٰ درجہ کی تعلیم اور معیاری تربیت نے طبیعت میں جو ہر تھے، ان کو جلا دی تھی۔ گو باسی تو شیراز کے تھے۔ مگر علم کی خاطر آپ کو مختلف اقصاع عالم کے سفر کا موقع ملا۔ اور ہندوستان بھی آئے تھے۔ تمام مروجہ علوم و فنون پر قدرت حاصل کی تھی۔ ذہانت، سخن دانی اور بذلہ سنجی آپ میں بدرجۂ اتم موجود تھی۔ امراء سے ان کے مراسم تھے۔ اہلِ علم سے ان کے تعلقات تھے اور درویشوں سے فیض صحبت حاصل تھا۔ صاحب مذاق، زندہ دل اور خوش صحبت تھے۔ خوش اخلاق ہمدرد، باپرور صوفی منش اور جامع الصفات شخصیت کے مالک تھے۔

انھوں نے بہت سی کتابیں لکھی ہیں جن میں گلستان بوستان ان کی عرفانی یادگاریں ہیں۔ ان شہرۂ آفاق کتابوں کو قبول عام اور شہرت دوام کی دولت ملی ہے۔ آج بھی دنیا بہت سے مدارس میں بڑی توجہ اور شوق سے پڑھائی جاتی ہیں۔ ان کے پند و نصائح کو طلبہ اپنی گرہ میں باندھ لیتے ہیں۔ ان کتابوں کا انگریزی ترجمہ بھی ہوا ہے۔ .... (جس میں علم و دانش کے خزانے بھر دیئے ہیں) کو اتنی مقبولیت اور قدر دانی ہوئی کہ مغربی جوہر شناسوں نے سر آنکھوں پر جگہ دی۔

ان دل آویز حکایتوں میں اتنا گہرا اثر ہے جو قاری کی سیرت کی تشکیل میں معاون ہوتا ہے اور انھیں فلاح و سعادت کی طرف لے جاتا ہے۔ آپ نے اپنے نصائح کے طلسم سے ان کی رگوں میں زندگی کی ایک نئی لہر پیدا کر دی ہے۔ یہ حکایات رنگین اور دلکش ہیں کہ ان کے مطالعہ سے اخلاقی جواہر ریزے باتوں باتوں میں ہمارے ذہن نشین ہو جاتے ہیں اس کی تاثیر کی اصلی وجہ آپ کا خلوص ہے۔

حکایت

ایک گنوار گدھے پر سوار ٹخ ٹخ کرتے گھر کی طرف آ رہا تھا۔ گھر جنگل سے کالے کوسوں دور تھا۔ تھوڑی دور چلا کہ بادل گھر آئے۔ موسلا دھار بارش شروع ہو گئی بجلی کوندنے سے آنکھیں چکاچوند ہو جاتی تھیں۔ بادل کی گڑگڑاہٹ سے دل دہل جاتے تھے ایسی تاریکی چھائی ہوئی تھی کہ ہاتھ کو ہاتھ نہیں سجھائی دیتا تھا ندی، نالے تیزی سے بہ رہے تھے۔ پانی کے شور و غل سے کلیجہ کانپتا تھا۔ غریب کا گدھا کیچڑ میں [illegible] رات جھلاتا رہا۔ جب صبر کا پیمانہ چھلک [illegible]

باقی صفحہ پر

...سب کو بڑا اچھا کہتے تھے۔
جب صبح ہوئی تو اس ملک کا بادشاہ اتفاق سے اس راستے سے گزرا۔ جہاں وہ رات بھر سردی میں ٹھٹھرتا آسمان کو سر پر اٹھائے واویلا مچاتا رہا تھا۔
بادشاہ نے ترس کھاکے ایک لباس فاخرہ زیب تن کرنے کے لیے اور ایک عربی گھوڑا سواری کے لیے انعام دیا۔ گنوار کے دوست نے کہا کر خوب بچے۔ ورنہ موت کے گھاٹ اتار دیے جاتے گنوار نے کہا "برائی کا بدلہ برائی آسان ہے مگر اس شخص کے ساتھ نیکی کرنا جس نے برائی کی ہے بڑے دل گردے کا کام ہے"

یہی ہے عبادت یہی دین و ایمان
مصیبت میں کام آئے انسان کے انسان

بقیہ چالاک بھائی صفحہ ۲۴ سے

دو ... ... کے حصے دار تھے۔
جاڑا آیا۔ بڑے بھائی نے کمبل کا بٹوارہ کیا۔ دن کو چھوٹا بھائی کمبل اوڑھے اور رات کو بڑا بھائی۔ خیر ... بھائی مان گیا۔
چھوٹا بھائی دن کو بے مطلب کمبل اوڑھے رہتا ... کو جاڑے سے مرتا۔ پھر چھوٹا بھائی حجام کے ... گیا۔ حجام نے کہا۔ جب تم کمبل لوٹاتے ہو اس ... کو کسی تالاب (ندی) سے بھگو کر دیا کرو۔
چھوٹے بھائی نے ویسا ہی کیا۔ جب بڑے بھائی ... کی چال سمجھ گیا۔ اور دونوں رات کو ... سوتے۔ اس طرح دونوں خوشگوار

بقیہ زلزلہ صفحہ ۲۳ سے

ہوں یعنی ان پر جھٹکوں کا کوئی اثر ہی نہ ہو۔ اس سلسلے میں تجربہ کیا جا رہا ہے اور بہت حد تک کامیابی ہو رہی ہے۔ فلیٹ اور اپارٹمنٹ کی تو تو منزلہ جو عمارتیں مکمل ہو رہی ہیں وہ رہائش کے لیے ابھی نہیں دی جا رہی ہیں بلکہ ان کی چھتوں پر بہت بھاری قسم کے وائبریٹر یعنی عمارت کو ہلانے والی مشین فٹ کیے جا رہے ہیں۔ یہ وائبریٹرس چھتوں کو ... پوری عمارت کو اس طرح ہلائیں گے گویا کہ وہ زلزلے سے ہل رہی ہیں۔ اس طرح وہ اور مستحکم ہو جائیں گی اور بالکل زلزلہ پروف ہو جائیں گی۔

بقیہ سائنس کی دنیا صفحہ ... سے

آہستہ آہستہ ہمیں سیاروں کے بارے میں نئی نئی معلومات ملتی جا رہی ہیں اور وہ دن دور نہیں جب چاند کی طرح انسان کے قدم دوسرے سیاروں پر بھی پہنچ جائیں گے۔

**

بقیہ نیکی کیا ہے صفحہ ۸ سے

باپ نے خوشی سے چلاکر کہا :۔ آفریں ہے تم پر۔ یہی ہے وہ نیک کام جس کی میں نے تم لوگوں سے آرزو کی تھی۔ تم ہی اس زیور کے اصلی حق دار ہو میرے بیٹے!"
بچو! ہمیشہ اچھا کام سمجھنے سے اچھا کام نہیں ہوتا ہے۔ اصلی اچھائی تو وہ ہے جب تم برے کے ساتھ بھی اچھائی کا برتاؤ کرو اور گناہ سے نفرت کرو، گناہگار سے نہیں۔

(خیال ...)

آدھی ملاقات

"پیام تعلیم" ملا۔ آپ لوگوں کی جو خاص عنایت مجھ پر ہے اس کا شکریہ۔ جنوری کے پرچے میں خطوط کے صفحے پر میں نے پیام تعلیم پڑھنے والوں سے اس کے خریدار بڑھانے کی اپیل کی تھی۔ خدا کرے میری اپیل پیامیوں کے دل کو لگی ہو۔ میں پرانے خریداروں کی تجدید اور نئے کی تلاش میں ہوں۔ ایک نئے خریدار کا منی آرڈر بھیج چکا ہوں ملا ہوگا۔ ۲۷۔ کو منی آرڈر کیا ہے۔

فروری کے پیام تعلیم کا ٹائٹل پیج بہت خوب ہے۔ یہ کالا اور نارنجی رنگوں میں چھپتا تو زیادہ پرکشش ہوتا۔ بعض مضامین کی زبان بچوں کے لیے سخت ہے بڑے بڑے الفاظ مضمون سے دلچسپی کی راہ میں روڑے بن جاتے ہیں۔

"انوکھا بدلہ" اچھی کہانی ہے۔ مگر کچھ لمبی ہوگئی ہے۔ "کہانی ایک لڑکے کی" دلچسپ ہے "خوشی کے آنسو" بھی اچھی کہانی ہے۔ مگر زیادہ پیچیدہ ہے۔ نظمیں بھی اچھی ہیں۔ محترم غلام ربانی صاحب کا مضمون "چاندی کا تاج" سب کا سرتاج ہے۔

مجھے خوشی ہے کہ "شہزادہ بے نظیر کی کہانی" بچوں کو پسند آرہی ہے۔ قدر افزائی کا شکریہ۔

خلیق انجم صاحب محترم ادھر کچھ دنوں سے خاموش ہیں؟

محترم شاہد صاحب کی خدمت میں بندگی عرض ہے۔ پیام تعلیم زندہ باد۔ (اسرار مہدی)

بہت دنوں کے بعد ایک نظم "پیام تعلیم" کو بھیجے ارسال کر رہا ہوں۔ حسین حسان مرحوم کی وفات سے دل جیسے بجھ سا گیا۔ ان کے خطوط نگلوں کے لیے تحریک کا باعث ہوتے تھے اور اس طرح بچوں کی محفل میں شامل ہونے کا موقع مل جایا کرتا تھا۔

پیام تعلیم برابر مل رہا ہے۔ ممنون ہوں۔ اب سے آپ ہی لوگ نہ صرف جاری رکھیں بلکہ ترقی بھی دیں۔

ایں دعا از من و از جملہ جہاں آمین باد!

خدا کرے آپ بخیر ہوں، میرے لائق کوئی خدمت؟

(علقمہ شبلی)

بقیہ بے ہنر زندگی ص ۳۶ سے

مانجھی پانی میں کود کر تیرنے لگا۔ لیکن پڑھے لکھے پنڈت جی ناؤ کے ساتھ ہی پانی میں ڈوبنے لگے مانجھی نے کسی طرح پنڈت جی کو کنارے لگایا۔ تب تک بیچارے پنڈت جی کا علم کا گھمنڈ اتر چکا تھا۔ (ہندی سے)

• سچی خوشی کام کرنے سے حاصل ہوتی ہے۔

بشیر احمد [illegible]

اِدھر اُدھر سے

الفارابی کی ۱۱۰۰ ویں سالگرہ

شہرۂ آفاق فلسفی ابونصر محمد الفارابی کی ۱۱۰۰ ویں سالگرہ سوویت یونین میں اور دنیا کے کئی ملکوں میں دھوم دھام سے منائی جارہی ہے۔ الفارابی جس مقام پر پیدا ہوئے تھے وہ اب سوویت قزاخستان کہلاتا ہے۔

الفارابی کی سالگرہ کے سلسلے میں مختلف النوع سرگرمیوں کا بھرپور پروگرام بنایا گیا ہے۔

الفارابی کی تصانیف جو آج تک موجود ہیں۔ کثیر تعداد میں شایع کی گئی ہیں۔ ریاضی کو فارابی کی دین، ریاست اور قانون سے متعلق فارابی کے خیالات، انسان دوستی کے نظریاتی سرچشمے اور دیگر موضوعات کے بارے میں ان کی تخلیقات اشاعت کے لیے مرتب کی جارہی ہیں۔ اس وقت ایک بین الاقوامی علمی کانفرنس منعقد کرنے کی تیاریاں کی جارہی ہیں یہ کانفرنس ۱۹۷۰ء کے موسم خزاں میں ماسکو میں ہوگی۔ اس کانفرنس کا موضوع "الفارابی اور عالمی تہذیب" ہوگا۔

(واقعات و تبصرے)

لطیفے

ماں :- بیٹے اتنی سخت دھوپ میں کیوں کھڑے ہو؟

بیٹا : ماں پسینہ سکھا رہا ہوں۔

میزبان : آپ نے تو صرف چائے نوش فرمائی ہے۔ آج شام کا کھانا بھی یہیں تناول فرماتے تو بہتر ہوتا۔

مہمان : بات دراصل یہ ہے کہ آج کا پہلا روزہ گھر پر ہی افطار کرنا چاہتا ہوں۔

مسافر : (مغرب کی دو رکعت نماز پڑھا کر) "میں مسافر ہوں آپ لوگ باقی رکعت پوری کرلیں"

مقتدی :- مغرب کی نماز میں قصر کا حکم شاید آپ ہی پر نازل ہوا ہے۔

جناب نثار احمد انجم قاسمی

ہندوستان کی اہم زبانوں اور انگریزی میں بچوں کے لیے بہترین اور سستی کتابیں شایع کرنے کے منصوبے کا آغاز کیا گیا ہے۔ اس کا سب سے بڑا مقصد یہ ہے کہ ہندوستان کے مختلف حصّوں میں بسنے والوں مختلف زبانوں کے جاننے والوں کے لیے ایک ہی سا ادب پیش کیا جائے تاکہ وہ ایک دوسرے کے حالات سے واقف ہو سکیں اور اس سے قومی ایکتا مضبوط ہو۔

اب تک مندرجہ ذیل کتابیں شایع ہوئی ہیں جو اُردو کے علاوہ انگریزی اور ہندوستان کی دوسری زبانوں میں بھی ملتی ہیں۔ ہر کتاب کی قیمت ایک روپیہ پچاس پیسے (۱/۵۰) ہے۔ یہ سب کتابیں رنگین تصویروں کے ساتھ فوٹو آفسٹ پر شایع ہوئی ہیں۔

۱۔ باپو (حصّہ اول و دوم) مصنف: سی فری ٹاس، مترجم: صالحہ عابد حسین
۲۔ سب کا ساتھی سب کا دوست ، : اُماشنکر جوشی ، ، : انور کمال حسینی
۳۔ کشمیر مصنف مالا سنگھ، مترجم: خدیجہ بیگم، تصویر: پریانند
۴۔ پرندوں کی دنیا مصنف: جمال آرا، مترجم: محمد شفیع الدین نیّر
۵۔ ہمالیہ کی چوٹیوں پر ، : بریگیڈیر گیان سنگھ، مترجم: محمد ذاکر
۶۔ ہماری ندیوں کی کہانی مصنف: لیلا مجمدار، مترجم: رضیہ سجاد ظہیر
۷۔ جنت کی سیر اور دوسری کہانیاں ، : لیلا بھاگوت، ، : رضیہ سجاد ظہیر
۸۔ رسیلی کہانیاں ، : منوج داس، ، : صغرا مہدی
۹۔ آزادی کی کہانی حصہ اول و دوم ، : وشنو پربھاکر، ، : انور کمال حسینی
۱۰۔ ہماری ریلیں ، : جگ جیت سنگھ، ، : عرش ملسیانی
۱۱۔ ہندوستان میں غیر ملکی سیاح ، : کے بی۔ کھنہ، تصاویر: کرشن کھنہ
۱۲۔ آؤ ناٹک کھیلیں ، : اوما آنند، مترجم: رفیعہ منظور الامین
۱۳۔ خاربلی کا خاندان ، : منوہر داس چترویدی، : محمد شفیع الدین نیّر
۱۴۔ بہت دن ہوئے حصّہ اول ، : چکسی بی۔ ام جوشی، : رضیہ سجاد ظہیر
۱۵۔ بہادروں کی کہانیاں، مصنف: راجندر اوستھی، مترجم: انور کمال حسینی
۱۶۔ رونت و تدیہ ، : کرشن چیتنیہ ، ، ، ،
۱۷۔ سدا بہار کہانیاں ، : شانتا رنگا چاری مترجم: انور کمال حسینی
۱۸۔ ایجادیں جنھوں نے دنیا بدل ڈالی (حصہ اول و دوم) ، : میر نجابت علی، ، : سید لسان
۱۹۔ سونا کی سیر ، : نارا تیواڑی، ، : انور کمال حسینی
۲۰۔ بڑا پانی مصنف: لیلا مجمدار، مترجم: صالحہ عابد حسین
۲۱۔ سورا ، : ملک راج آنند، ، : انور کمال حسینی
۲۲۔ ہاکی کا کھیل ، : سروِندر سانیال ، : پریتم لال
۲۳۔ پھول اور شہد کی مکھی : اشوک داور ، : انور کمال حسینی

ذاکر حسین سیریز

۲۴۔ ابو خاں کی بکری، مصنف: ڈاکٹر ذاکر حسین قیمت،
۲۴۔ انوکھی دُکان ، : قدسیہ زیدی ،
۲۵۔ گلابو چچا ہیا اور پری زاد ، ، ، ، ،
۲۶۔ دنیا کے جانور ، ، ، ، ،
۲۷۔ راجہ رام موہن رائے ، : عرش ملسیانی
۲۸۔ خواجہ الطاف حسین حالی ، : صالحہ عابد حسین
۲۹۔ سلطان زین العابدین "بڈشاہ" رضیہ سجاد ظہیر
۳۰۔ ذاکر صاحب کی کہانی : سعیدہ خورشید عالم

ملنے کا پتہ

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر نئی دہلی ۲۵، اُردو بازار جامع مسجد دہلی ۶، پرنسس بلڈنگ بمبئی ۳

پیام تعلیم

ماہنامہ

پیام تعلیم

نئی دہلی ۲۵

جلد ۱۲ شمارہ ۶

اڈیٹر

ولی شاہجہانپوری

معاون

صفیہ حسان

جون ۱۹۷۵ء

قیمت فی پرچہ ——— ۷۰ پیسے

سالانہ چندہ ——— سات روپے

پرنٹر پبلشر سید احمد ولی نے مکتبہ جامعہ لمیٹڈ کے لیے جمال پرنٹنگ پریس دہلی میں چھپواکر جامعہ نگر نئی دہلی ۲۵ سے شایع کیا

فہرست مضامین

محمد شفیع الدین نیّر کی کتابیں

تعلیمی دلچسپ کہانیاں

نام کتاب	قیمت
گنگلے کی دوڑ	۳۰ پیسے
میں گھر جاؤں تو کیسے	۵۰ "
مکھن کا ڈبہ	۵۰ "
ڈھول کا بول	۳۰ "
آٹے کا پتلا	۵۰ "
ہوشیار حسن	۵۰ "
تارا کا ڈنڈا	۲۵ "
انار راجہ	۳۰ "
بلغ شہزادی	۳۵ "
ریڈیو کا بھوت	۳۰ "
بونے کا بٹوا	۲۵ "
پری کی چھڑی	۳۵ "
پرستان کی سیر	۲۵ "
بونے کا انصاف	۳۰ "
چنن منن	۵۰ "
منی کا پرستان	۵۰ "
ملو میاں	۵۰ "
الو کی چھڑی	۵۰ "
میاں مٹھو	۵۰ "
طلسمی مینا	۵۰ "
ٹھلو میاں	۵۰ "

نام کتاب	قیمت
یادگار انگوٹھی	۵۰ پیسے
بدھو کی بیوی	۳۵ "
چھنگو سنگو	۵۰ "
پیسے کا صابن	۵۰ "
گھر کا آئینہ	۵۰ "
عید کے کھلونے	۵۰ "
باپ کی ناؤ	۵۰ "
مزدور کا بیٹا	۶۰ "
شیر خاں کے معرکے	۸۵ "
غالب کی کہانی	۲ روپے ۵۰ "

اخلاقی اور تعلیمی نظمیں

نام کتاب	قیمت
بچوں کا کھلونا	۸۵ "
گھی شکر	۷۵ "
نئی کہانیاں	۶۵ "
منی کے گیت (خاص لڑکیوں کے لیے)	۷۵ "
منی کا تحفہ (" " ")	ایک روپیہ ۲۰ "
وطنی نظمیں	۸۵ "
بچوں کا تحفہ (حصہ اول)	۸۵ "
بچوں کا تحفہ (" ")	۸۵ "
ہماری نعت	۴۰ "
اسلامی نظمیں	۷۵ "

ملنے کا پتہ: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ جامعہ نگر نئی دہلی ۲۵

بچّوں سے باتیں

اسکولوں کے امتحان تو ختم ہو گئے، بعض جگہ نتیجوں کا اعلان بھی ہو گیا۔ کہیں کہیں نتیجے نکلنا باقی ہیں۔ امید کرتے ہیں کہ آخر تک سب ہی بچّوں کو اپنی اپنی محنت کا پھل مل گیا ہوگا۔

جو لوگ کامیاب ہوئے ہیں انھیں ہم مبارکباد پیش کرتے ہیں۔ جو ناکام ہوئے ان سے ہمیں ہمدردی ہے۔ انھیں ہمارا مشورہ ہے کہ اپنی ناکامی سے بددل نہ ہوں۔ اس کے اسباب کا پتہ لگائیں، انھیں دور کرنے کے جتن کریں۔ ہمّت سے کام لینا سیکھیں اور اگلے سال کامیابی حاصل کرنے کا عزم کر کے پڑھائی میں لگ جائیں۔

مئی کے پرچے کے مطالعہ کے بعد جو خط ہمیں موصول ہوئے ہیں ان میں چند ہم اس شمارے میں شائع کر رہے ہیں۔ پیامی محمد مبین ایولوی نے بعض ایسی باتیں لکھیں ہیں جنھیں پڑھ کر ہمیں افسوس ہوا۔ ہمیں یقین ہے کہ جن لوگوں کے متعلق انھیں شکایت ہے وہ خود یہ خط پڑھ کر اپنے آپ کو ملامت کریں گے۔ شہرت حاصل کرنے کے لیے ایسی حرکتیں کرنے پر نادم ہوں گے اور آئندہ ایسا نہ کرنے کا عہد کریں گے۔

جہاں تک ہمارا تعلق ہے۔ ہمارے لیے یہ بات مشکل ہے کہ کسی مضمون یا کہانی کے متعلق اتنی چھان بین کر سکیں۔ کوشش تو ہماری یہی ہوتی ہے کہ اس قسم کی کہانیوں سے پیامِ تعلیم کے صفحوں کو پاک رکھیں۔

محمد مبین صاحب کے اس قسم کے خط سے ہمیں اپنے ایک عزیز رفیق یاد آگئے جو ایسی فردگزاشتوں پر ٹوک دیا کرتے تھے۔ یہ ہیں خلیق انجم اشرفی صاحب جو اپنی سفر و فیلتوں کی وجہ سے پیامِ تعلیم کو بھول سے گئے ہیں۔ خدا کرے کہ اب ان کی مشغولیت انھیں اتنی مہلت دے کہ وہ بزمِ پیامِ تعلیم میں شرکت کر سکیں۔

اس مرتبہ طویل خاموشی کے بعد مناظر عاشق ہرگانوی صاحب نے ہمیں یاد کیا اور ایک اچھی سی کہانی بھیجی ہے۔

م۔ ندیم صاحب بھی ایک دلچسپ ڈراما

[illegible] کرنے کے بعد شریکِ بزم ہوئے ہیں۔ ہم دونوں حضرات کے ممنون ہیں۔ اور امید کرتے ہیں کہ آئندہ بھی کرم فرماتے رہیں گے۔

ریحان احمد عباسی صاحب کی " شکاری کی باتیں " کافی پسند کی گئی ہیں۔ اس دلچسپ مضمون کی دوسری قسط آپ اس پرچے میں پڑھیں گے۔ اس مضمون کی خوبی یہ ہے کہ ہر آنے والی قسط اپنی پچھلی قسط سے زیادہ دلچسپ ہوتی جائے گی۔

آپ سب کو معلوم ہو ہی گیا ہوگا کہ دنیا کی تاریخ میں پہلی مرتبہ ایک خاتون دنیا کی سب سے اونچی پہاڑی چوٹی پر قدم رکھنے میں کامیاب ہوگئیں۔

" ماؤنٹ ایورسٹ " دنیا کی سب سے اونچی چوٹی ہے۔ ۱۹۵۳ء میں تین سنگھ نورکے اور سر اڈمنڈ ہلاری نے پہلی بار اس پر قدم رکھا تھا۔

اس کے بعد سے آج تک ۳۵ کوہ پیماؤں نے یہ عزت حاصل کی جن میں ۹ ہندوستانی شامل ہیں۔

جاپان کی مسز جنکو تبئی پہلی خاتون ہیں۔ جنھوں نے ۱۶ مئی ۱۹۷۵ء کو ساڑھے بارہ بجے دن کے وقت [illegible] کو سر کیا۔ ان کے ساتھ ایک شیرپا بھی جو [illegible] سمام انگ زیرنگ ہے۔ مسز تبئی کی عمر [illegible] ہے۔ وہ اس پندرہ نفری زنانی کوہ پیما [illegible] تھیں جو مسز ایکو ہسالوکی قیادت میں اس مہم پر آیا تھا۔

۳ مئی کو جب یہ پارٹی دوسرے کیمپ میں تھی کہ برفانی چٹان کے گرنے سے کئی خواتین زخمی ہوگئی تھیں۔ مسز تبئی بھی شدید طور پر زخمی ہوگئی تھیں بعض کا خیال تھا کہ اب یہ مہم ترک کر دی جائے۔ مگر آخری فیصلہ یہی ہوا کہ کوشش جاری رکھی جائے بالآخر کامیابی نے خود قدم چومے۔

یہ بھی حسنِ اتفاق ہے کہ خواتین کو یہ کامیابی اس سال میں حاصل ہوئی جو بین اقوامی خواتین کا سال ہے۔ اور یہ بھی کہ جس طرح ۱۹۵۳ء میں ایک ہندوستانی مرد نے یہ اعزاز حاصل کیا تھا۔ اسی طرح ۱۹۷۵ء میں یہ سہرا ایک ایشیائی خاتون کے سر بندھا۔

اس کامیابی پر مسز جنکو تبئی اور ان کی ٹیم کی ممبر مبارکباد کی مستحق ہیں اور ہم انھیں مبارک باد پیش کرتے ہیں۔

جناب انجم عباسی (بی اے آنرز)

اے خالقِ دو عالم، اے رحمتِ مکرّم
سب پر ہے لطف تیرا اے داورِ معظم

صناعیاں ہیں تیری بے مثل یا الٰہی
کتنی حسین تو نے بزمِ جہاں بنا لی

ہیں مہر و ماہ و انجم تیری ضیا سے روشن
قدرت سے تیری ذرّہ بھی ہے جوابِ ایمن

تو نے صدف کے سینے گوہر سے بھر دیے ہیں
تو نے ہی پتھروں سے چشمے رواں کیے ہیں

رہ کر نہاں نظر سے ہر رنگ سے عیاں ہے
ہر سمت تیرا بحرِ لطف و کرم رواں ہے

عاصی ہیں پُر خطا ہیں پھر بھی ہیں تیرے بندے
نادم ہیں سر جھکائے آئے ہیں در پہ تیرے

شاہِ اُممؐ کے صدقے اے کردگارِ عالم
وہ جوش دے کہ تیری مرضی پہ مر مٹیں ہم

اسلاف کی وہ عظمت ہم کو عطا ہو یارب
ٹھوکر میں پھر ہماری ارض و سما ہو یارب

نیکی کے راستوں کا راہی ہمیں بنا دے
عصیاں کے داغ دل پر جو ہیں انھیں مٹا دے

انجم بنا کے چمکا رفعت کے آسماں پر
تنویر لے کے تیری چھا جائیں ہم جہاں پر

جناب م - ندیم (علیگ)

سچّا دوست

کردار

رامو : ایک غریب آدمی
رامو کی بیوی اور بچّے
رادھے : رامو کا بچپن کا دوست اور اب راجہ کا منتری
شیاما : رادھے کی بیوی
پہرے دار : اور نوکر وغیرہ

(پہلا منظر)

(ایک ٹوٹا پھوٹا جھونپڑا ، دو تین مٹی کے برتن رامو ، اس کی بیوی اور بچّے زمین پر اوڑھے لیٹے بیٹھے ہیں)

ایک بچّہ : ماں مجھے بھوک لگی ہے

رامو کی بیوی : بیٹا سوجا ، دیکھ رانی اور گڈّو بھی سو گئے

بچّہ : مگر ماں بھوک کے مارے نیند نہیں آرہی ہے مجھے۔

رامو کی بیوی : سوجا بیٹا سویرے تیرے لیے پوریاں بنادوں گی۔

بچّہ : ماں تم روز یہی کہتی ہو ۔ مجھے نیند نہیں آرہی ہے ۔

رامو کی بیوی : سوجا میرے لال ۔ میں تجھے ایک اچھی سی کہانی سناتی ہوں ۔ اچھی پری کی ۔

بچّہ : تم ہر روز وہی ایک کہانی سنایا کرتی ہو۔ اچھی پری کی ۔ اگر وہ پری اچھی ہے تو ہمارے لیے کھانا کیوں نہیں لاتی ؟

رامو : اُف کتنی سردی ہے اور خالی پیٹ میں اور بھی لگتی ہے ۔

رامو کی بیوی : ہم کو تو بھوکے پیاسے رہنے کی عادت پڑ گئی ہے ۔ مگر بچّوں کا بلکنا مجھ سے نہیں دیکھا جاتا ۔

رامو : (ٹھنڈی سانس لے کر) ہماری قسمت ہی خراب ہے ۔ چار دن ہوگئے کوئی کام ہی نہیں ملا ۔

رامو کی بیوی : قسمت کو کیوں کوستے ہو ۔ کوشش کرنے سے سب کام بن جاتے ہیں ۔

رامو : میں تو بیس سال سے کوشش اور محنت کر رہا ہوں اس پر بھی نہ تو پیٹ بھرنے کو روٹی ہے اور نہ تن ڈھانپنے کو کپڑا ۔

رامو کی بیوی : مگر بُرے دن سدا نہیں رہتے ہمارے بھی کبھی تو اچھے دن آئیں گے ہی ۔

رامو: ہاں اچھے دن آئیں گے ۔ اسی انتظار میں زندگی بیت جائے گی ۔

راموکی بیوی: تم نے ایک دن کہا تھا کہ تمھارا بچپن کا دوست رادھے اب راجہ کا منتری ہوگیا ہے ۔ وہ پاٹھ شالہ میں تمھارے ساتھ پڑھا کرتا تھا نا؟

رامو: ہاں، وہ راجہ کا منتری ہوگیا ہے ۔ مگر اس کے منتری ہوجانے سے ہمیں کیا ۔ ہماری قسمت تو بدلنے سے رہی ۔

راموکی بیوی: مگر تم کہتے تھے کہ وہ تمھارا بڑا ہی پیارا دوست تھا۔ تم دونوں ساتھ ساتھ کھیلا کرتے تھے، پڑھا کرتے تھے، اور تم سے اور رادھا سے کبھی لڑائی نہیں ہوئی تھی اور جب وہ یہاں سے گیا تھا تو تم سے جدا ہوتے وقت بہت رویا تھا۔

رامو: ہاں یہ سب سچ ہے ۔ لیکن تم کو اس وقت یہ سب باتیں کیوں یاد آرہی ہیں ۔ کیا بیتی ہوئی باتیں یاد کرنے سے آدمی کا خالی پیٹ بھر سکتا ہے؟

راموں کی بیوی: میں نے کہا تھا نا کہ کوشش کرنے سے بہت کچھ ہوسکتا ہے میں سوچتی ہوں تم اس کے پاس چلے جاؤ ۔ شاید کچھ کام بن جائے ۔

رامو: تم بھی کیسی باتیں کرتی ہو۔ کہاں گنگو تیلی اور کہاں راجہ بھوج ۔ بیس سال پہلے کی باتیں بھلا اسے یاد رہی ہوں گی اب تک؟ وہ مجھے پہچان بھی نہ سکے گا

راموکی بیوی: کیوں نہ یاد رہی ہوں گی ۔ بچپن کی باتیں انسان زندگی بھر یاد رکھتا ہے ۔ میرا کہا مانو تم چلے جاؤ

رامو: اچھا مان لو اس نے مجھے پہچان بھی لیا تو میں اس کے آگے ہاتھ پھیلانے سے رہا ۔ بھیک مانگنا مجھے نہیں آتا ۔

راموکی بیوی: تم بھیک مت مانگنا ۔ بس اس سے کہنا کہ میں تم سے ملاقات کرنے چلا آیا ہوں ۔ اگر وہ تمھارا سچا دوست ہوگا تو سب کچھ خود ہی سمجھ جائے گا

رامو: اگر تم کہتی ہو تو چلا جاؤں گا لیکن راجدھانی تک مجھے پیدل ہی جانا پڑے گا ۔ ایک مہینہ کا راستہ ہے ۔

راموکی بیوی: بس تم کل تڑکے ہی چلے جاؤ ۔ میں محنت مزدوری کرکے بچوں کا پیٹ پال لوں گی ۔

رامو: اچھا تو سویرے ہی اٹھا دینا ۔

دوسرا منظر

(منتری محل کا دروازہ، پہرے دار کھڑے ہیں رامو پھٹے پرانے کپڑے پہنے اور ہاتھ میں لاٹھی لیے اور بغل میں ایک پوٹلی دبائے آتا ہے)۔

پہرے دار: کون ہو جی ۔ یہاں کیوں آئے؟ جانتے نہیں یہ منتری جی کا محل ہے سرائے نہیں ہے ۔

رامو: (ڈرتے ڈرتے) جی داروگا جی .... میں .... میں منتری جی کا دوست ہوں ۔ ان سے ملنے آیا ہوں

پہرے دار: (دوسرے پہرے دار سے) ارے بھیا سنتے ہو یہ بھی منتری جی کے دوست ہیں ۔ ذرا ان کی صورت دیکھنا ۔

دوسرا پہرے دار: کب سے دوستی ہے منتری جی سے تمھاری؟

رامو: جی وہ ہمارے ساتھ پاٹھ شالہ میں پڑھے ہیں ۔ ہمارے ہی گاؤں کے ہیں ۔

پہلا پہرے دار: (دوسرے سے) اگر یہ منتری جی کے گاؤں

کے ہیں تو ضرور ان کے رشتہ دار ہوں گے۔ بلوالو انھیں، ورنہ اگر منتری جی کو خبر ہوگئی تو بڑی آفت ہوگی

دوسرا پہرے دار: اچھا بھیا۔ ابھی خبر کرتے ہیں کیا نام ہے تمھارا؟

رامو: میرا نام رامو ہے۔

(پہرہ دار اندر خبر کراتا ہے۔ تھوڑی دیر بعد منتری جی اپنی بیوی کے ساتھ دروازہ پہ آتے ہیں)

منتری جی: (رامو کو دیکھتے ہی، رامو ہاتھ جوڑ کر نمستے کرتا ہے۔ کون رامو.... میرا بچپن کا پیارا دوست۔ (گلے سے لگا لیتا ہے) بیس سال بیت گئے مگر تم ذرا بھی نہیں بدلے۔ تمھارے ماتھے پہ چوٹ کا نشان اب بھی ویسا ہی ہے۔ مجھے لگتا ہے جیسے وہ کل ہی کی بات ہو۔ تمھیں یاد ہے رامو آم توڑتے ہوئے میرا ڈھیلا تمھارے ماتھے پہ لگا تھا۔

رامو: ہاں مجھے یاد ہے راد ھے۔ میرے سر میں سے خون نکل آیا تھا اور تم نے اپنا کرتا پھاڑ کر میرے سر میں پٹی باندھی تھی۔

منتری جی: (اپنی بیوی سے) شیاما جی۔ ان سے ملو یہ ہمارے بچپن کے دوست ہیں رامو۔ آج میں بہت خوش ہوں۔ ایسا لگتا ہے جیسے میرا بچپن ایک بار پھر واپس آگیا ہو۔

منتری کی بیوی: منتری جی کیا آپ اندر نہ چلیں گے۔ یہیں کھڑے باتیں کرتے رہیں گے۔ رامو بھیا اتنی دور سے آرہے ہیں تھک گئے ہوں گے۔

منتری جی: او ہو بھئی معاف کرنا رامو۔ میں بھی کیسا بے وقوف ہوں۔ میں بھول ہی گیا۔ چلو اندر چلیں۔

سب لوگ محل میں داخل ہوتے ہیں۔ رامو محل کی ایک ایک چیز کو آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھتا ہے۔

منتری جی: (رامو کی بغل میں دبی ہوئی پوٹلی لیتے ہیں) او ہو اس میں کیا ہے۔ ہماری بھابی نے ہمارے لیے تحفہ بھیجا ہے۔ واہ۔ واہ ستو ہیں۔ بہت سوندھے ہوں گے۔ میں ضرور کھاؤں گا۔ اچھا رامو بھیا تم نہاؤ، کپڑے بدلو، کھانا کھاؤ اور آرام کرو۔ میں ذرا دربار کی حاضری دے آؤں میں جلد ہی آجاؤں گا۔ پھر تم سے خوب باتیں ہوں گی۔

نوکر رامو کے لیے بہترین پوشاک لاتے ہیں اور سونے چاندی کے برتنوں میں کھانا پیش کرتے ہیں۔ رامو نے ایسا لذیذ کھانا زندگی میں کبھی نہیں کھایا تھا۔

رامو: (اپنے آپ سے) میں تو یہاں سونے چاندی کے برتنوں میں اچھا اچھا کھانا پیٹ بھر کر کھا رہا ہوں پر نہ جانے میرے بیوی بچوں کو آج کتنے دن کا فاقہ ہوگا؟

تیسرا منظر

رامو اور منتری باتیں کر رہے ہیں۔

منتری جی:- رامو بھیا۔ کیا تم کچھ دن اور نہ رکو گے؟

رامو: مجھے آئے ہوئے چھ مہینے بیت گئے۔ اب بیوی بچے بہت یاد آرہے ہیں۔ اب جانے ہی دو۔ پھر آؤں گا۔

منتری جی: جی تو نہیں چاہتا۔ لیکن تمھاری مرضی۔ مگر دیکھو
جلد ہی آنا اور اب کی بار بھابی اور بچوں کو بھی۔۔۔۔
رامو: ہاں ۔۔۔۔ ضرور لاؤں گا۔

چوتھا منظر

(ایک عالی شان حویلی کا دروازہ۔ دروازے پر
چوکیدار کھڑا ہے۔ رامو آتا ہے)
رامو: (حیرت سے) ارے یہ کیا۔ یہاں تو میری
جھونپڑی ہوا کرتی تھی۔ یہ حویلی کس کی ہے۔
چوکیدار: یہ راموکی حویلی ہے۔ تم کون ہو۔
رامو: میں۔ میں ہی رامو ہوں۔
چوکیدار: تم اور رامو۔ جاؤ جاؤ اپنا کام کرو۔ اگر
تمہارا نام بھی اتفاق سے رامو ہے تو اس کا
مطلب یہ تو نہیں کہ یہ حویلی تمھاری ہو گئی۔ جاؤ۔
جاؤ۔ راستہ ناپو۔
رامو کی بیوی اور بچے نکل کر دروازے پر
آجاتے ہیں۔ صاف ستھرے کپڑے پہنے ہوئے
ہیں۔ اور خوش ہیں۔
رامو کی بیوی: ارے تم آگئے
رامو: (آنکھیں ملتا ہے) میں خواب دیکھ رہا ہوں
یا یہ سچ ہے۔ وہ ہمارا جھونپڑا کیا ہوا۔ یہ حویلی
اور یہ تمھارے اور بچوں کے کپڑے اور یہ تمھارے
زیور یہ سب کہاں سے آئے۔
رامو کی بیوی: (ہنس کر) یہ سب تمھارے دوست
رادھے منتری کی مہربانی ہے۔
رامو: رادھے منتری نے۔۔۔۔ ارے اس بھلے

آدمی نے مجھے کچھ بھی نہیں بتایا۔ میں جب تک
وہاں رہا تم سب کے لیے پریشان رہا۔
رامو کی بیوی: میں نے کہا تھا نا کہ اگر وہ تمھارا سچا
دوست ہوگا تو تمھاری صورت دیکھ کر ہی سب
سمجھ لے گا۔ سچا دوست کبھی جتا کر احسان نہیں
کرتا۔
رامو: اچھا اب سمجھا اس نے مجھے شرمندگی سے
بچانے کے لیے کچھ بھی نہیں بتایا۔ اگر سنسار
میں ایسے دوست پیدا ہو جائیں تو سارے
دکھ دور ہو جائیں۔
شکریہ پیارے دوست۔ تم سدا خوش رہو۔

پردہ گرتا ہے

قدرت کا کمال

ہاتھ پیروں میں چھ چھ انگلیاں!

تہران۔ ایران کے صوبے میں ایک
خاندان کے سات افراد میں سے چار بچوں
کی چھ چھ انگلیاں ہیں۔ ان میں تین لڑکے
ہیں اور ایک لڑکی۔ ایک سال سے چھ سال
تک کے ان بچوں کے دونوں ہاتھ اور پیروں
میں چھ چھ انگلیاں ہیں۔ بچوں کے ماں باپ
کے ہاتھ پیروں میں پانچ پانچ ہی انگلیاں
ہیں۔

(پریس ایشیا)

سگریٹ نوشی

جناب کیف احمد صدیقی
(ایم۔ اے۔ پی ایچ ڈی)

بڑا نا سمجھ ہے جو ہے اس کا عادی
بہت ہی بُری ہے یہ سگریٹ نوشی

نہایت خطرناک اس کی طلب ہے
جو پیتا ہے سگرٹ بڑا بے ادب ہے
بڑوں سے بھی کرتا ہے وہ بدتمیزی ؛ بہت ہی بُری ہے یہ سگریٹ نوشی

اسے پی کے برباد ہوتی ہے صحت
جو ہنستی ہے سگرٹ تو روتی ہے صحت
اسی سے بگڑتی ہے ہر تندرستی ؛ بہت ہی بُری ہے یہ سگریٹ نوشی

یہی کینسر کے مرض کی امیں ہے
کہ دنیا میں جس کی دوا ہی نہیں ہے
اسے پی کے ہے دعوتِ مرگ دینی ؛ بہت ہی بُری ہے یہ سگریٹ نوشی

دھواں زہر بنتا ہے جب پھیپھڑوں میں
کئی داغ پڑتے ہیں تب پھیپھڑوں میں
اسی سے تو انسان کو ہوتی ہے ٹی۔ بی ؛ بہت ہی بُری ہے یہ سگریٹ نوشی

یہ بینائی کمزور کرتی ہے پیہم
دماغوں کو ماؤف کرتی ہے ہر دم
اسے چھوڑ دینا ہی ہے عقل مندی ؛ بہت ہی بُری ہے یہ سگریٹ نوشی

اسے صرف پیتے ہیں بدکار بندے
سدا دور رہتے ہیں دیں دار بندے
کہ سگرٹ کے اندر ہے دوزخ دہکتی ؛ بہت ہی بُری ہے یہ سگریٹ نوشی

اسے بھول کر بھی نہ منھ سے لگانا
کبھی کیفؔ اس سے نہ دل کو جلانا
کہ یہ ساری ہستی کو ہے راکھ کرتی ؛ بہت ہی بُری ہے یہ سگریٹ نوشی

بڑا نا سمجھ ہے جو ہے اس کا عادی

جناب ولی احمد تنہا

قدرت کے عجائب و غرائب

دُنیا میں مختلف قسم کے جانور اور پرندے موجود ہیں۔ جن میں سے اکثر کو ہم نے دیکھا تک نہیں ہے۔ آئیے چند ایسے ہی جانوروں اور پرندوں کے بارے میں جن کو ہم نے دیکھا نہیں ہے کچھ معلومات حاصل کریں۔

۱۔ ققنُس

یہ ایک پرندے کا نام ہے جس کی رنگ برنگ آواز سے حکیموں نے علمِ موسیقی کو ایجاد کیا۔ کہتے ہیں اس کی عمر ایک ہزار سال ہوتی ہے۔ اس کا جوڑا یعنی مادہ نہیں ہوتی۔ اس کی پیدائش اس طرح بیان کی جاتی ہے کہ جب یہ پرندہ بوڑھا ہو جاتا ہے تو لکڑیاں جمع کر کے ان میں بیٹھ جاتا ہے اور اپنی چونچ سے جس میں بہت سے سوراخ ہوتے ہیں۔ اور ہر سوراخ سے الگ الگ قسم کی آواز نکلتی ہے، گانے لگتا ہے ان سوراخوں کے ایک سوراخ سے دیپک کا راگ بھی نکلتا ہے اور اس وقت وہ اُس سوراخ پر زیادہ زور دیتا ہے۔ دیپک راگ کی خاصیت سے اُن لکڑیوں میں آگ لگ جاتی ہے اور وہ پرندہ اسی آگ میں جل کر راکھ ہو جاتا ہے۔ قدرتِ الٰہی سے اس راکھ پر مینہ برستا ہے اور اُس راکھ میں ایک انڈا پیدا ہوتا ہے اور کچھ دنوں بعد اس انڈے سے ویسا ہی پرندہ پیدا ہوتا ہے۔

بعضوں نے لکھا ہے کہ اس کی چونچ میں ۳۶۰ سوراخ ہوتے ہیں اور ہر سوراخ سے ایک علیحدہ راگ نکلتا ہے جب اس کی موت آتی ہے تو یہ پرندہ لکڑیاں جمع کر کے ان میں بیٹھ جاتا ہے اور گانے لگتا ہے اور اپنی ہی آواز سے مست ہو کر پروں کو جھاڑتا اور بازوؤں کو پھڑپھڑاتا ہے۔ یہاں تک کہ اس کے پروں سے آگ جھڑنے لگتی ہے اور وہ لکڑیاں بھڑک اٹھتی ہیں۔ اُسی آگ میں وہ جل جاتا ہے۔ قدرتِ الٰہی راکھ پر مینہ برستا ہے اور اُس راکھ میں ایک انڈا پیدا ہوتا ہے اور کچھ دنوں بعد انڈے سے ویسا ہی پرندہ پیدا ہوتا ہے۔ کہتے ہیں یہ پرندہ ہندوستان میں پایا جاتا ہے اس کو فارسی میں "آتشِ زن" کہتے ہیں۔

پرندے

۲۔ لال رنگ گلے میں کالے رنگ کا گول پٹہ، بڑی ناک، بڑی آنکھوں والے طوطے بھی ہوتے ہیں۔

جو دوسرے طوطوں سے کہیں زیادہ فصیح زبان ہوتے ہیں۔ اس قسم کا ایک طوطا ہندوستان میں پنجرے میں رکھا گیا۔ پنجرے کے اوپر کا حصہ کسی چیز سے ڈھکا ہوا تھا طوطے نے بڑے واضح الفاظ میں کہا۔

" میرے مُنہ سے پردہ ہٹاؤ۔ دم گھٹ رہا ہے"

۳۔ مصر میں ایک بڑا پرندہ پایا جاتا ہے جس کا سر سفید ہوتا ہے۔ دریائے نیل سے مچھلیاں پکڑ کر کھاتا ہے۔ وہ تیرتے وقت صاف الفاظ میں پکار پکار کر کہتا ہے "اللہ سب پر فوقیت رکھتا ہے"۔ یہ آواز ہر شخص سمجھ سکتا ہے۔ سلہ

۴۔ بادشاہ ابنِ منصور کو کسی نے تحفہ میں ایک گھوڑا بھیجا۔ جس کے دو سَر، دو پاؤں اور دو پر تھے۔ پروں کے سہارے وہ بخوبی تیر سکتا تھا۔ سلہ

۵۔ چند ماہ قبل تقریباً ساری دنیا کے اخبارات نے ایک ایسی مچھلی کی تصویر چھاپی جس کا نچلا حصہ انسانی اور اوپری حصہ مچھلی کا تھا اور ایک ایسے سانپ کی تصویر بھی چھپی تھی جس کے دو منہ تھے۔

۶۔ ہُدہُد ـــــ ایک پرندہ کا نام ہے۔ یہ پرندہ پانی حاصل کرنے کے سلسلے میں حضرت سلیمان علیہ السّلام (جن کو اللہ تعالیٰ نے جانوروں کی بولیاں سمجھنے کا معجزہ عطا کیا تھا) کا رہبر اور رہنما تھا۔ کیونکہ ہُدہُد کو زمین کے نیچے پانی اس طرح نظر آتا تھا جیسے شیشے میں سے نظر آتا ہے۔ ایک مرتبہ حضرت سلیمان علیہ السّلام کو پانی کی ضرورت تھی اور ہُدہُد غائب تھا۔ المختصر ہُدہُد کے آنے پر حضرت سلیمان نے اس سے فرمایا کہ میں تجھے بہت سخت سزا دوں گا۔ تو ہُدہُد نے اُن سے عرض کیا۔

" اے اللہ کے نبی۔ میں اللہ تعالیٰ کے حضور میں آپ کا کھڑا ہونا یاد کر رہا ہوں "

یہ سن کر سلیمان علیہ السّلام اللہ تعالیٰ کے خوف سے کانپنے لگے اور انھوں نے ہُدہُد کو معاف کر دیا۔

۷۔ دَابَّۃُ الْاَرْضِ ـــــ دَابَّۃُ الْاَرْضِ

یہ ایک جانور ہے جو قیامت کے قریب ظاہر ہوگا اللہ تعالیٰ قرآن پاک میں فرماتا ہے

"اور جب وعدہ اُن پر پورا ہونے کو ہوگا تو ہم ان کے لیے زمین سے ایک جانور نکالیں گے کہ وہ اُن سے باتیں کرے گا کہ لوگ ہماری باتوں پر یقین نہ لاتے تھے" (پ ۲۰ سورہ نمل ع ۶)

اس جانور کا حلیہ اس طرح بیان کیا جاتا ہے کہ اس کا چہرہ انسان کے چہرے کی مانند ہوگا، آنکھیں خنزیر کے جیسی ہوں گی کان ہاتھی کے جیسے اور سینگ بارہ سنگھے جیسے ہوں گے۔ اس کی کمر بلّی جیسی ہوگی۔ اس کی دم مینڈھے کی دم جیسی ہوگی۔ ٹانگیں اونٹ کے جیسی اور اس کے بدن کے ہر جوڑ سے دوسرے جوڑ تک بارہ گز کا فاصلہ ہوگا۔

ایک دوسری کتاب میں یہ لکھا ہے کہ اس کا قد ساٹھ گز لمبا ہوگا۔ اور وہ بہت تیز رفتار ہوگا اور یہ جانور فصیح اور شائستہ انداز میں لوگوں سے باتیں کرے گا۔

سلہ سلہ نگار پاکستان

سلہ سورہ

شاہدہ سلطان ضیائی بھوپال

(اُستادِ محترم حضرت مختار حسین ضیاؔ کی نظر ثانی کے بعد پہلی بار پیامی بھائی بہنوں کی نذر)

محنت روش ہماری ، محنت چلن ہمارا
نکھرے گا محنتوں سے یہ علم و فن ہمارا

محنت سے کھیتیاں ہیں، محنت سے کارخانے
محنت سے گل بداماں صحنِ چمن ہمارا

نفرت سے کچھ نہ ہوگا محنت کی ہے ضرورت
محنت سے اُٹھ سکے گا اونچا وطن ہمارا

تعلیم و تربیت کا مقصود بھی یہی ہے
ہو جائے محنتوں کا عادی بدن ہمارا

محنت سے حکمرانی، محنت سے پہلوانی
محنت سے نکھر رہا ہو ہر ہموطن ہمارا

گاڑے ہیں چاند پر بھی محنت کشوں نے جھنڈے
دھرتی تو تھی ہی اپنی اب ہے گگن ہمارا

شرمائے جا رہے ہیں آکاش کے ستارے
حیرت سے دیکھتے ہیں وہ بانکپن ہمارا

عزم و عمل کی دعوت دیتا ہے شعر اپنا
اے شاہدہ یہی ہے طرزِ سخن ہمارا

جناب ریحان احمد عباسی

شکار کی باتیں

۲

آپ یہاں سے پڑھیں:

ریتیلی زمین صاف یہ کہانی سنا رہی ہے کہ دونوں شیر یہاں کچھ دیر ریت کا غسل کرتے رہے ہیں۔

بگا اپنے گھٹنوں پر جھک گیا اور وہاں سے شیروں کے چند بال اٹھا کر مجھے دکھاتے ہوئے سرگوشی میں کہا "صاحب، یہاں شیر صبح کے وقت رکے تھے"۔ شیروں کے پنجوں کے درمیانی فاصلے ناپنے سے اندازہ ہوا کہ ان میں نر شیر ۹ فٹ ۴.۱ انچ اور شیرنی ۸ فٹ ۳.۱ انچ لمبے قد کی ہے۔

ہم نے ان نشانات سے کچھ دور ایک مناسب جگہ پر دوسرے پڈے کو بھی باندھ دیا اور اس کے سامنے بھی ڈھیر ساری گھاس ڈلوا دی۔ اس کے بعد ہم اسی طرح لائن بنا کر واپس مچان والی جگہ پر پہنچ گئے اور پہلے والے پڈے کے پاس سے ہوتے ہوئے واپس اسے راستے سے اپنے کیمپ آ گئے۔

جنگل میں کسی پڈے، بیل یا بکری وغیرہ کو اس لیے باندھا جاتا ہے تاکہ شیر وہاں آ کر اسے مار سکے اور پھر شکاری کو اسی جگہ یا اس کے آس پاس گھات لگا کر شیر کو شکار کرنے کا موقع مل جائے۔ اب وہ چاہے میدانِ جنگ ہو یا جنگلی جانوروں کا شکار، ہر جگہ خاص اصولوں اور ضابطوں کی پابندی کرنا ہی پڑتی ہے اور اگر ایسا نہیں کرتے تو کامیابی تو دور کی بات رہی، اُلٹے نقصان اٹھانا پڑ جاتا ہے۔ شکار میں تو خاص طور سے" اور وہ بھی جب شیر جیسے خوفناک جانور کے شکار کا ارادہ ہو، بڑی احتیاط اور ہوشیاری کی ضرورت پڑتی ہے تب جا کر کہیں کامیابی نصیب ہوتی ہے۔ مثلاً صرف ایسا نہیں ہوتا کہ جنگل میں گئے اور آنکھ بند کر کے کسی بھی پیڑ کی جڑ سے مویشی کو باندھ آئے، شیر وہاں آیا اور اسے مار لیا۔ مویشی کو باندھنے سے پہلے شکاری کو یہ ضرور دیکھنا پڑتا ہے کہ وہ جگہ کیسی ہے؟ کیا شیر اس طرف سے گزرتا ہے؟ اس جگہ کے آس پاس کسی ندی نالے میں شیر کے پینے کے لیے پانی اور اس کے قریب گھنی جھاڑیاں بھی ہیں یا نہیں؟ وغیرہ وغیرہ۔

شیر اپنے شکار کو مارنے اور اس کی تھوڑی بہت دعوت اڑانے کے بعد پانی ضرور پیتا ہے۔ پانی پینے کے بعد وہ موسم کے مطابق کسی سایہ دار یا دھوپ چھاؤں والی جگہ میں آرام کرنے کے لیے لیٹ جاتا ہے۔ چونکہ اس وقت شیر کے منہ پر خون لگا ہوتا ہے، اس لیے مکھیوں وغیرہ سے بچنے کے لیے وہ اکثر کسی سایہ دار جگہ پر ہی لیٹنا پسند کرتا ہے

پانی اگر دور ہوگا۔ تو شیر بھی اس وجہ سے دُور چلا جائے
گا۔ اس لیے اگر پانی زیادہ سے زیادہ دو تین سو گز کے
اندر اندر ہو تو اچھا رہتا ہے۔ ان حالات میں دن کے
وقت ہانکا کرا کے شیر کو شکار کرنے کا طریقہ بڑا کامیاب
رہتا ہے۔ ہانکے کا قاعدہ یہ ہے کہ جہاں شیر کی موجودگی کا
یقین ہو۔ اس سے کچھ فاصلے پر کسی کھلی جگہ کے پاس یا خشک
نالے کے کنارے مناسب جگہ پہ شکاری چھپ کر بیٹھ جاتا
ہے اور اس کے ساتھی جو جنگل کے محل وقوع کے اعتبار
سے چالیس پچاس یا اس سے زیادہ بھی ہو سکتے ہیں، دوسری
سمت سے چاند کی طرح نیم دائرہ بنا کر زور زور سے
ڈھول اور خالی کنستر بجاتے اور خوب شور مچاتے ہوئے
شیر کی طرف بڑھتے ہیں۔ شیر اس بے وقت کے راگ
سے گھبرا کر اُٹھ بیٹھتا ہے اور مجبوراً اس طرف چلنا شروع
کر دیتا ہے۔ جدھر سے شور کی آواز نہیں آتی۔ یہ وہی
سمت ہوتی ہے جہاں شکاری گھات لگائے بیٹھا ہوتا
ہے اور اس طرح شیر جب رفتار کرتا اُدھر سے گزرتا ہے
تو شکاری کو اس پہ نشانہ لگانے کا موقع مل جاتا ہے۔
کبھی کبھی تجربہ کار چالاک شیر کھلی جگہ کی طرف نہ آ کر ہانکا
کرنے والوں کے درمیان سے بھی گزر جایا کرتے ہیں،
لیکن ایسا کبھی کبھی ہی ہوتا ہے۔

جنگل میں مویشی کو بطور چارہ باندھنے کے بعد یہ
بات یقین سے نہیں کہی جا سکتی کہ اسے کون شکار کرے
گا۔ یعنی وہ شیر ہوگا یا گلدار (چیتا) یا کوئی اور جانور۔
ویسے میرا تجربہ ہے کہ عام حالات میں اگر چارا وغیرہ گاؤں
یا آبادی کے بہت قریب باندھا جائے تو گلدار کے
آنے کے امکانات بڑھ جاتے ہیں۔ گلدار شیر کے مقابلے میں
زیادہ چالاک نڈر اور بہادر ہوتا ہے۔ بلکہ اگر یہ کہا
جائے کہ مکار ہوتا ہے تو زیادہ صحیح ہوگا۔ گلدار عموماً
رات کی تاریکی میں آبادیوں کے قریب منڈلایا کرتا ہے
اور موقع پڑنے پر ان کے پالتو جانور اٹھا لے جاتا
ہے۔ ایک بار خود جب میں اپنے دس بارہ ساتھیوں
کے ساتھ جنگل میں کیمپ لگائے ہوئے تھا تو ایک
گلدار متواتر تین دن تک میرے کیمپ میں آتا رہا اور آخر
کار تیسرے دن وہ میری ایک بکری اٹھا لے جانے
میں کامیاب ہو ہی گیا۔ اس کے نڈرپن کا اندازہ اس بات
سے لگایا جا سکتا ہے کہ بکری کے مارے جانے کے
بعد اگلے دن جب میں نے اس کے لیے ہانکا کرایا تو
وہ میرے کیمپ سے صرف پچاس گز کے فاصلے پر
ایک گھنی جھاڑی سے اُٹھا جہاں کیمپ کی موجودگی کی
پروا کیے بغیر انتہائی اطمینان سے آرام کر رہا تھا۔

جب کبھی جنگل میں جانے، گھومنے یا وہاں سے گزرنے
کا موقع ملے تو بغیر ہتھیار کبھی نہیں جانا چاہیے۔ اگر شکار کا
ارادہ نہ ہو تب بھی اپنی حفاظت کے لیے کسی نہ کسی قسم کے
ہتھیار کا اپنے پاس ہونا بہت ضروری ہے۔ کیوں کہ معلوم
کس وقت اور کیسی ضرورت پیش آ جائے۔ ویسے میں خود
کئی بار یہ غلطی کر چکا ہوں۔ ایک بار میں جنگل میں اپنے ساتھ
ایک آدمی لے کر گھومنے کے ارادے سے نکلا تو راستے میں
اچانک ایک چڑچڑے ریچھ سے مڈبھیڑ ہو گئی جسے
بڑی مشکل سے ہم دونوں نے شور مچا مچا کر اور ہاتھ
گھما گھما کر وہاں بھگانے میں کامیاب ہو سکے۔ ایک بار
میں شکار کے ارادے سے ہی نکلا، لیکن اس وقت
میری رائفل میرے ساتھی کے پاس تھی جو مجھ سے چند
قدم کے فاصلے پر چل رہا تھا۔ چلتے چلتے ایک پیڑ کے
سائے میں بہت صاف شیر پہ نگاہ پڑی جو گردن اٹھائے

ہماری طرف دیکھ رہا تھا۔ اسے دیکھتے ہی میں نے رائفل کے لیے اپنے ساتھی کو اشارہ کیا، لیکن اتنی دیر میں کہ وہ میرے پاس آئے، شیر وہاں سے ہٹ کر گھنی جھاڑیوں میں کھسک گیا اور اس طرح ایک سنہرا موقع ہاتھ سے نکل گیا۔ ایک اور موقع پر ایک گلدار بھی میرے ہاتھ سے نکل گیا تھا۔ اس وقت رائفل تھی تو میرے ہی پاس، لیکن وہ بھری ہوئی نہ تھی۔ ایک بار تو ایسا ہی ہوا کہ ہم چار آدمی ایک لائن بنائے جنگل سے گذر رہے تھے۔ میں ان سب سے آگے تھا۔ ایک جگہ جیسے ہی میں مڑا تو اچانک ایک شیرنی پر نگاہ پڑ گئی جو زیادہ سے زیادہ دس بارہ گز کے فاصلے پر کھڑی مجھے گھور رہی تھی۔ شیرنی کے ساتھ اس کے دو جوان بچے بھی کھڑے تھے شیرنی نے بڑی خوفناک غراہٹ کے ساتھ اس بے جا مداخلت پر اپنی ناراضگی کا اظہار کیا۔ دونوں بچے ایک دم پنجوں پر جھک گئے جیسے وہ ماں کا اشارہ ملتے ہی مجھ پر ٹوٹ پڑنا چاہتے ہوں۔ شیرنی نے جب دیکھا کہ میں اپنی جگہ بالکل خاموش کھڑا ہوا ایک طرح اپنی غلطی کا اعتراف کر رہا ہوں تو وہ بھی اپنی روایتی فراخدلی کا مظاہرہ کرتے ہوئے، اپنے بچوں کو دھکیلتی ہوئی وہاں سے چلی گئی۔ شیرنی کو دیکھنے اور اس کے جانے میں مشکل سے چند سیکنڈ لگے، لیکن اس وقت مجھے ایسا محسوس ہوا کہ گھنٹوں لگ چکے ہیں۔ اس وقت رائفل میرے ہی پاس تھی اور تھی بھی بھری ہوئی، لیکن وقت کی نزاکت کو دیکھتے ہوئے میں نے خاموش رہنے میں ہی اپنی بھلائی سمجھی۔ ورنہ اگر میں فائر کی غلطی کر بیٹھتا تو نہ جانے کیا قیامت آ جاتی۔

خطرناک جنگلوں میں سے گزرتے وقت اصل شکاری کو ہمیشہ دوسرے ساتھیوں سے آگے ہی چلنا چاہیے۔ معاون شکاری جس کے پاس بھی کوئی نہ کوئی ہتھیار ضرور ہو، اس سے ایک گز پیچھے رہے۔ معاون شکاری اگر وہاں کا مقامی باشندہ ہوگا تو کامیابی کے امکانات بڑھ جائیں گے۔ ویسے بھی اوّل تو وہ اس علاقے سے بخوبی واقف ہوگا۔ اور دوسرے وہ ان معمولی معمولی آوازوں اور نشانات کی خاص پہچان بھی رکھتا ہوگا جن سے عموماً شہروں میں رہنے والے شکاری واقف نہیں ہوتے۔

خیمے کے پاس رکھی ہوئی میری آرام کرسی، مجھے واقعی بڑا آرام دے رہی تھی۔ چائے پینے کے بعد میں نے پائپ سلگایا اور ہلکے ہلکے کش لے کر اس سے لطف اندوز ہونے لگا۔ گاؤں کی طرف سے ڈھولک کی تھاپ صاف سنائی دے رہی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہاں کسی کھلی جگہ پہ ناچ گانے کی محفل جمی ہوئی ہے۔ جنگل کی سمت سے زیادہ سے زیادہ دو ڈھائی سو گز کے فاصلے سے کسی سانبھر کی ٹپوک ٹپوک، سنائی دی اور میرے خیالات کا سلسلہ ٹوٹ گیا۔

گاؤں والوں کے لیے حالات بدستور معمول کے مطابق تھے اور انھیں بیرونی دنیا کی سرگرمیوں سے کوئی غرض نہ تھی۔ وہ اس حد تک الگ تھلگ تھے کہ ان میں سے بیشتر نے ریل کا سفر کرنا تو الگ رہا، ریل کی صورت تک نہ دیکھی تھی۔ گھنے جنگلوں سے گھرا، کچی دیواروں، کچی چھتوں اور گھاس پھوس کے چھپروں والا یہ چھوٹا سا گاؤں ہی ان کے لیے سب کچھ تھا۔ اور تین میل ادھر اور چار میل ادھر واقع اسی طرح کے دو مزید گاؤں ہی ان کی دنیا تھی۔ گائے۔ بھینسوں کا ایک محدود گلہ،

چند ایکڑ کھیت جو تقریباً ۱۰۰ نفوس کے پیٹ بھرنے کے لائق اناج پیدا کر رہی دیتے ہیں۔ بس یہی ان کی کل کائنات، روپے پیسے ان کے پاس زیادہ نہیں۔ ویسے بھی انھیں چیزوں کی خرید و فروخت کی زیادہ ضرورت نہیں پڑتی اور اگر پڑتی بھی ہے تو جنس کے لین دین سے کام چلالیا جاتا ہے۔

غربت — ؟ ہاں روپے پیسوں کے اعتبار سے بیشک ان کا شمار غریبوں میں ہی کیا جائے گا، لیکن اگر ڈھولک کی تھاپ اور ناچ گانے کی محفلوں کو سامنے رکھ کر دیکھا جائے تو صاف معلوم ہوگا کہ وہ شہروں میں رہنے والے ان لاکھوں افراد سے کہیں زیادہ خوش و خرم زندگی گذار رہے جو بے حساب دولت کے مالک ہونے بھی سچی او حقیقی مسرتوں سے کوسوں دور ہیں۔

اب رات کے آٹھ بج چکے ہیں۔ چودھویں رات کا چاند، پورے ماحول پر دودھیا رنگ کی روشنی بکھیرتا آسمان میں بلند ہوتا جا رہا ہے۔ پاس والے پیڑ پر دو تین (الو کی طرح چھوٹی چڑیاں) آکر بیٹھ گئیں ہیں اور زور زور سے بول رہی ہیں۔ ممکن ہے، وہ میرے اس طرح خیالات میں گم بیٹھنے اور خلاف توقع میرے کیمپ کی وہاں موجودگی پر تبادلہ خیال کر رہی ہوں۔

میں وہاں سے اٹھ بیٹھا۔ رات کا کھانا کھایا کچھ دیر پائپ کے کش لیے اور اپنے اردلی کو یہ ہدایت دی کہ وہ مجھے ۵½ بجے صبح ضرور جگا دے، ۹½ بجے سونے کے لیے بستر پر دراز ہوگیا۔

(ماخوذ) اور باقی آئندہ

محترمہ سیدہ عنوان

ننھا ویر

ابھی تو میں ننھا سا ہوں، کل میں ہی ویر بنوں گا
دیش کا اونچا نام کروں گا، کام مہان کروں گا

انیائے کا ساتھ نہ دوں گا۔ نیائے چلن رکھوں گا
نردھن سے میں پریم کروں گا۔ دکھیا کو سکھ دوں گا
اندھیارے جیون کے لیے میں جلتا دیپ بنوں گا
ابھی تو میں ننھا سا ہوں، کل میں ہی ویر بنوں گا

اپنے کرتویہ کا پالن، صبح و شام کروں گا
کانٹے بھی بن جائیں گے کلیاں جہاں میں ہاتھ دھروں گا
امبر سورج بن کر بھی دھرتی کے چرن چوموں گا
ابھی تو میں ننھا سا ہوں، کل میں ہی ویر بنوں گا

کسی کے دین، دھرم کا میں اپمان کبھی نہ کروں گا
نت دھرم پریم کے پھولوں سے میں جھولی سب کی بھروں گا
جگ کی سیوا کروں گا ہمدم بن کے سب کا رہوں گا
ابھی تو میں ننھا سا ہوں، کل میں ہی ویر بنوں گا

خان عارف داؤدزی (کراچی)

محمود حسین چلے گئے

پیارے حبیب و مخلص محمود حسین چلے گئے
جرمن ادب کے فلسفی محمود حسین چلے گئے

قلبی سکوں نہ مل سکا، علم و فضل خفی رہا
میری کا شمل[۱] سے ملتجی محمود حسین چلے گئے

روئے گا ان پہ کب تلک، علم و ادب کا قافلہ
آوازِ حق کے مبتدی محمود حسین چلے گئے

مشرق کی سادگی لیے، ان کا شعار تھا یہی
خُلق و غِنا پہ مکتفی، محمود حسین چلے گئے

جامعہ[۲] اب یتیم ہے، غم میں تری سہیم ہے
تاریخ و فن کے بیہقی، محمود حسین چلے گئے

عارف نہ رو تو اس طرح دامنِ صبر تھام لے
تیرے لبیب و مشفقی، محمود حسین چلے گئے

۱ اینی میری شمل جرمن اسکالر

۲ کراچی کی جامعہ تعلیم ملی

جناب غلام حیدر

ہماری پوسی

ایک سچی کہانی

(۲)

(۳)

اگلے دن میں بہت اداس دفتر گیا۔ اب ہماری پیاری پوسی کو کھوئے ہوئے دو دن ہو چکے تھے۔ سارے دن کسی کام میں جی نہ لگا کبھی دل کہتا کہ آج جب گھر پہنچوں گا تو دروازہ کھلتے ہی میری بلی "میاؤں، میاؤں" کرتی میرے پیروں میں آکر لوٹنے لگے گی۔ شام کو بڑی امید کے ساتھ گھر کا تالا کھولا، دروازہ کھولا، مگر بلی کی آواز نہیں آئی۔ آج صبح سارے کمرے بھی کھلے چھوڑ گیا تھا۔ ایک ایک کونے میں جھانکا، امید کے خلاف ایک ایک بستر کو دیکھا مگر سوائے ناامیدی کے کچھ نہ ملا۔ رات کے کھانے میں بالکل بھی جی نہ لگا۔ بلی کے لیے بازار سے کباب خرید کر لایا کہ اگر رات کو کسی وقت آجائے گی تو اُسے کھلا دوں گا۔ مگر وہ رات کے بارہ بجے تک بھی نہیں آئی۔ کم تھا کہ میں اپنی بلی کے غم میں بچوں کی طرح بسور بسور کر رونے لگوں۔ آخر تھک کر لیٹ گیا۔ بہت دیر تو کروٹیں بدلتا رہا اور اپنی بلی کی پیاری پیاری حرکتیں یاد کرتا رہا، اس کا بھولا بھالا چہرہ، ڈھیلے ڈھیلے پنجوں سے بیٹھے بیٹھے ہم میں سے کسی کو چھیڑنا، کاغذ کے ٹکڑوں سے کھیلنا، غرض سب کچھ یاد آتا رہا۔ بچوں کے جانے سے طبیعت ویسے ہی اداس تھی اُس پر بلی کا غم کھائے جا رہا تھا۔

مجھے ایسا لگا کہ میں اپنی میز کے سامنے کرسی پر بیٹھا کچھ لکھ رہا ہوں۔ ایسے وقت ہماری پوسی ہمیشہ میری میز پر سامنے بیٹھی رہتی ہے اور جب میرا قلم ذرا تیزی سے چلتا ہے تو مجھے چھیڑنے کے لیے وہ اپنے پنجوں سے میرے قلم کی نب پکڑنے کی کوشش کیا کرتی ہے اور جب تک نہیں چھوڑتی جب تک میں اس کے سر پر ہاتھ پھیر کر پچکار کر اُسے اپنی گود میں نہ بٹھا لوں"

مگر آج مجھے لگا کہ بلی میرے سامنے میز پر ہی بیٹھی ہے مگر [illegible]

لگا کہ بلی میرے سامنے میز پر ہی بیٹھی ہے مگر کچھ ناراض ناراض سی ہے۔ آج وہ مجھے چھیڑ بھی نہیں رہی، میرا قلم پکڑنے کی کوشش بھی نہیں کر رہی۔ میں نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرنا چاہا تو اُس نے اپنا سر پیچھے کو کر لیا۔ مجھے بڑی حیرت ہوئی کہ اسے آج کیا ہو گیا ہے۔ میں نے ذرا آگے بڑھ کر اُسے پکڑنا چاہا تو وہ اور پیچھے ہٹ گئی اور منہ پھلائے دوسری طرف کو منہ کرکے بیٹھ گئی۔ میں نے عادتاً پوچھا کہ "پوسی! کیا بات ہے؟" اور مجھے یقین ہے کہ تم شاید مجھے پاگل کہوگے اگر میں یہ کہوں کہ اس نے اپنی 'میاؤں، میاؤں' میں جو کچھ کہا وہ پوری طرح، بالکل ایسے ہی میری سمجھ میں آیا جیسے ہم تم باتیں کرتے ہیں۔ پوسی کہہ رہی تھی: "میں ناراض ہوں، آپ سے بھی اور آپ کے گھر کے سب لوگوں سے بھی!"

"تم ناراض ہو!" میں نے پوچھا۔ اور جواب ملا: "میاؤں، میں سب سے ناراض ہوں۔"

میں نے پوچھا: "کیوں ناراض ہو؟" تو بلی نے جواب دیا: "مجھے بہت سی شکایتیں ہیں آپ لوگوں سے۔" ظاہر ہے کہ مجھے پھر سوال کرنا پڑا کہ "کیا شکایتیں ہیں تمھیں ہم سے؟" بلی نے بڑی روہانسی آواز میں جواب دیا:

"میں بھلی چنگی ایک گھر میں رہتی تھی۔ میرا دل لگا ہوا تھا وہاں۔ میرے ساتھ کھیلنے کو ایک سہیلی تھی، مجھے روزانہ بلا ناغہ چھیچھڑے کھانے کو ملتے تھے اور میں خوش تھی، چونکہ وہ میرا گھر تھا، میں وہاں پیدا ہوئی تھی۔ ایک لڑکا مجھے گود میں دبوچ کر لے آیا۔ بالکل نئے گھر میں، جہاں میرا کوئی ساتھی بھی نہیں ہے جس کے ساتھ میں کھیل سکوں، بات کر سکوں، مجھے یہاں لاکر جلدی سے اُس نے گھر کا دروازہ بھی بند کر دیا۔ سچ کہتی ہوں شروع شروع میں دو تین دن تو مجھ سے کچھ کھایا بھی نہ گیا۔"

"میں نے بلی سے پوچھا۔" اچھا اگر تمھیں یہ گھر اور یہاں رہنا پسند نہیں تھا تو تم بھاگ کیوں نہ گئیں اُسی وقت؟"

بلی نے جواب دیا: "بات یہ ہے کہ میں بہت سیدھی سادی اور بھولی بھالی طبیعت کی بلی ہوں جب وہ لڑکا مجھے اپنی گود میں یہاں لا رہا تھا تو میں یہ سمجھ ہی نہ پائی کہ یہ مجھے کہیں اور لیے جا رہا ہے اور اس لیے میں نے راستہ بھی غور سے نہ دیکھا۔ پھر شروع میں دو تین دن آپ لوگوں نے مجھے ایک منٹ کے لیے بھی نگاہوں سے اوجھل نہ ہونے دیا۔ سارے دن گھر کا دروازہ بند رکھا جاتا میری وجہ سے۔ پھر دروازے کے باہر ہر وقت ایک بڑا سا جھبرا کتا بھی ٹہلتا رہتا تھا جس سے مجھے بہت ڈر لگتا تھا۔ ایسے میں انجان گھروں اور راستوں میں کہاں ٹھوکریں اور ٹکریں کھانے کو نکل جاتی پھر جب کچھ دن بعد مجھے راستے معلوم ہو گئے تو میں صرف اس لیے رکی رہی کہ میرے چلے جانے سے آپ کے بچوں کا دل ٹوٹے گا۔"

میں نے پھر پوچھا: "اچھا یہ بات تو میں مانتا ہوں کہ یہاں تمھاری کوئی سہیلی نہیں ہے۔ مگر ہمارے بچے تو تم سے بہت محبت کرتے ہیں، تمھارے ساتھ کھیلتے ہیں، تمھارے لیے چھیچھڑے لاکر دیتے ہیں کبھی کبھی تو اپنے حصے کا دودھ بھی تمھارے لیے ڈال دیتے

ہیں!"

"مگر وہ سب کے سب صبح ہی صبح کہیں چلے بھی
تو جاتے ہیں اور میں دوپہر تک اداس اکیلی گھر میں پڑی
رہتی ہوں، میرے ساتھ گھر میں کوئی بات کرنے والا
تک نہیں ہوتا۔ پھر جب آتے ہیں تو کوئی میری ٹانگ
کھینچتا ہے کوئی دُم۔ اور میں یہ سب کچھ صرف اُن کی
خاطر سہتی ہوں میں :-

دیکھو بھئی! جہاں تک صبح سویرے اُن کے
چلے جانے کا سوال ہے تو یہ تو ایسی مجبوری ہے کہ میں
اور تم کچھ بھی نہیں کر سکتے انھیں اسکول جانا ہوتا ہے
تم بلی ہو، تم نہیں جانتیں کہ انسانوں کے لیے پڑھنا
لکھنا بہت ضروری چیز ہے۔ اور جہاں تک اُن کے
چھیڑنے کا معاملہ ہے تو ہم گھر کے بڑے انھیں
ہر وقت سمجھاتے بھی تو رہتے ہیں اور پھر محبت
میں تھوڑی بہت تکلیف تو اٹھانی ہی پڑتی ہے۔

بلّی :- اسی لیے تو میں یہاں اب تک رُکی ہوئی
بھی تھی۔ اگر مجھے ذرا بھی یہ احساس ہوتا کہ گھر
کے بچے مجھ سے محبت نہیں کرتے تو میں یہاں
سے کب کی بھاگ چکی ہوتی۔

میں :- اچھا کوئی اور بھی شکایت ہے تمھیں
ہم لوگوں سے؟

بلّی :- شکایتیں تو بہت ہیں۔ ایک دن میں
نے اپنی زندگی کا پہلا بڑا شکار، ایک کبوتر پکڑا
تھا تو آپ لوگ سب میرے پیچھے دوڑ پڑے
تھے اور میرا شکار مجھ سے چھڑا دیا تھا۔ مجھے اُس
دن بہت افسوس ہوا تھا۔ میں اُسی دن سمجھ گئی
تھی کہ یہاں میرا نباہ ہونا بہت مشکل ہے۔

میں نے تھوڑا سا ہنستے ہوئے جواب دیا۔
"اگر اس دن ہم تمھارا شکار تم سے نہ چھڑا دیتے تو
وہ کبوتر والا تمھیں مار ہی ڈالتا۔ اور شاید ایک دو
دن بعد تم اُس کے گھر میں کئی گھنٹے بند بھی رہی
تھیں اور تمھاری اچھی خاصی مرمت بھی ہوئی
تھی۔ دیکھو ہم تمھارے لیے جو کچھ بھی کرتے
ہیں وہ تمھاری بھلائی کے لیے ہی ہوتا ہے۔
جب کبھی تم چوہا پکڑتی ہو تو اُسے تو ہم تم سے نہیں
چھڑا دیتے۔ دیکھو جیسے ہم تمھیں پالتے ہیں اور تم
سے محبت کرتے ہیں ویسے ہی وہ کبوتر والا بھی تو اپنے کبوتروں
سے محبت کرتا ہے۔ اچھا اور کوئی شکایت ہو تو وہ بھی بتلا دو۔"

بلّی :- "ہاں، اب کئی دن سے تو گھر کے سارے
ہی لوگ مجھے بالکل اکیلا چھوڑ کر نہ معلوم کہاں
چلے گئے ہیں۔ اب تو کوئی بچہ بھی گھر میں نہیں جس
کے ساتھ میں تھوڑی دیر اپنا دل بہلا سکوں۔
میں اِن بچوں کی خاطر ہی یہاں گھر میں رُکی تھی، اب
وہ بھی خدا جانے کہاں غائب ہو گئے۔ اب اس گھر
میں کوئی اتنا بھی نہیں کہ مجھے تھوڑے سے چھیچھڑے
ہی لا کر دے دے کئی دن سے بھوکی بیٹھی ان کی
راہ تکا کرتی ہوں" مگر اب کوئی بھی نہیں آتا!" اب
بلّی کی آنکھوں میں آنسو چھلکنے لگے تھے۔

مجھے اُسے دیکھ کر سچ مچ بڑا دکھ ہو رہا تھا۔
میں نے اُسے سمجھانے کی کوشش کی "دیکھو، پوسی!
بالکل مجبوری تھی جس کی وجہ سے بچے کچھ دن کے لیے
باہر گئے ہیں۔ تمھیں پتہ نہیں کہ وہ جانے سے پہلے تمھارے
لیے کتنے پریشان تھے۔ پڑوس کے کتنے لوگوں سے
تمھارے لیے چھیچھڑے لانے کو کہہ گئے تھے، مجھ

سے کتنی پیاری باتیں کرتے تھے، تمھیں نہیں معلوم تم یقین کرو کہ وہ تم سے زیادہ اداس ہوں گے۔ مجھے بھی اس بات کا افسوس ہے کہ میں دن بھر باہر رہتا ہوں اور تمھارا کھانا تمھیں ٹھیک سے نہیں مل رہا بس دو چار دن کی بات ہے بچے آجائیں گے تو گھر میں چہل پہل ہو جائے گی۔ اور تمھیں تمھارا کھانا بھی ٹھیک سے ملنے لگے گا۔ تھوڑی سی تکلیف اور جھیل لو۔"

"جی۔ اور مجھے سب سے زیادہ شکایت تو خود آپ سے ہی ہے۔ آپ ہی نے میرا دل توڑا ہے میں اکیلے گھر میں بھی پڑی رہتی، بھوکی بھی رہ لیتی مگر (اور یہ کہتے کہتے بلّی کی آواز بھرا گئی۔ اور اس کی آنکھوں سے آنسو گرنے لگے، جنھیں جلدی سے اُس نے اپنے پنجے سے سارے منہ پر پھیلا لیا جیسا وہ کچھ کھانے کے بعد کرتی ہے) آپ کو تو مجھ سے بالکل محبت نہیں ہے۔ اُس دن صبح ہی صبح جب میں بھوکی اور اداس اپنی خاص جگہ خاموشی سے لیٹا رہنا چاہتی تھی تو آپ نے مجھے کتنی بے دردی سے ہٹا کر باہر پھینکا۔ یاد ہے آپ کو! بس اُسی وقت میرا دل ٹوٹ گیا۔ اور میں نے طے کر لیا کہ میں اب کبھی آپ کے ساتھ نہیں رہ سکتی۔ مجھے شروع میں تو یقین ہی نہ آیا کہ آپ مجھے سچ مچ نکالنا چاہتے ہیں۔ میں سمجھی آپ مذاق کر رہے ہیں مگر میری عقل ماری گئی تھی جو میں دوسری اور تیسری بار کمرے میں گھسی اور پھر جب آپ مجھے کمرے سے باہر دھکیل کر چلے گئے تو میں بہت دیر تک اکیلی بیٹھی صحن میں روتی رہی۔ پھر کچھ دیر بعد میں نے اپنے دل کو مضبوط کیا اور آخری بار فیصلہ کر لیا کہ اب مجھے یہ گھر چھوڑ دینا چاہیے۔ بس جو خیال آتا تھا، بچوں کا تھا۔ اُن سے سچ مچ اب مجھے بھی محبت ہو گئی ہے۔ مگر میں نے دل میں کہا کہ جب وہ ہی سب مجھے چھوڑ کر چلے گئے تو پھر میں کس کے لیے ٹھوکریں کھاؤں اور مصیبتیں جھیلوں۔ پھر بھی میں گھر کے ایک ایک کونے میں گئی۔ جہاں میرے ساتھ بچے کھیلتے تھے۔ وہاں گئی، ان کے کپڑوں کو سونگھا، ان میں اُن کی بو بسی ہوئی تھی۔ اور پھر میں گھر سے نکل گئی، بالکل پکّا ارادہ کر کے کہ اب میں کبھی اس گھر میں قدم نہیں رکھوں گی اس گھر کے سب لوگ بے مروت اور بے وفا ہیں۔" بلی رو رہی تھی۔

اب میری آنکھوں میں بھی آنسو آ چکے تھے میں نے بلّی کی منّت کی اور "مجھ سے سچ مچ بہت بڑی غلطی ہوئی پوسی! مجھے معاف کر دو" میں بڑھ کر اس کو پیار کرنا چاہتا تھا۔ میں نے اس کی طرف ہاتھ بڑھانا چاہا۔ لیکن ابھی میرے ہاتھ نے اس کے جسم کو چھوا ہی تھا کہ میری آنکھ کھل گئی اور میں نے دیکھا کہ میں اپنے بستر میں لیٹا ہوا ہوں، مگر میری آنکھیں بھیگی ہوئی تھیں۔

پانچ چھ دن بعد بچے آ گئے۔ جب میں نے انھیں راستے میں بتلایا کہ ان کی پوسی کھو گئی ہے تو اس خبر سے انھیں جتنا صدمہ ہوا۔ اُسے میں اپنے الفاظ بیان نہیں کر سکتا۔ ایک بچہ تو سچ مچ بسورنے

باقی ص۳۸ پر

جناب عبدالمتین نیازؔ

نذرِ مدرسہ

"اے ہمارے مدرسے، اے علم و فن کے پاسباں"

دور تجھ سے ہو رہے ہیں دیکھے سارے امتحاں
تجھ سے چھٹ کر زندگی میں یہ کمی ہو جائے گی
یہ امنگیں، یہ ترنگیں یہ ہنسی کھو جائے گی
خواب ہو جائیں گی یہ چہلیں، یہ ساری شوخیاں
اے ہمارے مدرسے، اے علم و فن کے پاسباں

تیرے سائے میں ملی ہے گیان کی منزل ہمیں
شب کے ساگر میں دکھایا صبح کا ساحل ہمیں
دے کے تہذیب و تمدن کر دیا قابل ہمیں
تو ہمارا دوست سچا، تو ہمارا مہرباں
اے ہمارے مدرسے، اے علم و فن کے پاسباں

نفرتوں سے دور رہنا ہم نے سیکھا ہے یہاں
ایکتا کیا چیز ہے، ہم نے یہ جانا ہے یہاں
زندگی کا اصل مقصد کیا ہے سمجھا ہے یہاں

تو ہے سورج پیار کا تیری زمیں ہے آسماں
اے ہمارے مدرسے، اے علم و فن کے پاسباں

جناب مشرف عالم ذوقی

چور کیوں بنا

رامو کے ہاتھ میں ہتھکڑی لگی ہوئی تھی اس کی وجہ یہ تھی کہ اس نے اپنے گاؤں میں چوری کی تھی۔ اس کے اردگرد کافی بھیڑ جمع تھی۔ داروغہ نے اس کے سر پہ ایک ہنٹر مارا اور پوچھا ——— "کیا تم اپنے بچاؤ کے لیے کچھ کہنا چاہتے ہو؟"

"نہیں!" رامو چیخ پڑا "میں اپنے بچاؤ کے لیے کچھ نہیں کہنا چاہتا۔ میں نے چوری کی ہے۔ اس کی سزا مجھے ضرور ملنی چاہیے۔ مگر مجھے گاؤں کے ان لوگوں سے اپنی بے بسی کی کہانی ایک بار پھر سے دہرا لینے دیجیے۔"

رامو کے چہرے پر غم و غصہ کے آثار ذرا بھی نہ تھے۔ داروغہ نے چیخ کر کہا۔ "کہہ دے اپنی بے بسی کی کہانی تاکہ تیرا غم کم ہو جائے۔"

رامو نے ایک سرد آہ کھینچ کر کہنا شروع کیا۔

"سردی کی وہ ٹھٹھری ہوئی رات تھی۔ چار سال کا ایک بچہ اپنی ماں کے پاس بیٹھا ہوا زار و قطار رو رہا تھا۔ اس کی ماں مرنے کے قریب تھی۔ باپ پہلے ہی مر چکا تھا۔ اس نے گاؤں والوں سے لاکھ منت سماجت کی کہ کوئی بھی نیک بخت اس کی ماں کو آ کر بچا لے، اس کی ماں کے لیے دوائی لا دے۔ نہیں تو اس کی ماں مر جائے گی۔ اس کی آرزوؤں کا خون ہو جائے گا۔ رات کافی تھی۔ ماں کے مُنہ سے عجیب قسم کی آواز آ رہی تھی۔ وہ چار سالہ بچہ ڈر گیا۔ گاؤں کے ہر مکان کے پاس جا کر وہ چیخنے لگا ——— "میری ماں کو آ کر بچا لو۔ وہ مجھ سے روٹھ رہی ہے"، مگر گاؤں والے تو میٹھی نیند سو رہے تھے۔ بھلا وہ اپنی نیند توڑ کر کیوں اُٹھتے۔ کسی بھی فرد نے دروازہ نہیں کھولا۔ اس کی بے بسی اور لاچاری نہیں پوچھی۔ وہ واپس گھر آیا۔ اس کی ماں مر چکی تھی۔ اب وہ اکیلا ہو چکا تھا۔ صبح اس واقعہ کی خبر ہر شخص کو ہو گئی۔ ہر طرف سے افسوس ظاہر ہونے لگا۔ وہ بچہ چیخ پڑا۔ "جب میری ماں مر رہی تھی تو میری لاکھ منت سماجت کے باوجود اُس کے لیے کوئی دوائی نہیں لایا اب افسوس ظاہر کرتے ہیں۔" وہ بچہ روتے روتے بیہوش ہو گیا۔ جب ہوش میں آیا تو پتہ چلا کہ ماں کا کریا کرم ہو چکا ہے۔ اب اس بچہ کا دنیا میں کوئی نہ تھا۔ اس نے گاؤں والوں سے نوکری کی بھیک مانگی۔ مگر اُسے کسی نے یہ سوچ کر نوکری نہ دی کہ وہ ابھی چھوٹا ہے کام کیا کرے گا۔ بھوک اور پیاس سے نڈھال اس بچے کو چوری کی لت لگ گئی۔ آج وہ پورا چور بن چکا ہے اور آپ کے سامنے کھڑا ہے۔"

رامو نے کہانی ختم کی اور پھر چیخ کر کہا۔ "

باقی صفحہ ۲۸

جناب آفاق دانش

چیتا سوار سالارِ اعظم

ایک بار ایک چیتا جنگل سے نکل کر گاؤں میں چلا آیا۔ اندھیری رات میں وہ اپنے شکار کے لیے ادھر ادھر گھوم رہا تھا۔ یکایک آسمان پر بادل گرجنے لگے ہوا تیز ہوتے ہوتے آندھی کی صورت اختیار کر گئی۔ تھوڑی ہی دیر میں بڑی بڑی بوندیں بھی گرنے لگیں۔ چیتا بارش سے بچنے کے لیے ایک بڑھیا کے پھوس کے چھپر والان میں جا بیٹھا۔ بڑھیا اپنے مکان کے اندر سو رہی تھی۔

بارش تیز ہوگئی۔ بڑھیا کی چھت بارش کا کیا مقابلہ کرتی۔ بارش کا پانی اندر ٹپکنے لگا۔ بڑھیا پریشان ہوگئی۔ وہ اپنا بستر پانی سے بچانے کے لیے ادھر ادھر گھسیٹتی اور بڑبڑاتی جاتی۔ "اس ٹپ ٹپ نے تو میری جان مصیبت میں ڈال دی ہے! یا اللہ میں کیا کروں! میری تو عقل ہی ماری گئی ہے!" چیتا دیوار کے قریب ہی بیٹھا بڑھیا کی بڑبڑاہٹ سن رہا تھا۔ اور ساتھ ہی بستر گھسیٹنے کی آواز بھی سنتا تھا۔ بڑھیا پھر بڑبڑائی "باپ رے باپ! اس ٹپ ٹپ نے تو میری جان لے لی۔ میں کس طرح اس سے چھٹکارا پاؤں! اب تو مجھ سے برداشت نہیں ہوتا۔ اب مجھے ضبط نہیں ہوتا۔" بڑھیا نے پھر بستر گھسیٹتے ہوئے بڑے غصے میں چلا کر کہا "بس کر — بس کر خدا کے لیے رک جا! میں تو مر جاؤں گی!" بڑھیا کے چلانے اور بستر گھسیٹنے کی کھڑکھڑ والی آواز کو چیتے نے سمجھنے کی کوشش کی تو اس کی سمجھ میں آیا کہ وہ ٹپ ٹپ جسے بڑھیا کوس کاٹ رہی تھی یہ آواز اسی کے چلنے کی ہے اور غالباً اس نے بڑھیا کو پکڑ رکھا ہے جبھی تو وہ بھاگتی پھرتی ہے۔ مگر وہ اسے چھوڑتا نہیں۔ یقیناً وہ کوئی مجھ سے بھی زیادہ طاقتور جاندار ہے۔ وہ یہ سوچ ہی رہا تھا کہ بڑھیا نے پھر بستر گھسیٹا۔ چیتا مارے ڈر کے سکتے میں پڑ گیا۔ وہ سوچنے لگا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ "ٹپ ٹپ" باہر نکل آئے اور اسے پکڑ کر اس طرح اس کی درگت بنائے جس طرح وہ اندر بڑھیا کی درگت بنا رہا تھا۔ مارے خوف کے وہ ایک کونے میں دبک کر بیٹھ گیا اور بارش کے تھمنے کا انتظار کرنے لگا۔

تھوڑی دیر میں ایک دھوبی اپنے گدھے کو ڈھونڈتا ہوا آ نکلا۔ اس نے سوچا کہ بڑھیا کے چھپر میں بھی دیکھ لوں کہیں گدھا بارش سے بچنے کے لیے ادھر نہ آ گیا ہو۔ وہ اندھیرے میں اس چھپر کے اندر گھسا۔ اس کونے میں ایک جانور بیٹھا ہوا محسوس ہوا۔ وہ سمجھ گیا کہ یہ ضرور اس کا گدھا ہوگا۔ وہ جھٹ اس کی طرف لپکا اور اس کا کان پکڑ کر غصے سے اس کو گھسیٹا۔ اور پھر دے لات پہ دے لات اس کی مرمت شروع کر دی۔ [illegible]

[illegible] بیٹھا تھا۔ اس کو یقین ہو گیا کہ یہی وہ "ٹپ ٹپ" ہے جو ابھی بڑھیا کی جان لے رہا تھا۔ مارے ڈر کے اس کا برا حال تھا۔ ادھر دھوبی کو پورا یقین تھا کہ یہ اس کا گدھا ہی ہے۔ لات گھونسے مار کر دھوبی اس کی پیٹھ پر بیٹھ گیا اور بولا۔

"حرامزادے! چل...... سیدھے گھر چل۔"

چیتے کو گدھا سمجھ کر وہ راستہ بھر گھونسے مارتا گالیاں دیتا گھر تک لایا۔ اور اُسے رسی سے باندھ کر وہ گھر میں جا کر سو رہا۔

صبح کو دھوبن جب باہر نکلی تو اس نے جو کچھ دیکھا وہ ناقابلِ یقین تھا۔ وہ فوراً دھوبی کے پاس گئی اور بولی "اجی! تم کو پتہ ہے کہ رات تم نے کس جانور کو پکڑ کر باندھ رکھا ہے۔"

دھوبی بولا۔" ارے وہی حرامزادے گدھے کو جو دن بھر لاپتہ تھا۔"

دھوبن بولی "ذرا باہر نکل کر تو دیکھنا..."

دھوبی باہر آیا۔ اس نے اپنی آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنا شروع کیا۔ پھر وہ اپنے سارے جسم پر ہاتھ پھیر پھیر کر دیکھنے لگا۔ کہ اس کے جسم پر چیتے نے کوئی خراش یا زخم تو نہیں لگایا۔ وہ حیران بھی تھا اور خوفزدہ بھی۔

جلد ہی یہ خبر گاؤں میں پھیل گئی۔ تمام چھوٹے بڑے یہ عجوبہ دیکھنے کو جمع ہونے لگے۔ لوگوں نے دھوبی سے پوچھنا شروع کیا کہ آخر اس نے کس طرح اتنے خطرناک جانور پہ قابو حاصل کر لیا۔ دھوبی جو خود بہت ڈرا ہوا تھا اپنے آپ کو اب سنبھال چکا تھا۔ اس لیے کہ اب وہاں بچاسوں لوگ موجود تھے اور وہ اس کی حفاظت کر سکتے تھے۔ دھوبی نے بڑے رعب کی لی۔ اور وہ پورا قصہ سنا دیا کہ اس کو چیتا کہاں ملا اور پھر کس طرح اُس نے اس کی مرمت کی۔ اور یہی نہیں بلکہ اس کی پیٹھ پر بیٹھ کر اس کو گدھا بنا کر گھر لایا۔ لوگ اس کی دلیری کے قائل ہو گئے۔

جلد ہی دھوبی کی بہادری کا قصہ شہر تک پہنچ گیا۔ شہر سے یہ بات آگے بڑھی تو بادشاہ کے دربار تک پہنچی۔

بادشاہ نے سُنا تو اسے دھوبی سے ملنے کا شوق پیدا ہوا وہ ایک روز اپنے گھوڑے پر سوار ہو کر دھوبی کے گاؤں پہنچا تو وہاں اس کو جب یہ معلوم ہوا کہ وہ چیتا وہی تھا۔ جس نے کئی آدمیوں کو مار کھایا تھا تو اس کو دھوبی کی بہادری پر بہت خوشی ہوئی۔ وہ دھوبی سے اتنا خوش ہوا کہ اس نے اسے ایک محل رہنے کو دیا اور بہت ساری دولت عطا کی۔ دھوبی اور دھوبن بڑے چین سے رہنے لگے۔ پھر جلد ہی بادشاہ نے دھوبی کو اپنی فوج کے ایک دستہ کا کمانڈر بنا دیا۔

کچھ ہی دن گذرے ہوں گے کہ پڑوسی ملک نے بادشاہ کی سلطنت پر حملہ کرنے کی ٹھانی۔ ایک بڑی فوج سرحد پر جمع ہو گئی۔ بادشاہ کو اس کی خبر ملی تو وہ پریشان ہو گیا۔ اس نے اپنے کمانڈروں کو بلا کر پوچھا " تم میں وہ کون بہادر ہے جو دشمن سے مقابلہ کرے گا۔" کوئی ہمت نہیں کر سکا۔ اس لیے دشمن کی فوج تعداد میں بہت زیادہ تھی۔ جب کوئی نہ بولا تو بادشاہ کو چیتے والے کمانڈر کا خیال آیا۔ اس نے اُسے طلب کیا۔ جب وہ حاضر ہوا تو بادشاہ نے اس سے کہا :۔" بہادر سپہ سالار! میری خواہش ہے کہ میری فوج تمھاری رہبری میں دشمن کا مقابلہ کرے۔ مقابلہ ہی نہیں بلکہ ان کا صفایا کر دے۔

دھوبی پہلے تو ڈرا مگر اس نے بادشاہ سے کہا کہ میں ضرور مقابلہ کروں گا۔ لیکن مقابلہ کرنے سے پہلے میں

دشمن کی قوت کا اندازہ کرنا چاہوں گا۔ بادشاہ راضی ہو گیا۔
دھوبی نے بادشاہ کی بات اپنی بیوی کو بتائی اور
کہا: "بھئی یہ تو ناممکن ہے کہ میں سپاہیوں کی سالاری کرسکوں
مجھے تو گھوڑے پر سوار ہونا بھی نہیں آتا ـــــ تم ایسا کرو کہ
میرے لیے کوئی ایسا گھوڑا منگوا دو جو بہت سیدھا سادھا
ہو تاکہ اگر میں اس پر کسی صورت سے بیٹھ جاؤں تو وہ مجھے
گرائے نہیں۔" بیوی نے رضامندی ظاہر کر دی، لیکن صبح
ہوتے ہی بادشاہ کے سپاہی ایک بڑا زبردست گھوڑا
لے کر اپنے سالار کے دروازے پر آ پہنچے۔ دھوبن نے ان
سے کہا "تم لوگ اب جا سکتے ہو۔"

سپاہی چلے گئے۔ دھوبی نے جو گھوڑے کی شکل
دیکھی تو مارے ڈر کے اس کے ہوش خراب ہونے لگے۔
وہ بولا "نہیں بابا ـــــ میں تو اسے ہاتھ بھی نہیں لگاؤں گا
یہ تو میری جان ہی لے گا۔"

بیوی بولی "گھبرانے سے آسان کام بھی مشکل ہو
جاتا ہے۔ تم ایسا کرو۔ اس درخت پر چڑھ جاؤ اور پھر
گھوڑے کی پیٹھ پر اتر جانا۔ میں تم کو رسی سے باندھ دوں گی۔
تو پھر یہ تم کو گرا نہیں سکے گا۔ دھوبی مان گیا۔ وہ اسی طرح
گھوڑے کی پیٹھ پر جا بیٹھا جس طرح دھوبن نے بتایا تھا۔
دھوبن رسی لینے گئی ہی تھی کہ گھوڑا ایک بار اچھلا۔ اس
نے محسوس کر لیا تھا کہ سوار اس کی پیٹھ پر بیٹھ چکا ہے۔
دھوبن رسی لے کر آ ہی رہی تھی کہ گھوڑا چل پڑا۔
دھوبی نے چلانا شروع کیا۔ ارے میں مر جاؤں گا۔
بس گرا۔ ارے میں مرا۔"

دھوبن نے زور سے چلا کر کہا۔ "ارے گھوڑے
کی گردن سے لپٹ جاؤ۔ اسے چھوڑنا نہیں... دیکھو۔
چھوڑنا نہیں۔"

دھوبی نے گھوڑے کی گردن دونوں ہاتھوں
سے کس کر پکڑ لی۔ اور گھوڑا ہوا سے باتیں کرنے لگا۔
سڑکوں سے گزرتا ہوا میدانوں کو پار کرتا ہوا،
کھائیوں اور نالوں کو پار کرتا ہوا بھاگتا رہا۔ دھوبی
اس کی گردن سے چپکا رہا۔ اُسے یہ محسوس ہو رہا تھا کہ
اس کی موت یقینی ہے اور کسی لمحہ بھی زندگی اس کا ساتھ
چھوڑ سکتی ہے۔ اسے جتنا ڈر لگتا وہ گھوڑے کی گردن
اتنی سختی سے اپنی پکڑ میں رکھنے کی کوشش کرتا رہا۔
حتّٰی کہ گھوڑا دشمن کی فوج کے قریب پہنچ گیا۔ دھوبی
کو اپنی موت بس اب چند لمحوں بعد ہی نظر آ رہی تھی
اس نے دل میں سوچا کہ دشمن تک تو ہرگز پہنچنا ہی
نہیں ہے وہ نہ جانے میرے ساتھ کیا سلوک کریں۔
اس سے بہتر ہے کہ گھوڑے کو چھوڑ کر میں یہیں گر جاؤں
ممکن ہے جان بچا پاؤں۔ اتنے میں اُسے ایک درخت
اپنے قریب آتا نظر آیا۔ اس نے سوچا اسی کو کیوں نہ
پکڑ لوں۔ اور گھوڑے سے نجات حاصل کروں۔ یہ
سوچ کر اس نے قریب آتے ہوئے درخت کو پکڑ لیا لیکن
گھوڑے کی رفتار اتنی تیز تھی کہ درخت کو اتنی زور کا
جھٹکا لگا کہ وہ جڑ سے ہی اکھڑ گیا اور دھوبی اس درخت
کو ہاتھ میں پکڑے ہوئے اب دشمن کی فوج کے درمیان
پہنچ چکا تھا۔ دشمن کے سپاہیوں نے دھوبی کو درخت
کی طرف جھکتے دیکھ لیا تھا۔ اب وہ یہ سمجھ بیٹھے کہ
اس بہادر اور طاقتور سپہ سالار نے اپنی طاقت کا لوہا
منوانے کے لیے ان کے سامنے جان بوجھ کر درخت
کو اکھاڑا تھا۔ دشمن بہت گھبرائے اور انھیں ایسا
لگا جیسے کوئی بہت بڑی فوج ان کی خبر لینے آ رہی ہے۔
دشمن کے سپاہیوں میں ایک شور مچا۔ بھاگو۔ بھاگو

[illegible] جان بچاؤ ــــــ ہمارے مقابلہ کو دیو
[illegible] آرہا ہے۔ ہم اس سے مقابلہ نہیں کر سکتے !!
اِدھر دھوبی دونوں ہاتھوں میں درخت اٹھائے
دشمن کی فوج کے درمیان اپنے گھوڑے کو دوڑا رہا
تھا۔ اس نے جب حالات کو اپنے موافق پایا تو ذرا ہمت
سنبھالی اور گھوڑے پر سے زور زور سے چلانا شروع
کیا۔
"ٹھہر جاؤ ــــ ماں کے لعل ــــ ایک ایک
کا کچومر نکال نہ دوں میرا نام نہیں ہے"۔ دشمن راجا نے جب
دیکھا کہ اس کے سپاہی سب تتر بتر ہو گئے تو اس نے
ایک خط لکھ کر اپنے خیمہ میں رکھ دیا اور اپنے گھوڑے
پر سوار ہو کر وہ بھی بھاگ گیا۔ گھوڑا خیموں کے درمیان رسّی میں
[illegible] کر کھڑا ہو گیا۔ اس کے رکتے ہی دھوبی سپہ سالار
[illegible] گیا۔ اب اس کے ہوش ٹھکانے لگ چکے
[illegible] کر پاس والے خیمہ میں گیا۔ تو وہاں اس نے
[illegible] دشمن راجا نے لکھ کر چھوڑ دیا تھا۔ اس پر
[illegible]: ہم آپ سے مقابلہ کی طاقت نہیں رکھتے ــــ
[illegible] معاف کر دیں۔ ہم نے اپنے سپاہیوں کو واپسی
[illegible] دیا ہے اور میں بھی واپس جا رہا ہوں"
[illegible] خط اٹھا لیا۔ اب اس نے یہ طے کر لیا
[illegible] گھوڑے پر سواری نہیں کرے گا۔
[illegible] کی ہمت اور مہارت کو تسلیم کر چکا
[illegible] بہت ہی سیدھا سادہ
[illegible] جیب میں رکھا اور
[illegible] ہو گیا۔ گھوڑا خود ہی اس کے
[illegible]
[illegible] گھر پہنچا تو اس کی بیوی اس کے

استقبال کو آئی۔ اس نے دھوبی سے خیریت پوچھی
تو دھوبی بولا: جان من! تم سے جدا ہو کر عجیب عجیب
مصیبتوں میں پھنسا۔ شکر ہے کہ گھر کو واپس آ گیا۔ اب
تم یہ خط لو اور یہ گھوڑا دونوں بادشاہ کے حضور میں
پیش کر آؤ"۔ اس کی بیوی خط اور گھوڑا لے کر بادشاہ
کے حضور میں گئی۔ اس نے بادشاہ کو بتایا کہ اس کا شوہر
تمام دن دشمنوں سے اکیلا لڑا ہے۔ اس لیے وہ اتنا تھک
گیا ہے کہ دربار میں حاضر نہ ہو سکا۔ وہ کل ضرور حاضر
ہو گا۔

دوسرے دن دھوبی بادشاہ کی ملاقات کو پیدل
دربار کے لیے روانہ ہو گیا۔ اسے اب بھی گھوڑے سے
ڈر لگتا تھا۔ لوگوں کو دشمن کی پسپائی کا علم ایک دن قبل
ہو چکا تھا۔ اس لیے کہ بادشاہ نے ہارے ہوئے راجا
کے اس خط کو دربار عام میں سنا دیا تھا۔ لوگ سپہ سالار
کو پیدل جاتے ہوئے دیکھ کر حیران تھے اور کہہ رہے
تھے کہ سچی بہادری اور عظمت والے لوگ کبھی اتراتے نہیں۔
کچھ لوگ کہہ رہے تھے "اتنی زبردست فوج
کو تنہا شکست دینے کے باوجود اس آدمی میں ذرہ
برابر گھمنڈ نظر نہیں آتا، وہ ہم جیسے لوگوں کی ہی طرح آج
بھی زمین پر چلتا ہے۔ نہ تو اس کے آگے پیچھے فوج
ہے اور نہ محافظ۔ سچ مچ بہادر ایسے آدمی کو کہتے ہیں"۔
دھوبی سپہ سالار۔ جیسے ہی دربار کے قریب
پہنچا بادشاہ نے خود آگے بڑھ کر اسے گلے لگا لیا۔
اور فوجی باجے فتح و نصرت کی دھنیں بجانے لگے۔

بادشاہ نے ہزاروں آدمیوں کے سامنے دھوبی سپہ سالار
کو اس کی دلیری، جواں مردی اور وفاداری کے لیے بے شمار
اعزاز بخشے اور اسے سالار اعظم کا لقب عطا کیا۔

جناب عبدالمنان منصوری

اونٹ کا گھمنڈ

تقریباً سو سال کی بات ہے کہ ایک گاؤں میں ایک بڑھئی رہتا تھا وہ بہت ہی غریب تھا یہاں تک کہ اس کو کئی کئی دنوں تک فاقہ کشی کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ وہ کبھی کبھار جنگل میں جاتا اور لکڑیاں کاٹ کر بازار میں فروخت کرکے اپنی زندگی بسر کرتا تھا اس طرح وہ بڑی محنت و مشقت سے اپنی روٹی کماتا تھا اور اپنی پیٹ کی آگ بجھاتا تھا۔

ایک دن وہ دور دراز کے جنگل میں گیا کیا دیکھتا ہے کہ وہاں ایک اونٹنی نے ایک بچے کو جنم دیا ہے۔ بڑھئی کو بچہ بہت پیارا لگا اس نے درختوں سے ہرے ہرے پتے توڑ کر کھلائے، اس کے بچے کو بھی اس نے پیار کیا اسی طرح وہ روز جنگل میں جا کر اونٹنی کی خدمت کرتا تھوڑے دنوں میں اونٹنی موٹی تازی ہو گئی اور اس کا بچہ بھی اچھلنے کودنے لگا۔ ایک دن جب بڑھئی گھر واپس ہونے لگا تب اونٹنی بھی اس کے پیچھے چل دی اونٹنی کے آنے سے اس غریب بڑھئی کی دنیا بدل گئی۔

اس بڑھئی کا گاؤں ریگستان میں تھا وہاں نہ موٹر چل سکتی ہے اور نہ گھوڑا گاڑی۔ اونٹ ہی ریگستان کا جہاز ہوتا ہے۔ بڑھئی اونٹنی کے پیٹھ پر سامان ڈھونے لگا۔ اس سے اس کو اچھی خاصی آمدنی ہونے لگی۔ اونٹنی بھی اپنے پیارے مالک کے لیے زیادہ سے زیادہ وزن اٹھانے لگی۔

پیسہ کما کر بڑھئی نے دو تین اونٹ اور خرید لیے تھوڑے ہی دنوں میں اس کے قسمت کا ستارہ عروج پر آ گیا۔ وہ پورے گاؤں میں مشہور ہو گیا۔ اب لوگ اسے گھور گھور کر دیکھنے لگے۔ اس نے اونٹنی کے بچے کو خوب سجایا اس نے اس کے پیر میں گھنگرو باندھ دیے اور اس کے گلے میں گھنٹیاں لگا دیں بڑھئی اپنی قسمت پر شاکر رہنے لگا۔

اس نے اونٹنی کے بچے کو اونٹوں کا سردار بنا لیا یہ اونٹوں کا سردار بڑی شان سے چلتا۔ چلتے وقت اس کے پیر کے گھونگھرو چھم چھم بولتے تھے اور اس کے گلے کی گھنٹیاں ٹن۔۔۔۔۔ ٹن کرتیں۔ دھیرے دھیرے بڑھئی کے پاس سو اونٹ ہو گئے۔ اونٹنی کا بچہ ان سو اونٹوں کا سردار تھا۔ ان اونٹوں کو کھلانے کے لیے بہت کہاں تھے اس لیے بڑھئی نے ایک نوکر رکھ لیا وہ سب اونٹوں کو چرانے کے لیے جنگل میں لے جاتا تھا۔

ایک دن نوکر نے اونٹوں کے سردار سے کہا۔ "آؤ تمہارے گلے سے گھنٹیاں نکال دوں اور پیر کے

گھونگھرو کھول دوں"۔ اونٹوں کے سردار نے چڑھ کر کہا۔
"کیوں ؟"

نوکر نے کہا "تمھیں جنگل میں جانا پڑتا ہے۔ اگر تمھارے گھونگرو اور گھنٹیوں کی آواز کسی شیر کے کان میں پڑ گئی تو ہم لوگوں کی جان خطرے میں پڑ جائے گی۔"
اونٹوں کا سردار بالکل نہیں ڈرا اس نے بے دھڑک کہا۔ "شیر......؟ شیر آکر میرا کیا کرے گا۔"

نوکر نے دھمکایا۔ "ایسا مت کہو شیر بہت بہادر ہوتا ہے وہ جنگل کا راجہ ہوتا ہے وہ تمھیں مار ڈالے گا۔"
اونٹوں کے سردار نے خم ٹھوک کر کہا۔ "وہ جنگل کا راجہ ہے تو میں اونٹوں کا راجہ ہوں۔ وہ ٹھگنا سا شیر کیا کرے گا دیکھو، میری گردن اور یہ لمبی لمبی ٹانگیں۔ کہاں میرا اتنا چوڑا جسم اور کہاں چھوٹا سا ٹھگنا شیر۔ ...اچھی! میں اس سے کیا ڈروں......؟ اونٹوں کا سردار ہوں سردار" نوکر نے بہت سمجھایا مگر اس اونٹ کے کانوں پر جوں تک نہ رینگی۔

دوسرے دن اونٹوں کا قافلہ جنگل میں چرنے گیا اونٹوں کے سردار کو سویرے کی باتیں یاد ہوئیں اس نے سبھی اونٹوں سے کہا: "تم لوگ دھیرے دھیرے پیچھے آؤ میں بڑھتا ہوں۔"

بڑھئی کے نوکر نے اُسے منع کیا لیکن وہ نہ مانا... اور آگے نکل کر جنگل میں اکیلے ادھر ادھر گھومنے لگا کبھی ...اپنی گردن کو گھمنڈ سے دیکھتا اور کبھی اپنے لمبے پیروں کو۔ پھر وہ بڑی بے نیازی کے ساتھ بلبلا اٹھا اس کے پیر کا گھونگھرو جب چھم چھم بولتا تو وہ دل ہی دل میں کہتا واہ رے ہم .... واہ رے ہم۔
اونٹوں کا سردار آگے چلا ہی رہا تھا کہ شیر نے اس کے گلے کی گھنٹیوں کی آواز سنی اور اس کی طرف لپکا اونٹ کے سردار کے سامنے آگیا۔ اپنے سامنے ایک اونٹ کو دیکھ کر وہ گرج اٹھا اس کی آواز سن کر اونٹ کی ساری اکڑ غائب ہو گئی وہ بھاگنا چاہتا تھا کہ شیر اچھل کر اس کی گردن پر بیٹھ گیا اور اس کی لمبی گردن ٹوٹ گئی شیر نے اس کا گوشت خوب مزے سے کھایا اور راستہ لیا۔

بیچارہ نوکر اونٹوں کے سردار کو تلاش کرنے وہاں جا پہنچا دیکھا کہ شیر نے اونٹوں کے سردار کو مار گرایا ہے۔ اس وقت اونٹوں کا قافلہ بھی وہاں پہنچ گیا۔ روتے روتے ایک اونٹ نے کہا۔ "اس بے وقوف کو سب نے پہلے ہی منع کیا تھا۔ مگر اس نے گھمنڈ میں آکر ایک نہ سنی اور اپنی جان دے بیٹھا۔"
★

جناب انصاری اسلم عزیز (مالیگاؤں)

دولت مند لکڑہارا

بچّو! آج ہم تمھیں ایک اچھی سی کہانی سنائیں گے۔ لیکن اس طرح سے جھوٹ نہیں بولیں گے کہ یہ کہانی ہمیں ہماری نانی اماں نے سنائی کیونکہ آج کل نانی اماؤں کو یہ سب سنانے کی فرصت ہی کہاں ملتی ہے اور ہے بھی تو سنانا نہیں چاہتیں تو لیجیے یہ کہانی سنیے جیسے میرے بھائی نے مجھے سنائی جو کہ محلّے کی بچوں کی لائبریری کے ممبر ہیں۔ کتنا اچھا ہوتا۔ اگر اس طرح ہر محلّے، ہر چالی میں ایسی ہی بچوّں کی لائبریری، قائم ہو جاتی جہاں اچھی سے اچھی پیاری پیاری کہانی کی کتابیں معمولی فیس میں پڑھنے کو مل جائیں۔ مجھے یقین ہے آپ کو یہ بات ضرور پسند آئی ہوگی۔

خیر لیجیے کہانی سنیے ایک تھا لکڑہارا جو جنگل سے لکڑیاں کاٹ کر لاتا بازار میں بیچ دیتا اور اس طرح اپنے بال بچّوں کا اور اپنا پیٹ پالتا۔ آجکل تو بغیر اجازت جنگل میں لکڑی کاٹنا جرم ہے انھیں پکڑ لیا جاتا ہے۔ جرمانہ اور سزا بھی ہو جاتی ہے۔ لیکن اس زمانے میں ایسا نہ تھا۔

وہ لکڑہارا بہت سیدھا سادہ، بھولا بھالا اور ایماندار تھا روزانہ صبح منہ اندھیرے اُٹھ کر کلہاڑی لے کر جنگل کی طرف نکل پڑتا اور دن ڈھلے واپس ہوتا اس طرح تین وقت کی روکھی سوکھی مشکل سے میسّر ہوتی۔

آخر وہ بھی تو ایک انسان تھا اس کے دل میں بھی خواہشیں پیدا ہوتیں۔ اس کی بھی کچھ آرزوئیں تھیں وہ روز روز کے اس بکھیڑے اور بیوی کی روز روز کی باتوں سے تنگ آچکا تھا اس نے اس بات کا تہیہ کیا کہ دوسرے شہر جاکر قسمت آزمائی کرے گا تاکہ دو پیسے ہاتھ میں بچ رہیں جو آئندہ اس کی اولاد کے کام آئیں۔

جب سے یہ خیال اس کے دل میں بسا تھا روز رات کو وہ خواب میں عجیب عجیب چیزیں دیکھتا کبھی وہ ایک بہترین تخت پر بیٹھا ہوا میں اڑا جا رہا ہے۔ اس کا لباس خوبصورت اور قیمتی ہے، سر پر سنہرا تاج، انگلیوں میں ہیرے کی انگوٹھیاں، گلے میں بیش قیمت موتیوں کے ہار لٹک رہے ہیں۔

کبھی وہ دیکھتا کہ ایک بہت لمبا قافلہ، بالکل شاہی لشکر، وہی شاندار سواریاں اور پالکیاں جس میں زرق برق لباس میں اس کی بیوی اور بچے بیٹھے ہیں ان کے لبوں پر مسکراہٹیں کھیل رہی ہیں ایک سجے سجائے گھوڑے پر آگے آگے وہ کمر میں تلوار باندھے نہایت شان کے ساتھ چلا آ رہا ہے۔ عیش و آرام کی تمام چیزیں سامان سفر میں حاضر غلاموں کے کاندھوں پر لدی ہیں۔ اس کے چہرے سے شاہی جاہ جلال

تا ہے۔

ایک دن لکڑہارے نے اپنے ان سپنوں کو حقیقت میں بدلنے کا ارادہ کر کے، سفر کا قصد کیا۔ اتفاق سے ایک قافلہ سمتِ مغرب میں جانے والا مل گیا۔ انھیں میں لکڑہارا بھی شامل ہو کر روانہ ہو گیا۔ اس قافلہ میں زیادہ تر تاجر تھے۔ جو سامان تجارت ایک جگہ سے خرید کر دوسری جگہ اچھے داموں سے فروخت کرتے تھے۔

سفر کی مختلف تکلیفیں برداشت کرتے، ایک شام قافلہ ایک پہاڑی درّے میں پہنچا۔ سورج ڈوب چکا تھا آگے سفر کرنا دشوار ہو گیا۔ آخرکار اسی پہاڑی درّے میں قیام (پڑاؤ) کرنے کا حکم ہوا۔ رات بھی ڈیرا جما چکی تھی۔ الاؤ جلائے گئے کھانا تیار ہوا۔ کھا کر سب اپنے اپنے ٹھکانوں پر سو رہے۔ پہرے داروں نے اپنی اپنی ڈیوٹیاں سنبھالیں آدھی رات کو اچانک چیخ و پکار اور بھاگ دوڑ کی آوازوں سے تمام مسافر جاگ اٹھے۔ رہزنوں (لٹیروں) نے پڑاؤ پر حملہ کر دیا تھا۔ وہ تیر و تلوار سے لیس تھے اور حملہ اتنا اچانک ہوا کہ قافلے کے لوگوں کو سنبھلنے کا موقع بھی نہ مل سکا اب وہ پورا علاقہ زخمیوں اور مسافروں کی چیخ اور لٹیروں کے گھوڑوں اور قہقہوں سے گونج رہا تھا۔ زمین سرخ ہو رہی تھی خیمے جل رہے تھے۔ اس دوران جو اپنی جان بچا کر بھاگنے میں کامیاب ہو سکا نکل بھاگا۔ باقی کو ظالم لٹیروں نے قید کر لیا۔

اسی افراتفری میں وہ لکڑہارا بھی موقع غنیمت جان کر ایک سمت نکل بھاگا۔ جان سب کو پیاری ہوتی ہے اور اب وہ اس خطرناک لٹیروں کے چنگل یعنی پہاڑی درّے سے بہت دور نکل آیا تھا۔ شور و غل کی آوازیں بند ہو چکی تھیں اس نے ایک اطمینان کا سانس لیا، دوڑتے دوڑتے وہ تھک کر چور ہو چکا تھا۔ اور اب اُسے بھوک اور پیاس کا احساس ہونے لگا. اس کا یہ پہلا سفر تھا۔ اس لیے سب ہی راستے اس کے لیے انجانے تھے۔ اس نے اپنی عقل سمجھ بوجھ سے ایک سمت کو چلنا شروع کیا۔ ابھی وہ کچھ ہی دور چلا ہوگا کہ اُسے کسی کے کراہنے کی آواز سنائی دی۔ پاس کی جھاڑیوں میں کوئی پڑا ہوا تھا۔ وہ شاید زخمی تھا۔ لکڑہارے نے دوڑ کر اسے سہارا دیا۔ اس نے جب غور سے اس کا چہرہ دیکھا تو اسے پہچاننے میں کوئی دقت نہ ہوئی کہ وہ زخمی دراصل قافلے کا میر (سردار) تھا۔ شدید درد کی بنا پر وہ کچھ بول نہیں پا رہا تھا۔ لکڑہارے نے اسے اپنے کاندھو پر اٹھا لیا اور پانی کی تلاش شروع کر دی تھوڑی سی دوڑ دھوپ کے بعد آخرکار ایک تالاب دکھائی دیا۔ لکڑہارا اُسے تالاب پر لے آیا اُسے پانی پلایا اُس کے زخموں کو دھو کر باندھ دیا۔

لیکن صبح ہوتے ہوتے اس بوڑھے تاجر نے دم توڑ دیا. مرنے سے پہلے اس نے اشرفیوں کی ایک تھیلی دیتے ہوئے کہا "لو بیٹا اسے رکھ لو۔ بس یہی پونجی میری کل کائنات ہے جو اب میں تمھیں سونپ رہا ہوں۔ ایک وقت آئے گا تمھیں بھی کسی اور کے سپرد کرنا پڑے گا۔ اس لیے بہتر ہے کہ مال سے زیادہ اعمال کی فکر کرو اور اعمال کے لیے علم ضروری ہے اس لیے علم کو بہتر سمجھو جس کی روشنی سے ہم اعمال بنا سکتے ہیں اور جب اعمال اچھے ہوں گے تو مال خود بخود تمھارے پاس آئے گا اور مناسب ہوگا کہ تم ان روپیوں سے تجارت شروع کر دو کیونکہ تجارت سے علم بڑھتا ہے۔ عمل ظاہر ہوتا ہے۔ خدا پر بھروسے

باقی صفحہ ۴۸ پر

جناب مناظر عاشق ہرگانوی

بلا عنوان

زبردست طوفان آیا تھا۔ اس کے بعد اتنی بارش ہوئی تھی کہ سارا گاؤں پانی میں ڈوب گیا تھا۔

لیکن اسے شکیل کی اماں کی دوررس نا رسیتی کہیے کہ گاؤں کے ڈوبنے سے پہلے ہی وہ شکیل کو ساتھ لے کر گاؤں سے نکل گئی تھی اور بھوک پیاس سے نڈھال سارا دن چلتی رہی تھی۔ اسی بے سروسامانی کے عالم میں وہ املتاس پور گاؤں پہنچیں۔ اس وقت رات اپنے پر پھیلا چکی تھی — شکیل کی اماں نے ایک دروازے پر دستک دی۔ ایک بوڑھی عورت نے دروازہ کھول کر سوالیہ نگاہوں سے ان دونوں کی طرف دیکھا۔ پھر پوچھا "کیا ہے؟"

"ہم مصیبت زدہ ہیں۔ ہمارا گاؤں باڑھ کی نذر ہوگیا ہے۔ ہمیں ....."

"اوہ، تم بھی ان لوگوں میں ہو" بوڑھی عورت بات کاٹ کر بولی۔ "تم سے پہلے بھی یہاں کئی لوگ آ چکے ہیں۔ لیکن ہم اپنے گھروں میں کسی کو پناہ نہیں دے سکتے۔ زمیندار کا حکم ہے کہ جتنے لوگ آئیں۔ اس کے پاس بھیج دیے جائیں"

"یہ زمیندار اچھے آدمی ہیں؟" شکیل نے پوچھا۔ اس کی عمر بارہ سال سے زیادہ نہ رہی ہوگی اور بڑا بھولا بھالا بہت ہی نیک لڑکا معلوم ہوتا تھا لیکن آنکھوں سے ویسے ذہین لگتا تھا۔

"زمیندار سے متعلق ہم کچھ نہیں کہہ سکتے" بوڑھی عورت نے سرگوشی کے لہجے میں جواب دیا۔ "ویسے اتنا بتا دوں کہ اس کے ظلم سے ہم سب پریشان ہیں۔ تم مصیبت زدہ لوگوں کے لیے بھی اس کے دل میں کوئی ہمدردی نہیں۔ دکھاوے کے لیے اس نے یہ کیا ہے کہ جتنے لوگ آ رہے ہیں ان سے وہ سوال پوچھتا ہے سنا ہے اب تک کسی نے صحیح جواب نہیں دیا ہے اس لیے سبھی مصیبت زدہ لوگوں کو اس شرط پر پناہ دے رہا ہے کہ وہ اس کے لیے سخت سے سخت محنت کریں گے"

"آپ کا شکریہ کہ اتنی باتیں بتا دیں" شکیل اپنی ماں کا ہاتھ تھامے ہوئے بوڑھی عورت سے بولا۔

"لیکن اب ہم جائیں گے کہاں؟" شکیل کی ماں نے بے چارگی سے اس کی طرف دیکھا۔

"زمیندار کے پاس"

"لیکن بیٹا، اس کے سوال کا ہم کیسے جواب دے سکیں گے اور میں نہیں چاہتی کہ وہ تم سے کوئی سخت کام لے۔ تم نے [illegible] تک کوئی سخت کام نہیں کیا ہے۔ خدا کو نہ معلوم کیا منظور تھا کہ اتنی اچھی زندگی گذارتے گذارتے

یکایک ہم یوں در بدر پھرنے پر مجبور ہو گئے ہیں۔"

"آپ ملول نہ ہوں اماں۔ آپ چلیں تو۔ اس وقت ہم بھوکے اور تھکے ہوئے ہیں۔ کل کیا ہوگا۔ اس وقت سوچنا مناسب نہیں۔"

"اچھا بیٹا چلو۔"

اور دونوں پوچھتے پاچھتے زمیندار کے محل نما مکان کے پاس پہنچے۔ زمیندار کے کئی اہلکار ان کی طرف بڑھے۔ ان کا دکھڑا سنا اور زمیندار کو خبر دی گئی۔ تقریباً ایک گھنٹے کے بعد ان کی طلبی ہوئی۔ انھیں دیکھ کر زمیندار نے کہا "تم لوگ یہاں اپنی غرض سے آئے ہو۔ اس لیے میں جاننا چاہوں گا کہ تم کتنے ذہین ہو۔ اس کے لیے دو سوال کروں گا۔ اگر جواب نہیں ملا تو تمھیں زندگی بھر ہماری عملداری میں کام کرنا ہوگا بولو منظور ہے؟"

"منظور ہے" شکیل نے اپنی ماں کو خاموش رہنے کا اشارہ کرتے ہوئے جواب دیا۔

"ہاں اتنا اور سن لو" زمیندار نے کہا "اگر تم نے میرے سوالات کا صحیح جواب دیا تو تم ہمارے مہمان ہوگے اور ایک مہینے تک یہاں رہ سکتے ہو اس کے بعد جہاں جانا چاہو گے اپنی مرضی سے جا سکتے ہو۔ ہاں تو۔ میرا پہلا سوال ہے۔

(۱) وہ کون سی چیز ہے، جس کا سایہ ہم نہیں دیکھ پاتے؟

"بس یہی سوال ہے؟" شکیل نے حیرت سے زمیندار کی طرف دیکھ کر کہا "یہ تو بہت ہی آسان سوال ہے۔ اس کا جواب ہے "ہوا" ہوا کو یا اس کی پرچھائیں کوئی نہیں دیکھ سکتا۔"

زمیندار اور اس کے حواری موالی لوگ تعجب سے شکیل کی طرف دیکھنے لگے۔

زمیندار نے دوسرا سوال کیا۔

(۲) ایک گڈریہ تھا۔ اس کے پاس چند بھیڑیں تھیں۔ اپنی شادی میں اس نے آدھی بھیڑیں بیچ دیں۔ اب جو بچیں، ان میں سے ایک بھیڑ کسی وجہ سے مر گئی۔ باقی بھیڑوں کا دوگنا اس گڈریے نے پھر خرید لیا۔ اب اس کے پاس پہلے جتنی ہی بھیڑیں ہو گئیں۔ بتاؤ اس گڈریے کے پاس شروع میں کتنی بھیڑیں تھیں؟"

شکیل چند لمحے تک سوچتا رہا۔ پھر سر اونچا کر کے بولا۔ "چھ بھیڑیں تھیں۔"

سارے لوگ چونک پڑے۔ زمیندار نے پہلو بدلتے ہوئے کہا "کیسے؟"

"شروع میں گڈریے کے پاس چھ بھیڑیں تھیں، جن میں سے آدھی یعنی تین بھیڑیں، اس نے اپنی شادی میں خرچ کرنے کے لیے بیچ دیں۔ اب گڈریے کے پاس صرف تین بھیڑیں بچیں، ان میں ایک بھیڑ کسی وجہ سے مر گئی۔ اب گڈریے کے پاس دو بھیڑیں بچیں دو کا دوگنا یعنی چار بھیڑیں اس گڈریے نے پھر خرید لیں۔ اس طرح اس کے پاس دو اور چار مل کر چھ بھیڑیں ہو گئیں۔ ٹھیک اتنی ہی بھیڑیں اس کے پاس شروع میں تھیں۔"

شکیل کا جواب سن کر زمیندار اسے گلے لگانے کے لیے آگے بڑھا۔ لیکن اس سے پہلے ہی اس کی ماں نے اسے اپنے سینے سے لگا لیا!"

★

آدھی ملاقات

بہت دنوں بعد 'پیام تعلیم' کی بزم میں حاضر ہورہا ہوں، مگر میں 'پیام تعلیم' کو بھولا نہیں۔ میں بھی 'پیام تعلیم' ہی کا پروردہ ہوں اور یہ میرا فرض ہے کہ میں نے اس کے ذریعہ جو حاصل کیا ہے اس کو کسی نہ کسی شکل میں لوٹا بھی دوں۔

براہ کرم مندرجہ ذیل پتے پر پیام تعلیم جاری فرما دیں۔ میں سالانہ چندہ محترمی یزمی صاحب (شاخ مکتبہ جامعہ علی گڑھ) کی خدمت میں یکم کو پیش کردوں گا۔ اور رسید آپ کی خدمت میں بھیجدوں گا۔

م۔ نادم

کبھی ابھی "پیام تعلیم" نظر نواز ہو۔ آپ کی س لہری اپنائیت کے لیے جہاں آپ کا شکر گزار ہوں وہاں انتہائی ندامت بھی ہوتی ہے کہ اس طویل عرصہ تک اپنے پیامیوں کے لیے کچھ نہیں لکھ پا رہا ہوں۔ اور آپ کا یہ خلوص اس احساس میں اور شدت پیدا کردیتا ہے۔

"نذر مدرسہ" کے عنوان سے یہ گیت فی الحال قبول کریں۔ اس کے ساتھ ہی یقین دلاتا ہوں کہ ضرور اپنے ذہن کو آمادہ کروں گا کہ کوئی اچھی دلچسپ نظم ہوجائے۔

اس کے ساتھ ہی اپنے قریبی ساتھی جناب بختیار حسین صاحب کی لائق ہونہار شاگردہ شاہدہ سلطان ضیائی کی پہلی بار یہ نظم "اونچا وطن ہمارا" بھی منسلک کررہا ہوں۔

عبدالمتین نیاز

بچوں کا پسندیدہ رسالہ "پیام تعلیم" نظر سے گزرا۔ ماہ اپریل کا رسالہ بھی کافی دلچسپ اور معلومات سے پُر ہے۔ خاص طور سے جناب اکرام احمد صاحب "سائنس کی دُنیا" مضمون کے لیے داد کے مستحق ہیں۔

مطالعہ کے دوران "شیشے کی دنیا" کی بھی سیر کی۔ اچانک بچوں کا شور وغل سنائی دیا۔ رانی راجا کی ان بن اور "میلہ" میں جانے کا شور وغل۔ بس اسی چیز کو ہوبہو "بچوں کی دنیا" عنوان سے قلمبند کرنے کی ناچیز کوشش کی ہے۔ اُمید ہے۔ آپ کو پسند آئے۔ اپنی رائے ضرور لکھیے۔ جواب کے انتظار میں۔

فضل احمد خان

عرض ایں کہ "پیام تعلیم" کا ہر ماہ بے چینی سے انتظار رہتا ہے شدید بے چینی کے عالم میں ماہِ فروری کا "پیام تعلیم" وصول ہوا اور ایک ہفتہ بعد ماہِ مارچ ۸۵ء کا پیام تعلیم وصول ہوا ماہ مارچ کا پیام تعلیم پڑھ کر بڑی خوشی ہوئی۔ جس میں جناب عادل کہلگانوں صاحب کی نظم "کورا کاغذ" بچوں کے شاعر و ادیب جناب محمد شفیع الدین نیر صاحب کی تقریر، شفیع تمنا صاحب کی نظم "ہندوستانی ہوں" بے حد پسند آئیں۔ جناب سعید احمد رفاعی کی نظم "میٹھی ہماری بولی ہے" بھی بے حد پسند آئی۔

پیام تعلیم میں شایع شدہ تمام مضامین، کہانیاں اور نظمیں پڑھ کر دل کو سکون اور خوشی حاصل ہوتی ہے۔
ماہ مارچ کے پیام تعلیم میں "بچوں سے باتیں" کالم میں آپ کی یہ شکایت کہ بڑے ادھر توجہ نہیں کرتے یہ روناہمیشہ کا ہے پڑھ کر بہت ہی تکلیف ہوئی۔ آپ کا شکایت کرنا واجبی ہے۔
"پیام تعلیم" کا مطالعہ کرنے والے تمام بڑے لوگوں سے میری درخواست ہے کہ وہ بھی بچوں کے لیے کچھ نہ کچھ لکھا کریں۔ بچے "آج کے بڑوں کا مستقبل ہیں۔ لہذا بڑے لوگوں کا فرض ہے کہ وہ بچوں کے لیے اپنی حتی المقدور کوشش سے تفریح کا سامان مہیا کریں۔ پیام تعلیم نہ صرف بچوں کے لیے بلکہ بڑوں کے لیے بھی تفریح کا بہترین ذریعہ ہے۔ پیام تعلیم اخلاقی، معلوماتی اور علمی مضامین شایع ہوتے آپ کے بچوں تک پہنچتا ہے تو بچے ان اخلاقی اور علمی مضامین سے بہت کچھ سیکھتے ہیں۔ لہذا میری اپیل ہے۔ کہ بڑے لوگ پیام تعلیم کے لیے اچھی اچھی نظمیں اخلاقی و علمی مضامین روانہ کریں تاکہ بچوں کو فائدہ پہنچ سکے۔

ولی احمد تنہا

امید ہے مزاج گرامی بہتر ہوں گے میں آپ کے رسالہ پیام تعلیم کا تقریباً دو سال سے مطالعہ کر رہا ہوں محمد حسین حسان صاحب نے ہمت افزائی بھی کی تھی جس کا میں تہہ دل سے شکر گزار ہوں۔ اللہ تعالیٰ اپنے حبیب کے طفیل جنت میں گھر عطا کیے ہوں گے انھوں نے بہت ہی ہمت افزائی کی اور بچوں کے لیے اچھی اچھی کہانیوں کو منتخب کرکے شایع کرتے رہے اور ان کی ہمت افزائی کی وجہ سے یہ رسالہ دن دونی رات چوگنی ترقی کرتا جا رہا ہے۔ اور آپ کی کاوشیں رہیں تو انشاءاللہ یہ رسالہ بچوں کے لیے مفید ثابت ہوگا۔
اس رسالہ میں ہر ماہ کوئی نہ کوئی نئی چیز پڑھنے کو ضرور ملتی ہے۔ یقین جانیے پیام تعلیم میں تمام شایع شدہ مضامین نونہالوں کے لیے مشعل راہ ثابت ہوتے ہیں۔ مگر پھر بھی اس پرچہ میں ایک بات کی کمی ہے وہ ہے قلمی دوستی اور سوال و جواب کا سلسلہ اگر آپ یہ سلسلہ جاری کریں تو بہتر ہوگا کیوں کہ اسی سے بچوں کا دماغی امتحان ہو سکتا ہے۔
ہے
میں جو کچھ ارسال کر رہا ہوں امید ہے۔ اس ناچیز کی ہمت افزائی ضرور کریں گے۔ شاید آپ کے پاس میرے پرانے تخلیقات بھی موجود ہوں گے۔ اور کیا لکھوں کسی قسم کی غلطی ہو معاف کریں۔

عبد المنان منصوری

امید کہ آپ بخیر ہوں گے۔ پیام تعلیم تین عدد موصول ہوئے بہت بہت شکریہ خود اپنے بچپن میں منگوایا کرتا تھا یا اب درس تدریس کے سلسلے سے منسلک ہو کر بچوں کے لیے جاری کرایا۔ پیام تعلیم واقعی احقر کے نظر کے مطابق ایک ایسا رسالہ ہے جس کو ہر مسلمان کے گھر میں جاری ہونا چاہیے اور میری خواہش ہے کہ ہر مدرسہ کی لائبریری میں اس کا فائل ہونا چاہیے یہ رسالہ بڑوں، بچوں سب کے لیے مشعل راہ ہے۔

رفیع الشان ہاشمی

مئی کا پرچہ موصول ہوا۔ جسے پڑھ کر بڑی ہی
خوشی ہوئی سچ مچ سرورق بڑا ہی پیارا ہے۔ اور اندر
تمام کہانیاں اور مضامین بھی نہایت دلچسپ ہیں۔ خاص کر
غلام حیدر صاحب کی کہانی "ہماری پوسی" ریحان احمد
صاحب کی کہانی "شکاری کی بائیں" بہت خوب ہے۔
معلوماتی مضامین میں جناب غلام ربانی صاحب
کا مضمون "دلوں کے نام" جناب اسرار صاحب
ندوی کا مضمون "ایک انقلابی بادشاہ" اور "دنیا
کا سب سے چھوٹا ملک" اور جناب امین صاحب کا
مضمون "پانی کا سوال" نہایت اہم ہے۔ جغرافیہ،
تاریخ اور سائنس پڑھنے والوں کو اس سے بہت
فائدہ ہوگا۔

میں ان تمام لکھنے والوں کا شکریہ ادا کرتا ہوں
اور ان سے آئندہ بھی لکھتے رہنے کی گذارش کروں
گا۔ میرا خیال ہے کہ ابھی پرچے کی کتابت پر خاص توجہ
دینے کی ضرورت ہے۔ کیونکہ ایک جگہ "ادب" کو
"آداب" لکھ دیا گیا ہے۔ اور ہاں کیا دہلی میں بچوں
کا سالانہ امتحان مئی میں ہوتا ہے؟ بہار میں تو اس
زمانے میں ہم سب ششماہی امتحان دیا کرتے ہیں۔

غلام محمد (درجہ ہشتم) پٹنہ

مئی کا پیام تعلیم ملا۔ اور ایک ہی نشست
میں ختم کر ڈالا۔ اس میں سب ہی مضامین اور کہانیاں
اچھی تھیں۔ امین صاحب کا معلوماتی مضمون تو بہت
ہی پسند آیا۔ خدا سے دعا ہے کہ وہ ہر شمارے میں
مضامین لکھتے رہیں۔ اسرار صاحب کا مضمون بھی
اچھا تھا۔

مگر دو کہانیاں باعث حیرت تھیں ایک تھی
خالد رشید کی کہانی "خدا جب دیتا ہے چھپر پھاڑ کر
دیتا ہے" حیرت ہوئی کہ آپ نے اس کو کیسے
چھاپ دیا۔ ابھی کھلونا کے سالنامے میں یہ کہانی
شایع ہوئی ہے اور اسے اردو کے مشہور ادیب
بلشیشر پردیپ نے لکھا ہے۔ مضمون نگار نے اس
کہانی کو لفظ بہ لفظ اتار کر آپ کو روانہ کر دیا۔ اور آپ
نے اس کو ویسے ہی شایع کر دیا۔ اس کے بارے میں
احتیاط رکھیے۔

بچوں کی کوشش کے تحت ایک کہانی "ماجد
کی عقل مندی" کے پیچھے بھی اسی طرح کی ایک کہانی ہے۔
یہ کہانی ہندی "پندرہ روزہ "چمک" کے
۱۹۷۳ء کے شمارے سے ترجمہ کی گئی ہے اور صرف
کرداروں کے نام بدل دیے گئے ہیں۔ فیروز احمد بختیار
نے وہ کہانی اپنے نام سے شایع کرائی اس لڑکے
کے مضامین کے بارے میں میں آپ کو خبردار کرتا
ہوں۔ اس کا ہر مضمون ہندی سے ترجمہ ہوتا ہے۔
اس لیے ذرا سوچ سمجھ کر شایع کیا کریں۔ فیروز نے
کھلونا میں بھی اس طرح کا چکر چلایا ہے۔ جس جگہ
سے وہ لیتا ہے صاف صاف نہیں لکھتا۔ کہانیاں
تو میں نے بھی آپ کو روانہ کی ہیں۔ مگر وہ سب میری
اپنی ہیں۔ آپ نے ان کو شایع کرنے کا وعدہ تو کیا
ہے۔ مگر پتہ نہیں کب چھاپ رہے ہیں۔ آئندہ
شمارے میں کوئی ایک چن کر اچھی سی کہانی شایع
کریں۔ پیام تعلیم کے خریدار میں بڑھانے کی کوشش
کرتا ہوں مگر ہر لڑکا وعدہ کر کے مکر جاتا ہے۔ ایک چھوٹا
سا ڈرامہ بعنوان "برائی کا انجام" روانہ کر رہا ہوں شریک
اشاعت کریں۔

(محمد مبین ایولوی)

بقیہ ہماری پوسی صفحہ ۲۲ سے

بھی لگا۔ بس سے اترنے کے فوراً بعد ہمارا بڑا بچہ رضا گھر میں نہیں گھسا بلکہ سیدھا اس گھر میں گیا جہاں سے وہ پہلی بار اس بلی کو لے کر آیا تھا نہ معلوم کیوں اُسے یقین نہیں آرہا تھا کہ اس کی پوسی کہیں اور جا سکتی ہے۔ اور میں بھی بچوں کی خوشی اور اپنی حیرت کو نباہ نہیں سکتا۔ جب میں نے دیکھا کہ دس منٹ بعد یہ صاحب اپنی بلی کو گود میں دبوچے، پیار کرتے ہوئے چلے آرہے آرہے ہیں۔ شاید یہ ان بچوں کی محبت ہی تھی کہ جو یہ پوسی ہمارے یہاں دوبارہ آنے کے لیے تیار ہوگئی۔

بقیہ چور کیوں بنا صفحہ ۲۴ سے

ایسی حالت میں میرا چور بننا [illegible] ہے؟"

سبھی کے چہرے اتر [illegible] تھے۔ داروغہ نے رک کر کہا —— [illegible] ہے میرے بچے! [illegible] میں تم کو کوئی اچھا [illegible] کا۔ [illegible] قانون اندھی کتاب کا نام ہے وہ کسی بھی بات کو نہیں دیکھو، جرم ثابت ہوجانے کے بعد جیل جانا ہی پڑتا ہے۔"

داروغہ نے رامو کو ہتھکڑی پہنائی اور لے چل دیا۔ گاؤں والوں کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ رامو نے رندھے ہوئے گلے سے ایک [illegible] اور آنسوں بھری آنکھوں سے گاؤں کو دیکھا [illegible]

"خوش رہو اہل وطن ہم تو سفر کرتے ہیں!"

بقیہ لکڑہارا صفحہ ۳۲ سے

[illegible] یہی باقی ہے" یہ کہتے کہتے اس کی سانسیں [illegible] ایک جانب ڈھلک گئی۔

لکڑہارا اس نیک اور بہادر انسان کی موت پر بہت رویا [illegible] اُسے اپنے ہاتھوں سے دفن کیا۔ پھر دوسرے شہر جاکر [illegible] تجارت اونٹوں پر لاد کر واپس اپنے شہر لوٹ آیا۔ اب وہ ایک نامور اور مشہور تاجر بن چکا تھا۔ اس کا ایک [illegible] ساتھ بھی تھا لیکن لکڑہارا اپنے بیتے دنوں کو ہمیشہ یاد کرتے رہتا اور مرتے دم تک وہ اس امیر کی باتوں کو نہیں بھولا۔

★★

اِدھر اُدھر سے

سال کی سب سے اہم خبر

جاپانی خاتون مسز جنکو تبئی کا دُنیا کی سب سے اونچی چوٹی ماؤنٹ ایورسٹ پر قدم رکھنا۔

۱۶ مئی کو ساڑھے ۱۲ بجے دن کو تاریخ میں پہلی بار ماؤنٹ ایورسٹ کو کسی خاتون کی قدم بوسی کا موقع ملا۔

اگرچہ ماؤنٹ ایورسٹ کا غرور ۱۹۵۳ء میں ہندوستان کے شیرپا تین سنگھ نورکے اور نیوزی لینڈ کے ایڈمنڈ ہلاری نے توڑ دیا تھا۔ لیکن کسی خاتون کو یہ اعزاز ۲۲ سال بعد مل سکا۔

اس عرصے میں ۳۵ مردوں نے چوٹی کی سیر کی۔ ان میں ۹ ہندوستانی بھی تھے۔ مگر کسی عورت کا گزر پہلی بار ۱۹۷۵ء میں ہوا۔

اس کامیابی پر ہماری وزیرِاعظم اندرا گاندھی نے مسز تبئی اور ان کی ٹیم کو مبارک باد دی اور اس پر خوشی کا اظہار کیا کہ خواتین کو یہ کامیابی اس سال میں ہوئی جو خواتین کا بین اقوامی سال ہے۔ کامیابی کی خبر جاپان میں بہت خوشی کے ساتھ سنی گئی۔

بندروں کے کارنامے

لندن ۱۷ مئی۔ اگر کسی ریسٹوران میں کوئی بندر آپ کے پاس آکر یہ پوچھے "کیا چاہیے؟" تو آپ کو کیسا لگے گا۔ جی ہاں یہ سچ ہے کہ ہوٹلوں اور ریسٹورانوں میں کچھ "نئی نئی باتوں" میں نیا پن لانے کے لیے مختلف قسم کی باتیں کی جاتی ہیں۔ اسی رجحان کی وجہ سے ریسٹورانوں میں انتہائی حسین و جمیل خواتین کو بطور بیرا (بیربیرا) رکھنے کا رواج پڑا تھا اور اسی رجحان نے ریوڈی جینرو کے ایک ریسٹوران میں بندروں کو بطور بیرا رکھنے کے رواج کو جنم دیا۔ اس ریسٹوران میں اب ہر وقت گاہکوں کی بھیڑ لگی رہتی ہے اور ریسٹوران کے مالک کافی پیسہ کما رہے ہیں۔

اس ریسٹوران کے سب کے سب بیرے بندر ہیں۔ یہ بیرے بندر گاہکوں کے پاس جا کر ان سے کاغذ پر آرڈر لکھواتے ہیں اور بھاگ کر کچن میں چلے جاتے ہیں اور چند منٹ کے اندر اندر مطلوبہ چیزیں لے کر گاہک کے پاس پہنچ جاتے ہیں اب یہ ریسٹوران اچھی اور فوری سروس کے لیے مشہور ہو گیا ہے۔ کیونکہ یہ بندر انسانوں کے مقابلے میں زیادہ تیزی سے کام کرتے ہیں۔

(الجمعیتہ)

•

سوا سال سے بے ہوش

جام نگر ۱۴ مئی: چودہ سال کا ایک بچہ جام نگر

...گزشتہ سوا سال سے بے ہوش پڑا ہے اور بمبئی اور دوسرے شہروں کے اسپتالوں میں اسے ہوش میں لانے کی سب ہی کوششیں ناکام ہوگئیں ہیں۔ پریس ٹرسٹ آف انڈیا نے یہ خبر دیتے ہوئے کہا ہے کہ گن ونت پانڈیا نامی اس لڑکے کا بمبئی کے ای ایم اسپتال میں ۷۳ء میں آپریشن کے دوران وہ بے ہوش کیا گیا تھا اور تب اب تک وہ ہوش میں نہیں آسکا ہے۔

اس بچے کو ۷۰۰ سے زیادہ انجکشن دیے جا چکے ہیں۔ اس وقت یہ بچہ جام نگر کے آیورویدک اسپتال میں زیر علاج ہے۔

(پریس ایشیا)

کالے باپ کا گورا بیٹا

گوہاٹی (آسام) کے چڑیا گھر میں ہمالیائی سیاہ ریچھ کا ایک سفید بچہ لوگوں کی دلچسپی کا مرکز بنا ہوا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ریچھ کے اس جوڑے کے دو بچے ہیں جن میں سے ایک سیاہ ہے اور دوسرا سفید۔ سفید بچہ چڑیا گھر سے آیا گیا ہے۔

....

- تمام بری خصلتوں میں سب سے بری دو خصلتیں ہیں انتہائی بخل، انتہائی بزدلی۔
(حضرت سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم)

- سچی گنہگار، اللہ کے نزدیک بخیل عابد سے بہتر ہے۔
(حضرت سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم)

- کسی کے لیے یہ زیبا نہیں کہ ہاتھ پہ ہاتھ دھرے بیٹھا رہے اور دعا کرے کہ اسے خدا رزق دے۔ آسمان سے سیم و زر کی بارش نہیں ہوا کرتا۔
(حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ)

عزیز احمد مراد آبادی

بچوں کی غزل

خدا پر ہے مرا ایمان کامل
نہیں درکار ہیں مجھ کو دلائل

چلو بڑھتے رہیں ہم سوئے منزل
ہمارا رہ نہ پائے کوئی مشکل

ہماری خواہشیں بے جا ہے قاتل
یہی کرتی ہے پیدا سب مسائل!

تحمل، حوصلہ اور ہوش ہو تو
بھنور سے بھی ابھر سکتا ہے ساحل

رکھو ایمان کی مشعل کو روشن
اندھیرے بُن رہے ہیں کفر و باطل

دعا ہے تجھ سے یہ میری خدایا!
کہ دولت دین کی ہو سب کو حاصل

ہے ناشکری بڑی، دورِ خوشی میں
خدا کی یاد سے ہونا نہ غافل

عزیز غم زدہ مایوس کیوں ہے؟
غموں ہی سے خوشی ہوتی ہے حاصل

بچوں کی کتابیں

مذہب

ارکانِ اسلام	مولانا اسلم جیراجپوری	1/60
آں حضرتؐ	الیاس احمد مجیبی (اردو)	0/80
آں حضرتؐ	الیاس مجیبی (ہندی)	0/60
پاک کہانیاں (دو حصّوں میں)	مقبول احمد سیوہاروی	4/00
چار یار	الیاس احمد مجیبی	2/50
خلفائے اربعہؓ	خواجہ عبدالحیٔ فاروقی	3/00
رسولِ پاکؐ	عبدالواحد سندھی	2/00
عقائدِ اسلام	مولانا اسلم جیراجپوری	0/60
مسلمان بیبیاں	مولانا اعجاز الحق قدوسی	1/00
نبیوں کے قصّے	خواجہ عبدالحیٔ فاروقی	1/50
ہمارے رسولؐ	〃 〃 〃	2/40
ہمارے نبیؐ (اردو)	سید نواب علی رضوی	1/20
ہمارے نبیؐ (ہندی)	سید نواب علی رضوی	0/40
سرکارِ دو عالمؐ	محمد حسین حسان ندوی	4/00

معلومات

آدمی کی کہانی	مشتاق احمد	2/00
انوکھا عجائب خانہ (چار حصّے)	محمد حسین حسان ندوی (چار حصّے)	2/00
بجلی کی کہانی	علی احمد خاں	0/50
پرواز کی کہانی	محمد عبدالغفور	0/80
تاریخِ ہند کی کہانیاں (اوّل)	جستہ سلطان	1/00
〃 〃 〃 (دوم)	ضیاء الرحمٰن	1/20
〃 〃 〃 (سوم)	مشتاق احمد اعظمی	1/00
〃 〃 〃 (چہارم)	〃 〃	1/25
خبر رسانی کے طریقے	رفیعہ منظور الامین	1/00
دنیا کے بچے	محمد حسین حسان ندوی	1/25
دہلی	ڈاکٹر مجاہد حسین زیدی	2/00
رابندر ناتھ ٹیگور	صفدر حسین	3/90
سماجی زندگی (چار حصّے)	احمد پٹیل و غلام ابرار	4/90
قدرت کے کرشمے	(مرتبہ) مکتبہ جامعہ لمیٹڈ	0/80
سمندر کے کنارے	سلطانہ آصف فیضی	1/50
سمندر کے نیچے	〃 〃	2/50
میرانیس	محمد حسین حسان ندوی	1/25
ہماری پارلیمنٹ	کیلاش چندر	1/25

کہانیاں، ڈرامے، ناول

جن حسن عبدالرحمٰن (ناول) دو حصّے		5/00
اس نے کیا کرہ جانا (کہانیاں)	آصف مجیب	0/37
پریم کی جیت (ڈراما)	اسداللہ کاظمی	0/37
تانیل خاں (کہانی)	محمد حسین حسان ندوی	0/50
ترکوں کی کہانیاں (کہانی)	مرتبہ: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ	0/55
تیس مار خاں کے کارنامے (ناول)	م۔ ندیم	1/50
تین اناڑی (ناول)	عصمت چغتائی	(زیر طبع)
چمپاوت کا آدم خور شیر (سچی کہانی)	محمد معین	0/35
چھوٹی لالٹین	مشتاق احمد	0/35
چقماق کی ڈبیا	برکت علی فراق	0/40
خوبصورت شہزادے کا سر بن گیا	کوثر بانو	0/40
شیدا	پروفیسر محمد مجیب	0/50
چنبیلی	محمد حسین حسان ندوی	0/50
ستاروں کی سیر (ناول)	کرشن چندر	2/00
کوے دادا (سچی کہانی)	حبیب احمد خاں	3/00
لال مرغی (کہانی)	عبدالواحد سندھی	0/50
مزہ چکھائیں گے (〃)	مرتبہ: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ	0/35
مزے دار پہیلیاں (مرتبہ)	محمود علی خاں	(زیر طبع)
ننھا ٹٹو (کہانی)	خورشید سلطان	0/40

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵

پیام تعلیم

بچوں کی کتابیں

مذہب

کتاب	مصنف	قیمت
...اسلام	مولانا اسلم جیراجپوری	۱/۶۰
...حضرت	الیاس احمد مجیبی (اردو)	۰/۸۰
...حضرت	الیاس مجیبی (ہندی)	۰/۶۰
...ک کہانیاں (دو حصوں میں)	مقبول احمد سیوہاروی	۳/۰۰
...ار یار	الیاس احمد مجیبی	۲/۵۰
خلفائے اربعہ	خواجہ عبدالحیٔ فاروقی	۳/۰۰
رسول پاک	عبدالواحد سندھی	۲/۰۰
حقائق اسلام	مولانا اسلم جیراجپوری	۰/۶۰
مسلمان بیبیاں	مولانا اعجاز الحق قدوسی	۱/۰۰
نبیوں کے قصے	خواجہ عبدالحیٔ فاروقی	۱/۵۰
ہمارے رسول	” ” ”	۲/۴۰
ہمارے نبی (اردو)	سید نواب علی رضوی	۱/۲۰
ہمارے نبی (ہندی)	سید نواب علی رضوی	۰/۴۰
سرکار دو عالم	محمد حسین حسان ندوی	۳/۰۰

معلومات

کتاب	مصنف	قیمت
...کی کہانی	مشتاق احمد	۲/۰۰
...کا عجائب خانہ (چار حصے)	محمد حسین حسان ندوی (چار حصے)	۲/۰۰
...ل کی کہانی	علی احمد خاں	۰/۵۰
...دادا کی کہانی	محمد عبدالغفور	۰/۸۰
...ہند کی کہانیاں (اوّل)	خجستہ سلطان	۱/۰۰
” ” ” (دوم)	ضیاء الرحمٰن	۱/۲۰
” ” ” (سوم)	مشتاق احمد اعظمی	۱/۰۰
” ” ” (چہارم)	” ” ”	۱/۲۵
...انی کے طریقے	فرخندہ منظور الامین	۱/۰۰
...ے	محمد حسین حسان ندوی	۱/۲۵
	ڈاکٹر عابد حسین زیدی	۲/۰۰

کتاب	مصنف	قیمت
رابندر ناتھ ٹیگور	صفدر حسین	۱/۹۰
سماجی زندگی (چار حصے)	احمد جلیل و غلام حیدر	۲/۹۰
قدرت کے کرشمے	(مرتبہ) مکتبہ جامعہ لمیٹڈ	۰/۸۰
سمندر کے کنارے	سلطانہ آصف فیضی	۱/۵۰
سمندر کے نیچے	” ” ”	۲/۵۰
میرانیس	محمد حسین حسان ندوی	۱/۲۵
ہماری پارلیمنٹ	کیلاش چندر	۱/۲۵

کہانیاں، ڈرامے، ناول

کتاب	مصنف	قیمت
جن حسن عبدالرحمٰن (ناول)، دو حصے		۵/۰۰
اس نے کیا کر دکھایا (کہانیاں)	آصف مجیب	۰/۳۷
پریم کی جیت (ڈراما)	اسداللہ کاظمی	۰/۳۷
نا نبیل خاں (کہانی)	محمد حسین حسان ندوی	۰/۵۰
ترکوں کی کہانیاں (کہانی)	مرتبہ، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ	۰/۵۵
تیس مار خاں کے کارنامے (ناول)	م۔ ندیم	۱/۵۰
تین اناڑی (ناول)	عصمت چغتائی (زیر طبع)	
چمپاوت کا آدم خور شیر (سچی کہانی)	محمد معین	۰/۳۵
چھوٹی لالٹین	مشتاق احمد	۰/۳۵
چقماق کی ڈبیا	برکت علی فراق	۰/۴۰
خربوزہ شہزادے کا سر بن گیا	کوثر بانو	۰/۴۰
شیدلا	پروفیسر محمد مجیب	۰/۵۰
چنبیلی	محمد حسین حسان ندوی	۰/۵۰
ستاروں کی سیر (ناول)	کرشن چندر	۲/۰۰
کورے دادا (سچی کہانی)	مجیب احمد خاں	۲/۰۰
لال مرغی (کہانی)	عبدالواحد سندھی	۰/۵۰
مزہ چکھائیں گے (”)	مرتبہ، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ	۰/۲۵
مزے دار پہیلیاں	(مرتبہ) محمود علی خاں (زیر طبع)	
ننھا ٹٹو (کہانی)	خورشید سلطان	۰/۲۰

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵

ماہنامہ

پیام تعلیم

نئی دلی ۲۵

جلد ۱۲ شمارہ ۷

اڈیٹر

ولی شاہجہانپوری

معاون

صفیہ حسان

جولائی ۱۹۷۵ء

قیمت فی پرچہ ——— ۷۰ پیسے

سالانہ چندہ ——— سات روپے

پرنٹر پبلشر سید احمد ولی نے مکتبہ جامعہ لمیٹڈ کے لیے جمال پرنٹنگ پریس دہلی میں چھپوا کر جامعہ نگر نئی دہلی ۲۵ سے شائع کیا

فہرست مضامین

★

بچت کرنا
کیوں ضروری
ہے
کیونکہ ....
ہماری قومی ترقی کا انحصار ملک کی سالانہ رفتار ترقی پر ہے۔
ملک کی سالانہ ترقی کی رفتار کا انحصار اس بات پر ہے
کہ ہم ترقیاتی پروگراموں میں کتنا سرمایہ لگاتے ہیں۔ اور
سرمایہ کی فراہمی کا انحصار ہماری بچتوں پر ہے۔
اگر ہم اپنی بچتوں کو ملکی معیشت کے ترجیحی شعبوں میں
لگائیں گے تو اس سے ملک کی رفتار ترقی تیز تر ہوگی۔
معیشت کے ترجیحی شعبوں میں تمام سرمایہ سرکار کی
طرف سے لگایا جاتا ہے۔
اس لئے قومی بچتوں کے ذریعے آپ جتنی بھی رقم بچاتے
ہیں وہ مکمل طور پر ملک کی ترقی کے کام آتی ہے۔
یاد رکھئے، قومی بچتوں میں لگائے گئے سرمایہ پر آپ کو خاصا سود ہی نہیں بلکہ
ٹیکسوں میں کافی رعایت بھی ملتی ہے۔ اس کے علاوہ آپ بجا طور پر اس بات پر
فخر کرسکتے ہیں کہ اس طرح آپ ملک کی تعمیر نو اور دفاع میں بھی اپنا پارٹ ادا کریں گے۔
قومی بچتوں میں سرمایہ لگائیے!
نیشنل سیونگز کمشنر
پوسٹ بکس نمبر 96 ، ناگپور

بچّوں سے باتیں

لیجیے، جولائی کا مہینہ پھر آگیا۔ یہ وہی مہینہ ہے پچھلے سال جس کی تیرہ تاریخ کو ہمارے عزیز اور شفیق ساتھی اور آپ کے پیام تعلیم کے کرتا دھرتا محمد حسین حسّان ندوی نے ہم سے ہمیشہ کے لیے منہ موڑا تھا۔

آج ہمیں ان کی یاد بُری طرح تڑپا رہی ہے اور نہ جانے کب تک تڑپاتی رہے گی۔ ان کی دلچسپ باتیں، مزیدار لطیفے، ادبی مباحثے، آج بھی دفتر میں گونجتے معلوم ہوتے ہیں۔

وقت کس تیزی سے گزرتا ہے کہ پتہ ہی نہیں چلتا۔ ۱۹۷۴ء کی بات ابھی کل کی بات معلوم ہوتی ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ مرحوم کل تک ہم میں موجود تھے اور دفتر کی فضا میں یہ سونا پن بالکل نیا نیا آیا ہے۔

جامعہ ہائر سکنڈری اسکول کے ایک طالب علم، انجم قاسمی نے مرحوم حسین حسان صاحب کو اپنے ایک مختصر مضمون میں خراجِ عقیدت پیش کیا ہے اسے آپ اس شمارے میں پڑھ سکتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کی روح پر اپنا فضل کرتا رہے۔ آمین!

مئی کے مہینے میں ہندوستانی سائنس دانوں نے ہندوستان کا پہلا مصنوعی سیارہ "آریہ بھٹ" خلا میں چھوڑ کر بہت بڑا کارنامہ انجام دیا ہے جس کے لیے تمام دنیا نے ہندوستان کو مبارک باد اور سائنس دانوں کو خراجِ تحسین پیش کیا۔

ہم نے یہ اہم خبر آپ کو بر وقت نہیں دی۔ اپنے کئی احباب سے فرمائش کی تھی کہ "آریہ بھٹ" پر مضمون لکھیں۔ سوچا تھا کہ یہ مضمون جون کے پیامِ تعلیم میں شایع کر سکیں گے۔ لیکن ایسا نہ ہو سکا۔ لوگ چھٹیوں میں اپنے اپنے وطن چلے گئے۔ ان کی واپسی کا انتظار ہی کر رہے تھے کہ پیامِ تعلیم کے ایک پرانے سرپرست نے غیر متوقع طور پر یہ مضمون بھیج دیا۔ یہ ہیں جناب اسرار ناروی، جو پیامِ تعلیم کی ہر طرح مدد کرتے رہتے ہیں۔ قلمی بھی اور مالی بھی۔ یعنی ہر دوسرے تیسرے مہینے دو ایک خریدار بھی مہیا کرتے رہتے ہیں۔ مفید مشوروں سے بھی نوازتے رہتے ہیں۔ کاش پیامِ تعلیم کو کچھ اور ایسے مخلص سرپرست مل سکیں۔

"فنکار کی باتیں" کی تیسری قسط آپ کو ضرور پسند آئے گی۔ جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں، اس کی [illegible]

قسط آپ کو پہلے سے زیادہ پر لطف معلوم ہوگی۔

خواجہ معین الدین صاحب حیدر آباد کنے طویل خاموشی کے بعد کرم فرمایا ہے اور "سورج" جیسا معلوماتی مضمون ارسال کیا ہے۔

مفتون کوٹلوی صاحب کی کہانی "ایک بادشاہ ایک فقیر" بھی آپ کو پسند آئے گی۔ اگست کے لیے آپ نے بہت اچھی نظم ارسال کی ہے۔

فرحت قمر صاحب کا مضمون "بھارت کی تیز رفتار ریلیں" آپ کی معلومات میں اضافہ کرے گا۔

نظموں میں شوکت پردیسی، رشید اختر خان عارف صاحبان کی نظمیں خاص طور پر پڑھنے کے قابل ہیں۔ عارف صاحب پاکستان سے کرم فرماتے رہتے ہیں۔ امید کہ یہ سلسلہ جاری رہے گا۔ ان کے علاوہ بھی نظمیں اور کہانیاں آپ کو پسند آئیں گی۔ ہم آپ کی رائے کا انتظار کریں گے۔

ہمارے بہت ہی بزرگ اور دیرینہ کرم فرما جناب غلام ربانی نے ازراہ کرم بہت عمدہ معلوماتی مضمون "زمین کی رفتار" عنایت فرمایا ہے۔ اس کے لیے ہم تہہ دل سے شکر گذار ہیں۔ یہ شہ پارہ آپ اگلے شمارے میں پڑھیں گے۔

محمد شفیع الدین نیر صاحب کی نظم "استاد صاحب" بچوں کے لیے ہی نہیں، بڑوں کے لیے بھی وقت کی چیز ہے۔ آج کل طالب علموں میں جو بے راہ روی آگئی ہے اس کا ذمہ دار بعض لوگ اساتذہ کو بھی ٹھہراتے ہیں۔ نیر صاحب نے استاد کی جو تصویر کھینچی ہے۔ اگر ہمارے اساتذہ ایسے ہو جائیں تو بڑی حد تک بچوں کی صحیح تربیت ہو سکے گی۔

ڈاکٹر کبیر احمد جائسی کے عنایت کی ہوئی کہانی آپ مئی کے پیام تعلیم میں پڑھ چکے ہیں۔ اگلے شمارے کے لیے آپ نے فارسی کی ایک دلچسپ کہانی کا ترجمہ عنایت کیا ہے "وفادار باز" موصوف نے وعدہ کیا ہے کہ وہ پیام تعلیم کی قلمی معاونت جاری رکھیں گے۔

بہت دنوں سے ہم نے پیامیوں کو ان کا ایک فرض نہیں یاد دلایا۔ وہ ہے پیام تعلیم کے خریدار بنانا۔ آج کی صحبت میں ہمیں پھر ایک بار یہ کہنا ہے کہ اگر آپ رسالے کو اس سے زیادہ مفید اور دلچسپ دیکھنا چاہتے ہیں تو اس کے خریدار پیدا کیجیے۔ اگر ہر پیامی ایک خریدار بھی بنالے تو ہمارے حوصلے بلند ہوں گے۔ اور ہم پرچے کو اور اچھا بنا سکیں گے۔

پتہ صاف اور خوشخط لکھیں۔
رقم سالانہ چندہ بذریعہ منی آرڈر روانہ کریں۔

جناب شوکت پردیسی

ڈھول کے پول

یہ ہیں بھیّا ڈھول کے پول

①

باتیں ایسی کرتے ہیں!!
گویا فکر سے مرتے ہیں
لیکن کام سے ڈرتے ہیں
وقت پہ ہو جاتے ہیں گول
یہ ہیں بھیّا ڈھول کے پول

②

دن بھر سوتا ہے محبوب
وقت کو کھوتا ہے محبوب
رسوا ہوتا ہے محبوب
اپنی ڈفلی، اپنے بول
یہ ہیں بھیّا ڈھول کے پول

③

علم و ادب میں کامل ہیں
لیکن اتنے کاہل ہیں
اپنے لیے اک مشکل ہیں
باتیں آدھی، باقی جھول
یہ ہیں بھیّا ڈھول کے پول

④

مستقبل کا پاس نہیں
کچھ بھی انہیں احساس نہیں
شوق بر آئے آس نہیں
ہر جذبہ ہے ڈانواں ڈول
یہ ہیں بھیّا ڈھول کے پول

⑤

ان سے جو بھی پیار کرے
اپنے کو بے کار کرے
جینا بھی دشوار کرے
راحت ہو جائے انمول
یہ ہیں بھیّا ڈھول کے پول

جناب انجم قاسمی (جامعہ ہائر سیکنڈری)

تیرہ جولائی

۱۳- جولائی پیام تعلیم کے مدیر جناب حسین حسان
مرحوم کا یوم وصال ہے۔ جامعہ کی تاریخ میں یہ دن ایک
ایسے دل خراش صدمے کی یاد دلاتا ہے۔ جب جامعہ برادری
بے شمار مصائب کا شکار ہو کر راہ و منزل کے تذبذب میں الجھ کر
رہ گئی تھی۔ لیکن ہر چند یہ ایک وقتی پریشانی تھی پھر بھی
دلوں پر اس کا اثر بڑا شدید تھا۔

یہ حالت ہو گئی محفل ساقی کے نہ ہونے سے
کہ خم کے خم بھرے ہیں اور میخانہ خالی ہے

موصوف بچوں کے ہی نہیں بڑوں کے بھی محبوب
صحافی تھے اور ایسے راہنما صحافی کی موت قیامت صغریٰ
سے کم نہیں ہوتی۔ جیسا کہ عربی کے مقولے میں ہے۔

موت العالِم موت العالَم

تیرہ جولائی کے دن نے ملک کے طول و عرض میں
صف ماتم بچھا دی تھی اس صدمہ جانکاہ پر پوری قوم
کی آنکھیں بھیگ گئی تھیں۔ لیکن قادر مطلق کا حکم۔
"موت سے مفر نہیں" اپنی جگہ مسلم ہے۔

جب ہم اپنے ماضی پر غور و پرداخت کرتے ہیں
اور موصوف علیہ الرحمتہ کی ذات گرامی کا جائزہ لیتے ہیں
تو یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہو کر سامنے آتی ہے
کہ موصوف کے پاس کوئی مادی طاقت نہیں تھی بلکہ
ان کی ذہنی صلاحیتوں اور فہم و فراست نے انھیں صحافت
کی صنف میں ممتاز کر دیا تھا۔ یہ امتیاز ناقصوں میں
ہی نہیں کاملوں میں تھا۔ ذٰلک فضل اللہ

پیام تعلیم جو مختلف مراحل سے گزرتا رہا اور ا
میں یہ جامعہ کے تعلیمی احوال و کوائف کے لیے جاری ک
گیا تھا۔ حضرت موصوف کی مساعی سے بچوں کا پرچہ بن گیا
جو بچوں کے لیے رہتی دنیا تک ناقابل فراموش ادب
تحفہ ہو گا اور رہین منت بھی۔ بقول حضرت موصوف کے
"میں نے اس کو آہستہ آہستہ بچوں کا پرچہ بنا دیا"
ہم اپنے جلیل القدر صحافی سے بے پناہ عقیدت و محبت
رکھتے ہیں جنھوں نے ہمیشہ بچوں کے ذہن کو اسلا
سانچے میں ڈھالنے کی سعی کی۔

۱۳- جولائی ہر چند ان کی موت کا دن ہے ——
—— لیکن ان کی موت نے جس ورا
کو ہمیں سونپا ہے اس کی حفاظت ہم سب کا فرض
اولین ہے اس دن سے ہمیں یہی اہم سبق ملتا
اس پر عمل کر کے "پیام تعلیم" کو ترقی دینا ہم سب
کا فرض ہونا چاہیے۔

★

جناب اسرار ندوی

آریہ بھٹ

ہندوں کا مصنوعی سیّارہ

"چچاجان، یہ مصنوعی سیارہ کیا ہوتا ہے؟"

"وہی تو بتانے جارہا ہوں: تارے تو آپ نے دیکھے ہیں؟ یہ دو طرح کے ہوتے ہیں۔ ایک وہ جو اپنی جگہ پر جمے رہتے ہیں۔ دوسرے وہ جو کسی سیارے کے گرد چکر لگاتے رہتے ہیں۔ جیسے زمین سورج کے گرد گھومتی رہتی ہے۔ جیسے چاند زمین کے گرد چکر لگاتا رہتا ہے۔ لیکن زمین، چاند وغیرہ تو بھئی اللہ میاں کے بنائے ہوئے سیارے ہیں۔ اسی طرح کے سیارے مختلف ملک کے سائنس دانوں نے بھی بنائے ہیں اور خلا٭ میں پہنچائے ہیں جو کسی نہ کسی سیارے کے گرد گھوم رہے ہیں —— اسی کو مصنوعی سیارہ یا اسپتنک کہتے ہیں۔ سب سے پہلا اسپتنک ہے۔ اکتوبر ۱۹۵۷ء کو روس نے خلا میں پہنچایا تھا۔ اسی قسم کا ایک مصنوعی سیارہ "آرٹ بھٹ" ہے اسے ہندوستان نے تیار کیا ہے۔ ۱۹ اپریل ۱۹۷۵ء کو ہندوستانی وقت سے دن کے ایک بجے، روس کے ایک خلائی اسٹیشن سے، روسی راکٹ پر سوار کرکے خلا میں پہنچا یا گیا اور جناب وہاں پہنچنے کے چند منٹ بعد ہی زمین کے گرد ایک بیضوی مدار (انڈے کی شکل کا راستہ) میں چکر لگانے لگا۔ اس کا زمین سے زیادہ سے زیادہ فاصلہ ۶۳۲ کیلومیٹر اور کم سے کم فاصلہ ۵۶۴ کیلومیٹر ہے۔"

تب تو چچا جان، ہمارے ملک نے سائنس اور ٹکنالوجی میں بڑی ترقی کی ہے۔ ابھی پچھلے ۱۸ مئی (۱۹۷۴ء) کو پوکھران (راجستھان) میں اپنے ایٹم بم کا کامیاب تجربہ کیا اور اب خلائی سائنس میں بھی ترقی یافتہ ملکوں کے ہم پلّہ ہوگیا۔"

"بے شک، بے شک، تب ہی تو ہماری ترقیاں بعض بڑے ملکوں کو کھل رہی ہیں۔"

"اچھا چچاجان، ایٹمی سائنس میں ہمارا ملک کس نمبر پر ہے؟"

"چھٹے نمبر پر۔ روس، امریکا، فرانس، انگلینڈ، چین کے بعد ہمارے ہی ملک کا نمبر ہے۔"

٭ زمین کے اوپر دو سو میل تک ہوا ہے۔ اس کو کرۂ ہوا کہتے ہیں۔ اس کے بعد ہوا نہیں ہے۔ اسی کو خلا یعنی ہوا سے خالی جگہ کہتے ہیں۔ خلا میں کوئی جاندار نہیں رہ سکتا ہے۔ نہ آگ سلگ سکتی ہے، نہ آواز پھیل سکتی ہے نہ آپ کی گیند اچھل سکتی ہے۔ اسی لیے زیادہ تر مصنوعی سیارے بغیر آدمی کے بھیجے گئے ہیں۔ ان میں بس مشینیں لگی ہوئی ہیں

"اور خلائی سائنس میں؟"

"ترقی یافتہ (ترقی پایا ہوا) ملکوں میں ہندوستان گیارہویں نمبر پر آتا ہے۔ اور ترقی پذیر (ترقی کرتے ہوئے) ملکوں میں چین کے بعد دوسرے نمبر پر ہے۔ وہ ملک جنہوں نے اپنے یا دوسرے ملک کے راکٹ کے ذریعے اپنا مصنوعی سیارہ خلا میں بھیجا ہے، یہ ہیں: روس، امریکا، مغربی جرمنی، فرانس۔ برطانیہ، آسٹریلیا، کناڈا، جاپان۔ اٹلی اور چین۔"

"چچا جان "آریہ بھٹ" کس جگہ تیار ہوا اور کن سائنس دانوں نے تیار کیا؟"

"بھئی ہم جہاں تک جانتے ہیں۔ یہ سیارہ بنگلور کے نزدیک پینیا خلائی ریسرچ سنٹر میں تیار کیا گیا ہے یہ ہندوستان کی خلائی تحقیق کرنے والی ٹیم اور روسی ماہروں کی ملی جلی کوششوں کا نتیجہ ہے اس ٹیم کے لوگوں کے نام تو ہمیں بھی نہیں معلوم ہیں۔ لیکن اس کے چیرمین پروفیسر ستیش دھون ہیں اور خلائی پروجیکٹ کے ڈائرکٹر ڈاکٹر یو۔ آر۔ راؤ ہیں۔ یہ دونوں اور ہمارے دوسرے خلائی سائنس داں، ہندوستان کے اس تاریخی اور شاندار کارنامے کو اپنی آنکھوں سے دیکھنے کے لیے روسی خلائی اسٹیشن پر موجود تھے۔"

"چچا جان، آریہ بھٹ کو خلا میں پہنچانے کے لیے روس لے جانے کی کیا ضرورت پڑی؟"

"ہاں اس کی ضرورت یوں پڑی کہ اس بھاری بھرکم سیارے کو مدار میں پہنچانے کے لیے ہمارے ہاں ابھی راکٹ تیار نہیں ہوئے ہیں ——— ۲۹ ہزار کلو میٹر فی گھنٹہ مصنوعی سیارے کی رفتار ہونی چاہیے۔ اب ظاہر ہے کہ اس کو ٹھیلنے کے لیے ایک طاقت ور راکٹ کی ضرورت تھی اور آپ جانتے ہیں۔ اس رفتار کی بڑی اہمیت ہے۔ اگر اس کی رفتار ۲۹ ہزار کیلو میٹر فی گھنٹہ سے کم ہوگی تو سیارہ زمین پر آگرے گا اور اگر رفتار اس سے بڑھ جائے گی تو سیارہ ہمیشہ کے لیے لاپتہ ہو جائے گا۔ رفتار ٹھیک ہی ہونے پر سیارہ گول یا بیضوی راستہ اپنا بنا لیتا ہے اور اسی راستے پر گردش کرتا رہتا ہے۔ 'آریہ بھٹ' بیضوی مدار میں زمین کے گرد چکر لگا رہا ہے اور خبریں بھیج رہا ہے۔"

"چچا جان، مصنوعی سیارے کو زمین اپنی طرف کھینچتی نہیں ہے؟"

"کیوں نہیں، ضرور کھینچتی ہے۔ لیکن کشش کی قوت کا مقابلہ ایک اور قوت کرتی ہے۔ جسے گریز قوت یا باہر کی طرف دھکیلنے والی قوت کہیے۔ یہ قوت سیارے کو باہر کی طرف دھکیلتی رہتی ہے جس طرح موٹر سے سفر کرنے والا گاڑی کے تیزی سے موڑ لینے پر ایک دھکے کے ساتھ دوسری طرف جا پڑتا ہے۔"

"چچا جان، ان سیاروں کا سائز کیا ہوتا ہے؟"

"بیٹے، ان کا سائز کوئی مخصوص نہیں۔ باسکٹ بال کے سائز سے لے کر اس کاٹیج تک (خلائی پلیٹ فارم سمجھیے)، بے شمار سیارے مختلف سائز کے خلا میں پہنچائے جا چکے ہیں۔ پہلا اسپتنک باسکٹ بال سے کچھ بڑا تھا۔ اس کے مقابلے میں ہمارا آریہ بھٹ دیو ہے۔ اس کا وزن ۳۶۰ کیلو گرام ہے اور اس کی لمبائی ایک سرے سے دوسرے سرے تک ۱۲۶ میٹر ہے۔ یہ ۹۶ منٹ ۴۱ سکنڈ میں زمین کا ایک چکر کر لیتا ہے۔ ان سیاروں کی عمریں بھی الگ الگ ہوتی ہیں۔ اسپتنک ۱ ۹۲ دن ۲ [illegible]

"دین گارڈ نمبر ۱"۔ ابتک کا سب سے بوڑھا خلائی سائنس
ہے ۔ ابھی چند سو برسوں تک چلے گا۔ آریہ بھٹ کی عمر
چھ ماہ مقرر کی گئی ہے ۔"

"چچا جان ، ان سیاروں کی تیاری میں تو سائنس
دانوں کو دن رات ایک کرنا پڑتا ہوگا اور روپے
بھی بے اندازہ لگتے ہوں گے پھر ان سے فائدہ
کیا ہے ؟"

"بالکل ٹھیک ، مجھے انتظار تھا اور امید تھی
کہ آپ یہ سوال ضرور کریں گے۔ بیٹے ، ان سیاروں
سے ایسی ایسی پتے کی بات معلوم کی جا رہی ہے جو کسی
اور ذریعے سے ممکن نہ تھا۔ جیسے ٹیلی ویژن براڈ
کاسٹ ، موسم کی پیشین گوئی ، معدنی خزانوں کی دریافت ،
فوجی جاسوسی وغیرہ۔ اس قسم کے بڑے فائدہ مند
کام یہ سیارے انجام دے رہیں ۔ پاکستان میں تانبے
کے ذخیرے اور خلیج بنگال میں ابھرتے ہوئے نئے
جزیرے کا پتہ ابھی حال میں امریکی مصنوعی سیارے
نے دیا تھا۔ کئی سمندری طوفانوں کی آمد سے بہت
پہلے مصنوعی سیاروں نے اس کی خبر دی ہے سنہ ۱۹۶۳ء میں
میں کیوبا میں روسی میزائلوں (دور دور تک نشانے
پر بم پھینکنے والی مشین) کی موجودگی کی خبر امریکی جاسوس
مصنوعی سیارے کے ہی دی تھی ۔"

"تب تو چچا جان ، یہ سیارے بڑے چغلخور ہوتے
ہیں ۔ لیکن چچا جان ۔ یہ سمجھ میں نہیں آیا کہ سیارے
خبریں بھیجتے کیسے کرہیں ۔"

"شاباش ، بڑی خوبصورتی سے آپ نے یک سوال
اور جڑ دیا۔ بھئی ان کی خبریں بھیجنے کا طریقہ بھی نرالا ہے آپ
کسی ڈاک گھر کے تار آفس کی طرف گئے ہیں۔ وہاں ٹک ٹک
اور ٹکوٹرا کی بے معنی آوازوں کے سوا کچھ اور آپ کے
پلے پڑتا ہے ؟ لیکن اس کو سن کر تار بابو لکھتے ہیں مجید
پاس ہو گیا۔ اسی طرح مصنوعی سیارے اپنی خفیہ زبان میں
سگنل (اشارے) دیتے ہیں۔ یہ سگنل ٹیلی میٹری اسٹیشن
وصول کرتے ہیں اور اسے ٹیپ کر کے یعنی ان آوازوں کا
ریکارڈ بنا کر خلائی تحقیق کے مرکز کو بھیج دیتے ہیں۔ وہاں ماہرین
کی ٹیم اس سے معنی مطلب نکالتی ہے۔ ہندوستان کا
ٹیلی میٹری کا اسٹیشن سری ہری کوٹ میں ہے۔ مدراس سے
اتر کی طرف ۔ ایک سو کیلومیٹر کے فاصلے پر کیلے کی شکل کا
ایک چھوٹا سا جزیرہ ہے اور خلائی تحقیق کا مرکز تو آپ
جانتے ہی ہیں بنگلور کے پاس ایک مقام پینیا میں ہے"

"چچا جان ، بس ایک بات اور بتا دیجیے اس مصنوعی
سیارے کا نام "آریہ بھٹ" کیوں رکھا گیا ؟"

"پانچویں اور چھٹی صدی عیسوی میں آریہ بھٹ
ایک بڑے ماہر فلکیات (چاند تاروں کا علم رکھنے
والے) گذرے ہیں۔ انہیں کے نام پر یہ نام رکھا گیا ہے۔
انھوں نے ۲۳ برس کی عمر میں پہلی کتاب "آریہ بھٹیہ" لکھی تھی جو
بہت مشہور ہوئی ۔ وہ کسم پورا میں ، جو پاٹلی پتر کا ایک محلہ تھا ۔
۴۷۶ء میں پیدا ہوئے تھے ۔ پاٹلی پتر کا موجودہ نام عظیم آباد پٹنہ
(بہار) ہے کہتے ہیں آریہ بھٹ کو سورج کے گرد گھومنے کا احساس تھا
کہ اس زمانے میں سورج کو زمین کے گرد گھومتا ہوا مانا
جاتا تھا۔ آریہ بھٹ نے زمین اور چاند کے قطر کی پیمائش
کا بھی حساب لگایا تھا ۔"

"چچا جان ، آپ نے ابھی فرمایا کہ آریہ بھٹ کی عمر
چھ ماہ ہے تو چھ ہی ماہ کیوں ؟

"بھئی بات یہ ہے کہ اس کو گردش میں رکھنے والی
گیس چھ ماہ بعد ختم ہو جائے گی ۔ اس میں ٹانیئے نیسم

جناب خان عارف داؤدزئی (کراچی)

نانِ جنّت نشاں

کھیرا نہیں ہوں میں
ککڑی نہیں ہوں میں
مولی نہیں ہوں میں
پھر کون ہوں بھلا ؟
کچھ تو ملے پتا

ہلدی نہیں ہوں میں
دھنیا نہیں ہوں میں
ہانڈی نہیں ہوں میں
چولھا نہیں ہوں میں
میں کون ہوں بھلا ؟
کچھ تو ملے سرا

ڈوری نہیں ہوں میں
رسّی نہیں ہوں میں
چمٹا نہیں ہوں میں
پھکنی نہیں ہوں میں
میں کون ہوں بھلا ؟
کچھ تو ملے پتا

میں گول گول ہوں
گرتی[1] کھٹول ہوں
پہیہ نہ خول ہوں
میدے کا رول ہوں
میں کون ہوں بھلا ؟
کچھ تو ملے سرا

چھان نہیں ہوں میں
بورا نہیں ہوں میں
گنتی ہوں میں بھلی
طاقت تمہیں ملی
آٹے سے ہوں بنی
ہوں آگ میں سنکی
چنگیر[2] میں سجی
بھاجی کے ساتھ ہوں
میں کون ہوں بھلا ؟
کچھ تو ملے پتا

---

[1] دُدھ دہی ملا پیئی روٹیاں، گلاں سو جیبں موٹیاں (پنجابی)   [2] ڈلیا میں ہوں سبھی (بعض علاقوں کی زبان کے مطابق)

جناب عادل کہلگانوی

اِحسَانُ

یہ روز کا معمول ہو چکا تھا کہ میں جس روز بھی آفس جانے کے لیے بس اسٹینڈ پہنچتا وہ ہاتھ بڑھا کر پان کی گلوری دے دیتا اور میں منہ میں پان ڈالے بس کی طرف بڑھ جاتا۔ میں نے کئی بار کترا کر نکل جانے کی کوشش بھی کی تھی مگر اُس کی منّت سماجت دیکھ کر میں مجبور تھا۔

یہ آج سے تین سال پہلے کی بات ہے۔ جب روی اور ششی دونوں بھائی اسٹیشن کے پلیٹ فارم پر مونگ پھلی بیچا کرتے تھے۔ میں اکثر ان سے مونگ پھلی خریدا کرتا اور گھر کے بچوں کو دے جا کر دیتا۔ اس طرح میں اُن دونوں بھائیوں کے بہت قریب آچکا تھا اور ان کی زندگی کے تاریک پہلو سے بھی مانوس ہو چکا تھا۔ مجھے معلوم ہوا کہ ان کے ماں باپ بہت پہلے انتقال کر چکے تھے اور وہ ریفیوجی تھے۔ مونگ پھلی بیچ کر جو پیسے انہیں حاصل ہوتے اسی سے دونوں شام کو روکھی پھیکی روٹی زہر مار کر لیا کرتے تھے۔

ایک روز کی بات ہے۔ اسٹیشن کے انکوائری کاونٹر[1] کے پاس لوگوں کی بھیڑ بھاڑ دیکھی۔ جا کر دیکھا تو معلوم ہوا کہ روی نے ایک شخص کا روپیہ اڑایا ہے۔ اور وہ شخص دُور کے رشتے میں اُن کا چچا ہوتا تھا۔ میں وہاں سے چلا تو سارے راستہ روی کی بات ہی یاد کرتا رہا کیا وہ دراصل اُچکّا تھا......؟

دوسرے دن جب روی سے ملاقات ہوئی تو میں اُس سے پوچھ ہی بیٹھا۔ ”کل تمھارے چچا تم پر کس لیے بگڑ رہے تھے؟“

”بات دراصل یہ تھی“ اس نے کہنا شروع کیا۔ ”کہ میں نے پیٹ کاٹ کاٹ کر آٹھ روپے بچا کر ان کے پاس رکھ چھوڑے تھے۔ کل جب میں نے ان سے روپیہ مانگا کہ ششی کے لیے ایک ریڈی میڈ شرٹ خریدوں گا تو انھوں نے اُلٹے مجھ ہی پر روپیہ چرانے کا الزام لگایا اور بیسیوں آدمی کے سامنے میری عزّت پر کیچڑ اچھال دی۔“

حالات سن کر میں نے ایک ٹھنڈی سانس لی۔ اور میں کر بھی کیا سکتا تھا۔ پھر کچھ سوچ کر میں بول پڑا۔

”روی ــــ!“

”جی ــــ فرمائیے!“

”یہ مونگ پھلی کب تک بیچتے پھروگے۔ وقت

---

[1] معلومات کی کھڑکی۔

کی قدر و قیمت کو پہچانو۔ بہتر تو یہ ہوگا کہ تم ایک چھوٹی
سی پان کی دکان ہی کر ڈالو۔ اچھا خاصہ روزگار کر لوگے
اور ڈھنگ کی زندگی بسر کر سکوگے۔ زندگی گھٹ گھٹ
کے جیسے جانے کا نام نہیں روی۔"

"آپ کا کہنا تو بجا ہے۔ مگر دوکان کے لیے تو رقم
چاہیے اور میرے پاس روپیہ ہے کہاں؟"

"یہ کام پندرہ روپوں سے بھی شروع کیا جا سکتا ہے
اور یہ کوئی بڑی رقم بھی نہیں۔ اس کے لیے تمہیں سوچنا
نہیں پڑے گا۔"

روی راضی ہوگیا

دوسرے ہی دن دونوں بھائی میرے کہنے کے مطابق
بکر چلے گئے۔ اتوار کا دن تھا۔ میں نے ان لوگوں کا ہر طرح
کا انتظام کر دیا۔ روی نے پان لگایا اور پہلی گلوری مجھ ہی
کو دی اور اسی تاریخ سے یہ روز کا معمول تھا کہ وہ مجھے
جب بھی دیکھ لیتا، پان کی گلوری مجھے مل جاتی۔

اس طرح دن گذرتے گئے۔ ان دونوں کی دکان
کافی چل نکلی۔ اب پان کے علاوہ مختلف قسم کے سگریٹ،
بیڑی۔ دیاسلائی اور دیگر اشیاء بھی فروخت ہونے لگیں
انہیں دیکھ دیکھ کر میں بہت خوش ہوتا۔

اچانک پچھلے دنوں میں نمونیہ کا شکار ہوگیا۔
میرے پاس جو کچھ رقم تھی تھوڑے دنوں میں پوری کی
ڈاکٹر کی فیس اور دواؤں کی قیمت کی نذر ہو چکی۔ لیکن
مرض بڑھتا رہا اور میری بیوی کی پریشانی بھی۔

اور جس دن ریکھا نے مجھے بتایا کہ آج کسی نہ کسی
صورت سے کچھ روپے کا انتظام بہت ضروری ہے تو
میرے حواس گم ہوگئے۔ مگر میری بیوی بڑی ہوشیار لڑکی
ثابت ہوئی ہے اس لیے میں نے مری ہوئی آواز میں کہا۔

"ریکھا، کسی طرح تم ہی یہ کام سنبھالو۔ میں اس
حالت میں کر ہی کیا سکتا ہوں؟"

اور ڈاکٹر آتا رہا۔ انجکشن لگتے رہے۔ اور
ایک روز میں چنگا بھی ہوگیا۔ ڈاکٹر نے اس دن کہا
اب مجھے دوا کی ضرورت نہیں رہی۔ البتہ ایک اچھی سی
ٹانک کے استعمال سے کمزوری بھی جاتی رہی گی۔

ایک روز طبیعت ذرا ٹھیک تھی۔ میں نے ریکھا
سے پوچھا۔

"آخر تم نے اتنے سارے روپوں کا انتظام کس
طرح کر لیا۔ یہ تو تم نے آج تک مجھے بتایا نہیں!!"

وہ بولی ــــ روی نے ایک سو روپے مجھے
دیئے تھے۔ لیکن اس نے مجھ سے قسم لے لی تھی کہ
میں آپ کے چنگا نہ ہونے تک یہ راز ظاہر نہ
ہونے دوں۔

کچھ دن اور گذر جانے کے بعد جب مجھ میں ذرا چلنے
پھرنے کی سکت پیدا ہوگئی تو سوچا چلو روی کا شکریہ ادا
کر آیا جائے جس نے عین مصیبت میں میری زبردست
مدد کی تھی۔

دکان کے سامنے آیا تو جیسے مجھے سانپ سونگھ
گیا ہو دکان میں روی کی جگہ ایک چالیس سالہ کالا
کلوٹا سا آدمی پان کے پتے پر چونا پھیلا رہا تھا۔ میں
نے اس سے پوچھا۔

"میں تو تم کو پہچانتا نہیں، مگر اس دکان میں روی
نام کا جو چھوکرا رہتا تھا، وہ کہاں ہے؟"

"ہاں بابوجی" اس نے جواب دیا۔ "وہی خود
یہ دکان میرے پاس فروخت کر کے جانے کہاں چلا گیا۔"

★★

از: خواجہ سید معین الدین (حیدرآباد)

سورج — ایک عجوبہ

ایک پرانی روسی کہانی میں ایک فلاسفر کا ذکر ہے۔ لوگ اُسے بہت بڑا عقلمند مانتے تھے "اپنی گتھیاں سلجھانے کے لیے دُور، دُور سے اس کے پاس آتے تھے اور اس کے مشوروں پر عمل کرنا اپنا فرض سمجھتے تھے۔ اس نے ایک دفعہ اپنے ملک کے کئی اور عقلمندوں کی ایک مجلس طلب کی اور ان کے سامنے یہ سوال رکھا۔" بتاؤ سورج اور چاند ان دونوں میں کون زیادہ اہم ہے اور کون زیادہ قابلِ قدر ہے؟"

فلاسفر نے کہا۔" چاند بہت اہم ہے، کیوں کہ وہ رات کی تاریکی میں چمکتا ہے اور اندھیرے کو دُور کرکے روشنی پھیلاتا ہے۔ سورج دِن کے اجالے میں چمکتا ہے اور روشنی دیتا ہے۔ اندھیرے کو دُور کرکے روشنی پھیلانا زیادہ اہم ہے۔" لیکن اس عقلمند نے یہ نہیں دیکھا کہ چاندنی چار دِن کی ہوتی ہے اور باقی تمام راتیں اندھیری ہوتی ہیں۔ اگر ان دنوں میں وہ بیچارہ ہوتا اور آپ کے سامنے ایسی باتیں کرتا تو آپ اسے پاگل سمجھ کر پتھروں سے اس کی آؤ بھگت کرتے۔

مگر سوچنے کی بات ہے کہ انسان اس سورج کو تقریباً تین لاکھ سال سے دیکھتا آرہا ہے پھر بھی آج تک اُسے پوری طرح سمجھ نہ سکا۔ آج بھی وہ ایک عجوبہ بنا ہوا ہے۔ انسان کو اس کے کچھ راز معلوم ہو سکے اور بہت کچھ معلوم ہونے ہیں۔ وہ برابر ان کی کھوج میں لگا ہوا ہے

بڑی مجبوری تو یہ ہے کہ سورج بہت دُور ہے۔ اس کے قریب تک پہنچنا بھی ممکن نہیں کیوں کہ وہ ایک دہکتا ہوا کرہ ہے۔ وہاں پہنچنے سے پہلے انسان جھلس کر کباب بن جائے۔ اس کو ٹکٹکی باندھ کر دیکھا بھی نہیں جاسکتا ورنہ بینائی سے ہاتھ دھونا پڑے۔ اس سے نکلنے والی روشنی کے بغیر کوئی چیز دیکھی بھی نہیں جاسکتی وہ کیسی ہے؟ کوئی نہیں بتا سکتا۔ کیا ہم اسے سفید کہہ سکیں گے؟ مگر سفید تو دودھ اور چونے کا رنگ ہوتا ہے؛ کیا اسے سیاہ کہہ سکیں گے؟ لیکن سیاہ رنگ کوتے اور کوئلے کا ہوتا ہے۔ کیا اسے زرد، سرخ اور سبز کہہ سکیں گے؟ مگر یہ رنگ تو پھولوں اور پتیوں کے ہوتے ہیں۔ آج سے تقریباً تین سو سال پہلے نیوٹن نامی ایک سائنس داں نے کہا تھا کہ وہ سات رنگوں سے مل کر بنی ہے۔ عجیب بات ہے کہ اس کے اندر سات رنگ چھپے ہوتے ہیں اس کے باوجود اس کا کوئی غالب رنگ نہیں۔ اسے بے رنگ کہنے کی بھی گنجائش نہیں۔ وہ ہمیں ہر طرف سے گھیرے ہوئے ہے۔ ہماری زندگی کا سب سے اہم جزو ہے پھر بھی وہ جیسے گزرتی ہے دکھائی نہیں دیتی۔ سورج خواہ سامنے ہو یا بادلوں کے پیچھے چھپا رہے روشنی تو ہمیں ضرور ملتی رہتی ہے اس کا آسمان میں موجود رہنا کافی ہے ورنہ گھپ اندھیرا چھا جاتا ہے۔

سبھی جانتے ہیں کہ سورج بادلوں کے پیچھے چھپا رہنے

پھریکی میں روشنی ملتی ہے۔ البتہ اِس حقیقت کو سمجھنا مشکل ہے کہ ایک شعلے سے جو روشنی نکلتی ہے اس کا منبع بھی یہی سورج ہے۔ روشنی کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ ایک توانائی ہے۔ رُوے زمین پر جو بھی توانائی صرف ہو رہی ہے وہ سورج ہی سے نکلتی ہے۔ اب شعلے کے تعلق سے کہا جاتا ہے کہ یہ توانائی آج سے بیس لاکھ سال پہلے اکٹھی تھی۔ بڑے بڑے درخت اپنی پرورش کے لیے اِسی سورج سے توانائی پاتے رہے۔ جب زمین کے مختلف طبقے کسی وجہ سے تہ و بالا ہوئے تو وہ درخت یا یوں کہیے کہ وہ توانائی چٹانوں اور مٹی کے تودوں کے نیچے دب گئی۔ وہی توانائی آج سطحِ زمین پر ایندھن (کوئلہ اور تیل) کی شکل میں لائی جا رہی ہے۔ اس طرح سورج کی توانائی کا یہ مختصر حصہ روے زمین پر اولین انسان کی آمد سے دس لاکھ سال پہلے آگ یا شعلے کی صورت میں موجود تھا۔

آگ بہت اہم ہے وہ انسان کی خدمت کے لیے سورج کی کم ترین دین ہے۔ دن اور رات کی گردش، موسموں کا چکر، غذاؤں کی تیاری، بارش اور ہواؤں کے رُخ کی تبدیلی، مختصر یہ کہ ہماری ساری زندگی سورج ہی کی رہینِ منت ہے۔ انسان اسے مسلسل دیکھتا آ رہا ہے اور تعجب میں ہے۔ اس کے کئی راز وہ معلوم کر چکا ہے۔ ابھی کئی راز معلوم کرنے ہیں۔

سورج کی اِس اہمیت نے انسان کو اس کی طرف اور زیادہ متوجہ کیا۔ اس نے دیکھا کہ سورج کا دہکتا ہوا یہ گولا ہر روز آسمان میں لڑھکتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ اُدھر جو اجالے اور اندھیرے کو اپنے قابو میں لیے ہوئے ہے۔ اس کی زندگی کے لیے ناگزیر ہے تو اس کی سوچ اور فکر نے ایک نیا موڑ اختیار کیا۔ اس نے دیکھا کہ سورج آسمان میں کبھی زیادہ دیر ٹھہرتا ہے تو کبھی اپنا قیام مختصر کر دیتا ہے۔ جب زیادہ دیر تک ٹھہرتا ہے تو دن لمبے ہوتے ہیں اور موسم گرم ہوتا ہے۔ اناج، غلّہ، پھل پھول پک جاتے ہیں اور کھانے کو خوب ملتا ہے۔ اس لیے انسان اِن دنوں کافی بحال رہتا ہے۔ اور جب اس کا قیام مختصر ہوتا ہے تو دن چھوٹے ہوتے ہیں۔ غذا کی کمی محسوس ہوتی ہے اور وہ سردی سے اکڑنے لگتا ہے تب اسے ایک ڈر سا لگا کہ یہ مختصر قیام گھٹتے گھٹتے کہیں ایسا نہ ہو جائے کہ کسی دن طلوع ہونا ہی بند نہ کر دے یا نظروں سے اوجھل رہے تو اس کے لیے بس موت ہی موت ہے۔ یہ بھیانک تصوّر اس کی جان کھانے لگا۔ اس لیے اس اولین انسان نے سوچا کہ سورج کو اپنے روزانہ معمول پر قائم رکھنے کے لیے اور اپنے راستے پر اسے چلتا بنانے کے لیے کیوں نہ اس کی چاپلوسی اور منت سماجت کی جائے۔ کیوں نہ اس کے سامنے نذر و نیاز اور قربانیاں پیش کرکے اس سے رحم و کرم کی بھیک مانگی جائے۔ جو چیز اس کی سمجھ سے بالاتر تھی اور اس کی عقل کی پہنچ سے پرے تھی مذہب اور عقیدے کا رنگ اختیار کر گئی۔ چنانچہ اس نے سورج کی پوجا شروع کر دی اور اسے خدا مان لیا۔

دُنیا کے تقریباً تمام مذاہب نے خدا مانا اور ایک یا ایک سے زیادہ سورج دیوتاؤں کو اپنے عقیدوں میں جگہ دی۔ چنانچہ قدیم مصریوں نے "را" نامی خداؤں کو سب سے طاقت ور مانا، آج بھی اہرام مصر کی دیواروں پر سورج دیوتاؤں کی تصویریں موجود ہیں۔ سورج دیوتاؤں کو قد میں اونچا اور جسم کے اعتبار سے پتلا دبلا بتایا گیا ہے۔ اس کو انسان کا دھڑ اور پرندے

ر نگا کر دکھایا گیا ہے۔ اور اس کے اطراف سورج کے
حلقے یا ہالے بنائے گئے ہیں اور ساتھ ہی اس کے اطراف
سانپ بھی دکھائے گئے ہیں۔
جنوبی امریکہ کے باشندوں نے سورج کو اپنا خدائے ثانی
مانا، ان کا سب سے طاقتور خدا یا خدائے اوّل "ویراکوچا"
تھا، ویراکوچا نے سورج دیوتا کو بنایا تھا۔ ایشیائے کوچک
کی "ہی ٹس" قبیلوں نے یہاں تک شاعری کر دی کہ سورج
دیوتا کو عورت دیوتا (دیوی) ماننے لگے اور اسے "کھے پٹ"
نام دیا۔ اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ دیوی دیوتاؤں کی شادیاں
بھی کرا دیں۔ چنانچہ کھے پٹ کی شادی موسموں کے دیوتا۔
"تے شپ" سے ہوئی تھی۔
ان تمام مذاہب میں سورج دیوتا کی تصویریں کسی
نہ کسی طرح انسان سے ملتی جلتی ہیں۔ جب دیوتا انسان نما
ہوں تو ان کی ضروریات بھی انسان جیسی ہونا لازمی تھا چنانچہ
سورج دیوتا کے رہنے سہنے کے لیے زمین پر مکانات تیار
ہوئے جنھیں مندر یا دیول کہا جا سکتا ہے۔ آج بھی مصر
میں "ہوانیس" پر سورج دیوتاؤں کے لیے بنائی گئی بڑی
بڑی دیولوں کے کھنڈر پڑے ہوئے ہیں (باقی آئندہ)

- باپ کا کوئی عطیہ بیٹے کے لیے اس سے بہتر نہیں
کہ اس کی تعلیم و تربیت میں انتہائی کوشش کر کے
اسے پاکیزہ اخلاق سے آراستہ کرے۔
(حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم)

- درماندہ اور پریشان حال بیواؤں اور یتیموں اور
غریبوں کی دستگیری کرنے والوں کی مثال اس شخص کی
سی ہے جو خدا کی راہ میں جہاد کرتا، دن بھر روزہ رکھتا
اور رات کو عبادت کرتا ہے (حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم)
(بشیر الدین نیر کوٹی)

محترمہ یاسمین بیگم

برسات

ہر سو مچا یہ شور ہے، برسات آگئی
ابر اور گھٹا کا زور ہے، برسات آگئی
اُف کتنا دلفریب ہے جنگل ہرا بھرا
کیا محو رقص مور ہے، برسات آگئی
یہ اور بات ہے کہ جلی جگنوؤں کی جوت
شب کا اندھیرا گھور ہے، برسات آگئی
بجلی کے ساتھ کالی گھٹا کی پتنگ میں
جل کی بندھی ہی ڈور ہے، برسات آگئی
سیلاب کے ہے تخت پہ جل دیوتا کا راج
نہ کوئی اور چھور ہے، برسات آگئی
نکلے ہیں گھر سے گھومنے بھینی پھوار میں
اور مست پور پور ہے، برسات آگئی
ڈھونڈے ہے رات چاند کو دن آفتاب کو
بادل فلک کا چور ہے، برسات آگئی
فطرت کے یہ تمام نظارے ہیں ہر طرف
ٹلوا یا ہل کی اور ہے، برسات آگئی

جناب مفتوں کوٹوی

ایک بادشاہ ایک فقیر

اکبر شاہ ثانی ۔ سلطنت مغلیہ کے اُن آخری دو بادشاہوں میں سے ہیں جن کے بعد مغلیہ سلطنت ہمیشہ کے لیے ختم ہوگئی یعنی اکبر شاہ ثانی کے بعد بہادر شاہ ظفر تخت نشیں ہوئے اور انھیں کے ساتھ خاندانِ تیموریہ کی بادشاہت کا خاتمہ ہوگیا۔

بادشاہ ، انگریزوں کے وظیفہ خوار تھے ، کمپنی بہادر کا زور روز بروز بڑھتا جا رہا تھا۔ دہلی اگرچہ اُجڑ گئی تھی پھر بھی ارباب کمال سے خالی نہیں ہوئی تھی۔ علماء شعرا مثلاً شاہ عبدالعزیز، مولانا فضل، امام خیر آبادی علما میں سے اور سید محمد میر اثر، حکیم قدرت اللہ قاسم، حضرت نصیر الدین نصیر اور میر نظام الدین ممنون، شعراء میں سے دہلی کی رونق بڑھاتے ہوئے تھے۔

ادھر قلعہ میں اور قلعہ والوں میں شاہی طور طریق اور شاہانہ رکھ رکھاؤ ، چلے آرہے تھے۔ اکبر شاہ ثانی کی غربت نوازی جہاں عروج پر تھی وہاں ان کی شاہانہ فیاضی بھی اپنے پورے شباب پر تھی ۔ بڑھاپے میں خیر خیرات کی طرف زیادہ متوجہ تھے۔ ایک دن تخت رواں پر سوار حضرت سلطان جی کی درگاہ میں فاتحہ خوانی کے لیے گئے ایک درویش صورت شخص نے بادشاہ سلامت کو دیکھتے ہی السلام علیکم کہا۔ بادشاہ نے خندہ پیشانی سے سلام کا جواب دیا مصافحہ کے لیے ہاتھ بڑھایا۔ بادشاہ نے بھی ہاتھ بڑھایا۔ اتنے میں تخت رواں جنتی کوچہ میں داخل ہوا۔ ہمراہی آگے پیچھے تھے درویش بادشاہ کا ہاتھ ہاتھ میں لیے چلتا رہا اور بادشاہ کی انگلی میں سے ہیرے کی انگوٹھی اتارنے کی کوشش کرتا رہا بادشاہ نے ہاتھ ڈھیلا کر دیا۔ لیکن چھنگلی میں سے انگوٹھی اتری نہیں ، چھنگلی میں درد ہونے لگا تو بادشاہ نے ہاتھ کھینچ لیا۔ فاتحہ خوانی کے بعد جب بادشاہ قلعہ میں واپس لوٹ آئے تو ناظر کو حکم دیا کہ ہزار روپے لے کر فوراً سلطان جی جاؤ۔ وہاں اس شکل و صورت کا درویش ملے گا۔ اسے یہ روپیہ دے آؤ۔ بادشاہ کے حکم کی تعمیل میں ناظر ایک ہزار روپے لے کر پہنچا لیکن وہ فقیر وہاں سے جا چکا تھا۔ ناظر کو نہیں ملا۔ اس نے واپس آکر بادشاہ سے کہا کہ درویش کا پتہ نہ لگا۔ بادشاہ نے افسوس ظاہر کیا کہ اس کی قسمت میں نہ انگشتری تھی نہ یہ ایک ہزار روپیہ۔

جناب فرحت قمر

بھارت کی تیز رفتار ریلیں

بچو! ریل گاڑی تو آپ کی بھی چلتی ہوگی۔ میرا مطلب اس ریل گاڑی سے ہے جب آپ ایک کے پیچھے ایک کھڑے ہوکر، ایک دوسرے کی قمیص کا دامن پکڑکر چلاتے ہو۔ چھک چھک، چھک چھک! آپ کی اس ریل کی رفتار ہوتی ہوگی ۴۔ ۵ کلو میٹر فی گھنٹہ اور آج کی ترقی یافتہ دنیا میں ریل کی رفتار ہو چکی ہے ۲۰۰ کلو میٹر فی گھنٹہ سے بھی زیادہ نہیں مایوس ہونے کی بات نہیں۔ دُنیا میں سب سے پہلی ریل جو لندن سے چلی تھی بس آپ کی ریل سے تھوڑا ہی تیز چلی تھی۔

ہر چیز کی ابتداء ایسی ہی معمولی ہوتی ہے نا —— دنیا کی پہلی ریل کی رفتار تو بس ۱۴ کلو میٹر فی گھنٹہ تھی۔ آپ میں سے تیز دوڑنے والا کوئی بچہ اس کے ساتھ ساتھ بھاگ سکتا تھا۔ لیکن اس وقت کی دنیا کے لیے بھاپ کی طاقت سے لوہے کی بنی بھاری بھرکم ریل کا چلنا ہی عجیب بات تھی۔ ہزاروں لوگ اپنا کام چھوڑکر دنیا کی پہلی ریل چلنے کا تماشہ دیکھنے کے لیے سارے راستے پر اکھٹے ہو گئے تھے۔

آج آپ لوگ جانتے ہی ہیں کہ سو دو سو کلو میٹر کا سفر ریل کے ذریعہ معمولی سی بات ہے۔ لیکن خیال کیجیے ۱۶ اپریل ۱۸۵۳ء سے پہلے کا جب بھارت میں کوئی ریل نہیں چلتی تھی۔ اس وقت ۱۰۰ کلو میٹر کا سفر بھی لوگوں کے لیے ایک بہت ہی بڑی بات تھی۔ بیل گاڑیوں کے ذریعہ تو یہ سفر پانچ دن کا ہوتا تھا اور گھوڑے پر بھی تین دن سے کیا کم لگتے ہوں گے۔

بھارت میں پہلی ریل بمبئی میں بوری بندر سے تھانہ اسٹیشن تک ۱۶ اپریل ۱۸۵۳ء کو پہلی بار چلائی گئی۔ یہ کوئی معمولی واقعہ نہیں تھا۔ انگریز گورنر کا سارا عملہ اور تقریباً تمام سرکاری افسران اس موقع پر موجود تھے۔ دوپہر ڈھل چکی تھی ساڑھے تین بجے کا وقت تھا کہ ریل کے چلنے کی تمام تیاریاں مکمل ہو چکی تھیں۔ ساڑھے تین بجے گورنر کا بینڈ بجنا شروع ہوا اور ۲۱ توپوں کی سلامی کے ساتھ ریل دھیرے دھیرے چھک چھک کرتی چل پڑی۔ لوگوں نے اس کامیابی پر اپنی خوشی کا اظہار بڑے زوردار طریقہ سے کیا۔ بھارت کی یہ پہلی ریل بھاپ کے انجن سے چلی تھی اور اس کا انجن، اس کے ڈبے، اس کی پٹڑیاں وغیرہ سب سامان انگلینڈ سے بن کر آیا تھا۔

کسی چیز یا کسی کام کی ابتداء کرنا دراصل مشکل ہوتا ہے۔ اس کے بعد تو دھیرے دھیرے اس میں ترقی ہوتی ہی جاتی ہے۔ یہی بھارت میں ریلوں کے معاملے میں ہوا۔ ۱۸۵۳ء یعنی بھارت میں ریلوے سسٹم کی ابتداء کے سال ہی انگریز بمبئی، مدراس اور کلکتہ میں

تو اپنے قدم اچھی طرح جما چکے تھے لیکن دہلی یعنی بھارت کی راجدھانی پر ان کا قبضہ پانچ سال بعد ۱۸۵۷ء میں ہوا۔ اس کے بعد بھارت میں انگریز سرکار باقاعدہ طور پر کام کرنے لگی اور دھیرے دھیرے ریل کی پٹری سارے ملک کے مختلف حصوں میں بچھنے لگیں۔

انیسویں صدی میں بھارت میں ریلوں میں ترقی کی رفتار بہت ہی سست تھی۔ کیونکہ انگریزوں کو تو بس اپنا کام چلانے بھر کے لیے ضرورت تھی۔ دوسری طرف ان کا مقصد پیسہ کمانا تھا۔ مختلف ریلوے لائنوں پر مختلف کمپنیاں ریلیں چلایا کرتی تھیں۔ یہی کمپنیاں ریلیں چلانے کا سارا خرچہ برداشت کرتیں اور یہی کمپنیاں ریلوں سے ہونے والا نفع حاصل کرتیں۔ یہ بیسویں صدی میں ہی ہوا کہ ہندوستان کے بڑے بڑے شہر ریلوں کے ذریعے ایک دوسرے سے جڑ گئے اور ملک بھر میں ۱۷۹ ریلوے تنظیمیں ریلوں کو چلانے میں لگ گئیں۔

جب ۱۹۴۷ء میں بھارت آزاد ہوا تب بھی اس دیش کی ریلوں کو ۴۲ کمپنیاں چلاتی تھیں۔ آزاد بھارت کو جو ریلوے سسٹم ملا اس میں اس وقت بہت سے مسئلے اور بہت سی مشکلیں موجود تھیں۔ دوسری جنگِ عظیم کی وجہ سے پیسہ کی کمی تھی اور پچھلے بیس سالوں سے ریلوں کی ترقی پر کوئی خاص توجہ نہیں دی گئی تھی۔ بھارت اور پاکستان کے الگ ہو جانے سے بھی ریلوے سسٹم کو زبردست دھکا لگا تھا۔ آزاد بھارت کی سرکار کے سامنے ریلوے سسٹم کو سنبھالنے سدھارنے کا مسئلہ تھا۔ کیونکہ دیش کی سماجی اور صنعتی ترقی کے لیے ریلوں کا اچھا ہونا بہت ضروری ہوتا ہے۔ اس کے لیے بھارت سرکار نے پہلا قدم جو اٹھایا وہ تھا پرائیویٹ ریلوے کمپنیوں کو ختم کر کے سارے دیش کی ریلوں کو نیشنلائز کرنا۔ یعنی اب سارے دیش کا ریلوے سسٹم سرکار کے قبضہ میں آ گیا۔ سارے دیش کو ۷ بڑی ریلویز میں بانٹ دیا گیا اور ان کی ترقی کے لیے پہلے تین پانچسالہ منصوبوں میں ۲۲۰۰ کروڑ روپے خرچ کیا گیا۔ چوتھے منصوبہ میں بھی ریلوں کی ترقی کے لیے دو ہزار کروڑ روپیہ کی عظیم رقم خرچ کی گئی۔ آج بھارت کا ریلوے سسٹم سارے ایشیا میں سب سے بڑی سرکاری تنظیم ہے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ بھارت کی ریلوں کی یہ تیز اور شاندار ترقی آزادی ملنے کے بعد ہی ہوئی۔

انسان اپنی ترقی سے کبھی مطمئن نہیں ہوتا اور یہی وجہ ہے کہ وہ برابر ترقی کرتا جاتا ہے۔ ریلوں کے معاملہ میں بھارت کے مطمئن ہو جانے کا سوال ہی نہیں کیونکہ ابھی تو بہت کچھ کرنا باقی ہے۔ ریلوں کے پھیلاؤ اور زیادہ تعداد کے ساتھ ساتھ تیز رفتار کی طرف توجہ دینا بھی ضروری ہوتا ہے۔ کیونکہ آج کل زندگی کی رفتار خود تیز ہو گئی ہے۔ ہر شخص جلد سے جلد اپنی منزل تک پہنچنا چاہتا ہے۔ بھارت سرکار نے ریلوں کی رفتار بڑھانے پر بھی توجہ دی ہے۔

چند سال پہلے ایک ریل گاڑی دہلی سے ہاوڑہ تک چلائی گئی تھی۔ اس کا نام ہے "راجدھانی ایکسپریس"۔ ۱۲۰ کلومیٹر فی گھنٹہ کی رفتار سے چلنے والی یہ ریل بھارت کی سب سے تیز ریل تھی۔ اب تو اس کی رفتار میں دس کلومیٹر فی گھنٹہ کی رفتار کا اور بھی اضافہ ہو گیا ہے۔ یعنی اس کی رفتار ہو گئی ہے اب ۱۳۰ کلومیٹر فی گھنٹہ۔ دہلی سے ہاوڑہ تک کا تقریباً ڈیڑھ ہزار کلومیٹر کا سفر راجدھانی ایکسپریس، ۱۷ گھنٹے سے بھی کم وقت میں ختم کر لیتی ہے اور پھر گاڑی بھی کیسی شاندار؟ سارے ڈبے ایئرکنڈیشنڈ

ہوتے ہیں جو بھارت کی ریل ڈبے بنانے والی انٹیگرل کوچ فیکٹری کے بنائے ہوئے بہترین ڈبے ہیں۔ گدّے دار بستر، آگے پیچھے ہو جانے والی صوفہ جیسی آرام دہ سیٹیں جن میں ایک چھوٹی سی فولڈنگ میز بھی جڑی ہوتی ہے۔ ٹکٹ کے پیسوں میں کھانا اور ناشتہ بھی شامل ہوتا ہے۔ بڑی بڑی کھڑکیوں میں شیشے لگے ہوتے ہیں۔ اور پردے بھی۔ ذرا پردہ ہٹائیے اور بڑے سے شیشے سے باہر کا نظارہ دیکھیے۔ دکھائی دینے والی ہر چیز پیچھے کی طرف تیزی سے بھاگتی نظر آتی ہے اور تیز رفتاری کی وجہ سے ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے ریل اڑ رہی ہو۔ اور پھر کمال یہ کہ باہر کی دھول اندر بالکل نہیں آتی۔ شور بھی بہت کم محسوس ہوتا ہے۔ تاش کھیلنے، اخبار رسالے پڑھنے، باتیں کرنے کے لیے بیٹھنے کے لیے ایک الگ کمپارٹمنٹ لگا ہے۔ غرضکہ سفر میں گھر کا سا آرام مل جاتا ہے۔ دراصل "راجدھانی ایکسپریس" بھارت میں ریلوں کے سفر میں ایک نئے زمانہ کی ابتدا ہے۔ ایک ایسا زمانہ جب ریلوں کا سفر بہت تیز اور آرام دہ ہوگا۔ راجدھانی ایکسپریس اس سلسلہ کا پہلا کامیاب تجربہ ہے۔ اور سارے بھارت میں یہ ریل گاڑی اپنی طرح کی انوکھی ریل گاڑی ہے۔

راجدھانی ایکسپریس کے بعد دہلی سے آگرہ تک چلنے والی تاج ایکسپریس کا نمبر آتا ہے۔ حالانکہ یہ فاصلہ تھوڑا ہے مگر رفتار کے حساب سے تاج ایکسپریس، راجدھانی ایکسپریس، کے بعد ہی آتا ہے۔ اس کی رفتار ۱۱۰ کلومیٹر فی گھنٹہ تک ہے اور اپنی اس تیز رفتاری کی وجہ سے ہی یہ صبح سویرے دہلی سے چلنے والوں کو بھارت کی سب سے خوبصورت عمارت تاج محل دکھا کر شام تک آگرہ سے واپس لے آتی ہے۔

تاج ایکسپریس کے بعد تیز رفتار گاڑیوں میں بہت سی ریلیں شامل ہیں۔ ان میں سے کچھ پچاس سال سے بھی زیادہ پرانی ہیں اور کچھ کی عمر پانچ سال کی بھی نہیں ان تیز رفتار گاڑیوں کی رفتار ۱۰۰ کلومیٹر تک ہے۔ ان گاڑیوں میں شامل ہیں۔ کالکا میل۔ کالکا سے ہاوڑہ تک، فرنٹیئر میل۔ پٹھانکوٹ سے بمبئی تک، دہرہ دون ایکسپریس۔ بمبئی سے دہرہ دون تک، دکن کوئین، بمبئی سے پونہ تک، جینتی جنتا۔ دہلی سے منگلور تک، دکن ایکسپریس۔ دہلی سے سکندر آباد اور مدراس تک، بلیک ڈائمنڈ ایکسپریس۔ ہاوڑہ سے دھنباد تک اور بمبئی مدراس ایکسپریس!

ابھی بیس سال پہلے تک زیادہ تر ریلیں بھاپ کے انجنوں سے چلتی تھیں۔ بھاپ کے انجن کو چلانے کے لیے کوئلہ کی ضرورت ہوتی ہے۔ اور کالے کلوٹے کوئلہ کے بارے میں تو آپ جانتے ہی ہیں کہ یہ آدمی کا حلیہ ایسا بنا دیتا ہے کہ شاید آپ ڈیوٹی ختم کرنے کے بعد ڈرائیور اور فائرمین کو پہچان بھی نہ سکیں اور بھوت سمجھ کر ڈر جائیں۔ کوئلہ کی اس دقت کو ختم کرنے کے لیے بھارت کی تیز رفتار ریلوں میں ڈیزل انجن استعمال کیے گئے۔ یہ انجن تو بھارت میں بنتے ہیں۔ لیکن تیل چونکہ بھارت میں زیادہ تر باہر سے آتا ہے اس لیے ڈیزل کے انجنوں کے لیے تیل کی بھی کمی ہو سکتی ہے اس لیے اب بجلی سے چلنے والی ریلوں کی طرف بھی دھیان دیا جا رہا ہے۔

بجلی کی ریل بھارت میں پہلی بار ۱۹۲۵ء میں بمبئی میں مقامی طور پر چلائی گئی تھی آج بمبئی سے پونہ تک، مدراس سے وجے واڑہ تک، کلکتہ سے ٹونڈلہ تک اور بمبئی سے بھساول تک بجلی کی تیز رفتار ریلیں چلتی ہیں

کلکتہ سے دہلی تک کا ۸۰ فی صدی راستہ بجلی کی ریل چلانے
کے لائق ہے دو سال میں باقی ۲۰ فی صدی راستہ بھی
پورا ہو جانے کی امید ہے۔ اس طرح ۱۹۸۲ء تک دہلی
سے بمبئی تک بھی بجلی کی ریلیں چلانے کا پلان ہے۔

بجلی کی ریلیں تیز رفتار، صاف ستھری اور دھوئیں
کے بغیر ہوتی ہیں۔ لیکن بجلی کی سپلائی کم ہو جانے کی صورت
میں ان ریلوں کو ٹھیک طریقہ سے چلایا نہیں جاتا۔ اس
کے لیے اب ریلوے بورڈ مختلف جگہوں پر اپنے بجلی گھر
بنانے کی سوچ رہا ہے۔ جاپان، فرانس، اٹلی،
مغربی جرمنی اور برطانیہ میں بجلی کی ریلیں بہت ترقی یافتہ
ہیں۔ وہاں تو اب ریلوں کو چلانے کے لیے ایٹمی طاقت
استعمال کرنے کے بھی تجربے ہو رہے ہیں۔ برطانیہ زمین
کے اندر اندر چلنے والی ریلوں کے لیے مشہور ہے اور
جاپان کی ریلوں کا تو کوئی جواب ہی نہیں۔ وہاں تو
ریلیں مقناطیسی لہروں کے ذریعہ زمین کے اوپر بھی
چلائی جاتی ہیں۔ توکیو ریلویز جاپان کی ریلیں ۲۱۰ کلو
میٹر فی گھنٹہ سے بھی زیادہ رفتار سے چلتی ہیں۔ لیکن
ان ملکوں کی ریلوں کی ترقی کی تاریخ کافی پرانی ہے۔
آپ کو ابھی پہلے معلوم ہوا تھا کہ بھارت میں ریلوں کی
واقعی ترقی تو بس آزادی کے بعد ہی ہوئی تھی۔ پھر بھی
ہمارے ریلوے سسٹم کا درجہ سرکاری ریلوں کے نظام میں
ایشیا میں پہلا اور ساری دنیا میں دوسرا ہے۔ ریل
سے متعلق ہر چیز اب بھارت میں خوب بنتی ہے۔

بمبئی، مدراس، دہلی، کلکتہ کے درمیان
ایئرکنڈیشنڈ ڈی لکس ریلیں بھی چلتی ہیں۔ ۷۰ کے قریب
ریلیں ایک ہزار کلومیٹر سے زیادہ کا فاصلہ طے کرتی ہیں۔
اور ۱۲ ریلیں دو ہزار کلومیٹر تک دوڑتی ہیں۔ بھارت
ایک بڑا دیش ہے۔ جس میں شمال سے جنوب
تک ۳۲۰۰ کلومیٹر اور مشرق سے مغرب تک ۲،۳۵ کلو
میٹر کا فاصلہ ہے۔ بھارت کی کل ریلوے لائنوں کا
مجموعی فاصلہ ۹۲ ہزار کلومیٹر ہے جس پر پچھلے سات ہزار
سے زیادہ اسٹیشنوں سے دن رات میں دس ہزار ریلیں
مسافروں اور سامان کو منزل تک پہنچانے کے لیے
چلتی ہیں۔ بھارتی ریلوں کو چلانے کا کام واقعی بہت
بڑا ہے۔ تقریباً ۱۴ لاکھ آدمی اس بڑے کام کو کامیابی
کے ساتھ چلانے کے لیے دن رات محنت کرتے ہیں۔
اور سرکار کو ۸۰ کروڑ سالانہ کا منافع دیتے ہیں۔

بھارت کی ریلوں میں سفر کرنے کے لیے اسکول و
کالج میں پڑھنے والے بچوں کو رعایتی ٹکٹ ملتا ہے۔
چھٹیوں میں گھومنے کے لیے بھی مختلف مقامات کے لیے
رعایتی ٹکٹ ملتے ہیں اور ایسا بھی ٹکٹ ملتا ہے جس
کو لے کر آپ پورے ہندوستان میں اپنی مرضی سے
چاہے جہاں اور چاہے جب سفر کر سکتے ہیں۔ اگر ایسا
ٹکٹ آپ کے پاس ہو تو آپ کالکا سے شملہ تک اور
سلی گوری سے دارجیلنگ تک ٹیڑھے میڑھے پہاڑی
راستوں پر بل کھاتی چلتی ریلوں کا بھی مزا لے سکتے ہیں۔
ان پہاڑی ریلوں کی رفتار تو سست ہوتی ہے۔ مگر ان
میں بیٹھ کر قدرت کی خوبصورتی دیکھنے کا لطف واقعی
بہت بڑی چیز ہے۔

تو کبھی اب کی چھٹیوں میں بھارت کی ریلوں میں
گھومو گے نا؟

(بشکریہ آل انڈیا ریڈیو)

جناب ریحان احمد عباسی

شکار کی باتیں

تیسری قسط

میرے اردلی نے مجھے صبح چھ بجے سے پہلے ہی جگادیا تھا۔ لیکن اُٹھتے اٹھاتے اور تیار ہوتے ہواتے ایک گھنٹہ لگ ہی گیا۔ بیما کو ساتھ لے کر جب میں جنگل کی طرف چلا تو سات بج رہے تھے۔ ہمارے دلوں میں اس وقت یہی خیال پیدا ہو رہا تھا کہ جلدی سے جلدی جاکر یہ دیکھا جائے کہ رات ان دونوں پڑوؤں پر کیا بیتی جنھیں ہم شیروں کے لیے بطور چارہ باندھ آئے تھے۔ ہمارا بیما شکاری گنگا ہم سے پندرہ منٹ پہلے ہی یعنی پونے سات بجے اسی مقصد سے جنگل کی طرف روانہ ہو چکا تھا۔ جب ہم نالے سے گزر رہے تھے تو ہمیں نیل گایوں کا ایک غول نظر آیا۔ شمار کرنے پر معلوم ہوا کہ وہ تعداد میں نو ہیں۔ ایک نر نیل یا پانچ مادہ نیل گائے اور تین بچے۔ ویسے تو جب ہم نے انھیں دیکھا تو وہ ایک کھلی جگہ پر ہم سے کوئی سو گز کے فاصلے پر کھڑے تھے لیکن اگر وہ اور زیادہ قریب ہوتے تب بھی اس وقت ان کے شکار کا کوئی سوال نہ اٹھتا تھا ہمیں اُن کی اچھل کود اور اٹھکھیلیوں کا انداز اتنا دلکش لگا کہ ہم چپ چاپ وہیں بیٹھ گئے اور کافی دیر تک اُن کا تماشہ دیکھتے رہے۔ پانی وہاں سے قریب ہی تھا۔ وہ ایک ایک دو دو کی تعداد میں گئے اور پھر واپس آگئے۔ کچھ دیر بعد شاید انھیں ہماری بو مل گئی اور وہ سب کے سب کان کھڑے کر کے شک کی نگاہوں سے ہماری طرف دیکھنے لگے۔ ان کا شک جلد ہی یقین میں بدل گیا اور وہ وہاں سے بھاگ کھڑے ہوئے۔ ان کے بھاگنے کا منظر اتنا پیارا تھا کہ طبیعت خوش ہو گئی۔ وہ جب وہاں سے بھاگے ہیں تو سب سے آگے ایک بڑی نیل گائے تھی جو غالباً عمر میں بھی دوسروں سے زیادہ ہی رہی ہو گی۔ اس کے بعد کوئی بیس گز کا فاصلہ دے کر یکے بعد دیگرے تین مادہ نیل گائے اور ان کے تینوں بچے۔ اس کے بعد پھر ۱۵ گز کا فاصلہ رکھ کر نر نیل۔ نر نیل کے چلے جانے کے باوجود آخری مادہ نیل گائے کچھ دیر وہاں رُکی اور اس نے دیکھا کسی قسم کا کوئی خطرہ نہیں ہے، تو وہ بھی اپنے ساتھیوں کے پیچھے اسی طرف دوڑ گئی۔ نیل گایوں نے فوجیوں کی طرح یہ صف بندی اس لیے کی تھی تاکہ خطرہ درپیش ہونے پر نر نیل اور بچوں کی مناسب حفاظت ہو سکے اور اگر کوئی برا وقت آئے بھی تو ایک آدھ مادہ نیل گائے تک ہی محدود رہے، اور نر نیل اور ان کے بچوں پر کوئی آنچ نہ آئے جن کی وجہ سے آئندہ نسل چلنے کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔ نر نیل بڑا ہی خوبصورت اور تندرست پٹھا تھا۔ اس کے سینگ بارہ انچ سے کم

ملے نہ ہوں گے۔ تینوں بچے شکل و صورت میں ایک جیسے تھے۔ اُن کی عمریں بھی تین ماہ کے لگ بھگ رہی ہوں گی۔

نیل گایوں کے اس قدرتی تماشے سے لطف اندوز ہوکر جب ہم نالے میں آگے کی طرف بڑھے تو وہاں سے کچھ فاصلہ جہاں نالے کا پاٹ ۵۰ گز چوڑا ہوگیا تھا اور جہاں خشک ریت کی موٹی تہہ جمی ہوئی تھی ہمیں ایک بڑے جوان شیر کے پیروں کے نشان دکھائی دیے۔ یہ علاقہ اس جگہ کے بہت قریب تھا جہاں ہم نے پہلا پڈا باندھا تھا۔ شیر کے پیروں کے نشان بھی اسی سمت جا رہے تھے اس لیے ہم بڑی احتیاط کے ساتھ اُن کے سہارے چلنے لگے۔ شیر نے کئی جگہ نالے کو اِدھر سے اُدھر پار کیا تھا اور ہر جگہ شیر کے پیروں کے نشان موجود تھے۔ اب نہیں کہا جا سکتا کہ اس نے ہر گڑھے پر جاکر پانی پیا تھا یا اسے پانی کے کنارے کسی خاص چیز کی تلاش تھی، بہرحال اس کے بعد وہ نشانات گھنے جنگل کی طرف چلے گئے تھے۔ اس لیے ہم نے وہاں سے براہ راست پڈے والی جگہ پر جانے کا فیصلہ کیا۔

شیر پڈے کے پاس سے بمشکل ۵۰ گز کے فاصلے پر سے گزرا تھا۔ لیکن اس نے پڈے کی طرف مطلق توجہ نہ دی تھی۔ جب ہم وہاں گئے تو پڈا بڑے اطمینان سے گھاس کھا رہا تھا۔ وہ بڑی اندھیری رات تھی۔ اس لیے ہو سکتا ہے کہ گھپ اندھیرے کی وجہ سے وہ سیاہ پڈے کو نہ دیکھ سکا ہو اور پڈا بھی اپنی قسمت سے اس وقت بالکل ساکن رہا ہو۔ شیروں کی سونگھنے کی حس بڑی کمزور ہوتی ہے۔ ورنہ اگر اس کی ناک نے ہی اس کی مدد کی ہوتی تب بھی پڈا زندہ نہ بچتا۔ بہرحال پڈا بچ گیا تھا اور اپنے پیروں پر کھڑا گھاس کھانے میں مشغول تھا۔ میں نے پڈے کو کھلوا کر اپنے ساتھ آتے ہوئے ایک رکھوالے کے ہمراہ واپس کیمپ بھیج دیا اور خود بیما کو ساتھ لے کر دوسرے پڈے کی طرف چل پڑا۔

کچھ دور چلنے کے بعد سانبھروں کا ایک جھنڈ ملا۔ وہ سب گھنے پیڑوں کے سائے میں کھڑے تھے۔ اس لیے انھیں شمار کرنا ممکن نہ تھا۔ سانبھروں نے ہمیں دیکھ لیا اس لیے وہ "پوک پوک" کی آوازیں نکالتے ہوئے وہاں سے بھاگ کھڑے ہوئے۔ البتہ ان میں سے تین نے بہادری کا ثبوت دیا۔ وہ "پوک پوک" ضرور کرتے رہے لیکن بھاگے نہیں۔ غالباً وہ اس طرح کی آوازیں نکال کر ہماری موجودگی سے دوسرے جانوروں کو خبردار کر رہے تھے۔ یہ سلسلہ ایک دو منٹ جاری رہا۔ اس کے بعد وہ بھی آہستہ آہستہ چل کر جنگل میں غائب ہوگئے۔ یہ تینوں نر سانبھر تھے۔ اور ان کے شاخوں دار سینگ ۳۶، ۳۴ اِنچ سے کم نہ تھے۔

دوسرا پڈا بھی اپنی جگہ زندہ سلامت ملا۔ میں نے اُسے بھی کھلوا دیا، اور اپنے ساتھ لیتا ہوا واپس آگیا۔

۲۰ ، فروری۔ ایک ہفتہ پہلے کی طرح ایک اور خالی دن۔ اس بار بھی شیروں نے کسی پڈے کو ہاتھ نہیں لگایا۔ جب ہم پڈوں کو دیکھ کر واپس کیمپ پہنچے تو ساڑھے نو بج رہے تھے۔ اس بار راستے میں کوئی نیل گائے یا سانبھر وغیرہ نہیں ملا ورنہ میرا ارادہ تھا کہ کیمپ والوں کے لیے ایک نہ ایک جانور شکار کر لوں گا۔ بڑا جانور تو خیر ملا نہیں البتہ راستے میں ایک کھیت کے اندر دس پندرہ جنگلی مرغیاں چگتی ہوئی نظر آگئیں۔ میں نے اپنے ساتھیوں سے کہا کہ وہ گھوم کر جائیں اور کھیت میں دوسری سمت سے داخل ہوں تاکہ مرغیاں بھاگ کر یا اڑ کر میری

طرف آجائیں۔ یہ ترکیب کامیاب رہی اور میں نے آسانی
سے دو فائروں میں اڑتے ہوئے مرغ اور ایک مرغی
کو گرا لیا۔ مرغ کے شکار کے بعد جب ہم سڑک پر آئے
تو گولے کے ایک پیڑ پر دو ہریل (کبوتر جیسا ایک پرندہ)
نظر آئے۔ ایک فائر میں یہ دونوں بھی نیچے آرہے۔ دوپہر
دو بجے کے قریب ہرکارہ ڈاک لے کر آگیا۔ شام کا
وقت خط پڑھنے میں اور ان کے جوابات لکھنے میں
گزر گیا۔ اس لیے اس شام دوبارہ جنگل کی طرف
نہ جا سکا۔ شام چھ بجے کے قریب بیما میرے پاس آیا
اور آج بھی خالی دن جانے پر مجھ سے اظہارِ ہمدردی
کرنے لگا۔ باتوں باتوں میں اس نے مجھے یقین دلایا کہ
اگر میں گاؤں کے شکاریوں کو ایک بکرا دلا دوں تو اس
کی دعوت اڑانے کے بعد وہ میرے لیے مخصوص پوجا کر کے
شکار کی دیوی کو خوش کرنے کی کوشش کریں گے اور اگر
دیوی راضی ہوگئی تو پھر یقیناً شیر کا شکار آسان ہوجائیگا
بیما نے جب اپنی بات پر بہت زیادہ اصرار کیا تو میں نے
بھی کچھ سوچتے ہوئے ایک بکرا اس کے حوالے کر دیا۔

اس دن گاؤں سے رات گئے تک گھنٹے اور گھنگھرو
اور گانے بجانے کی آوازیں آتی رہیں۔ بیما اور اس
کے ساتھی واقعی بڑی تندہی سے اپنا وعدہ پورا کرنے
میں لگے تھے تاکہ اس طرح شکار کی دیوی کو راضی کر کے
مجھے شکار دلانے میں کامیاب ہوسکیں۔

یکم مارچ۔ کل شام میں نے دو پڑے بندھوانے
کے بجائے ایک ساتھ پانچ پڑے بندھوادیے تھے
تاکہ کامیابی کا امکان بڑھ جائے۔ میں صبح سات بجے
گنگا کو ساتھ لے کر مشرق کی طرف اس سمت چل پڑا
جہاں تھوڑے تھوڑے فاصلے پر تین پڑے باندھے گئے
تھے۔ بیما مغربی اور شمالی سمت والے پڑوں کو دیکھنے کے
لیے چلا گیا۔ مجھے تینوں پڑے حسبِ سابق زندہ سلامت
ملے۔ راستے میں کوئی جانور بھی نہیں ملا جس کا ذکر کیا جاسکے
جب ہم کیمپ کی طرف واپس آرہے تھے تو آدھے راستے
سے کچھ پہلے بیما کا بھیجا ہوا آدمی مل گیا۔ جس نے بتایا کہ شمالی
سمت والے پڑے کو شیر مار کر کہیں دور اٹھا لے گیا ہے۔
میں نے فوراً مختصر ترین راستہ اختیار کیا اور جنگل کے اندر
سے ہوتا ہوا اس جگہ پہنچ گیا جہاں شیر نے پڑے کو مارا تھا
میں نے سب آدمیوں کو خاموش رہنے کی تاکید کرتے ہوئے
انھیں وہاں سے سو گز دور ایک مناسب جگہ پر بٹھا دیا
اور خود شیر کے پنجوں کا بغور مطالعہ کرنے کی غرض سے وہاں
ایک ایک انچ زمین کا جائزہ لینا شروع کر دیا۔ پنجوں
کے نشانات سے معلوم ہوا کہ وہ بہت ہی تندرست قسم
کا پورا جوان شیر ہے۔

شیر پڑے کے پاس نالے کے راستے ہی ہوکر آیا تھا
شیر نے پڑے کو کب دیکھا یا کتنی دور سے پڑے کی موجودگی
کا اسے پتہ چل گیا اس بارے میں کچھ کہنا مشکل ہے البتہ پڑے
کو اچھی طرح دیکھ لینے کے بعد وہ جھاڑیوں سے بچتا ہوا گھوم
کر دوسری سمت آیا اور جب اسے صاف جگہ مل گئی تو کوئی
۲۰ گز کے فاصلے سے ایک دم زوردار حملہ کر کے پڑے پر
ٹوٹ پڑا۔ شیر نے یقیناً پڑے کی گردن پر چھلانگ لگائی
ہوگی اور اسے گرا کر آن کی آن میں اس کی گردن توڑ دی ہوگی
خون کا نشان وہاں دور دور تک نظر نہ آرہا تھا۔ جس کا
مطلب تھا کہ شیر پڑے کو مارنے کے بعد اسے گردن سے دبوچ
کر کہیں اور لے گیا تھا تاکہ اطمینان سے اس کی دعوت اڑائے۔
شیر جب پڑے کو لے جا رہا ہوگا تو مرے ہوئے پڑے کی ٹانگیں

کہیں کہیں پر زمین سے ٹکرائی تھی جس کی وجہ سے خشک ریت
پر گھسٹتے ہوئے کھروں کے نشان دکھائی دے رہے تھے۔ یہ
نشان بھی بیس پچیس گز تک ہی ساتھ دے سکے، اور شیر جب
اپنے شکار کو لیے گھنے جنگل میں داخل ہوگیا تو وہ بھی دکھائی
دینا بند ہوگئے۔ ہم نالے میں ہی کچھ دور اور چلے اور تب
ایک جگہ پانی کے کنارے ایک بار پھر ہمیں شیروں کے کھوج
دکھلائی دے گئے۔ شیر اپنے شکار کی دعوت اڑا کر اسی
جگہ پانی پینے آیا تھا۔ دعوت اڑانے کا اندازہ ہمیں اس
کے پیروں کے نشانات دیکھ کر ہوا کیونکہ ایک آدھ جگہ
جہاں زمین سخت تھی پیروں کے نشان کے ساتھ خون
بھی نظر آرہا تھا۔

میں نے فوراً گنگا کو اشارے سے اپنے پاس بلایا
اور تمام باتیں اسے بتادیں۔ گنگا کے مشورے پر ہم اسی
جگہ بیٹھ گئے اور آدھ گھنٹے تک خاموشی سے جنگل کی آواز
پر کان لگائے رہے تاکہ جنگل میں شیر کی موجودگی یا اس
کی سمت کا اندازہ لگایا جا سکے جہاں شیر ہو سکتا تھا۔
اس وقت جنگل میں ایک طرح بالکل سناٹا چھایا ہوا تھا
آس پاس کوئی بندر یا کوا بھی نہیں بولا جس سے شیر
یا مرے ہوئے پڈے کی موجودگی کی اطلاع مل سکتی آخر
مجبور ہوکر ہم واپس کیمپ چلے آئے۔ البتہ میں اپنے دو
آدمیوں کو نالے کے کنارے پر دو بڑے پیڑوں پر بٹھا آیا
کہ وہ خاموشی سے نگرانی کے فرائض انجام دیتے رہیں اور
جیسے ہی کچھ دیر بعد وہاں آؤں تو صورت حال سے مجھے آگاہ
کردیں۔

کیمپ واپس آکر میں نے پہلا کام یہ کیا کہ فارسٹ
گارڈ اور دوسرے چھ آدمیوں کو قریب کے گاؤں اور لکڑی
کی کٹائی کرنے والوں کے کیمپ کی طرف بھیج دیا تاکہ وہاں
سے ہانکا کرنے والوں کو جمع کرکے لا سکیں۔ اس دوران
میرے اردلی شمس الدین نے شکار میں کام آنے والا
تمام ضروری سامان یکجا کردیا۔ میں نے جلدی جلدی ناشتہ
کیا اور اپنے طور پر تمام تیاریاں مکمل کرکے ہانکا کرنے والوں
کے انتظار میں بیٹھ گیا۔ گیارہ بجے کے قریب فارسٹ
گارڈ واپس آگیا۔ اس کے ساتھ صرف چھ آدمی تھے۔
مجھے بتایا گیا کہ لکڑی کے ٹھیکیدار نے زیادہ آدمی دینے
سے انکار کردیا ہے۔ ٹھیکیدار کا ڈیرا وہاں سے ایک
میل دور تھا اس لیے میں خود ہی اس سے بات کرنے کے لیے
چل پڑا۔ ٹھیکیدار خلافِ توقع بڑے اخلاق سے پیش آیا
اور ہم جلدی ہی ایک دوسرے کے دوست بن گئے۔

دراصل فارسٹ گارڈ نے ٹھیکیدار سے بدتمیزی سے
بات کی تھی اس لیے وہ ناراض ہوگیا تھا۔ میں نے
فارسٹ گارڈ کے رویے پر معافی چاہی۔ ٹھیکیدار نے
مزید ۳۰ آدمی میرے ساتھ کردیے لیکن یہاں تک آنے
جانے میں کافی قیمتی وقت ضائع ہوگیا۔

جب ان آدمیوں کو لے کر میں کیمپ پہنچا تو اس وقت
تک وہاں ۷۵ آدمی جمع ہوچکے تھے۔ میں نے سب لوگوں
کو ایک قطار میں بٹھادیا اور سب کو ایک ایک سگریٹ پیش کرتے
ہوئے ہانکا کرنے سے متعلق ضروری ہدایات دیں۔ ۵ ہانکیوں
کو الگ کرتے ہوئے انھیں سمجھایا کہ پیڑوں پر چھپ کر بیٹھ
جانے کے بعد جب ہانکا شروع ہو اور شیر ان کے پیڑ کی طرف
آئے تو وہ اس کا رخ میری طرف موڑنے کے لیے صرف کھانسیں
یا تالی بجائیں اور منہ سے کوئی اور آواز نہ نکالیں۔ غرض
تمام تیاریاں مکمل کرکے ہانکا کرنے والوں کو ساتھ لے کر
میں ذخیرے جنگل میں داخل ہوگیا۔ مچان والا پیڑ جب آدھا
میل رہ گیا تو میں نے فارسٹ گارڈ کی نگرانی میں ہانکا کرنے

کو سڑک پر روک دیا۔

اور ان کو سخت تاکید کردی کہ وہ آپس میں باتیں بالکل نہ کریں اور جب تک نیا حکم نہ دوں وہ وہاں سے نہ ہلیں چونکہ پہلے ہی کافی دیر ہوگئی تھی اس لیے میں ان دو آدمیوں سے جاکر نہ مل سکا جنھیں نگرانی کے لیے پیڑ پر بٹھا آیا تھا۔ بلکہ سیدھے مچان والے پیڑ کی طرف چل پڑا۔

تین بجے تک مچان بن کر تیار ہوگیا۔ اس کے بعد میں نے خود پانچ آدمیوں کو ساتھ لیا اور انھیں مچان کے دائیں اور بائیں سمت میں تھوڑے تھوڑے فاصلے پر پیڑوں پر بٹھا دیا۔ گنگا اور بیما نے کچھ اور آدمیوں کو لیا اور انھیں بھی ساتھ لے جاکر دائیں بائیں دونوں طرف دور تک بطور روک اسی طرح پیڑوں پر بٹھا دیا جب کہ میرا اردلی اور میرا۔ مچان والے پیڑ کے پیچھے پیڑ پر جا بیٹھے میں مچان پر بیٹھ گیا اور وہاں سے گنگا کو واپس بھیج دیا تاکہ وہ ہانکا کرنے والوں کے پاس جاکر انھیں پوزیشن سنبھالنے کے لیے کہہ سکے۔

ہانکا تین بج کر ۳۵ منٹ پر شروع ہوا۔ تین بج کر ۴۵ منٹ پر پانچویں نمبر کا روک یعنی پانچویں پیڑ پر بیٹھا ہوا آدمی زور سے کھانسا اور اس کے ٹھیک ایک منٹ بعد میں نے شیر کی جھلک دیکھی جو میری بائیں سمت سے دائیں طرف آہستہ آہستہ جا رہا تھا۔ اس کے چلنے کے انداز سے ظاہر ہو رہا تھا کہ اُسے اس وقت کسی قسم کے ڈر یا خطرے کا احساس نہ تھا۔ میں نے مچان پر فوراً اپنا رخ تبدیل کرتے ہوئے اپنا منہ شیر کی طرف کرلیا۔

باقی آئندہ

جناب مہر ورولوی

کیلا ایک پھل ایک غذا“

پھل قدرت کا ایک عطیہ ہے۔ ایک نعمت ہے۔ ہماری غذا میں کئی لذیذ پھلوں کا بھی شمار ہوتا ہے۔ ان میں کیلے کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ اس کا استعمال ہر جگہ پایا جاتا ہے۔ یہ پھل ہر موسم میں ملتا ہے کیلے کھانے والوں کو اس کی غذائی اہمیت سے واقف ہونا بھی ضروری ہے۔ کیلا ایک میٹھا اور لذیذ پھل ہے اور دیگر پھلوں سے ارزاں بھی۔ یہ ہر آدمی کا من بھاتا کھاجا ہے۔ ہر طبقے کے لوگ اسے بڑی چاہ سے خرید کر کھاتے ہیں۔ یہ پھل دن بہ دن بھارت میں کافی مقبول ہو رہا ہے۔ اب تو دعوتوں میں ضیافت کے لیے کیلا ضروری سمجھا جاتا ہے۔

یہ پھل بھارت کی تہذیب کی ابتدا سے یہاں پایا جاتا ہے۔ بادشاہ سکندر نے ق م ۳۲۷ء میں ہندوستان پر حملہ کیا تھا۔ اس زمانے میں گریک (یونانی) لوگوں کو یہاں "کیلے" کے پیڑ نظر آئے تھے۔ اجنتا کے غاروں میں بھی کیلے کے پیڑ پائے جاتے تھے۔ یہاں ق م ستلہ میں کیلے کی پیداوار کافی ہوتی تھی۔ پرتگیزوں کو کیلے کا علم پندرہویں صدی میں ہوا۔ انھوں نے اس پھل کو "بنانا" نام دیا۔ اور یہی انگریزی میں مقبول ہوا کیلا سنسکرت لفظ "کدلی" سے بنا ہے۔ اسے اردو ہندی میں کیلا ہی کہتے ہیں۔ بنگالی میں "کلا" کہا جاتا ہے۔ قدیم سنسکرت کی کتابوں میں 'کدلی' نام سے اس کا ذکر کیا ہے۔

آج بھارت میں آموں کے بعد سب سے زیادہ کاشت کیلوں کی ہوتی ہے۔ اس کی پیداوار ہر جگہ ہوتی ہے۔ خصوصاً ساحلی علاقوں میں زیادہ ہوتی ہے۔ ہمالیہ جیسے پہاڑی اور سرد خطوں میں بھی ہوتی ہے ہمالیہ میں کیلے کے پیڑ ...۴ فٹ بلندی تک پائے جاتے ہیں۔ ساحلی آب و ہوا اس پیڑ کے لیے زیادہ مفید ہونے کی وجہ سے وہاں زیادہ پھلتا پھولتا ہے۔ یہ سخت سردی اور طوفانی ہوا برداشت نہیں کر سکتا اس لیے ان سے محفوظ رکھنا ضروری ہوتا ہے بھارت کو کیلے کا جنم استھان (مقام پیدائش) مانا جاتا ہے اس ملک سے عرب تاجروں نے افریقہ والوں میں اور پرتگیزوں نے یورپ میں اس کو پھیلایا ہوگا۔ فی زمانہ کیلے کی پیداوار میں دنیا بھر میں ویسٹ انڈیز جزائر کا پہلا نمبر ہے۔ یہاں کے کیلے امریکہ اور یورپ میں زیادہ فروخت ہوتے ہیں۔ وسط اور جنوبی امریکہ بھی کیلے کی پیداوار کے لیے مشہور ہے۔ تمام دنیا میں گراس مچیل [illegible] قسم کے کیلے کافی مشہور ہیں۔ اس قسم کے کیلے جنوبی امریکہ میں کافی پائے جاتے ہیں۔ جزیرہ ہائے ملایا کے سنگاپوری کیلے بھی کافی مشہور ہیں۔

کیلا (جنہ ہلدی، ادرک کے گروہ میں شمار ہوتا ہے اس کے رنگ، لذت اور ساخت سے اس کی قسمیں مقرر

کی گئی ہیں۔ بھارت میں کیلوں کی کئی قسمیں ہیں جن میں تجارتی نکتہ نظر سے بیس قسمیں اہم ہیں۔ بھارت میں کیلوں کی پیداوار میں پہلا نمبر مدراس کا، دوسرا نمبر بنگال کا اور اس کے بعد بمبئی کا ہے۔ مدراسی کیلے کی مشہور قسم پوون، ملیبار یا کیرالہ میں "نین رن" قسم کے کیلے کافی مقبول ہیں، امرت ساگر، مرتبان جینی چمپا کی منبی وغیرہ اقسام کو بنگال میں زیادہ اہمیت دی جاتی ہے۔ مہاراشٹر (بمبئی) کے علاقے میں (سون کیل) یا سُرخ الایچی سفید الایچی راجیلے بھرائی قسم کے کیلے اونچے مانے جاتے ہیں جس طرح اچھے آموں کے لیے رتناگری، میٹھے انگوروں کے لیے ناسک کے نام مشہور ہیں اسی طرح اونچے کیلوں کے لیے بسین یا بسی کا نام ہر زبان پر آتا ہے۔ یہاں کے سرخ کیلے معیاری اور لذیذ ہوتے ہیں۔ اس لیے بمبئی کے شہری زیادہ پسند کرتے ہیں۔ اس علاقے کی دوسری قسم کے سرخ الایچی (سون کیل) ہے۔ یہ چھوٹے پتلے چھلکے والے اور بھی لذیذ ہوتے ہیں۔ راجیلے کیلے بھی نامی اور لذیذ ہوتے ہیں جن سے سُوکیلے تیار کیے جاتے ہیں۔ سوکیلے (سوکھے کیلے) کے لیے بسین تعلقہ (تحصیل) کا ایک مقام آگاشی کافی مشہور ہے۔ سوکیلے کافی گراں ہوتے ہیں۔ اس لیے یہ امیروں کا میوہ سمجھا جاتا ہے۔ سفید الایچی اونچی قسم کے کیلے خوش ذائقہ ہوتے ہیں۔ ان میں شکرین کافی مقدار میں ہوتی ہے۔ خاندیس (جلگاؤں) کے بھرائی کیلے کافی مشہور ہیں۔ یہ دہلی، پنجاب، شمالی بھارت پاکستان وغیرہ بھیجے جاتے ہیں۔

کیلے کے پیڑ کے تمام حصے کارآمد ہوتے ہیں، خصوصاً (الف) کچے کیلے اور پھولوں کا ساگ بنایا جاتا ہے۔ (ب) پکے ہوئے کیلوں سے عطر اور عرق تیار کیا جاتا ہے (ج) کیلے کے آٹے میں گیہوں کا آٹا ملا کر بسکٹ بنائے جاتے ہیں (د) اس کے پیڑ (تنے) سے روشنائی (مارکنگ انک) تیار کی جاتی ہے (ہ) تنے کے ریشوں سے مضبوط رسیاں بنائی جاتی ہیں (و) اس کے تنے کا رس کئی بیماریوں کے لیے مفید ہے (ز) پکے کیلے ناروں پر باندھتے ہیں (ح) بارہ ماہ ملنے والا شکرین (عرق) کیلے سے تیار ہوتا ہے۔ اس طرح ناریل کے پیڑ کی طرح کیلے کا پیڑ بھی کافی کارآمد ہے۔

کیلے کے قند ایک ایکڑ زمین میں ۱۰۰۰ سے ۱۲۰۰ لگائے جاتے ہیں۔ بونے کے بعد کیلے کے پیڑ میں ۱۲ تا ۱۵ مہینوں میں پھلیوں (کیلوں کے) گچھے لگتے ہیں۔ ایک گچھے کا وزن ۴۰ تا ۷۵ پونڈ ہوتا ہے۔ جس میں ۷۵ تا ۱۰۰ کیلے ہوتے ہیں۔ مغربی بنگال میں کیلے زیادہ استعمال ہوتے ہیں۔ لوگوں کو کیلے کی غذائی اہمیت کا علم ہونے کی وجہ سے اب زیادہ تعداد میں پیدا ہونے لگے ہیں۔ اس کی پیداوار میں ہر سال اضافہ ہو رہا ہے۔ پھر بھی آبادی کے لحاظ سے اس کی پیداوار کافی کم ہے۔

کیلے ہاضمہ کے لیے کافی مفید ہیں ان میں کافی مقدار میں وٹامن (حیاتین) پائے جاتے ہیں۔ چربی، نمک، شکر ہونے کی وجہ سے مفید عام ہے۔

جسم میں توازن برقرار رکھنے کے لیے اس کا استعمال ضروری ہوتا ہے۔ دماغی محنت کرنے والوں کے لیے دودھ کے ساتھ کیلے کا استعمال بہت مفید ہوتا ہے۔ اس طرح ہر طرح کے وٹامن اور غذائی اجزا حاصل ہوتے ہیں۔ آج کل غذائی قلت کے دور میں کیلے کو ضمنی غذا کے طور پر کافی اہمیت اور خاص مقام حاصل ہے۔ اس لیے ان کی فروخت میں بھی کافی اضافہ ہوا ہے۔ لہٰذا کیلے کی پیداوار میں اضافہ بھی اشد ضروری ہے۔

(شری ش۔ بھاگلکر کے مراٹھی مضمون سے ترجمہ)

جناب احمد مصطفےٰ خاں شیروانی (مالیر کوٹلہ)

شہاب ابھی پانچ سال کا تھا جب اس کی والدہ کا انتقال ہوگیا۔ اس سے چھوٹی ایک بہن بھی تھی۔ شہاب سوچا کرتا تھا کہ اس کی والدہ کہاں چلی گئیں جو اس کو گود میں بٹھایا کرتی تھیں اور شرارت کرنے پر بھی پیار کرتی تھیں۔ وہ اداس ہو جاتا مگر اس کی سمجھ میں کچھ نہ آتا کہ کیا ہوگیا ہے۔ اس کی چھوٹی بہن کو اس حادثے کا کیا خیال ہو سکتا ہے۔ اس کا کام تو صرف رونا یا سونا تھا۔ جب رونے اور سونے سے فرصت ہوتی تو غوں غوں کرتی۔

وقت اسی طرح کٹ رہا تھا اور شہاب اپنی والدہ کو بھولتا جا رہا تھا۔ ایک روز اس کے والد اس سے کہنے لگے کہ شہاب اگر ہم تم کو تمہاری والدہ لادیں تو کیا تم خوش ہو جاؤ گے۔ شہاب خوشی سے تالیاں بجاتا اب اس کی والدہ آجائیں گی جو اسے پیار کریں گی اور اسے گود میں بٹھائیں گی۔ اس نے اپنے دوستوں سے بھی کہا کہ اس کے والد اس کی والدہ لادیں گے۔ اس کے دوست بھی اس کی والدہ کا انتظار کرنے لگے۔

ایک روز جب شہاب سو کر اٹھا تو اس کے والد اس سے کہنے لگے کہ تمہاری والدہ آگئی ہیں۔ اس کے والد نے اس کی انگلی پکڑی اور اسے اپنے ساتھ لے کر ایک کمرے میں گئے۔ شہاب جب اس کمرے میں گیا تو اس نے اپنی والدہ کو بیٹھے دیکھا۔ اس کے والد نے اس سے کہا یہ رہی تمہاری والدہ۔ شہاب اپنے والد سے انگلی چھڑا پلنگ کی طرف بھاگا اور جلدی سے پلنگ پر چڑھنے لگا اور ساتھ ہی یہ کہتا جاتا کہ امی تم کہاں چلی گئی تھیں۔ اب کبھی میں شرارت نہ کروں گا۔ شہاب یہ کہہ کر اپنی نئی والدہ کی گود میں بیٹھنے لگا تھا۔ مگر وہ کچھ سہم سا گیا کہ یہ میری والدہ کہاں ہیں، وہ پلنگ سے اتر کر نیچے کھڑا ہوگیا۔

شہاب کے والد نے کہا "کیا بات ہے۔ کیا یہ تمہاری امی نہیں" اس نے اس بات کا کوئی جواب نہ دیا اور باہر دالان میں آکر کھڑا ہو کر رونے لگا۔ اب وہ اور بھی خاموش اور اداس رہنے لگا۔

شہاب جب چھ سال کا ہوا تو اس کے والد اسے ایک مکتب میں لے گئے۔ جہاں اسے پڑھنے کے لیے داخل کر دیا۔ دن مہینوں اور مہینے سالوں میں تبدیل ہونے لگے۔ اب وہ اسکول میں پڑھنے لگ گیا۔ وہ پڑھنے میں ہوشیار تھا دل لگا کر پڑھتا۔ اسکول جانے اور آنے کے بعد اپنے چھوٹے بھائی کو اٹھایا کرتا، اسے کھیلنے کے لیے کم وقت ملتا۔ اگر وہ اس بات کی شکایت کرتا تو اس کی پٹائی ہوتی مجبوراً اپنے چھوٹے بھائی کو اٹھاتا اور باہر چلا جاتا۔ بچہ اس کے ساتھ ہر وقت چمٹا رہتا۔

جب اس کی والدہ سو جاتیں تو وہ چپکے سے اٹھتا۔ اپنے اسکول کا کام کرتا۔ اگر اتفاقاً اس کی والدہ کی آنکھ کھل جاتی تو فوراً ڈانٹ پڑتی کہ کیا تیل

مفت آیا ہے جو آدھی رات کے وقت بھی روشنی کر رکھی ہے۔ وہ خاموشی سے دیا بڑھا کر لیٹ جاتا۔ ایسا بھی ہوتا کہ اسے باہر سڑک کی روشنی میں بیٹھ کر اسکول کا کام کرنا پڑتا۔

اگر کبھی اس کی والدہ اس سے ناراض ہو جاتیں تو وہ گھر سے نکال دیا جاتا۔ وہ اپنی کتابیں اٹھا کر اپنے ماموں کے گھر چلا جاتا۔ مگر اس کی مومانی بھی عجیب عورت تھی جسے دیکھ کر ڈر لگتا تھا۔ وہ بولتی بھی اس طرح سے تھیں جیسے کسی سے لڑ رہی ہوں۔ شہاب وہاں کتنے روز رہ سکتا تھا۔ مجبوراً کتابیں اٹھاتا اور واپس اپنے گھر آجاتا وہ گھر میں اسی طرح داخل ہوتا جیسے کوئی چور کسی مکان میں چوری کرنے داخل ہو رہا ہو۔ اسے یہی ڈر لگتا تھا کہیں اس کی والدہ نہ دیکھ لے جو اُسے دیکھتے ہی کہنے لگ جاتی ــ ہو آئے اپنے ماموں کے گھر۔ بڑے بھاگ گئے تھے جیسے پھر اس مکان میں آؤ گے ہی نہیں۔ وہ یہ سنتا اور اپنی کتابیں ایک طرف رکھ کر اپنے چھوٹے بھائی کو اٹھا کر باہر چلا جاتا، تب اسے اطمینان ملتا۔

اسکول میں ایک روز ہیڈ ماسٹر صاحب نے کہا کہ اسکول کا سالانہ جلسہ ہونے والا ہے۔ جس میں شہر کے پڑھے لکھے لوگ آئیں گے جو بچے سب سے اچھا مضمون لکھے گا اسے وظیفہ دیا جائے گا۔ شہاب نے بھی اپنا نام لکھوا دیا۔ مضمون لکھنے کے لیے شہاب وقت نکالنے کی کوشش کرتا مگر اسے وقت ہی نہ مل رہا تھا۔ اگر وہ اپنی والدہ سے کہتا تو اسے جواب ملتا " بڑا آیا ہے مضمون لکھنے والا۔ اٹھا اپنے چھوٹے بھائی کو اور اسے باہر لے کر جا۔" وہ مجبوراً اسے اٹھاتا اور باہر چلا جاتا۔ دوسری طرف جلسہ ہونے میں تھوڑے دن رہ گئے۔ مگر ابھی تک اس کا مضمون تیار نہ ہوا تھا۔ وہ حیران تھا کہ اب کیسے کیا کرے۔ اسنے اپنا نام تو دے دیا اگر مضمون تیار نہ ہوا تو کیا بھرے جلسے میں شرمندہ نہ ہوگا۔

جلسہ ہونے میں صرف ایک رات باقی ہے اور شہاب کا مضمون تیار نہیں۔ اس کی والدہ نے اُسے بلا یا اور کہا "دیکھو شہاب آج رات میں ایک شادی میں جارہی ہوں تمھارے والد بھی گھر پر نہ ہوں گے۔ تم اکیلے گھر پر رہنا اِدھر اُدھر مت جانا اگر تمھارے والد کو شادی سے فرصت ہوگئی تو گھر پر آجائیں گے۔ اِس بات کا سننا تھا کہ شہاب بہت خوش ہوا مگر اپنی خوشی ظاہر نہیں کی۔ خدا کا شکر ادا کیا کہ اس نے مضمون لکھنے کا سبب پیدا کر دیا۔ والدہ کے گھر سے چلے جانے کے بعد اس نے قلم دوات اٹھایا اور مضمون لکھنے بیٹھ گیا۔ لکھوں تو کیا لکھوں یہی سوچ رہا تھا اُسے ایسا لگا کہ مضمون اس کے دماغ میں آگیا۔ مضمون کی شکل میں اس نے کاغذ پر لکھ دیا۔ مضمون تیار ہونے کے بعد وہ اطمینان سے لیٹ گیا۔

شہاب ابھی سو رہا تھا کہ صبح ہی اس کی والدہ آگئیں وہ جلدی سے اٹھا۔ منہ ہاتھ دھوئے اور ناشتہ کیا۔ کپڑے جیسے تھے پہن کر اسکول کی طرف چل پڑا۔ راستے میں ایک جگہ بیٹھ کر اس نے مضمون کو دوبارہ دیکھا۔ اس میں چند اشعار لکھ دیے۔

اسکول میں ہر طرف جھنڈیاں لگی ہوئی ہیں اور بچے صاف کپڑے پہنے پھر رہے ہیں مگر شہاب وہی روزانہ والے کپڑے پہنے ہوئے ہے۔ جلسہ کا وقت ہوگیا۔ مہمان آنے شروع ہوگئے۔ جلسہ شروع ہوا۔ بچے خاموش بیٹھ گئے جن بچوں نے مضمون پڑھنے کے لیے دیا تھا وہ باری باری سے پڑھ کر اپنی جگہ بیٹھ جاتے ہیں۔ ہر بچے کی ہمت افزائی

کی جارہی ہے۔ شہاب کا بھی نمبر آگیا جو دوسرے بچوں کی طرح صاف کپڑوں میں نہ تھا۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھا اور اسٹیج پر پہنچ گیا۔ حاضرین کو سلام کیا اور مضمون پڑھنے لگ گیا۔ اس کے مضمون کی بہت تعریف ہوئی۔ ہیڈ ماسٹر صاحب نے شہاب سے کہا۔ کیا تم نے یہ مضمون لکھا ہے۔ اس نے کہا "شاید آپ کو یہ خیال ہے کہ میں نے یہ مضمون اپنے ماموں سے لکھوایا ہے جو پڑھے ہوئے ہیں۔ ایسا نہیں ہے۔ انھیں تو اس مضمون کا علم بھی نہیں۔ دوسرے وہ ہمارے گھر سے دور رہتے ہیں۔ یہ تو میں نے رات ہی لکھا ہے۔" اس پر ہیڈ ماسٹر صاحب نے کہا "اگر یہ بات ہے تو شہاب میں تم کو مبارکباد دیتا ہوں تم ایک روز اچھے ادیب بنوگے۔ اسی بات سے شہاب کی ہمت بندھی۔ اسے وظیفہ بھی ملنے لگا۔ اب اس کا شمار اسکول کے سب سے اچھے طالب علموں میں ہونے لگا۔

ایک روز شہاب نے اپنے ہیڈ ماسٹر صاحب سے کہا کیا آپ مجھے انگریزی پڑھا دیا کریں گے؟" انھوں نے کہا "ضرور، مگر اس بات کا خیال رکھنا مجھے صرف اس وقت فرصت ہوتی ہے جب میں سیر کے لیے جاتا ہوں تم اس وقت پڑھ لیا کرو۔ اس وقت میں دوڑ لگایا کرتا ہوں تم بھی میرے ساتھ دوڑا کرو اور انگریزی یاد کیا کرو۔" اب اس کا روزانہ کا کام تھا کہ ہیڈ ماسٹر صاحب کے ساتھ صبح کے وقت دوڑا کرے اور انگریزی کا سبق یاد کیا کرے۔ اس کا شوق دیکھ کر ہیڈ ماسٹر صاحب شہاب کا خیال رکھتے اور اس کی پڑھائی میں ہر طرح مدد دیتے۔

شہاب اپنی تعلیم سے فارغ ہوگیا۔ وہ نوکری کی تلاش میں تھا۔ اسے معلوم ہوا کہ کسی اخبار میں ترجمہ کرنے والے کی ضرورت ہے۔ وہ ایک سفارشی خط لے کر اڈیٹر صاحب کے پاس گیا۔ خط اڈیٹر صاحب نے پڑھا جواب دیا کہ میں تو ان صاحب کو نہیں جانتا۔ شہاب نے وہ خط اڈیٹر صاحب سے لے لیا اور اسے اپنی جیب میں رکھ کر کہا۔ کیا آپ کو کسی ترجمہ کرنے والے کی ضرورت ہے؟ جواب تھا "ضرورت ہے۔" اس نے کہا "لائیے کاغذ قلم دوات اور جس مضمون کا ترجمہ کرنا ہے وہ دیجیے اور جس جگہ آپ کہیں اس جگہ بیٹھ جاؤں۔ اڈیٹر صاحب نے ایک طرف اشارہ کیا کہ وہاں بیٹھ جاؤ۔

شہاب خاموشی سے بتائی ہوئی جگہ پر جاکر بیٹھ گیا اور ترجمہ کرنے لگ گیا۔ ترجمہ کرنے کے بعد اڈیٹر صاحب کو دیا۔ اڈیٹر صاحب نے پڑھا اور پڑھ کر کہا ٹھیک ہے تنخواہ کیا لوگے۔ جو آپ دینا چاہیں دیں، آپ کو کام چاہیے اور مجھے دام۔ تنخواہ مقرر ہوگئی اور شہاب اپنا کام دل لگا کر کرنے لگا۔ اخبار میں کام کرنے سے اسے مختلف لوگوں سے ملنے کا اتفاق ہوا۔ ساتھ ہی نئے نئے مضامین پڑھنے کا موقع ملا۔ جس سے اسے مضمون لکھنا اچھی طرح آگیا۔ شہاب اب اچھا ادیب ہے۔ لوگ اس کی عزت کرتے ہیں۔ یہ سب اس کی کوشش کا پھل ہے۔

لطیفہ

زرینہ : آج کا دودھ کھٹا ہے۔

فہیم : جی، کل بکری نے لیمو کھا لیا تھا۔

بشیرالدین شیرکوٹی

محترمہ عصمت ریاض بی۔اے

لوری

(ننھے فونی کے لیے)

شاعر کا تکلم لے کر
موجوں کا ترنم لے کر
کلیوں کا تبسم لے کر
اے چشمِ غزالاں سو جا
اے جانِ بہاراں سو جا

تکمیلِ تمنا تجھ سے
دلِ شاد ہمارا تجھ سے
اس گھر کا اجالا تجھ سے
اے چشمِ غزالاں سو جا
اے جانِ بہاراں سو جا

تعبیرِ جوانی تو ہے
الفت کی کہانی تو ہے
گلزار کی رانی تو ہے
اے چشمِ غزالاں سو جا
اے جانِ بہاراں سو جا

بلبل کا ترانہ تو ہے
رنگین فسانہ تو ہے
خوشیوں کا خزانہ تو ہے
اے چشمِ غزالاں سو جا
اے جانِ بہاراں سو جا

پریوں کی ادائیں لے کر
راحت کی صدائیں لے کر
گھر بھر کی دعائیں لے کر
اے چشمِ غزالاں سو جا
اے جانِ بہاراں سو جا

جناب م۔ ا۔ حسینی

حکیم کی وصیت

(الف لیلہ کا ایک ورق)

حبیب ایک محنتی اور جفاکش نوجوان تھا۔ وہ جنگل سے لکڑیاں کاٹ کر گزر اوقات کرتا۔ روزانہ صبح سویرے بیدار ہونا اور جنگل چلا جانا اور شام تک وہیں رہنا۔ یہی اس کی روزمرہ کی زندگی تھی۔ لکڑی کاٹنے سے طاقت اور چستی محسوس کرتا اور وہاں اسے کچھ دلچسپ اور اچھے ساتھی بھی میسر آگئے تھے۔ کائنات کی دلفریبی اس کا دل بہلاتی تھی اور لکڑی کے کام سے اس کو جو آمدنی ہوتی وہ اس کے اور اس کی ماں کے لیے بالکل کافی تھی، وہ اس پر قانع اور راضی تھا۔

حبیب اس پر قانع ضرور تھا لیکن اس سے خوش اور مطمئن نہیں تھا اور نا معلوم احساس اس کے دل میں یہ چٹکیاں لیتا رہتا تھا کہ وہ اس لیے نہیں پیدا ہوا ہے کہ لکڑی کاٹے۔ مگر اس کے سوا وہ کوئی دوسرا کام نہیں جانتا تھا جس سے روزی حاصل کر سکے اور اپنے کو خوشحال بنا سکے۔ وہ نہ وکیل تھا نہ ڈاکٹر، نہ انجینیر اور نہ جج، کیونکہ یہ چیزیں بغیر علم کے حاصل نہیں ہو سکتی ہیں اور دوسرے کاموں کے بارے میں سوچتا تھا کہ لکڑی کاٹنے سے بہتر نہیں ہیں۔

ہو سکتا ہے کہ اس کا یہ احساس کہ وہ لکڑہارا نہیں پیدا کیا گیا ہے،" بالکل بے بنیاد ہو یا ممکن ہے اس کی ماں نے اسے یہ احساس دلایا ہو۔ اس کی ماں اکثر بتایا کرتی تھی کہ اس کے والد یونان کے مشہور حکیم تھے، وہ جب بچہ تھا جبھی اس کے والد کا انتقال ہو گیا، مرتے وقت انھوں نے ان دونوں کے لیے کوئی سرمایہ اور دولت نہیں چھوڑی تھی۔ اس کے والد نے اپنی زندگی کا آخری سفر ایران کا کیا تھا۔ وہ شہنشاہ ایران سے ملاقات کے لیے جا رہے تھے ان کے ساتھ بہت سارے زر و جواہرات تھے۔ سمندری قزاقوں اور ڈاکوؤں نے سب کچھ لوٹ لیا اس کے والد کو جواہرات کے لٹ جانے کا افسوس اتنا نہیں ہوا جتنا کہ کتابوں کے برباد اور ضایع ہونے کا ہوا۔ اس نے اپنی زندگی کے آخری دن اپنی یادداشت سے ان کتابوں کے علم و حکمت کو جمع کرنے میں گزارے اس نے اپنی انتھک کوششوں سے اس علم کو پانچ جلدوں میں جمع کر دیا۔ اور انھیں کتابوں کو بطور ترکہ حبیب اور اس کی والدہ کے لیے چھوڑا، مرتے وقت اپنی بیوی کو یہ وصیت کی تھی:

"حبیب کے واسطے ان کتابوں کی حفاظت کرنا کیونکہ وہ ہمیشہ لکڑہارا ہی نہیں رہے گا۔ بلکہ ان کے ذریعہ اتنی بڑی تبدیلی ہو گی کہ جس سے اس کی زندگی

کا رُخ پلٹ جائے گا۔"

ممکن ہے انھیں باتوں اور پیش گوئی نے اس کی زندگی کو بے اطمینان بنا دیا ہو!

معمول کے مطابق ایک روز حسیب لکڑی کاٹ رہا تھا اچانک اس کی نظر ایک انوکھے پتھر پر پڑی، اس نے جب اس پتھر کو ہٹایا تو اس کے نیچے ایک گہرا کنواں دکھائی دیا، اس کی دیواریں سونے اور چاندی سے بنائی گئی تھیں، اس نے بڑے جوش و شوق سے اپنے ساتھیوں کو آواز دی، سب نے بیک وقت کنویں میں جھانکا انھیں سونے اور چاندی کی دیواریں نظر آئیں، سب بہت خوش ہوئے انھیں محسوس ہوا کہ اب اُن کے دن پھر رہے ہیں وہ دُنیا کے امیر ترین بن رہے ہیں۔

سب ساتھی حسیب کو نظر انداز کر کے اس دیوار کو حاصل کرنے کی فکر میں لگ گئے، حسیب نے اپنے نظر انداز کیے جانے پر اعتراض کیا اس کا جواب ان ساتھیوں نے گھونسوں اور پتھروں سے دیا حسیب اس ناگہانی مصیبت سے بچنے کی کوشش کر رہا تھا کہ اس کا پیر کنویں میں جا پڑا، ساتھی اس سے مطمئن ہو گئے اور انھیں بالکل یہ خیال نہ آیا کہ حسیب زندہ بچے گا اور دوبارہ ان سے ملے گا۔

ساتھیوں نے راتوں رات سونا اکٹھا کیا اور خوش خوش گھر لوٹے۔ تھوڑے عرصے میں یہ معمولی لکڑہارے دولت مند تاجر بن گئے۔

حسیب کو اس کنویں میں گرنے سے کوئی تکلیف نہیں پہونچی، اس نے گھبراہٹ میں ادھر ادھر دیکھنا شروع کیا۔ سامنے ہی اسے ایک سفید چمکدار دروازہ نظر آیا، اس سے قریب ہی سونے کی کنجی لٹک رہی تھی اس کے ذوقِ جستجو نے دروازہ کھلوایا، اندر داخل ہوا، لیکن خوف و دہشت سے کانپنے لگا، وہ ایک بڑے ہال میں تھا، ہال خطرناک سانپوں اور اژدہوں سے بھرا ہوا تھا۔ سارے سانپ اور اژدہے اپنی دموں کے بل کھڑے تھے۔ سب سے آگے ایک عجیب سانپ تھا، اس کا سر اور چہرہ خوبصورت عورت جیسا تھا اور پورا جسم سانپ سے مشابہ تھا، ڈر سے اس کا سارا جسم کانپ رہا تھا۔ اچانک اس سانپ نے انسانوں کی طرح گفتگو شروع کی اور بتایا کہ وہ ان سانپوں کی ملکہ ہے اس نے حسیب سے کھانے کے لیے پوچھا جب حسیب نے بتایا کہ بھوک و پیاس سے اس کا برا حال ہے تو اسے کھانا پیش کیا گیا، حسیب کھانا کھانے لگا اور انسان نما سانپ نے اپنی کہانی شروع کی حسیب کھانا کھا چکا اس کی کہانی سے اکتاہٹ ہوئی اسے اس عورت کی داستان اور جادو کر دیئے جانے سے کوئی دلچسپی نہ تھی، اس کو اپنا گھر اور ماں یاد آ رہی تھی، ملکہ نے جلد ہی محسوس کر لیا اور اپنی کہانی ادھوری چھوڑ کر حسیب سے اس کا اور اس کی ماں کا حال دریافت کیا اور کہا کہ:۔

"اگر واقعی تم واپس جانا چاہتے تو مجھے اس چھری سے مار ڈالو، میں اس زندگی سے تنگ آ گئی ہوں، نہ تو میں عورت ہوں کہ عورتوں میں زندگی بسر کروں، نہ سانپ ہوں کہ سانپوں کی طرح اطمینان سے زندگی گذاروں، یوں بھی اگر تم نے مجھے مارا نہیں اور میرے ٹکڑے نہ کر دیے تو اس جگہ سے واپس نہیں جا سکتے ہو اس لیے مجھے قتل کر دو، اور میرے جسم کے ٹکڑے کر ڈالو، اس کے بعد سر اور اس کے آس پاس کے ٹکڑوں کو جمع کر کے اس برتن میں اُبال لو، جب گل اور پگھل جائے اور عرق بن جائے تو اسے پی لو، اور خبردار کسی دوسرے گوشت

پلانا، اس کے جسم کو علاحدہ ابالو، اور دُم کے ٹکڑوں کو
الگ ابالو، اور ان دونوں کے عرق الگ الگ بوتلوں
میں رکھ لو، اور خیال رہے کہ دم کا عرق ہر بیماری کا
علاج ہے اور جسم کا عرق زہر قاتل ہے، اسے حفاظت
سے رکھنا اور اپنے دشمنوں کے خلاف استعمال کرنا۔"

حسیب نے اس کے حسب ہدایت کام شروع
کیا۔ اس نے سر کا عرق پیتے ہی اپنے فکر و خیالات، زندگی
کے مسائل کے سوچنے میں تبدیلی محسوس کی، اس نے غیر
اختیاری طور پر اپنے اندر بے پایاں جذبہ پایا کہ اب
وہ فوراً جاکر لوگوں کو اخلاق، اچھا کردار، اور علم و دانش
سکھلائے، اسے قلبی سکون اور اطمینان محسوس ہوا وہ سیدھا
اپنی ماں کے پاس پہونچا۔

ماں اپنے اکلوتے بچہ کو پاکر خوشی سے رو پڑی۔ بیٹے
کی گمشدگی سے بیمار پڑ گئی تھی اور جسم لاغر اور نڈھال ہو گیا
تھا۔ بوڑھی ماں حسیب کی عقل و دانش میں تبدیلی محسوس
کرکے بہت خوش ہوئی اور اس کا چہرہ دمک اٹھا۔ حسیب نے
اس کو عرقِ شفا پلایا۔ ماں بالکل صحت مند اور توانا ہو گئی،
اس نے باپ کی میراث بیٹے کی سپرد کی، ان کتابوں میں
اس کے دانشمند باپ کے علم و حکمت کا خزانہ تھا،

اب حسیب لکڑہارے کے بجائے معلم تھا،
اپنا بیشتر وقت پڑھنے پڑھانے میں گذارنے لگا،
اس کے علم کا چرچا ہوا اور دنیا کے گوشہ گوشہ میں
پھیل گیا، اس کے پاس عوام و خواص شاگرد بن کر آنے
لگے۔ اب وہ غریبوں، مالداروں، رعایا اور بادشاہوں
کا محبوب اور بے مثال استاد تھا۔

اس کے پرانے لکڑہارے ساتھیوں نے بھی
اس کی شہرت سنی، انھیں حسد اور جلن ہوئی، انھوں
نے یہ بھی سنا کہ حسیب ایسی دوا لایا ہے جس سے اس کی
ماں کی صحت بہتر ہو گئی ہے، اسی کے لالچ میں وہ حسیب
سے ملنے آئے، انھیں ایک کمرے میں بٹھایا گیا، حسیب
کے آنے میں کچھ تاخیر ہوئی ان کی نگاہ جستجو ایک بوتل پر
پڑی انھوں نے سمجھا یہی جام صحت ہے۔ حسیب کی
تاخیر سے فائدہ اٹھانا چاہا اور بوتل خالی کر دی۔ چند ہی
سیکنڈ کے بعد حسیب کمرے میں داخل ہوا اس کے سامنے
اس کے پرانے ساتھی بے حس و حرکت پڑے تھے
جسم زرد اور بے نور آنکھیں۔

بقیہ آریہ بھٹ صفحہ ۹ سے

(ایک دھات) کے چھ سلنڈر رکھے گئے ہیں۔ ان میں
کمپرس (دبائی ہوئی) کی ہوئی نائٹروجن گیس ہے۔ ایک
دوسرے کے مقابل لگی ہوئی ٹونٹیوں سے نکلنے والی
گیس مصنوعی سیارے سے فی منٹ دس سے نوے چکر لگاتی
رہتی ہے۔ اس گیس کے ختم ہونے پر آریہ بھٹ لٹو کی طرح
لڑکھڑا کر گر جائے گا۔ اور اس کے بعد آریہ بھٹ ۲ کی
تیاریاں لگ بھگ مکمل ہیں۔ اس میں ٹیلی ویژن کیمرہ نظام
ہوگا، جو معدنی ذخیروں اور زرعی فصلوں کے امکانات کا
پتہ لگائے گا۔ لیکن اس کے داغنے کے لیے نئے سمجھوتے
کی ضرورت ہے۔ آریہ بھٹ کے لیے دس مئی ۱۹۷۲ء کو
روس سے سمجھوتا ہوا تھا۔

★★

جناب رشید احمد اعظمی

چھٹیوں کی سرگرمیاں

ہے زمانہ چھٹیوں کا، ہوئے ختم امتحاں سب
ملے گھر کو اپنے مرے آج مہرباں سب
یہ طرح طرح کے مضمون نہ پڑھیں گے آج سے ہم
یہ حساب اور سائنس نہ رٹیں گے آج سے ہم

نہ تو ٹیچروں کا ہم پر کوئی اب کرم ہی ہوگا
بڑا لطف آئے گا اب ہمیں کوئی غم نہ ہوگا
نہ قلم دوات ہوگی نہ بغل میں ہوں گے بستے
کوئی ہوگا اپنے رستے کوئی ہوگا اپنے رستے

جہاں دل کہے گا اپنا وہیں گھومتے پھریں گے
سبھی شادماں رہیں گے سبھی جھومتے پھریں گے
کبھی گرم سیر ہوں گے کبھی باغ میں رہیں گے
وہ خیال ہوں گے پورے جو دماغ میں رہیں گے

یونہی کھیل کود کر ہم شب و روز کاٹ لیں گے
جو گڑھے کبھی ہوں گے حائل سر راہ پاٹ لیں گے
مرے ساتھیو! عزیزو! تمھیں ہو خیال اس کا
نہ کبھی دلوں میں لانا کوئی تم ملال اس کا

یہ زمانہ قیمتی ہے نہ اسے عبث گنواؤ......
بری صحبتوں سے خود کو میرے دوستو بچاؤ
پڑھو سال بھر یونہی تم نہ ڈرو کبھی امتحاں سے
جو اٹھو تو لیکے اٹھو میرے دوستو یہاں سے

یہ تمھاری محنتیں ہی کبھی ہوں گی بارور سب
کبھی پھولیں اور پھلیں گی یہی شاخ اور شجر سب

جناب محمد مبین ایوبی

ہمدردی

احمد ایک گوالے کا لڑکا تھا۔ وہ ساتویں جماعت میں پڑھتا تھا پڑھنے کے ساتھ ساتھ وہ اپنے باپ کے کاموں میں ہاتھ بٹایا کرتا تھا۔ وہ خود دودھ بیچا کرتا تھا۔ اس طرح باپ کے کام میں تھوڑی آسانی ہو جاتی تھی۔

اعجاز اسی کا ہم جماعت لڑکا تھا۔ وہ نیک اور شریف تھا۔ اس میں تمام اچھی عادتیں موجود تھیں اس نے دل بہت حساس پایا تھا۔ وہ کسی پر بھی ظلم ہوتا نہیں دیکھ سکتا تھا۔ اور کسی کی ذرا سی تکلیف پر وہ تڑپ اٹھتا تھا۔ اور ظالم کے خلاف آواز اٹھاتا تھا۔ اس لیے پورے اسکول میں ہر عزیز لڑکا تھا اور ہر کوئی اس کی عزت کرتا۔ احمد کی اعجاز سے گہری دوستی تھی۔ ایک دن احمد دودھ بیچ رہا تھا۔ اور فروخت ہوئے دودھ کی آمدنی گن رہا تھا۔ اس وقت اعجاز دوڑتا ہوا آیا۔ احمد اسے دیکھ کر حیرت میں پڑ گیا۔

"خیریت" اس نے پوچھا

"ہاں" اعجاز نے جواب دیا۔ مگر اس کے چہرے سے پتہ لگ رہا تھا کہ وہ بہت جلدی میں ہے۔ اس کے ہاتھ میں ایک بڑی سی بوتل تھی۔

"ایک لیٹر دودھ دو" وہ بولا۔

احمد اسے گھورنے لگا اور پھر بولا۔ "عجیب بات ہے گھر پر تو دودھ پہنچا دیا ہے کس کے لیے؟ کیا مہمان آ گئے ہیں؟"

"نہیں۔" اعجاز نے جواب دیا۔ "یہ مجھے چاہیے"

"تمہیں اور ایک لیٹر" احمد حیرت سے دیکھنے لگا۔

"کیا لیٹر بھر دودھ پی کر پہلوان بننے کا ارادہ ہے کیا؟"

"ایسا ہی سمجھو" اعجاز مسکرایا۔

احمد نے اس کو دودھ دے کر پیسے لے لیے۔ مگر اس کے ذہن میں یہ سوال کوندتا رہا کہ اعجاز دودھ کیوں لے گیا۔

دوسرے دن بھی اعجاز بوتل لے کر آیا تو اسے حیرت ہوئی آخر اعجاز اتنا دودھ کیا کرتا ہے۔ اس نے دودھ دے دیا۔

اور پھر اعجاز کا معمول ہو گیا۔ وہ روزانہ آتا اور دودھ لے جاتا تھا۔

احمد کے ذہن میں مسلسل دودھ کے بارے میں کیڑے کلبلاتے رہے۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اعجاز دودھ کا کیا کرتا تھا۔ ایک دن سوچا کہ آج وہ اعجاز کا پیچھا کرے گا۔

اس دن اس نے اعجاز کو دودھ دے دیا۔ جب دودھ لے کر اعجاز دور نکل گیا۔ تو وہ دکان سے اٹھ کھڑا ہوا۔ اور اپنے بھائی کو دکان پر بٹھا کر اعجاز کے تعاقب میں چل پڑا۔

اعجاز بوتل چھپاتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا۔ اس کا رخ

ے ایک ویران سے ٹوٹے ہوئے مکان کی طرف تھا۔
احمد ہوشیاری سے اس کا پیچھا کر رہا تھا۔ اعجاز بار بار
یچھے پلٹ کر دیکھتا تھا۔ کہ اس کے پیچھے کوئی آتو نہیں
ا ہے اس لیے احمد مکانوں کی آڑ میں آگے بڑھ رہا تھا۔
ز اعجاز اس ٹوٹے ہوئے مکان کے پاس پہنچ گیا۔ اس نے
اروں طرف دیکھا۔ اور جھٹ سے اس مکان میں گھس گیا
مد بھی اس مکان کے قریب پہنچ گیا۔ اس کو حیرت ہوئی
اعجاز اس مکان میں دودھ لے کر کیا کرنے گیا ہے۔ جیسے
ی وہ مکان میں پہنچا اس کے کانوں میں "کون کون" کی
ازیں آنے لگیں۔

احمد اچھی طرح پہچان گیا یہ آوازیں کتے کے پلّوں کی
یں۔ وہ آہستہ سے اس مکان میں داخل ہو گیا۔ اس
نے دیکھا کے اعجاز چند کتوں کے پلّوں کے پاس بیٹھا ہے۔
ایک پلّہ اس کے پاس آیا۔ اعجاز نے اس کے منہ
سے دودھ کی بوتل لگا دی۔ کتے کا پلّہ آہستہ آہستہ دودھ
پینے لگا۔

احمد حیرت سے اس منظر کو دیکھ رہا تھا۔ اعجاز آہستہ
آہستہ پیار سے دوسرے کتے کے پلّوں کے جسم پر ہاتھ
پھیر رہا تھا۔
احمد سے برداشت نہ ہوئی وہ اعجاز کے سامنے جا کر
کھڑا ہو گیا۔
"احمد ــــ تم" اعجاز اسے دیکھ کر گھبرا
گیا۔
"کیا کر رہے ہو۔"
"کتے کے پلّوں کو دودھ پلا رہا ہوں" اعجاز پیار
سے ایک بچے کے جسم پر ہاتھ پھیرتا بولا۔
"کیوں۔"

"احمد تم تو جانتے ہو" اعجاز اس کے قریب آ کر
بولا "یہ گلی کی کتیا کے بچے ہیں۔ جسے میونسپلٹی والوں
نے زہر دے کر ہلاک کر دیا تھا۔ وہ مر گئی۔ مگر اس کے
یہ چھوٹے چھوٹے بچے تھے۔ ان کی ماں نہیں تھی جو ان
کو دودھ پلاتی اور گوشت وغیرہ لا کر ان کو دیتی۔ اور اگر ان
کو یہ چیزیں نہ ملتیں تو یہ ننھے ننھے بچے بھوک سے تڑپ کر
مر جاتے مجھ سے یہ دیکھا نہیں گیا۔ میں ان کو زندہ
رکھنے کے لیے میں انھیں روز دودھ پلاتا ہوں۔ اور
ان کو گوشت اور روٹی بھی لا کر ڈالتا ہوں۔ تاکہ یہ زندہ
رہیں۔ دیکھو یہ زندہ ہیں اور کتنے موٹے ہو گئے ہیں
آخری جملہ کہتے ہوئے اعجاز کی آنکھوں میں خوشی کی چمک
تھی۔

"اعجاز ــــ تمہاری یہ جانوروں سے ہمدردی۔"
"احمد ــــ ہمدردی ہر اک کے ساتھ کی جا سکتی
ہے۔ چاہے وہ انسان ہو یا جانور وہ آدمی آدمی ہی نہیں
ہے جس کے دل میں کسی کے لیے ہمدردی نہ ہو۔ اور
پھر یہ ننھے بچے تو ہمدردی کے مستحق ہیں" اعجاز بولا
اس وقت ایک بچہ احمد کے پاس آیا۔ احمد نے اسے
اٹھا لیا۔ اور گلے سے لگا لیا۔ سچ مچ ہمدردی انسان
کی زندگی کا ایک حسن ہے جس کے بغیر انسان انسان نہیں۔

• اس شخص کو کبھی موت نہیں آتی جو علم کو زندگی بخشتا ہے
اور وہ شخص فقیر نہیں کہلا سکتا جسے علم و عقل کی دولت
حاصل ہے۔　　　(حضرت علی کرم اللہ وجہہ)

• رضائے الٰہی پر راضی رہنا قلب کو تسکین بخشتا ہے
(حضرت علی کرم اللہ وجہہ)
بشیر الدین شیرکوٹی

بچوں کی کوششیں

ایک روپیہ کا نوٹ

ہمارے گھر کے پاس ایک گھر ہے اس گھر میں ایک کنبہ ہے اس کنبہ میں ایک لڑکا ہے جس کا نام بشیر ہے۔

بشیر بہت اچھا لڑکا ہے ایک دفعہ اس کے ابّا اسے اپنے ساتھ بازار لے گئے بازار میں ایک سے ایک بڑھ کر پھل بک رہے تھے بشیر کے ابّا نے ایک سیب کو دیکھا جس کا رنگ ملا جلا سفید اور گلابی تھا۔ بشیر دیکھتا رہا کہ اس کے ابّا اچھے اچھے بڑے بڑے سیب چھانٹ کر رکھتے رہے انھوں نے چھ سیب رومال میں باندھ کر دیے اور کہا میں کام کو جا رہا ہوں تم اپنی امی کو دے دینا۔ بشیر خوشی خوشی گھر گیا اور امی کو سیب دیے اور ایک روپے کا نوٹ بھی دے دیا۔ انھوں نے پوچھا کہ بیٹے یہ روپیہ کہاں سے ملا بشیر نے جواب دیا کہ جب خونچہ والا سیب چھانٹ رہا تھا تو اس کے خونچے سے گر پڑا تھا جب میں واپس آ رہا تھا تو میں اٹھا کر لے آیا یہ آپ کا ہے اسے رکھ لیجیے امی نے کہا کہ جاؤ اور خونچہ والے کو دے آنا اور کہنا کہ یہ آپ کا روپیہ ہے گر گیا تھا اب یہ آپ لے لیجیے۔ اس خونچہ والے نے اس کو دو سنترے دیے اس نے لینے سے انکار کر دیا اور جب روپیہ دے کر گھر پہنچا تو اس کے ابّا آ چکے تھے۔ انھوں نے جب ایک روپیہ کے نوٹ کی بات سنی تو بہت خوش ہوئے اور کہا کہ میں تمھارے لیے کیلے لایا ہوں اور یہ تم نے اچھا کیا کہ جھوٹ نہیں بولا اور تم کسی کی چیز مت اٹھانا یہ چوری ہے اور اللہ کو ناپسند ہے۔

احمد رشید صدیقی (سیوہارہ)

جھوٹا ڈر

اس دن اتوار تھا۔ انور کی خالہ ان سے ملنے آئی ہوئی تھیں۔ ان کے ساتھ اسلم اور شہناز بھی تھے۔ انھیں دیکھ کر وہ بہت خوش ہوا۔ سارا دن وہ اکٹھے کھیلتے رہے۔

انور کی خالہ کو شام کو جانا تھا۔ پر دوپہر سے ہی بارش شروع ہو گئی۔ اس کی ماں نے کہا۔ "بہن آج رات یہیں رک جاؤ۔ کل چلی جانا۔ بارش میں جانا ٹھیک نہیں ہے۔"

اس کی خالہ ماں گئیں انور تو خوشی سے ناچنے
لگا۔ بولا "رات کو خالہ سے کہانی سنیں گے"
انور کی ماں جلدی۔ جلدی روٹی پکانے کی تیاری
کرنے لگیں۔ ان لوگوں کے سونے کا انتظام بھی کرنا تھا
انھوں نے انور کو بلا کر کہا۔
"انور اوپر والی کوٹھری میں چلے جاؤ۔ وہاں
کچھ چادریں اور دریاں پڑی ہیں۔ اٹھا لاؤ۔"
انور نے اوپر جانے کے لیے سیڑھیوں کی بتی
جلائی۔ پر یہ کیا؟
بلب ہی فیوز تھا۔ اندھیرا ہی اندھیرا تھا۔
انور اندھیرے سے بہت ڈرتا تھا۔ وہ صرف اندھیرے
سے ہی نہیں اکیلا جانے سے بھی ڈرتا تھا۔ پر وہ یہ بات
کسی سے کہنا نہیں چاہتا تھا۔
اسے بچنے کا ایک ہی راستہ دکھائی دیا۔ اور وہ
سیڑھیوں سے ہی لوٹ آیا۔ اور آکر ماں سے بولا
"ماں مجھے چادریں اور دریاں نہیں ملیں"
"ارے وہ کپڑے والی الماری میں ہیں۔ بتی
جلا کر دیکھ لینا" اس کی ماں نے کہا۔
"لیکن سیڑھیوں میں بتی نہیں" انور بولا
"کیا ہوا کمرے میں تو ہے"
"میں اکیلا نہیں جاؤں گا" اس نے روہانسی
آواز میں کہا۔
اسلم اور شہناز اس کی بات سن رہے تھے وہ
بڑے حیران ہوئے۔
شہناز بولی "اپنے ہی گھر میں ڈرتے ہو؟"
"اور اندھیرے میں بھی" اسلم نے کہا
"چلو میں تمھارے ساتھ چلتی ہوں" شہناز نے
اس کا ہاتھ پکڑا۔ انور کو بڑی شرم آئی۔ شہناز اس
سے چھوٹی تھی پر ڈرتی نہیں تھی انور نے سوچا مجھے
ڈرنا نہیں چاہیے۔
دوسرے دن اسلم اور شہناز اپنے گھر چلے گئے
لیکن انور اپنی عادت چھوڑنے کی ترکیب سوچتا رہا
جب اندھیرا ہو جاتا تو وہ سیڑھیوں پر چڑھنے کی
کوشش کرتا۔ لیکن دو چار سیڑھیاں چڑھنے کے
بعد ہی وہ ڈر کر نیچے اتر آتا
دھیرے دھیرے وہ اس بات کو بھول گیا۔
ایک دن اس کی ماں کو کسی پارٹی میں جانا
تھا۔ پارٹی شام کو تھی رات کو لوٹنے میں انہیں
دیر ہو گئی۔ انور کو اسکول کا کام کرنا تھا۔ دن میں
وہ اوپر والے کمرے میں بیٹھا تھا۔ اس کی کاپیاں وہیں
پڑی رہ گئی تھیں۔ اب اوپر سے کاپی لائے بنا کام کیسے
کرے؟
وہ ماں اور پاپا کا انتظار کرنے لگا۔ کافی دیر
تک بھی وہ نہ آئے۔ تو وہ بہت پریشان ہوا۔ اگر
اسکول کا کام پورا نہ ہوا تو ساری کلاس میں شرمندہ ہونا
پڑے گا۔
اس نے سوچا "آج چاہے کچھ بھی ہو میں کاپی ضرور
لاؤں گا اور وہ بھی اندھیرے میں جا کر"
اور اس نے ویسا ہی کیا۔ وہ دھیرے دھیرے
ایک ایک سیڑھی چڑھ کر گیا۔ کمرے میں جا کر بتی جلائی
کاپی نکالی اور بتی بجھا دی۔ اس طرح وہ بنا ڈرے نیچے
اتر آیا۔ اب اسے ذرا بھی ڈر نہیں لگ رہا تھا۔ کیونکہ
اب وہ سمجھ گیا تھا۔ کہ ڈر صرف دل کا وہم ہے۔
خالد نواز خاں (غازی پور)

جناب ارمغان ساحل سہسرامی

چاچا نہرو

سب سے پیارے چاچا نہرو
آنکھ کے تارے چاچا نہرو

بچوں کے متوالے تھے وہ
ان کی آنکھ کے تارے تھے وہ
دیش کا اونچا نام کیا ہے
نہیں کبھی آرام کیا ہے
بچوں سے الفت رکھتے تھے
اور سب سے محبت کرتے تھے
بچوں سے کھیلا کرتے تھے
بچے بھی چاچا کہتے تھے
کتنے پیارے پیارے سے تھے
چاچا بھولے بھالے سے تھے
قوم کے وہ ہی راہنما تھے
بھارت کا سندر سپنا تھے

ساحل ان کا نام بہت ہے
گھر گھر چرچا نام بہت ہے

جناب عبدالعزیز نشتر

نخروں والی میری گڑیا

نخروں والی میری گڑیا
بالکل ہے آفت کی پڑیا
بات بات پر غصہ ہوتی
چپکے چپکے پہروں روتی
روٹھے تو مشکل ہے منانا
کب تک اس کے ناز اٹھانا
لیکن گڈا سیدھا سادا
اس کی چنتا ہم کو زیادہ
دونوں کی جو کر دیں شادی
گڈے کی ہوگی بربادی
مانگے گی وہ گہنا زیور
دکھلائے گی تیکھے تیور
چنتا سے تب بھولا گڈا
ہو جائے گا جلدی بڈھا
ہم نے بھی یہ سوچ لیا ہے
اپنے دل کو کڑا کیا ہے
عادت اچھی ہوگی نہ جب تک
شادی اس کی ہوگی نہ تب تک
چاہے ہو جائے وہ بڑھیا
نخروں والی میری گڑیا

۵ بندیات

کتاب	مصنف	قیمت
یلک نا رو	یوسف ناظم	۲/۰۰
انعامی معاملہ اور مدرسی کہانیاں	محمد حسن حسان ندوی	۱/۰۰
انصاف کا خون	ابرار محسن	۰/۷۵
جیت کس کی	محمد حسین حسان ندوی	۱/۰۰
دعوت ملا جی کی	″ ″ ″	۰/۵۰
پکڑ دم کٹے کو	مولانا عبدالواحد سندھی	۰/۶۰
تدورانا پردیس چلے	″ ″ ″	۰/۷۰
بتو جتو	″ ″	۰/۶۰
پان کھا کر طبلہ بجا کر رام ناچا	″ ″	۰/۶۰
بدنصیب شہزادی	ابرار محسن	۱/۰۰
عقل کا سودا	″ ″	۰/۷۰
جنگل کا راجا	″	۱/۰۰
تیس مار خاں	″	۰/۹۰
بندر کا گھر	خضر برنی	۰/۴۵

کتاب	مصنف	قیمت
دلی دور ہے	مجیب احمد خاں	۰/۵۰
جب اور اب	آصف مجیب	۱/۷۵
تین کوڑیاں	اقبال امروہوی	۱/۲۰
سونے کا پنجرہ	احسان الحق	۰/۶۵
چینی کی گڑیا	محمد حسین حسان ندوی	۰/۵۰
بہادر سیاح	″ ″ ″ ″	۰/۶۵
چچا غالب	مرتبہ: محمد حسین حسان ندوی	۲/۰۰
ہرن کے بچے	ترجمہ: قرۃ العین حیدر	۰/۵۰
بھیڑیے کے بچے	″ ″ ″ ″	۰/۵۰
میاں ڈھینچوں کے بچے	″ ″ ″ ″	۰/۵۰
شیر خاں	″ ″ ″ ″	۰/۵۰
لومڑی کے بچے	″ ″ ″ ″	۰/۵۰
بہادر	″ ″ ″ ″	۰/۷۵

بچوں کی کتابیں

مذہب

کتاب	مصنف	قیمت
ارکانِ اسلام	مولانا اسلم جیراجپوری	۱/۶۰
آں حضرتؐ	الیاس احمد مجیبی (اردو)	۰.۸۰
آں حضرت	الیاس مجیبی (ہندی)	۰/۶۰
پاک کہانیاں (دو حصوں میں)	مقبول احمد سیوہاروی	۳/۰۰
چار یار	الیاس احمد مجیبی	۲.۵۰
خلفائے اربعہؓ	خواجہ عبدالحیٔ فاروقی	۳/۰۰
رسولِ پاکؐ	عبدالواحد سندھی	۲.۰۰
عقائدِ اسلام	مولانا اسلم جیراجپوری	۰.۶۰
مسلمان بیبیاں	مولانا الٰہی رزاق ندوی	۱/۰۰
نبیوں کے قصے	خواجہ عبدالحیٔ فاروقی	۱.۵
ہمارے رسول	، ، ،	۲/۴۰
ہمارے نبی (اردو)	سید نواب علی رضوی	۱/۲۰
ہمارے نبی (ہندی)	سید نواب علی رضوی	۰/۴۰
سرکارِ دو عالم	محمد حسین حسان ندوی	۲/۰۰

معلومات

کتاب	مصنف	قیمت
آدمی کی کہانی	مشتاق احمد	۲/۰۰
انوکھا عجائب خانہ (چار حصے)	محمد حسین حسان ندوی (چار حصے)	۲/۰۰
بجلی کی کہانی	علی احمد خاں	۰/۵۰
پیداوار کی کہانی	محمد عبدالغفور	۰/۸۰
تاریخِ ہند کی کہانیاں (اول)	خجستہ سلطان	۱/۰۰
، ، ، (دوم)	ضیاء الرحمٰن	۱.۳۰
، ، ، (سوم)	مشتاق احمد اعظمی	۱.۰۰
، ، ، (چہارم)	، ،	۱/۲۵
[illegible]رسانی کے طریقے	رفیعہ منظور الامین	۱.۰۰
[illegible]کے بچے	محمد حسین حسان ندوی	۱.۲۵
	ڈاکٹر مجاہد حسین زیدی	۲.۰۰

کتاب	مصنف	قیمت
رابندر ناتھ ٹیگور	صفدر حسین	۲/۹۰
سماجی زندگی (چار حصے)	احمد پٹیل و غلام ابرار	۴/۹۰
قدرت کے کرشمے	(مرتبہ) مکتبہ جامعہ لمیٹڈ	۰/۸۰
سمندر کے کنارے	سلطانہ آصف فیضی	۱/۵۰
سمندر کے نیچے	، ، ،	۲/۵۰
میر انیس	محمد حسین حسان ندوی	۱/۲۵
ہماری پارلیمنٹ	کیلاش چندر	۱/۲۵

کہانیاں، ڈرامے، ناولے

کتاب	مصنف	قیمت
جن حسن عبدالرحمٰن (ناول) دو حصے		۵/۰۰
اس نے کیا کر دکھانا (کہانیاں)	آصف مجیب	۰/۳۷
پریم کی جیت (ڈراما)	اسداللہ کاظمی	۰/۳۷
نانبیل خاں (کہانی)	محمد حسین حسان ندوی	۰/۵۰
ترکوں کی کہانیاں (کہانی)	مرتبہ: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ	۰/۵۵
تیس مار خاں کے کارنامے (ناول)	م۔ ندیم	۱/۵۰
تین اناڑی (ناول)	عصمت چغتائی (زیرِ طبع)	
چمپاوت کا آدم خور شیر (سچی کہانی)	محمد معین	۰/۳۵
چھوٹی لالٹین	مشتاق احمد	۰/۳۵
چقماق کی ڈبیا	برکت علی فراق	۰/۴۰
خربوزہ شہزادے کا سر بن گیا	کوثر بانو	۰/۴۰
شیدلا	پروفیسر محمد مجیب	۰/۵۰
چنبیلی	محمد حسین حسان ندوی	۰/۵۰
ستاروں کی سیر (ناول)	کرشن چندر	۲/۰۰
کوے دادا (سچی کہانی)	مجیب احمد خاں	۲/۰۰
لال مرغی (کہانی)	عبدالواحد سندھی	۰/۵۰
مزہ چکھائیں گے (،)	مرتبہ: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ	۰/۲۵
مزے دار پہیلیاں	(مرتبہ) محمود علی خاں (زیرِ طبع)	
ننھا ٹٹو (کہانی)	خورشید سلطان	۰/۳۰

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ - جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵

ماہنامہ
پیامِ تعلیم
نئی دلی ۲۵

جلد ۱۲ شمارہ ۹

اڈیٹر
ولی شاہجہانپوری

معاون
صفیہ حسان

ستمبر ۱۹۷۵ء

قیمت فی پرچہ ۷۰ پیسے
سالانہ چندہ سات روپے

پرنٹر پبلشر سید احمد ولی نے مکتبہ جامعہ لمیٹڈ کے لیے جمال پرنٹنگ پریس دہلی میں چھپوا کر جامعہ نگر نئی دہلی سے شائع کیا۔

حضور: میری چینی اور آٹے کی
بوریوں کا دھیان رکھیں۔

بچوں سے باتیں

مجھے سب سے پہلے تو پیامیوں سے معذرت کرنی ہے کہ اگست کا شمارہ انھیں دیر سے ملا اور یہ شمارہ بھی دیر سے ہی نکلے گا۔

اب سنیے اس شمارہ کا قصہ۔ ۵۔ اگست کو مجھے فلو نے آن دبوچا گرفت اتنی سخت تھی کہ دس دن تک گھر سے باہر قدم نہ نکل سکا۔ مرض نے تو چھوڑ دیا۔ مگر کمزوری نے یہ حالت بنا رکھی ہے کہ آج ۲۵۔ اگست کو بھی صرف آپ سے باتیں کر سکا ہوں۔ ابھی تک دفتر کے دوسرے کام کرنے کی ہمت نہیں ہوتی۔ بہرحال اب یہ کمزوری بھی رخصت ہو رہی ہے اور بہ ظاہر تشویش کی کوئی بات نہیں ہے۔

ہر سال کی طرح اس مرتبہ بھی ۱۵۔ اگست کو وزیر اعظم مسز اندرا گاندھی نے لال قلعہ پر قومی پرچم لہرایا اور قوم سے خطاب کرتے ہوئے تلقین کی کہ ہم سب کو اپنی اپنی جگہ نہایت دیانت داری سے اپنے فرائض انجام دینا چاہیے۔ آپ کے ذمہ یہ کام ہے کہ آپ اپنی پڑھائی میں محنت کریں۔ اچھے نمبروں سے کامیابی حاصل کریں اور اس طرح اپنا فرض ادا کریں۔

یہ پرچہ آپ کو کیسا لگا۔ اس سے ہمیں ضرور آگاہ کیجیے۔ میں نے علالت کے دوران اسے ترتیب دیا ہے اس لیے کہہ نہیں سکتا کہ آپ کو کس حد تک پسند آئے گا۔ جہاں تک میرے

حواس نے ساتھ دیا، میں نے کوشش کی ہے کہ آپ کی دلچسپیوں میں کمی نہ آئے۔

ریحان احمد عباسی صاحب کی "شکاری باتیں" شیر کے مارے جانے کے بعد ختم ہو گئیں۔ مگر انھوں نے وعدہ کیا ہے کہ وہ آپ کو محظوظ کرنے کی کوشش کرتے رہیں گے۔

خلیق انجم اشرفی صاحب کا ڈرامہ "ٹھوکر" پڑھنے کی چیز ہے۔ سلطان احمد صاحب ساحل کا "آذار" بڑا معلوماتی مضمون ہے۔ محمد امین صاحب کی کہانی "ہوا کا فیصلہ" بھی آپ کو پسند آنا چاہیے۔ مفتون کوٹوی، شوکت پردیسی اور خضر بستی صاحبان کی نظمیں بھی دلچسپ ہیں۔ مسعودہ حیات صاحبہ، نثار گورکھپوری صاحب وغیرہ کی نظمیں بھی وقت کی چیزیں ہیں اور خوب ہیں۔

ہاں بھئی ایک خوشگوار تبدیلی آپ کو اس شمارے میں اور نظر آئے گی۔ مسٹر گلیڈون عیسیٰ نے برسہا برس پیام تعلیم کی تزئین میں حصہ لیا ہے ادھر کچھ سال پہلے وہ مکتبہ جامعہ سے ریٹائر ہو گئے تھے اب پھر پیام تعلیم کی محبت نے انھیں اس طرف متوجہ کر دیا ہے اب آپ کو پرچہ چھپا چھپا سا لگے گا۔ دعا کیجیے کہ ان کی صحت قایم رہے اور وہ اپنی خواہش پر عمل کرتے رہیں۔

تقریباً ۳ سال ہوئے جب رشید حسن خاں صاحب نے "حرفوں کا جادو" کے عنوان سے ایک مفید سلسلہ بہت دلچسپ انداز میں شروع کیا تھا۔ اس کا مقصد تھا۔ اردو املا کی تعلیم۔ یہ سلسلہ کافی پسند کیا گیا تھا۔ مرحوم حسین حسان صاحب نے خاں صاحب سے اصرار کیا کہ یہ سلسلہ جاری رکھا جائے۔ مگر خاں صاحب کی مصروفیتوں نے اس میں بریک لگا دیا اور گاڑی چند اسٹیشنوں کے بعد رک گئی۔ جب مرحوم نے بہت اصرار کیا تو رشید حسن خاں صاحب نے اپنا پورا مسودہ حسین صاحب کے سپرد کر دیا۔

کچھ دن بعد حسین حسان صاحب اللہ کو پیارے ہوئے اور کاغذ کی قلت اور دوسری مصروفیتوں کے باعث اس مسودہ پر غور کرنے کا موقع نہ مل سکا۔ یکایک یہ خیال آیا کہ حسین حسان صاحب کی پہلی برسی (۱۳۔ جولائی ۱۹۷۵ء) پر اس کو شایع کیا جائے۔ چنانچہ خاں صاحب سے اس پر نظر ثانی کی درخواست کی گئی جسے موصوف نے منظور کر کے کتاب کو منسوب بھی حسین حسان صاحب مرحوم کے نام کر دیا۔ یہ کتاب جس کا نام ہے "اردو کیسے لکھیں" انشاء اللہ جلد ہی شایع ہو جائے گی۔

پیام تعلیم کے ایک ہمدرد رفیق ہیں خالد عرفان صاحب۔ آپ بنگلور میں کیمسٹری کے استاد ہیں۔ بہت دنوں کے بعد ایک عمدہ مضمون ارسال کیا ہے جس کا عنوان ہے "کیا آپ ہوا میں سوراخ کر سکتے ہیں؟" یہ مضمون اکتوبر میں پڑھیے۔

جناب شوکت پردیسی

آزادی کا لمحہ

(یہ گیت اگست کے پرچے میں چھپنا چاہیے تھا۔ دیر سے موصول ہونے کی وجہ سے ایسا نہ ہوسکا۔ اب پیش ہے) (مدیر)

ساری دنیا میں ہے میری یکساں عزت یارو!
ساری دنیا میں ہے میری شان وشوکت یارو!
دیس دیس کے پرچم کی ہے مجھ سے عظمت یارو!
میری خاطر لوگوں نے دے دی ہے اپنی جان
میں ہوں آزادی کا لمحہ میری بڑی ہے شان

میں نے آکر لہرایا ہے لال قلعہ پر پرچم
میں نے ہی اس ماہ کو بخشا ہے اک ربط باہم
میرے ساز سے گونجے آزادی کے نغمے ہمدم
پیار و محبت سے ملتا ہے مجھ سے ہر انسان
میں ہوں آزادی کا لمحہ میری بڑی ہے شان

بستی بستی، گلشن گلشن ہے میرا ہی چرچا
آج فضا میں گونج رہا ہے ہر سو میرا نغمہ
میرے آنے سے بچوں میں ہے کتنی سندرتا
آج ہے سب کے دل میں جیسے خوشیوں کا طوفان
میں ہوں آزادی کا لمحہ۔ میری بڑی ہے شان

★

یوم آزادی کے موقع پر

اس سال یوم آزادی کی اہمیت خاص طور سے بڑھ گئی ہے۔ ہماری عظیم پردھان منتری نے جو بروقت فوری اور حوصلہ مندانہ قدم اٹھائے ہیں ان کی بدولت ملک انتشار، انارکی اور بربادی کے غار میں گرنے سے بچ گیا ہے۔ کچھ سماج و ملک دشمن عناصر نے ایسے ہی غیر ملکی عناصر سے ساز باز کرکے بھارت کی جمہوریت اس کی ایکتا اور طاقت کو برباد کرنے کی کوشش کی تھی۔ ایمرجنسی کے نفاذ اور قومی زندگی کو مضبوط کرنے اور بھرشٹاچار، نااہلیت، جمع خوری، منافع خوری، اسمگلنگ اور ایسی ہی دوسری برائیوں کو ختم کرنے کے لیے جو سخت قدم اٹھائے گئے ان کا ایک بہت اچھا اثر ہوا ہے۔ تبھی پردھان منتری نے ملک کی اقتصادی کایا پلٹ کے لیے ایک ۲۰ نکاتی انقلابی پروگرام کا اعلان کیا۔ ان انقلابی اقدامات سے پورے ملک کو ایک نئی روح اور ایک نئی طاقت سے بھر دیا ہے اور ملک میں تعمیری سرگرمیوں، قومی وقار کو بلند رکھنے، ذمہ داری و ڈسپلن محسوس کرنے کا ماحول پیدا ہوا ہے۔ قیمتوں میں گراوٹ آنے لگی اور ملک کے ہر گاؤں اور زندگی کے ہر میدان میں لوگوں نے، مزدوروں اور فیکٹری مالکوں نے، طلباء طالبات نے، کسانوں اور دفتر میں کام کرنے والے لوگوں نے اس بات کا عہد لیا ہے کہ وہ سخت محنت کرکے پیداوار کو بڑھائیں گے اور عام لوگوں کے لیے اچھی اور فوری خدمات مہیا کریں گے۔

اس سے بھی زیادہ ملک میں نیا اعتماد جاگا ہے اُن میں پھر سے اس بات کا بھروسا پیدا ہوا ہے کہ ان میں بڑے بڑے کام کرنے کی صلاحیت ہے۔ سماج دشمن اور ملک دشمن عناصر عوام کے جس اعتماد کو توڑنا چاہتے تھے وہ پھر سے پیدا ہوا ہے۔ اور ہم پھر سے ایک نئے بھارت کے راستے پر آگے بڑھ رہے ہیں۔ ایک ایسا بھارت جو ایکتا کی رسی میں بندھا ہوگا، طاقتور ہوگا اور ایسا بھارت جو اپنے مثالی سیکولرزم، سماج واد اور جمہوریت پر مبنی ہو، ایک ایسا بھارت جس میں

باقی صفحہ پر

جناب آفاق دانش

عالم بھیڑیا اور جاہل لومڑی

(بنیادی خیال ایک یونانی کہانی سے لیا گیا ہے)

لومڑی اپنی مکاری کے لیے کتنی مشہور ہے
یہ تو آپ جانتے ہی ہیں۔
لومڑی کی دوستی بھی بہت خطرناک ہوتی ہے۔
وہ اپنے دوستوں کی ایسی لمبی چوڑی تعریفیں کرتی
ہے کہ خود اس کے دوست دنگ رہ جاتے ہیں اور
اپنی من بھاتی تعریفیں سن کر پھولے نہیں سماتے۔
اور اپنے بارے میں اتنے خوش گمان ہو جاتے
ہیں کہ خود کو بڑے سے بڑے خطروں کے سامنے
پیش کر دیتے ہیں۔ نتیجہ کیا ہوتا ہے۔ وہ آپ سمجھ ہی
گئے ہوں گے۔ یعنی سراسر تباہی۔

ایک جنگل میں ایک لومڑی اور ایک بھیڑیا
اچھے دوست کی طرح رہتے تھے۔ ایک دن بھیڑیے
نے شکار کیا۔ شاید اس دن اس کو زیادہ بھوک لگی
تھی اس لیے لومڑی بی بی کو کچھ حصہ دیے بغیر ہی وہ
سارا شکار کھا گیا۔ بی لومڑی اسی دوران بھیڑیے
کے گھر پہنچیں۔ وہاں دیکھا تو گوشت ختم صرف بال و پر
رہ گئے تھے۔ دل میں سوچا کہ شاید شکار بہت عمدہ
تھا اس لیے بھیڑیا اکیلے ہی چٹ کر گیا۔

دوسرے دن لومڑی کا جنگل کے اندر ہی ایک
چھوٹے سے میدان میں گزر ہوا۔ وہاں ایک جنگلی
گھوڑا گھاس کھانے میں مصروف تھا۔ لومڑی
فوراً دوڑ کر اپنے دوست بھیڑیے کے پاس آئی اور
بولی۔ "دوست! آج ایک بہت ہی خوبصورت
جانور نظر آیا ہے۔ اس کا اگر شکار ہو سکے تو پھر کیا
پوچھنا ہے۔ میرا خیال ہے کہ جنگل کے جانوروں میں
اس سے اچھا گوشت کسی کا نہیں ہوگا۔" بھیڑیا لومڑی
کے ہمراہ اس میدان تک آیا۔ پہلے دور سے ہی دونوں
ایک جگہ ٹھہر کر گھوڑے کو دیکھنے لگے۔ اتنے میں گھوڑے
نے دو ایک بار ہنہنا کر ان کو آگاہ کر دیا کہ ان سے بالکل
ڈرا ہوا نہیں ہے۔ لومڑی گھوڑے کے پاس آئی
اور گھوڑے سے بولی: "جناب عالی! آپ کا خوبصورت
جسم، آپ کی یہ لمبے بالوں والی دم، یہ بلند کاٹھ اور
یہ بے مثال آواز، واللہ آپ کا اس بھرے جنگل میں
تو کوئی ثانی ہے ہی نہیں۔" گھوڑے نے اپنی
تعریف سنی تو پھر ہنہنایا۔

لومڑی نے پوچھا۔ "کیا اس ناچیز کو اپنا اسم گرامی
بتانے کی زحمت گوارا کریں گے؟"

گھوڑا بولا، "یہ میرا نام میرے کھر پر نقش ہے۔"

جو جانتا چاہے وہ اسے پڑھے۔"

لومڑی بولی: "بندہ پرور کاش کہ یہ سعادت میرے نصیب میں ہوتی! میرے والدین بے چارے اتنے غریب تھے کہ وہ مجھے تعلیم نہ دلا سکے۔ ہاں! میرا دوست بھیڑیا اچھا خاصا پڑھا لکھا ہے۔ اس کے پاس علم و ہنر کے درجنوں سرٹیفکٹ موجود ہیں۔ وہ آپ کا اسم گرامی ضرور پڑھے گا۔" بھیڑیا لومڑی کی زبانی اپنی تعریفیں سن کر پھول گیا اور بڑے عالمانہ غرور کے ساتھ گھوڑے کے پاس گیا۔ جیسے ہی اس نے گھوڑے کے کھُر کی طرف اپنا منہ جھکایا۔ گھوڑے نے وہ زوردار دولتی جھاڑی کہ بھیڑیا چاروں شانے چت دور جا گرا۔ اس کے جبڑے کی ہڈی ٹوٹ گئی اور اس کا تھوتھنا لہو لہان ہو گیا۔

لومڑی بولی: "دوست یہ تو برا ہوا۔ خیر چلو ابھی ایک طرف کا جبڑا تو سلامت ہے۔ آئندہ اس طرح کسی کا نام پوچھنے کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ ایسے سرپھروں سے تو اللہ دور ہی رکھے۔ اچھا ہی ہوا جو میرے والدین غریب تھے۔ ورنہ وہ مجھے اسکول ضرور بھیجتے۔ اور پڑھنے لکھنے کی ایسی ہی سزا مجھے بھی ملتی۔"

***

برکھا کی بہار

از مسعودہ حیات

آئی برکھا کی بہار   دل کی دنیا کا قرار
اس کا رنگ نرالا
بچہ بچہ تڑپ رہا تھا تیز تپش کے مارے
لوگوں کے دل پر چلتے تھے گرم ہوا کے آرے
لو کے کارن سوکھ گئے تھے پانی کے سب دھارے
آئی برکھا کی بہار   دل کی دنیا کا قرار
اس کا رنگ نرالا
نیل گگن پر رنگ برنگا جھوم کے بادل آیا
مدت کی پیاسی دھرتی پر امرت رس برسایا
آنکھوں میں ٹھنڈک سی آئی دل نے بھی سکھ پایا
آئی برکھا کی بہار   دل کی دنیا کا قرار
اس کا رنگ نرالا
کھیتوں کا دہقان چلا ہے کاندھے پر ہل رکھ کر
ساتھ چلے ہیں بیوی بچے بوجھ اٹھائے سر پر
بوئیں گے یہ کھیت کو اپنے جوت جلے گی گھر گھر
آئی برکھا کی بہار   دل کی دنیا کا قرار
اس کا رنگ نرالا
دھرتی پر سبزہ لہرایا پھول کھلے گلشن میں
ڈالی ڈالی کوئل بولے، مور بھی ناچے بن میں
قوسِ قزح نے رنگ بکھیرے کتنے آج گگن میں
آئی برکھا کی بہار   دل کی دنیا کا قرار
اس کا رنگ نرالا
سکھیوں نے ملہاریں گائیں برساتوں کی مستی میں
جی کو مست کر کے ہوک سی اٹھی ہر شاعر کے دل میں
اب بھی کوئی تشنہ لب [illegible]
آئی برکھا کی بہار   دل کی دنیا کا قرار
اس کا رنگ نرالا

[illegible]
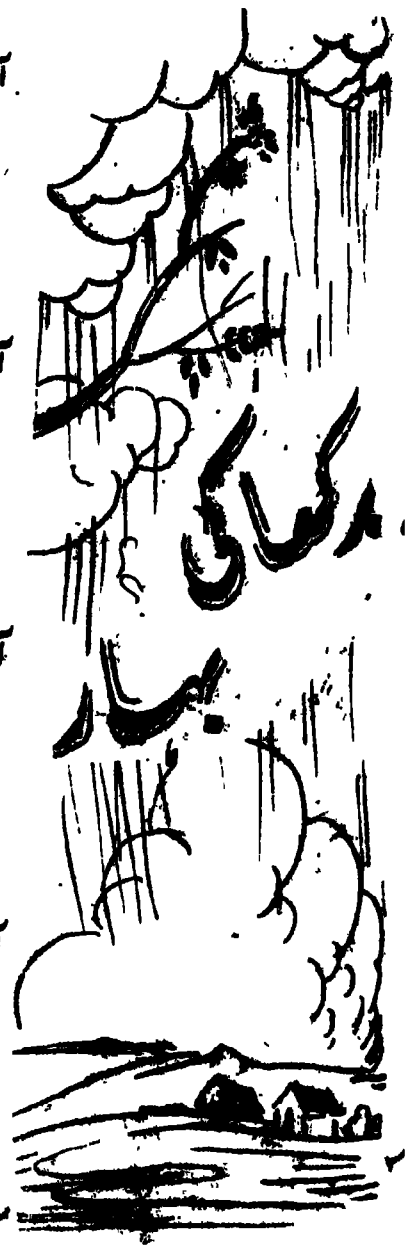
برسات آگئی ہے، برسات آگئی ہے

بارش کی کیف افزا ہر رات آگئی ہے ۔۔۔ فصلِ رے کے رنگین جذبات آگئی ہے
فضلِ خدا کی ہم کو سوغات آگئی ہے ۔۔۔ ہے دل نواز جس کی ہر بات آگئی ہے

برسات آگئی ہے برسات آگئی ہے

پُرکیف ہیں فضائیں پُرعیش ہیں ہوائیں ۔۔۔ کرتی ہیں مست ہم کو ماحول کی ادائیں
جھولیں، جھلائیں، باہم مل کر خوشی منائیں ۔۔۔ لو سیر کرنے نکلیں، ٹہلیں، پھریں، پھرائیں

برسات آگئی ہے، برسات آگئی ہے

بارش کو قبضہ دے کر، گرمی ہوئی روانہ ۔۔۔ بوندیں بنیں حقیقت، لوئیں ہوئیں فسانہ
بنگلہ ہو، جھونپڑا ہو، کوٹھی، غریب خانہ ۔۔۔ ہو در کہ آستانہ، ٹھنڈا ہے ہر ٹھکانہ

برسات آگئی ہے۔ برسات آگئی ہے

بارش شروع کی ہے، دلکش ہیں کیا پھواریں ۔۔۔ آبِ حیات بوندیں پتوں کو جو نکھاریں
ٹھنڈی ہوا کے جھونکے، ذہن و نظر سنواریں ۔۔۔ ہیں دل ربا فضائیں، جذبات کو ابھاریں

برسات آگئی ہے۔ برسات آگئی ہے

بچے بھی خوش، جواں بھی، بوڑھے بھی شادماں ہیں ۔۔۔ کیسی تمازتیں تھیں؟ باقی وہ اب کہاں ہیں
دل ہیں شگفتہ، [illegible] شادابیاں جہاں ہیں ۔۔۔ رنگینیاں ہیں جتنی ناقابلِ بیاں ہیں

برسات آگئی ہے، برسات آگئی ہے

برسے گا [illegible] اب تو ساون برس رہا ہے ۔۔۔ رم جھم برس رہا ہے، چھن چھن برس رہا ہے
[illegible] آنگن، آنگن برس رہا ہے ۔۔۔ تو چھت ٹپک رہی ہے، [illegible] برس رہا ہے

برسات آگئی ہے، برسات آگئی ہے

[illegible] بارش کے بعد سردی ۔۔۔ پتوں پہ گاہ سرخی، سبزی ہے گاہ زردی
[illegible] تمام کر دی ۔۔۔ موسم نے پھر بھی مستی، طبعِ حزیں میں بھر دی

برسات آگئی ہے، برسات آگئی ہے

جناب رشید الدین

ابو العلاء معرّی

شاعرِ مشرق علامہ اقبال کے دوسرے اردو مجموعۂ کلام "بالِ جبریل" میں ایک مختصر سی نظم ہے جس کا عنوان ہے "ابو العلاء معرّی" گو یہ ایک مختصر سی نظم ہے مگر اس میں اقبال نے زندگی کا ایک بہت بڑا فلسفہ بیان کیا ہے، ابو العلاء معرّی عربی زبان کا مشہور شاعر تھا۔ اس کے قصائد کا مجموعہ "لوازم" کے نام سے مشہور ہے۔ اس کے علاوہ نثر میں اس کا ایک رسالہ "غفران" کے نام سے ملتا ہے۔

یہ شخص گوشت نہیں کھاتا تھا بلکہ سبزی خور تھا۔ ہندوستان میں تو خیر یہ کوئی خاص بات نہیں کیونکہ یہاں اکثر لوگ ترکاری استعمال کرتے ہیں۔ اور گوشت سے قطعی پرہیز کرتے ہیں لیکن عرب جیسے ملک میں یہ بڑی عجیب بات معلوم ہوتی ہے کہ ایک مسلمان گوشت نہیں کھاتا۔ چنانچہ ایک بار اس کے ایک دوست نے اسے بھنا ہوا تیتر بھیجا کہ اس طرح اس کی قسم ٹوٹے لیکن معرّی نے اسے کھانے کی بجائے اس خوان کی طرف دیکھ کر مردہ تیتر سے مخاطب ہو کر کہا:

"افسوس کہ تجھے تیری کمزوری نے مارا۔ اگر تو کمزور نہ ہوتا تو آج اس طرح میرے دسترخوان پر نہ آتا۔"

معرّی اس بات پر افسوس کا اظہار کرتا ہے کہ وہ تیتر کی بجائے شاہین کیوں نہ بنا۔

افسوس صد افسوس کہ شاہیں نہ بنا تو
دیکھے نہ تیری آنکھ نے فطرت کے اشارات

نظم صرف چھ اشعار پر مشتمل ہے جس کا پانچواں شعر اوپر درج کیا گیا ہے۔ چھٹے شعر پر نظم ختم ہوجاتی ہے اور یہی اس نظم کا حاصل ہے۔ یہ وہ شعر ہے جو معرّی تیتر سے مخاطب ہو کر کہتا ہے۔ لیکن اس میں زندگی کا ایک فلسفہ چھپا ہوا ہے۔ شعر یہ ہے۔

تقدیر کے قاضی کا یہ فتویٰ ہے ازل سے
ہے جرمِ ضعیفی کی سزا مرگِ مفاجات

یعنی دنیا طاقتوروں کی ہے کمزوروں کی نہیں۔ یہاں جو کمزور ہے وہ اپنی موت آپ مر جاتا ہے اور جو طاقتور ہے وہ دنیا سے اپنا وجود منوا لیتا ہے۔ اس میں بقائے اصلح کا اصول پیش کیا گیا ہے۔ یعنی دنیا میں وہی سرخرو ہوتا ہے جو صالح یعنی اچھا یا طاقتور ہے اور جو کمزور اور ناتواں ہوتے ہیں وہ زندگی کی سختیوں کا مقابلہ نہیں کرسکتے۔ علامہ اقبال کا یہ شعر اتنا مشہور ہوا کہ اس نے اردو میں ضرب المثل کی حیثیت اختیار کر لی ہے۔ طلبا اور خصوصاً نوجوانوں کو اس شعر کو ہمیشہ پیش نظر رکھنا چاہیے تاکہ وہ عملی زندگی میں کامیاب اور کامران رہیں۔

جناب شاہد جمیل

شب برات

پھر سال بھر پہ دوستو آئی شب برات
[illegible] بخششوں کی جھولیاں لائی شب برات

دامن میں رحمتوں کے سمندر لیے ہوئے
یارو ہر اک نگاہ کو بھائی شب برات

ہر دل سرور و کیف میں ڈوبا ہوا لگے
یوں سج کے ہر نظر میں سمائی شب برات

جس سمت دیکھیے ہیں پٹاخوں کی گڑبڑیاں
اک شور سا فضاؤں میں لائی شب برات

ہر گھر بنا ہوا ہے عبادت کا گلستاں !
رحمت سراپا بن کے ہے چھائی شب برات

[illegible] حساب آج گناہ و ثواب کا
[illegible] کس طرح سے منائی شب برات

[illegible] پہ رکھ دو دلِ سیاہ
[illegible] ہر ایک برائی شب برات

جناب رشید عارف (بمبئی)

ہمارا گیند

اُچھلتا، اُچھلتا، اُچھلتا چلا
کبھی دائیں جانب کبھی بائیں اور

اسے اپنے پیروں سے ماریں گے ہم
اسے لے کے میدان میں جائیں گے ہم
اِدھر اور اُدھر لے کے بھاگیں گے ہم
یہ ناچے تو ساتھ اس کے ناچیں گے ہم

اُچھلتا، اُچھلتا، اُچھلتا چلا
کبھی دائیں جانب کبھی بائیں اور

اگر چاند ہم ہیں تو تارا ہے گیند
ہم اِس کے ہیں اور یہ ہمارا ہے گیند
ہمارے لیے اک سہارا ہے گیند
ہماری طرح سب کو پیارا ہے گیند

اُچھلتا، اُچھلتا، اُچھلتا چلا
کبھی دائیں جانب کبھی بائیں اور

نام تعلیم
دنود رستوگی

ترجمہ: جناب خلیق انجم اشرفی

ٹھوکر

کردار

شرما جی: استاد عمر پینتالیس سال
سنیل: شرما جی کا لڑکا عمر پندرہ سال
مہیش: ایک نقلچی طالب علم عمر سترہ سال
شیلو: مہیش کا غنڈہ دوست عمر بیس سال
مقام: شرما جی کی بیٹھک
وقت: صبح

(معمولی سی بیٹھک ہے۔ ایک تخت بچھا ہے۔ دو تین کرسیاں پڑی ہیں ——— ایک پر کتابیں رکھی ہیں، دوسرے پر اخبار اور رسالے۔ کمرے میں دو دروازے ہیں۔ داہنی طرف کا دروازہ اندر جانے کے لیے اور بائیں طرف کا دروازہ باہر جانے کے لیے۔ پردہ اٹھتا ہے۔ شرما جی اخبار پڑھتے نظر آتے ہیں اندر سے سنیل چائے لے کر آتا ہے)

سنیل: پتاجی۔ چائے لیجیے۔

شرما جی: (پڑھنے میں مگن ہیں) اسٹول پر رکھ دو۔

(سنیل چائے اسٹول پر رکھ دیتا ہے شرما جی اخبار ہی پڑھتے رہتے ہیں)

سنیل: پتاجی چائے ٹھنڈی ہو جائے گی۔

شرما جی: (چونک کر) ایں ...... ہاں ...... ہاں۔ ابھی پیتا ہوں۔

سنیل: اخبار میں کوئی خاص خبر ہے کیا؟

شرما جی: ہاں بیٹا۔ ایک طالب علم نے اپنے استاد پر تیزاب پھینک دیا (شرما جی چائے پیتے ہیں)

سنیل: تیزاب پھینک دیا! لیکن کیوں؟

شرما جی: وہی نقل کا چکر۔ طالب علم نقل کر رہا تھا۔ استاد نے ٹوکا۔ وہ پھر بھی نہ مانا ———

——— تو استاد نے مجبور ہو کر اس کی پرچیاں اور کاپی لے لی۔ طالب علم نے اس وقت تو کچھ نہیں کہا لیکن راستے میں استاد کے اوپر تیزاب ڈال دیا جس سے

اس کا چہرہ جل گیا۔

سنیل: لڑکا پکڑا گیا یا نہیں؟

شرماجی: نہیں وہ تیزاب پھینک کر بھاگ گیا۔ پولیس اس کی تلاش میں ہے۔

(چائے پی کر شرماجی پیالی اسٹول پر رکھ دیتے ہیں)

سنیل: (پیالی اٹھاکر) اپنے کالج میں کبھی تو کوئی طالب علم نقل کرتے پکڑے گئے ہیں۔

شرماجی: ہاں دس کو تو میں نے ہی پکڑا ہے۔ نہ جانے کیا ہوتا جارہا ہے طالب علموں کو، پڑھنے لکھنے سے جی چراتے ہیں۔ کلاس سے بھاگ کر فلمیں دیکھتے ہیں۔ کورس کی کتابوں کی جگہ سستے ناول اور گھٹیا قسم کے فلمی رسالے پڑھتے ہیں اور جب امتحان ہوتا ہے تو نقل کرتے ہیں۔

سنیل: پتاجی میں آپ سے کہنا نہیں چاہتا تھا لیکن

(پیالی پھر اسٹول پر رکھ دیتا ہے)

شرماجی: کیا بات ہے؟

سنیل: وہ مہیش ہے نا......

شرماجی: ہاں، ہاں! اسے اچھی طرح جانتا ہوں میں دسویں کلاس کا امتحان دے رہا ہے۔

سنیل: کل آپ نے اسے نقل کرتے ہوئے پکڑا تھا؟

شرماجی: ہاں میں نے اسے وارننگ دے کر چھوڑ دیا تھا۔

سنیل: کل شام کو...... (رک جاتا ہے)

شرماجی: کیا ہوا کل شام کو؟

سنیل: اس نے مجھے راستے میں روکا۔ اس کے ساتھ غنڈوں جیسا ایک لڑکا اور بھی تھا۔

شرماجی: کیا کہا اس نے؟

سنیل: کہنے لگا۔ اپنے باپ سے کہہ دینا کہ اگر ا[illegible] حرکتوں سے باز نہ آئے تو جہنم رسید کردوں[illegible]

شرماجی: (مشتعل ہوکر اٹھتے ہوئے) مہیش نے ا[illegible] کہا۔ اس کی یہ ہمت؟

سنیل: مہیش نے نہیں اس کے ساتھی نے کہا

شرماجی: مجھے دھمکی دیتا ہے! اس نے مجھے سمجھ[illegible] کیا ہے!

سنیل: آج شام کو اس کا ایک پرچہ ہے۔

شرماجی: ہوں....!

سنیل: وہ آج بھی نقل کرے گا۔

شرماجی: دیکھوں گا کیسے کرتا ہے نقل! کل تو صرف وارننگ ہی دی تھی آج رپورٹ کردوں گا دو تین سال کے لیے ڈِبار کردیا جائے تب پتہ چلے گا بچو کو۔ ہوں!.... نقل کریں گے!

سنیل: (سہمے ہوئے لہجے میں) پتاجی....!

شرماجی: کیا ہے؟

سنیل: مہیش کا دوست بہت بڑا غنڈہ ہے۔

شرماجی: ہوں.....!

سنیل: بات بات پر چھرا نکال لیتا ہے۔

شرماجی: میں چھرے سے نہیں ڈرتا۔

سنیل: وہ مجھ کو دھمکا رہا تھا۔

شرماجی: کیا کہہ رہا تھا۔

سنیل: یہی کہ اگر ماسٹر صاحب نے مہیش کو پکڑا[illegible] تجھے چھرا ماردوں گا۔

شرماجی: ہاں..... ہنسی کھیل ہے چھرا مارنا!

(باہر سے شیلو اور مہیش کا داخلہ۔ شیلو اپ[illegible] لباس اور انداز سے صاف غنڈہ لگتا ہے)

شیلو: (ہنس کر)۔ ہاں میرے لیے چھرا مارنا ہنسی کھیل ہی ہے۔

شرماجی: ہیش کون ہے یہ بدتمیز لڑکا؟

شیلو: میں بتاتا ہوں میرا نام شیلو ہے اور میں ہیش کا دوست ہوں کہیے آپ کو کوئی اعتراض ہے۔

شرماجی: بغیر اجازت کمرے میں کیوں آئے؟

شیلو: دروازہ کھلا تھا اپنے پیروں سے چل کر آگئے۔

شرماجی: میں تم سے بات نہیں کرنا چاہتا۔ ہیش تم بتاؤ اس بدتہذیبی کا کیا مطلب ہے؟

ہیش: شرماجی ہم آپ سے بات کرنے آئے ہیں۔

شرماجی: غنڈا لے کر؟

ہیش: بات ہی ایسی ہے۔

شرماجی: ہوں ... بولو کیا کہنا چاہتے ہو؟

ہیش: ہمارا پیغام آپ کو سنیل نے دیا ہوگا۔

شرماجی: اپنے منہ سے کہو۔

ہیش: آپ نے مجھے کل نقل کرتے ہوئے کیوں پکڑا تھا؟

شرماجی: کیوں کہ وہ میرا فرض تھا۔

شیلو: اپنا فرض آج کے لیے بھول جائیے۔

شرماجی: کیا مطلب؟

شیلو: آج کے پرچے میں نقل کرنا ضروری ہے۔ ہیش آج نقل کرے گا۔

شرماجی: یہی کہنے آئے ہو؟

شیلو: جی ہاں۔ ہیش نقل کرے گا اور میں کالج کے پھاٹک پر رہوں گا۔ اگر آپ نے اسے روکا یا ٹوکا تو نتیجہ برا ہوگا۔

شرماجی: دھمکی دے رہے ہو؟

شیلو: دھمکی نہیں وارننگ۔

شرماجی: ہوں .... سنیل تم اندر جاؤ جب تمھاری ضرورت ہوگی بلا لوں گا۔

(سنیل بادلِ ناخواستہ اندر چلا جاتا ہے)

شرماجی: ہوں .... اب تم بیٹھ جاؤ تاکہ اطمینان سے باتیں ہو سکیں۔

شیلو: ہم ایسے ہی ٹھیک ہیں۔

شرماجی: تمھاری مرضی (بیٹھ کر) تم بھی کھڑے رہنا ہی پسند کرتے ہو ہیش؟

ہیش: جی نہیں۔ جی ہاں! ایسے ہی ٹھیک ہے۔

شرماجی: اچھا، اب بولو کہ تمہارا نقل کرنا کیوں ضروری ہے؟

ہیش: جی .... میں پڑھ نہیں پایا۔

شرماجی: کیوں نہیں پڑھ پائے؟

ہیش: جی .... میں بیمار ......

شرماجی (بات کاٹ کر): جھوٹ مت بولو۔ تم نے کبھی دل لگا کر پڑھنے کی کوشش نہیں کی۔ تمھاری دلچسپی دوسرے کاموں میں رہی۔ وہ کام کیسے ہوں گے اس کا اندازہ میں تمھارے دوست کو دیکھ کر ہی لگا سکتا ہوں۔

شیلو (چیخ کر): کیا مطلب؟ آپ میری توہین کر رہے ہیں۔

شرماجی: چیخنے کی ضرورت نہیں۔ میں اونچا نہیں سنتا۔ ہاں ہیش تم نے وہ کہاوت ضرور سنی ہوگی کہ آدمی اپنی صحبت سے پہچانا جاتا ہے۔ تمھارے

دوست آوارہ اور غنڈے ہیں۔

شیلو: شرما جی! زبان سنبھال کر بات کیجیے ورنہ..

شرما جی: ورنہ ..... تھپڑے کی دھمکی دے کر تم مجھے سچ بولنے سے نہیں روک سکتے۔ میرا سوال تم سے نہیں مہیش سے ہے۔

مہیش: کیا کہنا چاہتے ہیں آپ؟

شرما جی: تم نقل کیوں کرنا چاہتے ہو؟

مہیش: جی، پاس ہونے کے لیے۔

شرما جی: اگر سب لوگ نقل کرنے لگیں تو پھر امتحان کی کیا قیمت رہ جائے گی۔

شیلو: ہوں! جیسے ابھی تو بہت بڑی قیمت ہے۔

مہیش: جی..... لیکن میرا پاس ہونا ضروری ہے اگر نقل نہیں کی تو فیل ہو جاؤں گا اور اگر فیل ہو گیا تو پتا جی.....

شرما جی: ناراض ہوں گے، یہی نا؟ کیا تم نے پتا جی سے نقل کرنے کی اجازت لے لی ہے؟

مہیش (حیران سا ہو کر): پتا جی سے اجازت! یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟

شرما جی: اس کا مطلب یہ ہوا کہ تم اچھی طرح جانتے اور سمجھتے ہو کہ نقل کرنا غلط ہے اور اسی لیے اس غلط کام کی اجازت پتا جی سے لینا مناسب نہیں سمجھتے۔ کیوں؟ یہی بات ہے نا؟

مہیش: جی..... جی ہاں۔

شرما جی: اگر میں تمھاری جگہ ہوتا تو نقل کر کے پاس ہونے پر فیل ہونے کو ترجیح دیتا۔

[illegible] باتیں ہیں.....

[illegible] (بات کاٹتے ہوئے): تم چپ رہو مہیش۔

مجھے بات کرنے دو۔ یہ ماسٹر تمھیں بہکا رہا ہے خود کو پڑھانے کے بجائے سال بھر گھپ سے اڑاتے ہیں اور جب لڑکے نقل کر کے پاس ہونا چاہتے ہیں تو ان کی نانی مرتی ہے۔

شرما جی: کیا بک رہے ہو؟

شیلو: ٹھیک کہہ رہا ہوں۔ میں ماسٹروں کی حرکتیں اچھی طرح جانتا ہوں۔ لڑکوں کو جان بوجھ کر فیل کر دیتے ہیں تاکہ انہیں ٹیوشن مل سکے۔

شرما جی: میں ایسا نہیں کرتا

شیلو: ہزاروں لوگ کرتے ہیں ماسٹر لوگ اپنی پارٹی بازی میں لڑکوں کو بھی پھانس لیتے ہیں اور جب لڑکے پاس ہونے کے لیے نقل کرتے ہیں تو ایمان دار بن کر انھیں پکڑاتے ہیں۔

شرما جی: یہ جھوٹ ہے۔

شیلو: کیا یہ بھی جھوٹ ہے کہ ماسٹر لوگ پیسہ لے کر لڑکوں کو نقل کراتے ہیں، انھیں پاس کرتے ہیں؟

شرما جی: میں نے ایسا کبھی نہیں کیا۔ تمھارا دوست اس بات کی گواہی دے گا کہ پچھلے سال میں نے اپنے لڑکے سنیل کو نقل کرتے پکڑا تھا۔

مہیش: ہاں شیلو۔ ماسٹر صاحب ٹھیک کہہ رہے ہیں۔

شیلو: تم چپ رہو (شرما جی سے) ایک آپ کے ایمان دار ہونے سے کیا ہوتا ہے۔ اور ماسٹر کیسے ہیں اسے میں بھی جانتا ہوں آپ بھی جانتے ہیں۔

شرما جی: میں نے دنیا بھر کا ٹھیکہ نہیں لیا ہے۔

شیلو: لیکن میں نے مہیش کو پاس کرانے کا ٹھیکا لیا ہے۔ سال بھر ہڑتالیں ہوتی رہیں کبھی ماسٹروں کی ہڑتال کبھی لڑکوں کی ہڑتال۔ پڑھائی کے نام پر زیرو۔ فیس پوری لی۔ اب لڑکے نقل بھی نہ کریں؟

شرماجی: تمھاری دلیل میری سمجھ میں نہیں آئی۔

شیلو: ابھی آجائے گی (چھرا نکال کر) یہ چھرا دیکھتے ہیں نا؟ اس کی زبان آپ سمجھ لیں گے کان کھول کر سن لیجیے۔ مہیش آج نقل کرے گا اور آپ اسے ٹوکیں گے نہیں۔

شرماجی: یہ ناممکن ہے!

شیلو: تو آپ اپنی ڈیوٹی دوسرے کمرے میں لگوا لیجیے۔

شرماجی: تمھاری دھمکی سے ڈر کر میں یہ کبھی نہیں کر سکتا

شیلو: یعنی آپ مہیش کو نقل نہیں کرنے دیں گے؟

شرماجی: نہیں!

شیلو (چھرا گھما کر) تو شام کو آپ کا بیٹا اسپتال میں ہوگا۔

شرماجی: (آواز دے کر) سنیل ادھر آؤ

سنیل (آکر) کیا ہے پتاجی؟

شرماجی: مہیش۔ سنیل تمھارے سامنے کھڑا ہے اپنے دوست سے کہو اسے ابھی چھرا مار دے شام تو بہت دور ہے۔

شیلو (سنیل کا بازو پکڑ کر اینٹھتا ہوا): ٹھیک ہے اس چھوکرے کو میں اپنے ساتھ لیے جا رہا ہوں۔ یہ میری قید میں رہے گا۔

سنیل (درد سے چیختے ہوئے): میرا ہاتھ چھوڑو۔ ٹوٹا جا رہا ہے۔

مہیش: سنیل کا ہاتھ چھوڑ دو شیلو

شیلو: بکومت!! (شرماجی سے) آپ کا چھوکرا بڑا نازک ہے چھرے کا وار کیسے جھیل پائے گا؟

(سنیل کا بازو اور زور سے مروڑتا ہے)

سنیل (تقریباً رو کر): پتاجی.... مجھے بچائیے۔

شیلو: ماسٹر صاحب۔ بولیے مہیش کو نقل کرنے دیں گے یا نہیں؟

شرماجی (سختی سے): نہیں!

شیلو: نہیں؟ (سنیل کا بازو اور مروڑتا ہے)

سنیل (تکلیف سے بے چین ہو کر) پتاجی۔

(مہیش بولنے کے لیے منہ کھولتا ہے لیکن شیلو کی گھڑکی سن کر چپ رہ جاتا ہے)

شرماجی (اسی سختی سے): نہیں!

شیلو: تو ٹھیک ہے۔ چل بے چھوکرے۔

(شیلو سنیل کو دھکا دیتا ہے۔ وہ گر پڑتا ہے شیلو ٹھوکر مارنے کے لیے پیر اٹھاتا ہوا) چل اٹھ

مہیش: (اچانک چیخ کر): شیلو! خبردار جو سنیل کو مارا!

شیلو (ڈانٹ کر): مہیش!

مہیش: چھرا اپنی جیب میں رکھ لو (سنیل کو اٹھاتا ہوا) اٹھو سنیل۔ مجھے افسوس ہے کہ میری وجہ سے تمہیں......

شیلو: ابے لڑکیوں جیسی باتیں کیوں کر رہا ہے؟

مہیش: میں اندھا تھا جو تم جیسے لفنگوں کی باتوں میں آ کر پڑھائی سے جی چرایا۔ استادوں کی بے عزتی کی۔

شیلو: مجھے نفنگا کہتا ہے گدھے! جیبھ کاٹ کر پھینک دوں گا۔

مہیش: یہ دھمکی کسی اور کو دینا شیلو۔ اب میں اتنا بزدل نہیں رہا کہ ڈر جاؤں۔

شیلو: مجھے کیا۔ میں تو تیرے لیے آیا تھا۔ مرجانے۔
(چلا جاتا ہے)

مہیش: (شرما جی سے) آج آپ نے میری آنکھیں کھول دیں۔ میں بہت شرمندہ ہوں مجھے معاف کر دیجیے۔

(مہیش شرما جی کے پیروں پر گر جاتا ہے۔ وہ اسے اٹھا کر سینے سے لگا لیتے ہیں)

شرما جی: مجھے خوشی ہے! تم صحیح راستے پر آگئے۔

مہیش: میں آپ کو یقین دلاتا ہوں سر۔ اب اپنی محنت سے ہی پاس ہو کر دکھاؤں گا۔ اس سال فیل ہو جانے کا مجھے کوئی دکھ نہیں ہوگا۔

شرما جی: میری دعائیں تمھارے ساتھ ہیں۔ تم نے ایمان داری اور محنت کی اہمیت سمجھ لی اب تم زندگی کے کسی امتحان میں فیل نہیں ہو سکتے۔ سنیل۔ جا کر ماں سے کہو۔ جلدی سے مہیش کے لیے چائے اور ناشتہ تیار کر دیں۔

(سنیل اندر جاتا ہے۔ شرما جی مہیش کو اپنے پاس بٹھالتے ہیں)

(پردہ گرتا ہے)

"پیام تعلیم" آپ کا پرچہ ہے۔ خریدار بنا کر اس کو مقبول بنانے میں ہمارا ہاتھ بٹائیں۔

جناب نثار گورکھپوری

برسات

کیف پرور دن ہیں اس کے، پر فضا ہر رات ہے
دوستو خوشیاں مناؤ آج کل برسات ہے

ہر طرف پھیلا ہوا ہے ایک نظاروں کا جال
ایسے نظاروں کی خالق بس خدا کی ذات ہے

لال، پیلے، اودے، نیلے پھول ہیں زیبِ چمن
ہر طرف رنگینیوں کی آج کل بہتات ہے

جیسے حوروں کی زمیں ہو سبز پریوں کا ہو دیس
اس جہانِ رنگ کے آگے پرستاں مات ہے

ساز جھرنوں کا، ترنم ریز ندیوں کا ہے رقص
جھومتی ہیں وادیاں اک عالمِ جذبات ہے

پاؤں میں پھولوں کے گہنے سر پہ ہے کالی گھٹا
اوڑھ کر دھانی لبادہ آگئی برسات ہے

پھوٹ ہیں، یہ جامنیں ہیں، اور بھٹے ہیں مگر
آم وہ میوہ ہے جو برسات کی سوغات ہے

دل ہمارا کیوں مگن ہے آجکل برسات میں
اے نثارِ بے نوا ایسی بھلا کیا بات ہے

جناب خضر برنی

پکنک کا تیوہار

پائی ہے اسکول سے چھٹی چلیں گے جمنا پار
آج منائیں سارے بچے پکنک کا تیوہار
متھرا کے کچھ پیڑے لے لیں، سندیلے کے لڈو
حبشی حلوہ گھٹنے والا، لاؤ بھیا گڈو
ہاپڑ کے کچھ پاپڑ کچری لائیں موہن بھٹو
پائی ہے اسکول سے چھٹی چلیں گے جمنا پار
آج منائیں سارے بچے پکنک کا تیوہار
آلو کی ترکاری ہوگی اور میتھی کا ساگ
سونٹھ کھٹائی نمک مرچ اور کچھ زیرے کی لاگ
پوری کا پکوان کریں گے بھیا رام سبھاگ
پائی ہے اسکول سے چھٹی چلیں گے جمنا پار
آج منائیں سارے بچے پکنک کا تیوہار
کھانا کھا کر پانی پی کر ایسی دوڑ لگائیں
دیکھ کے لمبی دوڑ ہماری ہرن بھی کچھ شرمائیں
ہنسی خوشی اور پیار کے بل پر من اپنا بہلائیں
پائی ہے اسکول سے چھٹی چلیں گے جمنا پار
آج منائیں سارے بچے پکنک کا تیوہار

جناب محمد امین

ایتھوپیا کی سرزمین سے

ہوا کا فیصلہ

کہانی نمبر ۹

بیگم دیر کے صوبے میں گوندار کے قریب جنگل میں ایک اژدہا رہتا تھا۔ اپنی عادت کے مطابق کیڑے مکوڑوں اور زندہ چیزوں کو پکڑ کر کھاتا رہتا۔ اگر کوئی چھپکلی اور بچھو اس کے راستے میں آتا تو اس پر بھی وہ ہاتھ صاف کر دیتا۔ موقع دیکھ کر وہ جنگل کے باہر بھی چلا جاتا اور قریب میں جو گاؤں تھے وہاں کی بکریوں اور مویشیوں کو بھی پکڑ لیتا۔ جب لوگ اس کی حرکتوں سے تنگ آ گئے تو یہ طے کیا کہ شکاریوں کی ایک ٹولی جائے اور اسے ڈھونڈھ کر اس کا خاتمہ کر دے تاکہ "نہ رہے بانس نہ بجے بانسری"

بلم، ڈھال اور تیز چاقو لے کر شکاری نکل پڑے اور اژدہے کو ڈھونڈنے لگے۔ سانپ کو سن گن مل گئی اور وہ وہاں سے کھسک کر کپاس کے ایک کھیت میں چلا گیا۔ وہاں ایک کسان کام کر رہا تھا۔ سانپ کو دیکھ کر کسان گھبرا گیا اور ڈر کر اپنے آلے پھینک پھانک کر بھاگنے والا ہی تھا کہ اژدہے نے کہا: "کسان تم میرے بھائی ہو۔ اس وقت دشمن مجھے مارنے کی فکر میں ہیں کہیں مجھے چھپا دو تاکہ میں بچ جاؤں۔"

کسان رک گیا۔ سوچ کر اس نے کہا: "تمھارے بارے میں ہزار باتیں مشہور ہیں۔ لیکن اس وقت تم مصیبت زدہ ہو، چلو میں مدد کیے دیتا ہوں" اور اس نے اسے کپاس سے ڈھک دیا۔ شکاری جب وہاں پہنچے تو انھوں نے پوچھا: "کیا تم نے ادھر کوئی اژدہا دیکھا ہے۔ وہ بڑا ظالم ہے اور ہمارے مویشی کھاتا رہتا ہے۔"

"میں نے تو نہیں دیکھا" کسان نے جواب دیا۔ شکاری اس کی تلاش میں دوسری طرف نکل گئے۔ جب خطرہ دور ہو گیا تو کیا س کے نیچے سے برآمد ہوتے ہوئے اس نے سر اٹھایا "دشمن گئے" کسان نے اطمینان دلایا۔ "اب تم محفوظ ہو"

سانپ وہاں سے ٹلا نہیں بلکہ وہ کسان کو اپنی گیر وڑی (گرفت) میں کسنے کی کوشش کرنے لگا۔

"یہ تم کیا کر رہے ہو؟" کسان نے سنبھلتے ہوئے کہا۔ "مجھے بھوک لگ رہی ہے" سانپ نے کہا "اور تمھیں نگلنے کی فکر میں ہوں"۔

"کیا کہا؟ میں نے تمھاری جان بچائی اور اس کے بدلے تم میری جان لینا چاہتے ہو۔ یہ شرافت ہے؟"

"میں کیا کروں۔ بھوک کا کوئی علاج نہیں تمھیں نگلنا ہی پڑے گا"، سانپ نے جواب دیا۔

"تم بڑے ناشکرے ہو"، کسان نے اسے برا بھلا کہا۔

"میں مجبور ہوں۔ کھائے بغیر رہ نہیں سکتا" سانپ نے پھن کو باہر نکالا۔

"ایسا ہی ہے تو چلو جج کے پاس چلیں" کسان نے تجویز پیش کی۔

"اچھا تو چلو درخت کو جج بنا کر اس سے پوچھیں" سانپ راضی ہو گیا۔

دونوں زیتون کے درخت کے پاس گئے جو سڑک کے کنارے اُگا ہوا تھا۔ دونوں نے اپنے اپنے مقدمے پیش کیے۔ درخت نے کسان کو مخاطب کر کے اس سے کہا: میں سڑک کے کنارے اُگا ہوا ہوں اور میرا کام ہے کہ سب کو سایہ دوں۔ مسافر جو تھکے ماندے آتے ہیں وہ میرے سایے میں بیٹھ کر دم لیتے ہیں۔ لیکن جب وہ جانے لگتے ہیں تو میری شاخوں کو کاٹ کر لے جاتے ہیں اور ان سے کلہاڑی کا دستہ اور ہل کا بلیڈ بناتے ہیں۔ آدمی کتنا احسان فراموش ہوتا ہے۔ تم بھی اسی کی ذات سے ہو۔ اس لیے میں تمھارا ساتھ نہیں دے سکتا۔ سانپ کی نیت ٹھیک ہے۔ وہ تمھیں کھانا چاہتا ہے۔ ضرور کھائے گا"۔

اس کے بعد دونوں ندی کے پاس گئے اور اُسے بھی اپنی اپنی کہانی سنائی۔ ندی نے کسان سے کہا۔ "میں دونوں کناروں کے بیچ میں بہتی رہتی ہوں اور انسان کے لیے پانی بہم پہنچاتی ہوں۔ پانی نہ ہو تو انسان کو کتنی تکلیف ہو گی۔ خشک موسم میں میری وادی میں سے سوراخ کر کے انسان اپنے لیے اور اپنے مویشی کے لیے پانی نکالتا ہے۔ بارش کے موسم میں میں پانی سے لبریز ہو جاتی ہوں۔ پانی کی اتنی بہتات ہو جاتی ہے کہ میں انسان کے کھیتوں میں پھیل جاتی ہوں لیکن ایسے وقت میں بجائے خوش ہونے کے انسان مجھ سے خفا ہونے لگتا ہے وہ مجھ کو گالیاں دیتا ہے اور مجھ پر پتھروں کی بارش کرتا ہے مجھ سے اسے جو فائدہ پہنچا ہے۔ اسے وہ بھلا دیتا ہے۔ وہ بے اعتبار ہوتا ہے انسان کی فطرت جب اس قسم کی ہو تو میں تمھارے حق میں فیصلہ کیوں دوں۔ سانپ کو چاہیے کہ وہ تمھیں کھا جائے"۔

پھر دونوں گھاس کے پاس گئے۔ اس نے سارا ماجرا سن کر کسان سے کہا: "وادی میں اُگ کر میں انسان کے مویشی کے لیے چارہ پیدا کرتی ہوں۔ مجھ سے وہ اپنے گھروں کی چھتیں بھی بناتا ہے۔ لوگ

بھی بناتا ہے۔ لیکن بوڑھی ہو کر جب میں سوکھ کر
ٹوٹ جاتی ہوں تو وہ چنگاری سے مجھے جلا دیتا
ہے پھر مجھ پر ہل چلا دیتا ہے اور میری جگہ پر اناج
بوتا ہے۔ میں اگر اُگنے کی کوشش کرتی ہوں تو جڑ
سے وہ مجھے اکھاڑ پھینکتا ہے اور مجھے اور میری
ہستی کو نیست و نابود کر دیتا ہے۔ انسان کی فطرت
اچھی اور قابل اعتبار نہیں لہٰذا مقدمہ تمھارے
خلاف جاتا ہے اور سانپ کو چاہیے کہ تمھیں ضرور
کھا جائے۔"

کسان گھبرا گیا اور سوچنے لگا کہ اب تو
خیریت نہیں۔

بہر حال ادھر تینوں لوٹ کر سڑک پر
ان کو ہوا مل گئی۔ کسان نا امید ہو چکا تھا۔
مایوسی کے علاوہ اور کوئی راستہ نہیں تھا۔
ڈرتے ڈرتے اس نے ہوا کو اپنی بات بتائی۔ ہوا نے
سن کر کہا۔ "قدرت کے نظام میں ہر چیز کی اپنی اپنی
فطرت ہے۔ گھاس اُگتی ہے اور کوشش کرتی ہے کہ زندہ
رہے لیکن انسان اسے کاٹ دیتا ہے۔ تاکہ خود زندہ رہے
ندی بہتی ہے تاکہ وہاں دوسری چیزیں زندہ رہیں۔
اس کا پانی لبریز ہو کر اوپر اٹھتا ہے وہ اس کی فطرت
ہے۔ ندی اس سے باز نہیں آسکتی لیکن سیلاب سے
جب انسان کی فصلیں بہنے لگتی ہیں تو اسے دکھ ہوتا
ہے اس لیے کہ فصلوں پر اس کی زندگی کا دارومدار
ہے۔ درخت کو اپنی شاخیں کیوں عزیز ہیں اس لیے
کہ انھیں کی وجہ سے اس کا حسن باقی ہے۔ سانپ
کو جو چیز ملتی ہے وہ کھا لیتا ہے۔ وہ بھی اپنی فطرت
سے مجبور ہے۔ لہٰذا درخت، گھاس اور ندی کی

جو شکایتیں ہیں وہ غلط نہیں ہیں۔ سانپ کو بھوک
لگتی ہے یہ بھی صحیح ہے۔"

کسان کا دل بیٹھنے لگا۔ اسے ڈر لگا۔ کہ اب
خیریت نہیں۔ لیکن ہوا نے اپنی بات کو واضح
کرنے کے لیے کہا۔ "لیکن سوال یہ نہیں ہے کہ کس
کو کیا شکایت ہے بلکہ اصلی اور سچی بات یہ ہے
کہ ہر چیز اپنی فطرت سے مجبور ہے۔ لہٰذا ہم سبھی
کے لیے تو خوشی ہونے کی بات ہے کہ سب چیزیں
ویسی ہی ہیں جیسی کہ قدرت نے انھیں بنایا ہے۔
دراصل ہمیں قدرت کا شکر ادا کرنا چاہیے اور اپنی
اپنی فطرت کو باقی رکھنے کی خوشی میں ناچنا اور گانا
چاہیے۔"

پھر ہوا نے ایک ڈھولک کسان کو دی۔ دوسری
سانپ کو دی کہ وہ بجائیں اور جھوم جھوم کر ناچیں۔
ڈھولک پکڑنے کے لیے سانپ کو اپنی گرفت
سے انسان کو چھوڑنا پڑا۔

"تمھاری فطرت انسان کو کھانا ہے" ہوا
نے گا کر اور ناچ کر سانپ کو بتایا۔

کسان نے کہا "تمھاری فطرت ہے کہ تم کو
کوئی کھانے نہ پائے" سانپ کی گرفت سے اس
طرح وہ آزاد ہو گیا۔ ڈھولک پھینک کر وہ تیزی
سے بھاگا اور صاف بچ نکلا۔

نوٹ: (کہانی نمبر دس اگلے شمارے میں پڑھیے
جس کا عنوان ہے "کنواں جس سے بکریاں
نکلتی ہیں")

جناب ریحان احمد عباسی

شکاری کی باتیں

(پانچویں قسط)

جگا کی بات اپنی جگہ درست ہی تھی۔ اس وقت میں خود یہی سوچ رہا تھا کہ جلد سے جلد شیر کے بارے میں معلوم ہو جائے کہ وہ کہاں اور کس حالت میں ہے تاکہ اس غیر یقینی صورتِ حال سے نجات ملے اور دماغ پر جو تناؤ کی کیفیت طاری ہے وہ دور ہو۔ میں نے جب شیر پر فائر کیے تھے اس وقت جگا میرے قریب نہ تھا، اس لیے اسے ٹھیک طرح یہ اندازہ نہیں تھا کہ شیر کے گولیاں کہاں کہاں لگی ہیں۔ اس کی باتوں سے میں نے اندازہ لگایا کہ اس کے نزدیک اس بار بھی شیر معمولی زخمی ہوا ہے اور وہ ڈر رہا ہے کہ زخمی شیر کسی بھی وقت ہانکا کرنے والوں کے لیے مصیبت کھڑی کر سکتا ہے۔

بہر حال سرگوشیوں میں ہی میں نے اسے یقین دلانے کی کوشش کی کہ میرے دونوں فائر بڑے کامیاب رہے ہیں اور اس بار شیر بچ کر کہیں نہیں جائے گا۔ جگا غالباً میرے جواب سے پھر بھی مطمئن نہیں ہوا کیونکہ اس کے سر ہلانے کا انداز بتا رہا تھا۔ جیسے کہہ رہا ہو۔ "ہو سکتا ہے آپ کا نشانہ ٹھیک لگا ہو۔ ویسے مجھے تو یقین آیا نہیں۔"

جگا کے طرزِ عمل سے چند لمحوں کے لیے میرے دل میں شبہات نے سر ابھارا، لیکن فوراً ہی میرا اعتماد بحال ہو گیا۔ مجھے پورا یقین تھا کہ شیر زیادہ دور نہیں گیا ہے۔ وہ جہاں کہیں بھی ہے، بُری طرح زخمی ہے اور اگر اس پر تیسرا فائر ہوا تو بھی وہ زخموں کی تاب نہ لاتے ہوئے دو چار گھنٹوں کے

اندر اندر یقیناً خود بخود مر جائے گا۔

بہر حال جگا پرانا شکاری تھا اور اس کی یہ احتیاط مناسب ہی تھی۔ وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ زخمی شیر کیا قیامت ڈھا سکتا ہے اور اس وقت جو بھی اس کے سامنے پڑ جائے اس کا کیا حشر ہوتا ہے۔ جگا نے اپنی مقامی زبان میں کچھ کہا اور میں نے دیکھا بیتا پیڑ پر ادھر اُدھر گھوم پھر کر زخمی شیر کو دیکھنے کی کوشش کر رہا ہے۔ بندروں کی طرح یہ تانک جھانک بیکار گئی اور شیر پھر بھی نظر نہ آیا۔ میرا اردلی بھی جو میرے پیڑ کے پیچھے والے پیڑ پر بیٹھا تھا، شیر کی پوزیشن کے بارے میں کچھ نہ بتا سکا۔ آج کے تجربے نے مجھے یہ سبق سکھایا کہ پیچھے والے پیڑ پر مجھے ایک کے بجائے دو نگراں بٹھلانے چاہیے تھے، کیونکہ زخمی شیر عموماً اسی رُخ کو بھاگا کرتا ہے۔

میں نے ہر طرح کے امکانات کو ذہن میں رکھتے ہوئے جگا کے ساتھ اس صورت حال پر تبادلۂ خیال کیا۔ چونکہ شیر کی صحیح پوزیشن کا علم نہیں تھا۔ اس لیے ان لوگوں کو ساتھ لے کر پیدل شیر کو ڈھونڈنے کا سوال نہ اٹھتا تھا۔ اب شام کے تین بج رہے تھے۔ شیر کو تلاش کرنے کے سلسلے میں اگر ہم گاؤں سے بھینسوں کا ریوڑ منگواتے تو بھی اس کام میں دو گھنٹے تو لگ ہی جاتے اور اس طرح شام پانچ بجے تک جنگل میں اتنا اندھیرا پھیل جاتا جو شیر کو تلاش کرنے کے لیے انتہائی ناموزوں رہتا۔ جس طرف میں نے شیر کو بھاگتے ہوئے دیکھا تھا، وہ جگہ بڑے سایہ دار درختوں، گھنی جھاڑیوں اور لمبی لمبی گھاس سے گھری ہوئی تھی۔ چونکہ شیر کے شدید زخمی ہونے کا مجھے یقین تھا، اس لیے میرے اندازے کے مطابق وہ زیادہ دور تک نہ بھاگ سکا ہوگا۔

ان سب باتوں کو دیکھتے ہوئے آخر یہی طے کیا گیا ہم وہاں ایک گھنٹہ اور انتظار کریں۔ اس دوران شیر یا تو مر جائے گا یا پھر اس کے ہلنے جلنے، بولنے یا کسی بندر یا کوّے کے وہاں آ جانے سے ہمیں اس کی پوزیشن کے بارے میں صحیح صحیح پتہ چل جائے گا کہ وہ ہے کہاں اور اتنی احتیاط کے باوجود اگر پھر بھی کامیابی نہ ہوئی تو ہم اندھیرا پھیلنے سے پہلے پہلے کیمپ واپس چلے جائیں گے اور دوسرے دن صبح کے وقت گائے بھینسوں کا ریوڑ آگے رکھ کر اسے ڈھونڈنے کی کوشش کریں گے۔ یہ بات طے ہو جانے پر بیتا نے ہانکا کرنے والوں کو خبردار کر دیا کہ وہ ابھی ایک گھنٹہ اور پیڑوں پر بیٹھے رہیں اور خاموشی سے آوازوں کو سننے اور سمجھنے کی کوشش کریں۔

چار بجے تک ہم خاموش اور ساکت بنے پیڑوں پر جمے رہے، لیکن کسی طرف سے کوئی آواز نہ سنائی دی جو ہماری رہنمائی کر سکتی۔ میں نے اور زیادہ وقت ضائع کرنا مناسب نہ سمجھا اور پیڑ سے نیچے اُتر آیا۔ پھر تینوں شکاریوں کو ساتھ لے کر بڑی احتیاط کے ساتھ پھونک پھونک کر قدم رکھتا ہوا اُس طرف بڑھنے لگا جدھر میرے خیال کے مطابق شیر چھپا ہوا تھا۔ تینوں شکاریوں نے اپنے ہاتھوں میں لوہے کی تیز کلہاڑیاں تھام رکھی تھیں اور اپنی جیبوں میں پانچ پانچ چھ چھ پتھر بھر رکھے تھے تاکہ وقت ضرورت کام آ سکیں۔ کوئی ۲۰ گز چلنے کے بعد بیتا جلد ہی ایک پیڑ پر چڑھ گیا۔ جگا اور تیسرا شکاری گنگا بھی

اسی طرح باری باری الگ الگ پیڑوں پر چڑھ گئے۔
میں البتہ نیچے ہی رہا اور کچھ فاصلے پر کھڑے ہو کر پیڑوں
پر چڑھتے ہوئے شکاریوں کی حفاظت کرتا رہا کہ کہیں
ایسے وقت، جب کہ وہ پیڑ پر چڑھنے میں معروف
ہوں، شیر کسی طرف سے اچانک نمودار ہو کر ان پر
حملہ نہ کر بیٹھے۔ چونکہ شیر وہاں سے نظر نہ آیا اس
لیے دس گز اور آگے بڑھنے کے بعد پیڑوں پر چڑھنے
کا یہی عمل پھر دوہرایا گیا۔ میں ابھی گنگا کو پیڑ پر چڑھنے
میں مدد دے ہی رہا تھا کہ میں نے دیکھا، بیما منہ سے
کوئی آواز نکالے بغیر بڑی تیزی سے دونوں ہاتھ
ہلا ہلا کر سامنے کی طرف اشارہ کر رہا ہے اس کی
احتیاط بتا رہی تھی کہ اس نے شیر کو دیکھ لیا ہے۔
بیما کا اشارہ دیکھ کر گنگا اپنے پیڑ سے نیچے اتر آیا
اور خود بھی اسی پیڑ پر جا پہنچا جس پر بیما چڑھا ہوا
تھا۔ گنگا نے خاموشی سے رسّی سے بنی سیڑھی، جسے
ہم اپنے ساتھ لائے تھے، پیڑ کے ساتھ لٹکا دی
تاکہ میں بھی اوپر چڑھ سکوں۔ پیڑ پر چڑھنے کے
بعد بیما نے ایک طرف اشارہ کر کے مجھے کچھ دکھانا
چاہا۔ لیکن میں باوجود کوشش کچھ بھی نہ دیکھ سکا۔
آخر بڑی جدوجہد کے بعد میری آنکھوں نے وہ
کالا دھبہ دیکھ ہی لیا جسے بیما دکھانا چاہ رہا تھا۔ وہ
یقیناً شیر ہی تھا اور اگرچہ پیڑ سے اس کا فاصلہ
۲۵ گز سے زیادہ نہ تھا، لیکن لمبی لمبی گھاس اور
گھنی پتیوں کے سائے کی وجہ سے اس کے جسم
کا بہت معمولی حصہ نظر آ رہا تھا اور یہ پتہ نہیں چل
رہا تھا کہ اس کا سر کس طرف ہو سکتا ہے اور دم کس
طرف؟ مجبوراً میں نے اسی کالے دھبے کا نشانہ
لیتے ہوئے ایک فائر جھونک دیا۔ فائر کی آواز کے
ساتھ ہی شیر اچھلا اور جیسے ہی وہ اچھل کر ایک
طرف گرا تو مجھے اس کی گردن اور کندھا نظر آ گیا۔
میں نے فوراً ہی گردن کے جوڑ پر ایک فائر اور
داغ دیا۔ لیکن اس بار شیر کی طرف سے کوئی حرکت
نہیں ہوئی۔ وہ جو کہتے ہیں ناکہ دودھ کا جلا چھاچھ بھی
پھونک پھونک کر پیتا ہے۔ بالکل اسی کے مصداق
میں بھی شیر پر اس وقت تک برابر فائر کرتا رہا
جب تک کہ میگزین پوری طرح خالی نہ ہو گئی۔ فائر کے
دھماکوں نے جنگل کے سناٹے کو کچھ دیر کے لیے درہم
برہم کر دیا۔ لیکن شیر پر ان کا مطلق اثر نہ ہوا
اور وہ بدستور اسی طرح زمین پر بے حس پڑا رہا۔
دن کی روشنی بڑی تیزی سے کم ہوتی جا رہی تھی
اور اب مزید فائر کرنے کا کوئی فائدہ نہیں معلوم ہوتا
تھا۔ اس لیے ہم پیڑ سے نیچے آ گئے۔ تینوں شکاریوں
کو اپنے پیچھے رکھتے ہوئے اور رائفل کی نال آگے
بڑھاتے ہوئے میں پھر پہلی جیسی احتیاط کے ساتھ
شیر کی طرف بڑھنے لگا اور جب وہ صرف دس گز دور
رہ گیا تو ہم پھر رک گئے۔ بیما وغیرہ نے اپنی جیبوں میں
جو پتھر بھر رکھے تھے، وہ اب کام آئے۔ ہم نے وہاں
کھڑے کھڑے کوئی ایک درجن پتھر شیر پر برسائے
لیکن اس کی طرف سے کوئی حرکت محسوس نہیں ہوئی۔
شیر یقیناً ٹھنڈا ہو چکا تھا۔ ورنہ اگر اس میں ذرا بھی
جان باقی ہوتی تو وہ یہ گستاخی کبھی برداشت نہ کرتا۔
اب کسی چیز کا ڈر باقی نہ رہا تھا اس لیے ہم نے
وہیں کھڑے کھڑے آوازیں لگانا شروع کر دیں
ہانکا کرنے والے بھی ہمارے پاس آ گئے

[illegible] معلوم ہوا کہ میرے پہلے دونوں فائر
[illegible] میں دھڑکنے سے ذرا پیچھے پڑے تھے
[illegible] کے دل سے پار ہونے میں بس ایک انچ کی
کسر رہ گئی تھی۔ تیسرا فائر جو پیڑ کے اوپر سے کیا
[illegible] سیدھا دل کو چھیدتا ہوا نکل گیا تھا اور اس کے
ساتھ ہی شیر کی زندگی کا چراغ بھی گل کر گیا تھا۔ اس
کے بعد جو ہم نے چار پانچ فالتو فائر کیے، وہ بھی
[illegible] کے سب شیر کی پسلیوں اور پیٹ پر پڑے
تھے۔ لیکن میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ گولیاں شیر کے
جسم کے اندر ہی رہ گئی تھیں۔ ورنہ اگر پہلی تین گولیوں
کی طرح یہ بھی باہر نکل جاتیں تو شیر کی کھال بری طرح
خراب ہو جاتی۔

جب سب نے مرے ہوئے شیر کو اچھی طرح
دیکھ لیا تو میں نے اس کی پیمائش کی۔ ناک سے دُم کے
سرے تک اس کی لمبائی ۹ فٹ ۱۰ انچ تھی اور وہ
بہت ہی خوبصورت اور تندرست شیر تھا۔ اس کے
دانت بھی بڑے صاف اور تیز و مضبوط تھے اور
میرے اندازے کے مطابق وہ چھ سال سے
زیادہ عمر کا نہ تھا۔

پیڑ سے مچان اُتارنے کے بعد دو لمبی لمبی مضبوط
لکڑیاں کاٹ کر ایک اسٹریچر تیار کیا گیا جس پر شیر کو
[illegible] باندھ دیا گیا۔ شیر کے وزن سے لدے پھندے
جب ہم کیمپ پہنچے تو شام کے چھ بج رہے تھے
[illegible] کے مارے سب کا برا حال تھا۔

[illegible] کے مارے جانے کی خبر جلد ہی گاؤں
[illegible] اور ابھی میں منہ ہاتھ دھو کر چائے
[illegible] مشغول تھا۔ کہ گاؤں کی طرف سے مردوں،
عورتوں اور بچوں کے جوق در جوق آنے کا سلسلہ
شروع ہو گیا۔ چونکہ اب رات کا اندھیرا پھیل چکا
تھا۔ اس لیے میں نے شیر کے پاس دو لیمپ جلوا کر
رکھوا دیے تھے تاکہ گاؤں والے اچھی طرح
شیر کو دیکھ سکیں۔ اس گاؤں میں چماروں کے گھر
نہیں تھے اس لیے میں اور میرا اردلی، دونوں
خود ہی کھال اتارنے کے کام میں جٹ گئے اور جب
ہم اس کام سے فارغ ہوئے تو رات کے گیارہ
بج رہے تھے اور جنگل سے چھپکا چڑیلوں کے
بولنے کے علاوہ دُور سے کسی کانکڑ کی "بھون بھون"
بھی سنائی دے رہی تھی۔ اس بھونکنے والے ہرن
نے یقیناً کسی خطرناک درندے کو دیکھ لیا تھا اور
بھونک بھونک کر دوسروں کو متوقع خطرے سے
خبردار کر رہا تھا۔

اب کون جانے کہ وہ 'خطرہ' کیا ہے۔ کوئی شیر،
گلدار یا کوئی دوسرا جانور؟

★★

محمد محسن علی ۔ جیکب آباد ۔ پاکستان

آؤ آنکھ مچولی کھیلیں

یہ نظم پاکستان سے موصول ہوئی ہے۔ محمد محسن علی کی عمر ۱۵ سال ہے۔ تعلیم سے دلچسپی کے ساتھ مضمون نویسی اور شاعری کا بھی شوق ہے۔ ہندوستانی بچوں سے قلمی دوستی کرنے کے خواہش مند ہیں ۔

پتہ ہے: مکان نمبر ۹/۱۴ ۔ ۱۳ ڈنگر محلہ ۔ جیکب آباد

آؤ آنکھ مچولی کھیلیں
اب رک جاؤ چپ ہو جاؤ
دیکھو شور نہ ہونے پائے
پیڑ کے پیچھے سب چھپ جاؤ
چور کھڑا ہے کان لگائے
آؤ آنکھ مچولی کھیلیں

غزلی رانی! چور بنو تم
احمد بھیا! مور بنو تم
آؤ آنکھ مچولی کھیلیں

چور کی آنکھ پہ پٹی باندھو
مور کے پیر میں رسی باندھو
آہٹ سنتے ہی لپکے گی
بجلی بن کر ٹوٹ پڑے گی
آؤ آنکھ مچولی کھیلیں

غزلی ہاتھ لگا جائے گی
تم کو چور بنا جائے گی
آؤ آنکھ مچولی کھیلیں

جناب ارمغان ساحل سہسرامی

بڑھ کر وہی اوّل ہوتے ہیں

تعلیم کا جو دم بھرتے ہیں
بد کام سے نفرت کرتے ہیں
اُستاد سے اپنے ڈرتے ہیں
بڑھ کر وہی اوّل ہوتے ہیں

تعظیم بڑوں کی کرتے ہیں
جو وقت پہ پڑھنے جاتے ہیں
بڑھ کر وہی اوّل ہوتے ہیں
مکتب میں کتابیں لاتے ہیں

بچوں سے جو اُلفت کرتے ہیں
تہذیب کی بات اپناتے ہیں
ماں باپ کی خدمت کرتے ہیں
بڑھ کر وہی اوّل ہوتے ہیں

استاد کی عزت کرتے ہیں
پڑھنے میں جو محنت کرتے ہیں
بڑھ کر وہی اوّل ہوتے ہیں
لکھنے کی مہارت کرتے ہیں

جو علم سے دامن بھرتے ہیں
ساحل سے محبت کرتے ہیں
مجبور پہ شفقت کرتے ہیں
بڑھ کر وہی اوّل ہوتے ہیں

جناب سلطان احمد ساحل

راڈار

راڈار سائنسی معلومات میں ایک حیرت ناک اضافہ ہے۔ یہ ایک مجوبہ آلہ ہے جو بیک وقت ٹرانسمیٹر اور ریسیور دونوں ہے۔ اس کے ذریعہ ہم کوسوں دور کی چیزوں کی تصویر بہ آسانی دیکھ سکتے ہیں۔ اتنا ہی نہیں بلکہ گھپ اندھیرے بادلوں کے باوجود دور دراز کی تصویر اس کے پردے پر صاف نظر آجاتی ہے۔ یہ آلہ اتنا حساس ہے کہ یہ کسی بھی شئے کے مقام کی صحیح نشان دہی کرتا ہے اور ساتھ ہی ساتھ اس مخصوص شئے کی رفتار، سمت جو حرکت پذیر ہے بالکل واضح کردیتا ہے اور ٹھیک ٹھیک فاصلہ بتا رہا ہے!

قدرت نے سبھی جانداروں کو آنکھیں عطا کی ہیں لیکن چمگادڑ کو آنکھ سے محروم رکھا اور اس کے جسم میں لرزش پیدا کرنے کی قوت عطا کی ہے۔ یہ لرزش راہ میں کسی طرح کی رکاوٹ کے نہ ہونے سے ٹکرا کر لوٹ آتی ہے۔ ان ہی لوٹنے والے لرزشوں کی مدد سے چمگادڑ اپنی راہ تلاش کرتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ چمگادڑ بھی گھپ اندھیرے میں بغیر کسی چیز سے ٹکرائے آسانی سے پرواز کر لیتا ہے۔ اس طرح ہم چمگادڑ کو بھی قدرتی راڈار کہہ سکتے ہیں۔

راڈار کا مخصوص حصہ ریڈیائی لہروں کی اشاعت پھر راستے میں کسی شئے سے ٹکرا کر واپس لوٹ آنا بالکل آواز کے گونج کی طرح ہوتی ہے۔ راڈار ریڈیائی لہروں کا ترسیل کرتا ہے اور یہ لہریں کسی شئے سے ٹکرا کر آناً فاناً منعکس ہو جاتی ہیں جو اس کی ایک اہم خاصیت ہے۔ یہ لہریں جتنا وقت کسی شئے تک پہنچنے میں لیتی ہیں ٹھیک اتنے ہی وقت میں یہ لہریں کسی شئے سے ٹکرا کر لوٹ آتی ہیں۔ اس عمل میں ضائع شدہ وقت کی صحیح رفتار کی پیمایش ہی راڈار کا بنیادی اصول ہے۔ اِسی پیمایش سے کسی مخصوص شئے کی دوری معلوم ہو جاتی ہے۔

دراصل راڈار میں جو ریڈیائی لہر پیدا ہوتی ہے وہ کیا چیز ہے اور یہ کیسے متواتر نمودار ہوتی رہتی ہے؟ ٹرانسمیٹر، ایریل میں میگنیٹرون کو آگے پیچھے بہت تیزی کے ساتھ بھیجتا ہے جس سے اس کے ارد گرد AC پیدا ہو جاتی ہے جو ایک بدلتا ہوا مقناطیسی دائرہ پیدا کر دیتی ہے۔ مقناطیسی دائرہ کا یہ اثر بہت تیزی سے فضا میں منتشر ہو جاتا ہے اور اپنی متواتر بدلنے والی کیفیت کے باعث لہروں کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ یہی پیدا شدہ لہر ریڈیائی لہر ہے جس کی رفتار ۱۸۶۰۰۰ میل فی سیکنڈ ہے۔

ر راڈار آلے پر ایک ریڈیائی لہر ایک سیکنڈ میں وٹ آتی ہے تو اس کا مطلب ہوا کہ لہر کو کسی شئے ک پہنچنے اور واپس لوٹ آنے میں صرف آدھ سیکنڈ کا وقت صرف ہوتا ہے۔ خلاء میں کسی شئے کا پتہ لگانے کے لیے راڈار ریڈیائی لہروں کا ایک تلاطم ترسیل کرتا ہے اور منعکس لہروں کو (REFLECTOR) کے ذریعہ مجتمع کرتا ہے پھر اس منعکس لہروں کی سمت ہی اس شئے کو بتاتی ہے کہ وہ کس جگہ قیام پذیر ہے۔ ریڈیائی لہریں راڈار سے نشر کرنے کے لیے ایک ٹرانسمیٹر رہتا ہے جس کا عمل ریڈیو براڈ کاسٹنگ کے طور طریقے پر ہوتا رہتا ہے۔ ریڈیائی لہروں کو موصول کرنے کے لیے ایک خاص قسم کا ریسیور رہتا ہے جو ٹیلی ویژن ریسیور کی طرح کام کرتا ہے۔

عام طور پر راڈار کے چار حصے ہوتے ہیں۔ انٹینا لہر پھینکنے یا منعکس کرنے کا کام انجام دیتا ہے، لہریں، لہر کو مہیا کرتی ہیں۔ اسکرین ایک پردہ ہوتا ہے۔ جب کوئی لہر کسی شئے سے ٹکرا کر لوٹتی ہے تو اسی اسکرین پر ایک خاص قسم کا اشارہ ابھرتا ہے۔ چوتھا حصہ موٹر اور کنٹرولر کا ہے۔ یہ حصہ دوسرے سبھی حصوں کے کل پرزوں کو قوت پہنچاتا ہے اور ان پر کنٹرول رکھتا ہے۔ راڈار کا انٹینا کئی قسم کا ہوتا ہے۔ انٹینا کا کام یہ ہے کہ خلاء میں ایک لہر پھینک کر رک جاتا ہے تھوڑی دیر میں اگر وہ لہر کسی شئے سے ٹکرا کر واپس نہیں آتی ہے تو انٹینا دوسری لہر چھوڑتا ہے جیسے ہی لہر کسی شئے سے ٹکرا کر لوٹتی ہے انٹینا اس شئے پر مستقل اپنی نگاہ برقرار رکھتا ہے!۔

راڈار کا ٹرانسمیٹر وقت مقررہ کے بعد زیادہ تعداد والی ریڈیائی لہروں کے طرارے منتشر کرتا ہے جو منجملہ ایک ساتھ ایک سیدھی و پتلی شعاع میں گردش کرتے ہیں۔ ٹرانسمیٹر کا کام سکنڈ کے ہر دس لاکھویں حصہ تک ایک طرارہ ترسیل کرنا پھر لمحہ بھر کے لیے اُسے روکنا اور پھر فوراً ترسیل کرنا اس طرح یکے بعد دیگرے طرارے کی اشاعت جاری رہتی ہے۔ یہ شعاع شدہ ریڈیائی لہریں بادلوں سے ہو کر آگے نکل جاتی ہیں اور کسی طرح کی کوئی رکاوٹ ان کو مرعوب نہیں کر سکتی۔ کسی ٹھوس شئے سے ٹکرا کر یہ لہریں لمحہ بھر میں بالکل روشنی کی مانند ریسیور میں لوٹ کر میگنیٹرون کو حرکت میں لا دیتی ہیں۔ ریسیور ایک میگنیٹرون ٹیوب ہے جسے کیتھوڈ رے ٹیوب بھی کہتے ہیں جس میں ایک الیکٹرون گن لگی ہوتی ہے جس سے الیکٹرون کی دھار نکل کر ٹیوب کے دوسرے حصے پر لگے ہوئے ایک چمکدار اسکرین پر پڑتی ہے۔ یہ اسکرین ایک خاص قسم کے مسالہ سے آلودہ ہوتا ہے جو الیکٹرون کے پڑتے ہی روشنی سے دمک اٹھتا ہے اور روشنی نقطہ نمودار ہوتا ہے جس سے کسی شئے کی تصویر دکھائی پڑتی ہے۔ اگر ریڈیائی لہروں کی اشاعت صرف ایک ہی سمت میں ہوتی تو سامنے کی تفصیلات سے محروم رہنا پڑتا اس لیے بالکل محفوظ ہو جانے کے لیے ہوائی جہاز میں لگے راڈار سیٹ کے ایریل برابر چاروں طرف رقصاں رہتے ہیں تاکہ منتشر لہریں ہوائی جہاز کے نیچے تمام علاقوں پر بار بار پہنچ سکیں۔ اور خطرے سے آگاہی مل سکے۔ طیارے میں

باقی صـ۳۱ پر

(ہندی سے ترجمہ)

جناب محمد عرفان نجف علیمی (الہ آبادی)

اپنا اپنا دکھ

کسی گاؤں میں ایک غریب کسان رہتا تھا۔ اس کے ایک لڑکا تھا۔ نام تھا عارف۔ وہ کسان غریب ہونے کی وجہ سے اپنے بیٹے کو عیش و آرام کا سامان نہیں فراہم کر پاتا تھا۔ عارف دن بھر جنگل میں گائیں چرایا کرتا تھا۔ شام کو روکھا سوکھا کھا کر سو جاتا۔

اس گاؤں کے قریب ایک شہر میں ایک امیر تاجر رہتا تھا اس کے بھی ایک لڑکا تھا جس کا نام شمیم تھا۔ شمیم اپنے باپ کے دولت مند اور امیر ہونے کی وجہ سے ہر طرح سے خوش تھا۔ پھر بھی وہ اس بات سے دکھی رہتا تھا۔ کہ وہ کہیں اپنی خواہش سے آجا نہیں سکتا۔ اپنے دوستوں کے ساتھ کھیل بھی نہ سکتا تھا۔ رات دن نوکروں کی دیکھ ریکھ میں وہ ہمیشہ اپنے آپ کو ایک قیدی کی طرح محسوس کرتا تھا۔ رات دن وہ یہی سوچتا تھا کہ کس طرح قید و بند کی ان زنجیروں سے چھٹکارا پاؤں اور شہر کے دیگر بچوں کی طرح میں بھی کھیلوں اور خوب گھوموں پھروں۔

ایک بار گھر کی غریبی سے تنگ آکر غریب کسان کا بیٹا عارف گھر چھوڑ کر کہیں چلا گیا

ادھر دولت مند تاجر کا بیٹا بھی گھر کے بندھنوں سے چھٹکارا پانے کے لیے گھر سے کہیں چلا گیا۔ راستہ میں غریب کسان کے لڑکے کی ملاقات اس امیر کے لڑکے سے ہوئی۔ دونوں کا تعارف ہوا اور دوستی ہو گئی۔

اسی بیچ اچانک شمیم کا باپ گھوڑے پر سوار کہیں سے آ رہا تھا۔ اس نے اپنے بیٹے اور غریب کسان کے بیٹے کو دیکھا۔ اس نے پوچھا۔ "تم دونوں کہاں جا رہے ہو؟ دونوں لڑکوں نے اپنے گھر چھوڑنے کی وجہ بتائی۔

دونوں کے دکھوں کو سن کر اس دولت مند آدمی نے اپنے بیٹے شمیم سے کہا: "بیٹا تم ٹھیک کہتے ہو،" میرے دھنی خاندان میں بہت سے بندھن ہیں اس لیے آج سے تم غریب کسان کے بیٹے بن کر رہو۔ وہاں تم آزادی سے گھوم پھر کر کھیل کود سکو گے۔"

اس کے بعد اس امیر نے کسان کے لڑکے سے کہا۔ "تم وہ سبھی سکھ چاہتے ہو جو میرے گھر میں ہے۔ آؤ آج سے تم میرے بیٹے بن کر رہو گے۔"

اب شمیم گائے چراتا ہوا جنگل میں گھومنے
کھلی ہوا اور دور تک پھیلے ہوئے ہرے بھرے
گھاس کے میدان تو اسے بہت اچھے لگتے ۔ لیکن
سوکھی روٹیاں ، میلے کچیلے بدبودار کپڑے اور ٹوٹی
پھوٹی جھونپڑی اسے اچھی نہیں لگتی تھی ۔ اس
لیے وہ اداس رہنے لگا ۔ اچانک ایک دن وہ
غریب کا گھر چھوڑ کر اپنے گھر واپس لوٹ گیا ۔

ادھر دھنی کا گھر چھوڑ کر عارف بھی اپنے
غریب کسان باپ کے گھر لوٹ آیا ۔ اسے دھن
دولت کی قید و بند بری طرح کھٹکنے لگی ۔ راستے
میں دونوں کی جب ملاقات ہوئی تو شمیم نے کہا
"میں غریبی میں اپنی زندگی کے دن نہیں گزار سکتا"
عارف نے کہا ۔ "میں امیری کے بندھن میں
نہیں رہ سکتا ۔ میں تو ہرے بھرے کھیت میں
اپنی گایوں کو چرا کر روکھا سوکھا کھا لینا ہی پسند
کروں گا ۔"

ہر آدمی ہر جگہ نہیں رہ سکتا ۔ اس کو جہاں
ایک بار رہنے کی عادت پڑ جاتی ہے اسے وہ
چھوڑ نہیں سکتا ۔

★★

بقیہ راڈار صـ۲۹ سے

تین قسم کے راڈار لگے ہوتے ہیں ۔ ایک راڈار طیارے
کو زمین کی اونچائی ظاہر کرتا ہے اسے آلٹی میٹر بھی
کہا جاتا ہے ۔ دوسرا راڈار طیارے کی بالکل صحیح
رفتار کو ظاہر کرتا ہے اور تیسرا راڈار طیارے کی
راہ میں آنے والی رکاوٹوں کا پتہ لگاتا ہے ۔ اس
راڈار کی مدد سے موسم خراب ہونے پر بھی طیارے
کو ہوائی اڈے پر بحفاظت اتار لیا جاتا ہے ۔
راڈار دور سے آتے ہوئے بادلوں کو پکڑ کر ظاہر
کر دیتا ہے کہ یہ بادل کتنے پانی میں ہے اور پل بھر
میں یا کتنے وقفہ میں کہاں پہنچ جائے گا ۔ اس طرح
موسم کا حال بھی معلوم ہو جاتا ہے !

غرض کہ راڈار انتہائی کار آمد آلہ ہے جو
رات کے اندھیرے میں ۔ کہرے میں ، بارش
یا طوفان میں بھی بہت دور دور کی مخفی چیزوں کا فوراً
پتہ لگا لیتا ہے ۔ ہوائی جہاز اور سمندری جہاز میں
اس کی خاص اہمیت ہے سمندری جہاز میں راڈار
سمندر کی گہرائی بھی ناپ کر واضح کر دیتا ہے ۔

بقیہ پیغام صـ۵ سے

ہر شہری باعزت زندگی گذار سکے گا ۔
آیئے بھارت کے اس عظیم تاریخی دن اب ہم
پھر سے یہ عہد کریں کہ ہم اپنی کڑی محنت سے
ایک بہتر ملک کے ڈسپلن کے پابند سپاہیوں کی
طرح پردھان منتری شریمتی اندرا گاندھی کے
۲۰ نکاتی اقتصادی پروگرام کو کامیاب بنائیں گے
کیونکہ اس کا مقصد ملک کے کروڑوں مرد عورتوں
کو اقتصادی نجات دلانا ہے اس مقدس دن پر
میں ہر شہری کو ، دلّی کے باشندوں کو بدھائی
دیتا ہوں اور خدا سے دعا کرتا ہوں کہ ان کی زندگی
سکھی اور خوشحال ہو ۔

جناب خلیل الرحمٰن (دہلوی)

جہاں گیر کے تفریحی مشاغل

چڑیا گھر

جہاں گیر (۱۶۰۵ - ۱۶۲۶) کے چڑیا گھر میں سفید شاہین - باشہ - شکرا - کنجشک - کوّا - بٹیر - تیتر - پودنہ - طاؤس - باز - بیرو - (انگریزی مرغی) موجود تھے۔ ولایت زیر باد سے ایک پرندہ آیا جو طوطی کے مشابہ تھا۔ اس کی عادت یہ تھی کہ تمام رات الٹا لٹک کر چہچہے کرتا تھا۔

عجائب گھر

چرندے

اس میں ایک بکرا تھا جو بقدر ایک پیالہ دودھ دیتا تھا۔

درندے

راجہ نرسنگھ دیو نے سفید چیتا پیش کیا تھا۔ ایک شیر ایک بکری سے اس قدر مانوس (ہلا ہوا) ہو گیا تھا کہ دونوں ایک پنجرے میں رہتے تھے۔

فیل خانہ

اس میں ایک ہاتھی تھا۔ جس کا نام "گیراج" تھا۔ اس کا قد سات گز اور ۲ تسو نکل کا تھا۔

تصاویر

ایک شخص نے ایک تصویر جہانگیر کو لا کر دی جس میں ایک عورت کی تصویر اس حالت میں کھینچی تھی کہ اس کی کنیز جھانویں (کھردری بنی ہوئی اینٹ جس سے بدن اور پیر کا میل چھڑاتے ہیں) سے اس کے تلوے مل رہی ہے۔ جہانگیر نے پانچ ہزار روپے دے کر وہ تصویر لی۔ اس پر مصور کو خود تعجب ہوا۔ عرض کی "حضور اس میں کیا بات ہے؟" جہانگیر نے کہا "جب تلوے سہلائے جاتے ہیں تو خفیف (ہلکی) سی گدگدی پیدا ہوتی ہے۔ اس کا اثر چہرہ پر بھی ظاہر ہوتا ہے۔ اور یہ اثر تصویر میں موجود ہے"۔

جہانگیر جس جانور کا شکار کرتا اس کی تصویر کھینچ کر رکھ دیتا تھا۔

مشاہدات

درخت :-

شیخو پور میں "ایک بڑ" کا درخت "یا"

نظر ۱۲۰ ... اس کے تنے کا گھیرا (CIRCOMFERNCE)

۱۸ - جڑ سے شاخ تک کی بلندی

(HE...) ۱۲۸ گز تھی۔ اور اس کی

جاتیں جو زمین گیر ہو کر درخت بن گئی تھیں ۲۰۰۳ گز تھیں۔

پھل

فتح پور سے ایک "تربوز" آیا تھا جس کا وزن ۳۴ سیر تھا۔

"انار" کی نسبت تحقیق کیا گیا کہ وہ ۴۰ تولے تک ہوتا ہے۔

"امرود بہی" ۲۹ تولے تک ہوتی ہے۔

حادثہ

ایک دفعہ جالندھر کے مضافات (آس پاس کے گاؤں) میں بڑے زور کی آواز آئی ساتھ ہی آسمان سے بجلی سی گری۔ یہ معلوم ہوتا تھا کہ آگ برس رہی ہے۔ دس بارہ گز زمین بالکل سیاہ ہو گئی تھی۔ زمین کو کھودا تو لوہے کا ایک ٹکڑا نکلا جو سخت گرم تھا۔ جب ٹھنڈا ہوا تو پرگنہ (علاقے) کے حاکم نے خریطہ (امیروں کے خط کا سرکاری لفافہ) میں رکھ کر جہانگیر کے پاس بھیج دیا۔ اس میں چوتھائی حصہ لوہا ملا کر دو تلواریں اور خنجر وغیرہ تیار ہوئے جن میں یمنی (YEM Ni) تلواروں کا سا دم خم تھا۔

مرقع

جن کا ذکر جہانگیر نے اپنے واقعات میں حیرت کے ساتھ کیا ہے۔

پستے کے چھلکے کے برابر ہاتھی دانت کے چار مرقعے تھے۔

پہلے میں چند پہلوان باہم لڑ رہے تھے۔ ایک ہاتھ میں نیزہ لیے کھڑا ہے۔ تو دوسرے کے ہاتھ میں پتھر کا ٹکڑا ہے۔ ایک اور پہلوان زمین پر ہاتھ ٹیکے ہوئے بیٹھا ہے۔ سامنے ایک کمان، ایک لکڑی اور ایک ظرف (برتن) رکھا ہوا ہے۔

دوسرے میں ایک تخت ہے جس پر ایک شامیانہ (بڑا خیمہ) تنا ہوا ہے۔ تخت پر ایک بادشاہ پاؤں پر پاؤں رکھے ہوئے بیٹھا ہے۔ پیٹھ تکیہ سے لگی ہوئی ہے۔ پانچ خدمت گار (نوکر) گرد و پیش کھڑے ہیں۔ اوپر سے ایک درخت کی شاخ بادشاہ کے سر پر سایہ کر رہی ہے۔

تیسرے میں نٹ (مداری) تماشا دکھا رہا ہے۔ ایک بلّی (لمبا بانس) کھڑی ہے۔ اس میں تین طنابیں (کھنچنے کی ڈوریاں) بندھی ہیں۔ ایک نٹ اس طرح کھڑا ہے کہ بائیں ہاتھ کو سر کے پیچھے سے لا کر دائیں ہاتھ کو پکڑ لیا ہے۔ ایک ہاتھ میں ایک لکڑی ہے جس کے سرے پر ایک بکری معلق (لٹکی ہوئی) ہے اور ایک نٹ گلے میں ڈھول ڈالے ہوئے بجا رہا ہے۔ ایک اور شخص ہاتھ اوپر اٹھائے ہوئے کھڑا ہے اور طناب (ڈوری) کی طرف دیکھ رہا ہے۔ پانچ اشخاص اور ادھر ادھر کھڑے ہیں۔

چوتھے میں ایک درخت کے نیچے حضرت عیسیٰ علیہ السلام بیٹھے ہوئے ہیں۔ ایک آدمی ان کے پاؤں چوم رہا ہے۔ وہ ایک پیر مرد سے باتیں کر رہے ہیں۔ چار شخص اور آس پاس کھڑے ہیں۔

(مختصر و ماخوذ از تزک جہانگیری)

جناب محمد منور مسعودی

ایک چینی کہانی

بہت دنوں کی بات ہے ایک تالاب کے کنارے ایک لڑکا اپنی بوڑھی ماں کے ساتھ رہتا اور کھیتی باڑی کرتا۔ لیکن کافی محنت اور کوشش کے باوجود ان کے دن بڑی مشکل سے کٹتے۔

یہ نوجوان لڑکا ہمیشہ اس فکر میں رہتا تھا کہ دن رات محنت کے باوجود کیوں غریب اور خالی ہاتھ ہے؟ آخر کار اس نے ارادہ کیا کہ ایک غیب کی باتیں بتانے والے شخص (کاہن) کے پاس جائے اور اپنی مشکل اس کے سامنے پیش کرے کیونکہ اس نے سنا تھا کہ وہ شخص ہر مشکل کو حل کرتا ہے۔ وہ فوراً اس سے ملنے چل پڑا۔

سات مہینے تک چلنے کے بعد ایک بوڑھی عورت کی جھونپڑی کے پاس پہنچا۔ بوڑھی عورت نے اس سے پوچھا: "اتنی تیزی میں کہاں جا رہے ہو؟" لڑکے نے جواب دیا: "میں اس بزرگ غیب داں کے پاس جا رہا ہوں تاکہ اس سے پوچھوں کہ میں دن رات کام کرتا ہوں پھر بھی اتنا غریب اور محتاج کیوں ہوں؟"

بوڑھی عورت نے کہا: "میری بھی ایک مشکل ہے۔ میری سترہ سالہ لڑکی جو خوبصورت بھی ہے اور خوب سیرت بھی، لیکن وہ ابھی تک نہ بولتی ہے اور نہ بات کر پاتی ہے۔ بزرگ غیب داں سے پوچھنا کہ میری بیٹی کب زبان کھولے گی؟"

جوان نے اس بوڑھی عورت کی درخواست منظور کر لی اور اپنے راستے پر چل پڑا۔ چلتے چلتے ایک دوسری جھونپڑی تک پہنچا۔ وہاں ایک بوڑھے آدمی نے دروازہ کھولا پوچھا: "اے نوجوان! تم اتنی تیزی میں کہاں جا رہے ہو؟"

جوان نے اپنا مقصد اس سے بتایا۔ بوڑھے آدمی نے کہا: "میری یہ خواہش ہے کہ تم اس غیب داں سے میرے بڑے اور رنتا ور نارنگی کے درخت کے بارے میں بھی پوچھو کہ وہ پھل کیوں نہیں دیتا؟"

صبح ہوتے ہی جوان اپنے راستے پر چل پڑا اور چلتے چلتے ایک بپھرے ہوئے دریا تک پہنچا جہاں وہ اپنی تھکن دور کرنے کے لیے ایک پتھر پر بیٹھ گیا اور دریا کو پار کرنے کی تدبیر سوچنے لگا۔ اچانک آندھی آگئی اور دریا کا پانی اوپر آگیا اس طوفان میں سے ایک بہت بڑا اژدھا نکلا اور اس نوجوان سے پوچھنے لگا: "اے جوان تم کہاں جا رہے ہو؟"

جوان نے جواب دیا: "میں بزرگ غیب داں

کے پاس جارہا ہوں تاکہ وہ میری مشکل کو حل کردے۔"

اژدہے نے کہا: "اس غیب داں سے کہنا کہ میں (اژدھا) عرصہ سے اس دریا میں رہتا ہوں اور آج تک کسی کو میں نے تکلیف نہیں پہنچائی۔ اب میری خواہش ہے کہ میں اب آسمان پر چلا جاؤں۔"

جوان نے اس کی بھی درخواست کو قبول کرلیا، اُسی وقت اژدہے نے نوجوان کو اپنی پیٹھ پر بٹھایا اور دریا کے اس پار پہنچادیا۔ جوان اپنے راستے پر چل پڑا اور چلتے چلتے ایک اونچے پہاڑ کی چوٹی پر اُس غیب داں کی عبادت گاہ تک جا پہنچا اس نے ایک بوڑھے آدمی کو دیکھا جو ایک درخت کے نیچے بیٹھا سوچ بچار میں مشغول تھا۔

جوان نے سلام کیا: بوڑھے آدمی نے بڑی مہربانی سے جواب دیا اور پوچھا: "اے بیٹے تم کہاں سے آئے ہو اور تم کیا چاہتے ہو؟"

جوان نے اپنے چاروں سوال اس کے سامنے پیش کیے۔ غیب داں نے تمام سوالات سننے کے بعد کہا: "مجھ سے ایک ہی مطلب حل ہو سکتا ہے نہ کہ دو، تین مطلب حل ہو سکتے ہیں نہ چار، پانچ مقصد پورے ہو سکتے ہیں نہ چھ، تمھارے چار سوالات ہیں ان میں سے ایک کو چھوڑ دو۔"

جوان سوچ میں پڑ گیا وہ اپنی حاجت کو نہیں چھوڑ سکتا تھا۔ لیکن اس کے ساتھ ہی اسے وہ وعدہ یاد آجاتا تھا جو اس نے راستے میں ایک بوڑھی عورت، ایک بوڑھے مرد اور ایک اژدہے سے کیا تھا کہ وہ ان کی مشکل کا بھی حل غیب داں سے پوچھے گا آخر کار اس نے بہتری اسی میں سمجھی کہ وہ اپنے سوال کو چھوڑ دے اور دوسروں کی مشکل کو مقدم سمجھے۔ جب اس نے ان تین مشکلوں کے جواب کاہن سے سنے، کاہن سے واپسی کا سلام کیا اور واپس لوٹا۔

جب وہ دوبارہ دریا کے کنارے پر پہنچا تو اژدہے نے پوچھا کہ میرے سوال کا کیا ہوا؟

جوان نے کہا: غیب داں (کاہن بزرگ) نے یہ حکم دیا ہے کہ تو مجھے دریا کے پار پہنچادے۔ اژدہے نے اس کا حکم مان لیا اور جوان کو اپنی پیٹھ پر بٹھاکر دریا کے دوسرے طرف لے گیا۔ جونہی وہ دریا کے کنارے پر پہنچے۔ اژدھا آسمان کی طرف اُٹھ گیا۔ اژدہے نے اس موتی کو جو اس کے سر پر تھا۔ نیچے پھینکا اور کہا: "یہ تمھاری اس زحمت کا صلہ ہے جو تم نے میرے لیے برداشت کی" جوان نے موتی اٹھالیا اور بوڑھے آدمی کے مکان کی طرف چل پڑا۔

جونہی بوڑھے آدمی نے نوجوان کو دیکھا اس نے پوچھا: بتاؤ کیا تم نے اپنا وعدہ پورا کیا؟ میرے سوال کا جواب لائے کہ نہیں؟ جوان نے کہا ہاں، غیب داں نے کہا ہے کہ تمھارے گھر کے حوض کے نیچے نو کوزے چاندی کے اور نو کوزے سونے کے دفن ہیں اگر تم ان کوزوں کو زمین سے باہر نکال لو اور اس حوض کے پانی سے نارنگی کے پیڑ کو پانی دو تو درخت میں پھل آ سکتے ہیں۔"

بوڑھے مرد نے اپنے بیٹے اور اس جوان سمیت چل کر زمین سے وہ سونے چاندی کے

کو نے نکال لیے۔ اور اُسی وقت حوض صاف اور پاک پانی سے بھر گیا اور جونہی نارنگی کے درخت میں پانی دیا گیا اس پر پھل آنے شروع ہو گئے بوڑھا آدمی بہت خوش ہوا اور اس سونے چاندی میں سے آدھا حصہ جوان کو بھی دیا۔

اب جوان بوڑھی عورت کی طرف چل پڑا۔ جب اس کے پاس پہنچا تو بوڑھی عورت نے پوچھا، "اے جوان، کیا تم نے میرا سوال غیب داں تک پہنچایا؟"

جوان نے کہا: "ہاں، غیب داں نے کہا ہے کہ تمھاری لڑکی بہت جلد بولنے لگ جائے گی۔" ابھی جوان کی بات ختم نہ ہوئی تھی کہ لڑکی کمرے میں داخل ہو گئی اور ماں سے پوچھنے لگی: "یہ کون ہے؟"

بوڑھی عورت خوشی سے چلا اٹھی اور لڑکی کو اپنی گود میں لے لیا اور کہا "کیا ہی اچھا اور مبارک وقت ہے! تمھاری خوش بختی اسی میں ہے کہ تم نیک نوجوان سے شادی کر لو۔"

اس طرح سے نوجوان اس خوبصورت لڑکی اور سونے چاندی کی بھری ہوئی تھیلیوں اور اژدہے کے دیے ہوئے موتی کے ساتھ اپنے گھر کو واپس لوٹا اور اس کے بعد اس کی زندگی خوشگوار بن گئی۔

(فارسی سے ترجمہ)

آدھی ملاقات

امید ہے مزاج بخیر ہوگا۔ ضروری تحریر یہ ہے کہ اگست کا تازہ شمارہ موصول ہوا۔ سبھی مضامین پسند آئے۔ محترم خلیق انجم اشرفی کا ترجمہ کردہ ڈرامہ بیحد پسند آیا معجزہ شق القمر، امیر خسرو کی چند پہیلیاں، خوددار باپ، گ سے گدھا، وغیرہ سبھی مضامین اور کہانیاں بہت ہی دلچسپ اور سبق آموز ہیں میں پیام تعلیم میں سبھی لکھنے والوں کا شکر گزار ہوں کہ ان حضرات نے اپنی ساری قوت وصلاحیت پیام تعلیم کے لیے وقف کردی ہے۔ یہ کہنا قطعاً مبالغہ نہ ہوگا بلکہ یقیناً اظہار حقیقت ہوگا کہ اس طرح کی اصلاحی کہانیوں سے بچوں کی اصلاح ہوگی۔ ان کے اندر شعور اور سلیقہ پیدا ہوگا۔ ان کے ذہن میں پاکیزہ خیالات جنم لیں گے۔ رسالہ سرورق دیکھ کر بیحد خوشی ہوئی آج کے ایسے دور میں جب کے کاغذ عنقا ہو چکا ہو۔ کتابت وطباعت اس قدر گراں ہو۔ ایسا حسین دلکش اور جاذب نظر رسالہ نکالنا آپ ہی کا کام ہے۔ دراصل ان سب خصوصیات کے لیے آپ یقیناً لائق تحسین و مبارک باد ہیں۔ خدا کرے پیام تعلیم دن دونی رات چوگنی ترقی کرے۔ امتحان ختم ہو چکا ہے اب میں فرصت میں ہوں پیام تعلیم کی توسیع اشاعت کے لیے ہر ممکن کوشش کروں گا۔

محمد عرفان نجف علیمی الہ آباد

امید ہے آپ شادماں ہوں گے۔ ماہ جون کا محبوب رسالہ "پیام تعلیم" نظر سے گزرا ٹائیٹل بہت ہی خوب ہے میں نے اسے شوق کی آنکھوں سے دیکھا اور دل کے شوق سے مطالعہ کیا۔

آپ نے چنیدہ چنیدہ پھولوں کو کس خوبصورتی سے سجائے ہیں یہ آپ کی کاوش ہے بچوں کے لیے اگر کوئی رسالہ ہے تو واقعی میں وہ صرف "پیام تعلیم" ہے۔ اس کی جتنی بھی تعریف کی جائے گویا سورج کے مترادف ہے۔ آپ کی اگر یہی کاوش رہی تو انشاء اللہ یہ رسالہ ضرور ترقی کی راہوں میں گامزن رہے گا۔ ناچیز کی یہ گزارش ہے کہ اردو داں حضرات اسے ذوق وشوق سے پڑھیں اور اپنے بچوں کی تعلیم میں اضافہ کریں میری بھی یہی تمنا ہے کہ رسالہ پھولے پھلے اور پروان چڑھے۔

"پیام تعلیم" کے لکھنے والے ادب کے منجھے معلوم ہوتے ہیں۔ جناب آفاق دانش کی۔ "چیتا سوار سالار اعظم" واقعی بہترین کہانی ہے اتنا اچھا لکھنے والے مصنف کو مبارک باد پیش کرتا ہوں۔ اس کے علاوہ جناب انصاری اسلم عزیز کی کہانی "دولت مند لکڑہارا" جناب ولی احمد تنہا کا معلوماتی مضمون "قدرت کے عجائب وغرائب" اور جناب م۔ ندیم کا ڈرامہ "سچا دوست" بہت

بھی خوب ہیں۔

جناب انجم عباسی کی نظم "حمد" اور جناب کیف احمد کی سگریٹ نوشی یہ دونوں بھی قابل تعریف ہیں۔

عبدالمنان منصوری

اگست کے شمارے میں نگارشات کی اشاعت کا شکریہ۔ پہیلیوں کے جواب مضمون کے اختتام پہ دے دیئے جاتے تو بہتر رہتا، جگہ باقی بھی تھی۔ انھیں زرا پلٹ کر لکھ دیا جاتا جیسے اصل مضمون میں لکھے ہوئے تھے، خیر۔

سرورق خوب ہے۔ اس میں اگست کے لحاظ سے یوم آزادی کا تخیل بھی لایا جاتا تو بہتر رہتا۔ لیکن ع

رموز مملکت خویش خسرواں دانند

مفتون کوٹوی

تازہ شمارہ ملا۔ پیام آزادی۔ خوشیوں کا دن اور برسات کا موسم بالکل وقت کے تقاضے کی چیزیں ہیں۔ کہانیوں میں خوددار باپ حب الوطنی کا درس دیتا ہے۔ معلوماتی مضامین میں شق القمر اور گ سے گدھا بیحد پسند آئے۔ امید کہ شاہد عظیم صاحب آئندہ بھی اس طرح کے مضامین لکھ کر ہماری معلومات میں اضافہ کریں گے۔ شیخ سعدیؒ کے اصل نام شرف الدین سے مجھے اختلاف ہے۔ جہاں تک مجھے یاد ہے ان کا اصل نام مصلح الدین تھا۔ جولائی کا پرچہ نہیں ملنے کے سبب "آریہ ورت" (آدھی ملاقات اگست ۱۹۷۵ء) کے بارے میں زیادہ کچھ نہیں جان سکا جس کا مجھے افسوس ہے۔ ڈرامہ "چلے اور چینی" پسند آیا۔

زیر نظر شمارے میں "کتابوں کی باتیں" کے تحت نقد و تبصرہ دیکھا۔ یہ صرف بچوں کی کتابوں پر ہونا چاہیے اور وہ بھی آسان اور دلچسپ زبان میں اختصار کے ساتھ۔ اب کی بار "ادھر ادھر سے" کے صفحات بھی غائب رہے۔ یہ مستقل عنوان بچوں کی دلچسپی میں خاصا اضافہ کرتا ہے۔

اب کی بار برسات کی تعطیل میں میرا اسکول ایک ماہ کے لیے ۲۴ جولائی کو بند ہو گیا تھا۔ مجھے "پیام تعلیم" (جولائی) کا سخت انتظار تھا۔ آخر ۲۸ جولائی کی ڈاک دیکھنے کے بعد ڈاکیے سے کہہ کر میں مکان کے لیے روانہ ہو گیا اور آج بھی کچھ پیام تعلیم کے آجانے کی امید لے کر پوسٹ آفس پہنچا۔ یہ تو ملا مگر جولائی کا نہیں۔ اس لیے آپ سے گذارش ہے کہ مذکورہ ماہ کے پرچے روانہ فرما کر شکریہ کا موقع دیجیے۔

عادل کہلگانوی

ماہ جولائی اور اگست کا "پیام تعلیم" ملا۔ اگست کے شمارے کا دیدہ زیب اور دلکش رنگین سرورق بے حد پسند آیا۔ جناب محمد شاہد عظیم صاحب کا مضمون "گ سے گدھا" کافی دلچسپ اور مزیدار ہے۔ ویسے عظیم صاحب آئندہ بھی جانوروں اور پرندوں پر ایسے ہی مضامین لکھنے کا وعدہ کیے ہیں۔ ہماری خواہش ہے کہ وہ ہر شمارہ کے لیے ایک مضمون لکھتے رہیں۔

جناب غلام ربانی صاحب کا مضمون "زمین کی رفتار" بھی دلچسپ اور معلوماتی رہا۔

خاص کر جناب عبدالغفار احمد صاحب کا مضمون

باقی صفحہ [illegible] پر

اِدھر اُدھر سے

ایک سو چھبیس سالہ عورت کا انتقال —

پونہ ۲۹۔ جولائی ۱۹۷۵ء کی خبر دی ٹائمس آف انڈیا بمبی کے اخبار میں شائع ہوئی ہے کہ بیرونی ممالک سافری کی ہوئی عورتوں میں سے ایک عورت اپنی ۱۲۶ سالہ زندگی کے بعد کل یہاں انتقال کر گئی۔

مسز ڈھونڈا بائی شیورام کامبلے۔ مہاراشٹر میں سب سے معمر عورت ہو گذری ہے۔ اس کی ۹۶ سالہ دختر مسز کاکھمابائی کشین گائیکواڈ نے یو این۔ آئی سے کہا کہ اس کی ماں برٹش افسران کے خاندانوں میں "آیا" کی حیثیت سے کام کیا کرتی تھی اور برطانیہ، سری لنکا۔ برما۔ ہانگ کانگ اور کئی برطانوی نو آبادیات کا سفر کر چکی تھی اس کے چھ پوتے ۲۵ پڑپوتے اور ۵ پڑپڑپوتے پوتیاں ہیں۔

برفانی انسان کے نقش قدم

سری نگر ۲۰۔ اگست آدمی کے پیروں سے بڑے پیر کے نشان کل یہاں اخباروں میں شایع کیے گئے۔ جن سے باور کیا جاتا ہے کہ یہ ضرور افسانوی برفانی انسان کے پیر کے نشان ہیں۔ ۵۱۰۳ میٹر اونچی مہانندا پہاڑ کی چوٹی کے راستے سے لیے گیے دو پیروں کے نشان کو یہاں کے مقامی اخبار آفتاب نے شایع کیا ہے۔ پیروں کے نشان کا فوٹو مہم پسند طلباء کی ٹیم نے لیا تھا۔ اخبار نے ٹیم کے لیڈر مسٹر غلام نبی شاہ کے حوالہ سے کہا ہے کہ پیر کے نشان تازہ اور واضح تھے اور ان کا سلسلہ بہت دور تک جا رہا تھا۔　　(الجمعیتہ)

اُردو کے غیر مسلم طلباء

الہ آباد کا ڈپلوما کورس

الہ آباد ۲۰۔ اگست الہ آباد یونیورسٹی نے اُردو ڈپلوما کے جن نو طالب علموں کے کامیاب ہونے کا اعلان کیا ہے ان میں سے آٹھ غیر مسلم بھی ہیں۔ یہ کامیاب طالب علم ہیں، اشوک کمار، دیوی پرشاد، گنگا چرن، قمر افروز، اوم پرکاش شرما۔ رویندر سہائے، رادھے شیام، راجیش کمار چڈھا اور ورنیندر۔

(الجمعیتہ)

سرکس گھوڑ دوڑ کا میدان

ہم سب لوگ لفظ سرکس سے بخوبی واقف ہیں اور ہم سب نے کبھی نہ کبھی کوئی نہ کوئی سرکس دیکھا بھی ہوگا لیکن ہم میں سے بہت کم لوگوں کو معلوم ہوگا کہ سرکس کا مطلب کیا ہے؟ لفظ سرکس ' اصل میں لاطینی زبان کا ہے جس کا مطلب ہے گھیرا۔ قدیم روم میں ایک بڑا گھیرا بنا کر گھوڑوں یا رتھوں کی دوڑ ہوا کرتی تھی یا پھر جانوروں کو لڑا کر ان کا تماشہ دیکھا جاتا تھا اور اس گھیرے کو سرکس کے نام سے پکارا جاتا تھا۔ موجودہ سرکس بھی اسی قدیم سرکس سے لیا گیا ہے۔ اس سرکس میں بھی گول دائرے کے اندر کھلاڑیوں اور جانوروں کے کرتب وغیرہ دیکھتے ہیں۔

بارش کے بعد کیڑے مکوڑے کیوں باہر نکل آتے ہیں

کیڑے مکوڑے عام طور پر زمین کے اندر سوراخ بنا کر رہتے ہیں۔ رات کے وقت اندھیرا ہونے پر وہ اپنے بلوں سے باہر نکلتے ہیں۔ اور اگر ان پر روشنی ڈالی جائے تو فوراً اپنے بلوں میں چلے جاتے ہیں۔ لیکن اگر کافی عرصہ تک بارش ہوتی رہی تو پھر یہی کیڑے دن کے وقت بھی باہر نکل آتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ بارش کا پانی ان کے بلوں میں گھس جاتا ہے۔ جس سے وہاں کی ہوا باہر نکل جاتی ہے کیونکہ کیڑے مکوڑے بھی ہوا کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتے اس لیے وہ سانس لینے کے لیے باہر نکل آتے ہیں۔ دوسری بات یہ بھی ہے کہ وہ اپنے پورے جسم سے سانس لیتے ہیں۔ اس لیے وہ یہ نہیں کر سکتے کہ پانی میں رہ کر صرف اپنا منہ باہر رکھ کر سانس لیتے رہیں۔

ہماری رگوں میں خون کس طرح گردش کرتا ہے

ہم ہمیشہ کہتے ہیں کہ خون ہماری رگوں میں گردش کرتا ہے دراصل خون خود بخود رگوں میں نہیں دوڑتا۔ بلکہ دل کے پمپ کے ذریعہ اسے جسم کے مختلف حصوں میں بھیجا جاتا ہے۔ ہمارے دماغ میں لاتعداد رگیں ہوتی ہیں۔ جب یہ سکڑتی ہیں تو خون چھوٹی چھوٹی نسوں کے ذریعہ بہہ کر جسم کے مختلف حصوں میں چلا جاتا ہے۔ ان میں سے بعض نسیں تو پانی سے بھی پتلی ہوتی ہیں جو خون کو جسم کے ایک ایک حصے تک پہنچاتی ہیں۔ خون کی اس طرح گردش کرنے کی بات ۱۶۲۸ء میں ایک انگریز ڈاکٹر ولیم ہاروے نے دریافت کی تھی۔

(پریس ایشیا انٹرنیشنل)

بقیہ آدھی ملاقات صـ ۳۸ سے

"شق القمر" پر کافی روشنی ڈالتا ہے۔ اس شمارے میں نثر کا حصہ کافی دلچسپ اور بہت خوب رہا۔

پیام تعلیم میں لکھنے والے حضرات سے میری گذارش ہے کہ وہ نظم کے حصہ کو خوب سے خوب تر بنانے کی کوشش کریں۔ بچوں کے لیے اچھی اچھی اور دلچسپ نظمیں ارسال کریں۔

"پیام تعلیم" کے لیے ایک مختصر سا مضمون "کبیر داس۔ شاہ کبیر ایک ہی نام" ارسال خدمت ہے

ولی احمد تنہا ظفر گوی

نہرو بال پستکالیہ

ہندوستان کی اہم زبانوں اور انگریزی میں بچوں کے لیے بہترین اور سستی کتابیں شایع کرنے کے لیے کتابوں کا اس سلسلہ کا آغاز کیا گیا ہے۔ اس کا سب سے بڑا مقصد یہ ہے کہ ہندوستان کے مختلف حصوں میں بسنے والوں، مختلف زبانوں کے جاننے والوں کے لیے ایک ہی سا ادب پیش کیا جائے تاکہ وہ ایک دوسرے کے حالات سے واقف ہو سکیں اور اس سے قومی ایکتا مضبوط ہو۔

اب تک مندرجہ ذیل کتابیں شایع ہوئی ہیں جو اُردو کے علاوہ انگریزی اور ہندوستان کی دوسری زبانوں میں بھی ملتی ہیں۔ ہر کتاب کی قیمت ایک روپیہ پچاس پیسے (۱/۵۰) ہے۔ یہ سب کتابیں رنگین تصویروں کے ساتھ فوٹو آفسٹ پر شایع ہوئی ہیں۔

۱۔ باپو (حصہ اول و دوم) مصنف: سی فری ناس، مترجم: صالحہ عابد حسین
۲۔ سب کا ساتھی سب کا دوست ، ، اُماشنکر جوشی ، ، انور کمال حسینی
۳۔ کشمیر مصنف مالا سنگھ، مترجم: خدیجہ بیگم، تصویر: پریانند
۴۔ پرندوں کی دنیا مصنف: جمال آرا، مترجم: محمد شفیع الدین نیّر
۵۔ ہمالیہ کی چوٹیوں پر ، ، بریگیڈیر گیان سنگھ، مترجم: محمد ذاکر
۶۔ ہماری ندیوں کی کہانی (حصہ اول) لیلا مجمدار، مترجم: رضیہ سجاد ظہیر
۷۔ جنت کی سیر اور دوسری کہانیاں } ، ، لیلا بھاگوت، ، ، رضیہ سجاد ظہیر
۸۔ رسیلی کہانیاں ، ، منوج داس، ، ، صغرا مہدی
۹۔ آزادی کی کہانی حصہ اول و دوم } ، ، وشنو پربھاکر، ، ، انور کمال حسینی
۱۰۔ ہماری رلیلیں ، ، جگ جیت سنگھ، ، ، فرش ملسیانی
۱۱۔ ہندوستان میں غیر ملکی سیاح } ، ، کے سی کھنہ، تصاویر: کرشن کھنہ
۱۲۔ آؤ ناٹک کھیلیں ، ، اوما نند، مترجم: رفیعہ منظور الامین
۱۳۔ خاربلی کا خاندان ، ، منوہر دیال چترویدی، محمد شفیع الدین نیّر
۱۴۔ بہت دن ہوئے حصہ اوّل } ، ، چوکسی بی۔ ام جوشی، ، رضیہ سجاد ظہیر
۱۵۔ بہادروں کی کہانیاں مصنف: راجندر اوستھی، مترجم: انور کمال حسینی
۱۶۔ روبنت و تعمیر ، ، کرشن چیتنیہ ، ، ، ، ، ،
۱۷۔ سدا بہار کہانیاں ، ، شانتا رنگاچاری مترجم: انور کمال حسینی
۱۸۔ ایجادیں جنھوں نے دنیا بدل ڈالی (حصہ اول و دوم) } ، ، میر نجابت علی ، ، سید احسان
۱۹۔ سونا کی سیر ، ، تارا تیواڑی ، ، انور کمال حسینی
۲۰۔ بڑا پانی مصنف: لیلا مجمدار، مترجم: صالحہ عابد حسین
۲۱۔ مورا ، ، ملک راج آنند ، ، انور کمال حسینی
۲۲۔ ہاکی کا کھیل ، ، سردیندر سانیال ، ، پریتم لال
۲۳۔ پھول اور شہد کی مکھی ، اشوک داور ، ، انور کمال حسینی

ذاکر حسین سیریز

۲۳۔ ابو خاں کی بکری، مصنف: ڈاکٹر ذاکر حسین قیمت: ۲/۰۰
۲۴۔ انوکھی دُکان ، ، قدسیہ زیدی ، ، ۲/۵۰
۲۵۔ گلابو چوہیا اور پری زاد } ، ، ، ، ، ، ۲/۰۰
۲۶۔ دنیا کے جانور ، ، ، ، ، ،
۲۷۔ راجہ رام موہن رائے ، ، فرش ملسیانی
۲۸۔ خواجہ الطاف حسین حالی ، ، صالحہ عابد حسین
۲۹۔ سلطان زین العابدین بڈشاہ ، رضیہ سجاد ظہیر
۳۰۔ ذاکر صاحب کی کہانی ، سعیدہ خورشید عالم

ملنے کا پتہ

مکتبہ ... جامعہ نگر نئی دہلی ۲۵، اردو بازار جامع مسجد دہلی ۶، پرنسس بلڈنگ بمبئی ۳

Regd. No. D(S)-037

SEPTEMBER, 19[illegible]

PAYAM-I-TALEEM

NEW DELHI-110025

کتاب	مصنف	قیمت	کتاب	مصنف	قیمت
ایک نادرہ	یوسف ناظم	۲	دلّی دور ہے	حبیب احمد خاں	۰/۵۰
انسانی معاملات اور دوسری کہانیاں	محمد حسین حسان ندوی	۱	جب اور اب	آصف مجیب	۱/۷۵
انصاف کا تخت	ابرار محسن	۰/۷۵	تین کوڑیاں	اقبال امروہوی	۱/۲۰
جیت کس کی	محمد حسین حسان ندوی	۱/۰۰	سونے کا پنجرہ	احسان الحق	۰/۶۵
دعوت ملا جی کی	"	۰/۶۰	چین کی گڑیا	محمد حسین حسان ندوی	۰/۵۰
پکڑو دم کتے کو	مولانا عبدالواحد سندھی	۰/۶۰	بہادر ستیاج	"	۰/۶۰
تدو ماما پردیس چلے	"	۰/۶۰	چچا غالب	مرتبہ محمد حسین حسان ندوی	۲/۰۰
بنو چتو	"	۰/۶۰	ہرن کے بچے	ترجمہ قرۃ العین حیدر	۰/۵۰
پان کھا کر طبلہ بجا کر رام ناچا	"	۰/۶۰	بھیڑیے کے بچے	"	۰/۵۰
بدنصیب شہزادی	ابرار محسن	۱/۰۰	میاں ڈھینچوں کے بچے	"	۰/۵۰
عقل کا سودا	"	۰/۶۰			
جنگل کا راجا	"	۱	شیر خاں	"	۰/۵۰
تیس مار خاں	"	۵۰	لومڑی کے بچے	"	۰/۵۰
بندر کا گھر	ظفر برنی	۰/۴۵	بہادر	"	۰/۴۵

ماہنامہ

پیامِ تعلیم

نئی دِلّی ۲۵

جلد ۱۲ شمارہ ۱۰

اڈیٹر

ولی شاہجہاں پوری

معاون

صفیہ حسّان

اکتوبر ۱۹۷۵ء

قیمت فی پرچہ :۔ ۷۰ پیسے

سالانہ چندہ :۔ سات روپے

پرنٹر پبلشر سید احمد ولی نے مکتبہ جامعہ لمیٹڈ کے لیے
جمال پرنٹنگ پریس دہلی میں چھپوا کر جامعہ نگر
نئی دِلّی ۲۵ سے شایع کیا

فہرست مضامین

کیوں صاحب آپ کا روضہ ہے ؟

اجی حضرت ابھی تو میں زندہ ہوں۔ اور معمولی آدمی ہوں۔ روضہ تو بادشاہوں کا بنتا ہے۔

عزیز پیامیوں کو عید مبارک ہو!۔

سچی بات تو یہ ہے کہ عید تو ان ہی لوگوں کی ہے جنھوں نے رمضان المبارک کے مہینے میں دن کو روزے رکھے اور راتیں عبادت میں گزاریں۔ یہی لوگ مبارک باد کے مستحق ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کی عبادت اور بندگی کو قبول فرمائے۔ آمین۔

۲۔ اکتوبر کو مہاتما گاندھی کا یوم پیدائش ہے اس دن کو قومی تیوہار کی طرح پورے ہندوستان میں منایا جاتا ہے۔ گاندھی جی کی تعلیمات کے چرچے ہوتے ہیں۔

آپ کے اسکول میں بھی یہ تقریب منائی جاتی ہوگی اس سال بھی منائی جائے گی۔ ان کی تعلیمی زندگی خاص طور پر آج کے طالب علموں کے لیے قابلِ تقلید ہے۔ گاندھی جی پر بے انتہا کتابیں لکھی گئی ہیں۔ ان کے بچپن کے حالات آپ بھی پڑھیے، اور اس پر عمل کرنے کی کوشش کیجیے۔ جلسے، جلوس اور لمبی لمبی تقریروں کے مقابلے میں ان کی خدمت میں سچا خراج عقیدت یہی ہے کہ ان کے خیالات کو اپنائیے اور ان کی تعلیمات پر عمل کیجیے۔

ہم نے اگست کے پرچے میں لکھا تھا کہ پندرہ اگست کی اسکولی تقریبات پر بچے اپنے تاثرات ہمیں بھیجیں۔ سب سے اچھے مضمون پر پانچ روپے کا نقد انعام کا وعدہ بھی کیا تھا۔ ہمیں افسوس ہے کہ صرف ۳۔ ہی مضمون آسکے۔ ان کی تفصیل ہم اگلے پرچے میں شائع کریں گے اور انعام پانے والے کے نام کا اعلان بھی کر دیں گے۔

اس شمارے میں آپ کو کئی اچھی چیزیں ملیں گی۔ شوکت پردیسی صاحب کی نظم عید اور مفتوں کوٹوی صاحب کی نظم "ہمیں پھر یاد کا

[illegible] " وقت کی چیزیں ہیں اور خوب ہیں ۔

جیسا کہ پچھلے پرچہ میں بتایا تھا ۔ خالد عرفان صاحب کا مضمون اس شمارے میں پڑھیے اور اپنی سائنسی معلومات میں اضافہ کیجیے۔ سید غلام ربانی صاحب کی خدمات پیام تعلیم پر اتنی ہیں کہ ہم ان کا شکریہ ادا کر کے بھی اپنے فرض سے سبکدوش نہیں ہو سکتے ۔ عمر کی اس منزل پر پہنچ کر بچوں کا اتنا خیال رکھنا بچوں کی خوش قسمتی ہے ۔ ورنہ آج کل تو ہمارے ادیب اور شاعر، خاص طور سے وہ جن کا شمار "بڑوں" میں ہونے لگتا ہے ۔ بچوں کے لیے لکھنا اپنی توہین سمجھتے ہیں ۔ کاش ایسے حضرات محترم غلام ربانی صاحب سے سبق حاصل کر سکیں ۔

خلیق انجم اشرفی صاحب ان دنوں بہت مصروف زندگی گزار رہے ہیں ۔ دفتری پابندیوں کے ساتھ مقابلے کے امتحان کی تیاری انھیں دوسرے کاموں کا موقع نہیں دیتیں ۔ پھر بھی پیام تعلیم کے لیے وقت نکال ہی لیتے ہیں ۔ یہ نتیجہ ہے ان کی اس دلچسپی کا جو انھیں بچوں کے ادب سے اور اس محبت کا جو "پیام تعلیم" سے انھیں ہے

اس شمارے میں ان کا ترجمہ کیا ہوا ایک ڈراما پڑھیے ۔ ان کے ابتدائی نوٹ کو پڑھیے تو معلوم ہوگا کہ بچوں کے ادب سے متعلق وہ کتنی معلومات رکھتے ہیں ۔

ان کے علاوہ بھی اس شمارے میں آپ کی دلچسپی کے بہت سامان موجود ہیں ۔ خدا کرے آپ کو پسند آئیں ۔

عید مبارک

جناب شوکت پردیسی

آئی ہے عید رحمتِ یزداں لیے ہوئے
ہمراہ اپنے دودھ و سویّاں لیے ہوئے

سامانِ انبساط نمایاں ہے ہر طرف
سرمستیٔ نشاطِ بہاراں ہے ہر طرف

دیکھو! وہ لوگ گھر سے چلے، عید گاہ میں
باہم ملیں گے اب تو گلے، عید گاہ میں

موسم کا حسن ہے نہ یہ جھونکا ہوا کا ہے
روزے کے بعد عید بھی تحفہ خدا کا ہے

رنج و ملال دل سے مٹاؤ کہ عید ہے
آپس میں میل جول بڑھاؤ کہ عید ہے۔

ہر دل کے واسطے ہے پیامِ خوشی یہ عید!
لائی ہے ربط خاص بنامِ خوشی یہ عید!

بچّوں کے حوصلوں کا بڑا زور و شور ہے
بوڑھوں کی بات چیت کا انداز اور ہے

جوتا نیا ہے اور نیا ہے لباس بھی
سب کچھ نیا ہے، دل میں نئی کچھ ہو آس بھی

کپڑوں سے قیمتی ہے محبت کی اک نگاہ
ہر چیز سے بلند ہے آپس کی رسم و راہ

اٹھو! بصد خلوص کرو اہتمامِ عید!!
سب کو بناؤ آج کے دن شاد کامِ عید!!

جناب خالد عرفان

کیا آپ ہوا میں سوراخ کر سکتے ہیں

آیئے آج ہوا کی بعض اور خصوصیتوں کے بارے میں جانیں۔ پچھلی بار آپ نے "ہوائی سمندر" میں ہوا کے دباؤ کے بارے میں پڑھا تھا کہ وہ اوپر نیچے، دائیں بائیں چاروں طرف پھیلا ہوا ہے اور اس کا اتنا زور ہوتا ہے کہ اس پر قابو نہیں پایا جا سکتا۔ یہاں تک کہ ایک بوتل کے اندر بھی وہ اس قدر ہوتا ہے کہ آپ کے دوست ایک غبارہ تک پھونک نہیں سکتے جو اس بوتل کے منہ پر اندر کی طرف فٹ کیا جائے آپ کو یاد ہوگا آپ نے اپنے دوست کو چیلنج کیا تھا کہ آپ اس غبارے کو بوتل کے اندر ہی پھونک کر گول گپا کر دیں گے آیئے آج اسی کے بارے میں جانیں کہ ایسا کب اور کیسے ہو سکتا ہے۔ بھئی اس غبارے کو بوتل کے اندر پھونکنا آسان ہے۔ بس اس کے لئے آپ کو ہوا کے اندر سوراخ بنانا ہوگا۔ آپ ہنس دیں گے۔ جو چیز ٹھوس ہوتی ہے، جس کو دیکھا جا سکتا ہے اس میں سوراخ بننے تو سمجھ میں آنے والی بات ہے لیکن جو چیز دکھائی نہیں دیتی، جس کا ٹھوس وجود نہیں اس میں سوراخ کیسا؟ لیکن ایسا ممکن ہے، ہر چیز میں آپ جانتے ہی ہیں کہ کچھ نہیں تو ہوا ضرور بھری ہوئی ہوتی ہے اور اگر اس میں سے ہوا نکال دیں تو جو خالی جگہ بن جائے گی وہ سوراخ ہی تو ہوگی۔ اور جب کسی چیز میں ایسا سوراخ ہو جاتا ہے ہوا نکل جاتی ہے تو اس میں دباؤ کم ہو جاتا ہے۔ اس تجربے میں بھی پہلے کی طرح آپ کو ایک دودھ کی بوتل اور غبارے کی ضرورت ہے۔ اس کے علاوہ کسی پرانے اخبار کا چھوٹا سا ٹکڑا بھی لے لیجیے۔ جو آسانی سے بوتل میں داخل کیا جا سکے اور ہاں ذرا اپنی امی سے کہہ کر دیا سلائی کی ڈبیا بھی مانگ لیجیے۔ اب آپ کو یہ کرنا ہے کہ بوتل کے اندر جو ہوا پائی جاتی ہے۔ اسی کو کسی اور گیس میں بدل دیں جو ہوا سے کم حجم رکھتی ہو اور اس طرح کم جگہ گھیرتی ہو۔ اس کے لیے آپ بس یوں کیجیے کہ کاغذ کے ٹکڑے کو سلگا کر بوتل کے اندر ڈال دیجیے شکل ۱
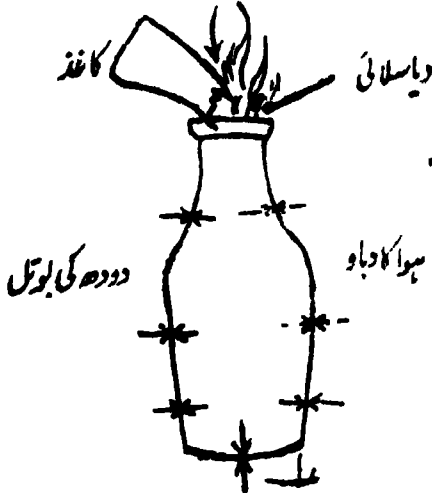
کاغذ جیسے جیسے جلے گا اس کی گرمی سے بوتل کے اندر کی ہوا بھی گرم ہو جائے گی، پھیلے گی اور اس کا کچھ حصہ بوتل سے باہر نکل جائے گا۔ اب جب

بوتل ٹھنڈی ہو گی تو ہوا سکڑنے گی اب جلدی سے
غبارہ کو بوتل کے منہ پر چڑھا دیجیے شکل ۲ غبارے

خالی ہوا کا دباؤ
غبارہ
قابلی ہوا کا دباؤ
ہوا کا دباؤ
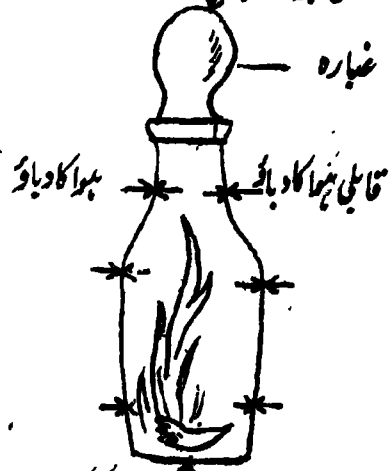
جلتا ہوا کاغذ جو بوتل کے اندر کی کچھ ہوا سے
مل کر بوتل میں سوراخ (یعنی خلا) پیدا کر رہا ہے

۲

پر باہر کی ہوا کا دباؤ زیادہ ہوگا۔ لیکن اندر کی ہوا کا کم۔
اس سے خود بخود غبارہ اندر کی طرف چلا جائے گا
شکل ۳ اب ہوا کے سکڑنے سے ظاہر بات

خارجی ہوا کا دباؤ
خارجی کا ہوا کا دباؤ
غبارہ
۳
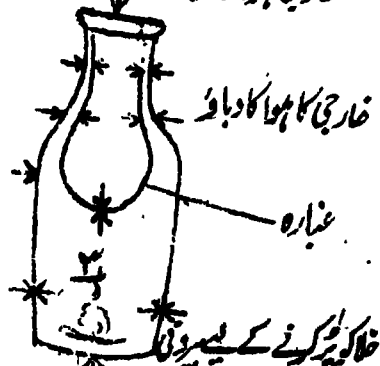
خلا کو پُر کرنے کے لیے بیرونی
ہوا غبارے کو اندر دھکیل دیتی ہے۔

ہے بوتل کے اندر کا دباؤ کم ہو گیا ہے اس لیے کہ ہوا
کی مقدار جو بوتل کے اندر پائی جاتی ہے وہ کم ہو گئی

ہے۔ اس طرح بوتل میں کچھ "خالی جگہ" بن گئی ہے
یا "خلا" پیدا ہو گیا ہے۔ یا یوں کہیے کہ ایک طرح
سا بن گیا ہے۔ اب باہر کی ہوا اس خالی جگہ کو پُر کرنے
کی کوشش کر رہی ہو گی۔ اس بات کو آپ آسانی سے
سمجھ سکتے ہیں۔ آپ نے ریت میں گھروندے بنائے
ہوں گے۔ آپ نے دیکھا ہوگا جیسے ہی آپ ڈھیر
کے اندر سے کچھ بالو نکال کر سوراخ بنائیں گے ویسے
ہی آہستہ سے ارد گرد کی بالو اس سوراخ کو پُر
کرنے کے لیے آجائے گی۔ ہوا کے معاملے میں بھی
کچھ اسی طرح کی بات ہوتی ہے۔ لیکن بوتل کا شیشہ
چونکہ سخت ہوتا ہے۔ باہر کی ہوا اندر نہیں داخل
ہو سکتی اور سوراخ پُر نہیں ہو سکتا لیکن بوتل کے
منہ پر لگا غبارہ پھولے گا۔ پھر چونکہ باہر کی ہوا
کا دباؤ زیادہ ہوگا۔ اس لیے وہ اندر داخل ہو
جائے گا اور خود بخود یہاں بھی پھول جائے گا۔
آپ کو پھونکنے کی ضرورت نہیں پڑے گی اس
لیے کہ بوتل کے اندر کی ہوا کا دباؤ باہر کی ہوا
کے دباؤ سے کافی کم ہوتا ہے۔ اب اگر غبارے
کو باہر نکالنا ہو تو شیشے اور غبارے کے درمیان
آپ کو ایک پنسل داخل کرنا ہوگی۔

اب آئیے آپ کو ہوا کے دباؤ کا ایک اور
کمال بتاؤں، آپ دو پیالوں کو ایک دوسرے
کے ساتھ پیوست کر سکتے ہیں۔

اس تجربے میں آپ کو ایک جیسے شیشے
کے دو پیالے لینے ہیں، تھوڑا سا کاغذ اور دیا سلائی
بھی چاہیے۔ اس کے علاوہ جاذب کاغذ کا اتنا
ٹکڑا کر اس میں سے گلاس کے منہ کے ناپ کا ٹکڑا

جا سکے۔ ظاہر بات ہے آپ کو قینچی کی ضرورت پڑے گی۔

خیال رہے جاذب کاغذ ایسا ہو جو دونوں طرف سے روشنائی وغیرہ کو جذب کر سکے۔ اس میں سے آپ ایک گول ٹکڑا اس طرح کاٹیے کہ اس کا قطر پیالے کے منھ کے قطر سے آدھا انچ زیادہ ہو۔ اب اس پھر پیالے کے منھ کا قطر بنا کر اتنے حصے کو درمیانی طرف سے کاٹ لیجیے اس طرح درمیان میں ایک سوراخ سا ہو جائے گا۔ اب اس سوراخ والے جاذب کاغذ کو ایک پیالے کے منھ پر اس طرح ڈھانپیے کہ ایک کالر سا بن جائے۔ دیکھیے ڈھانپنے سے پہلے کالر کو گیلا کر لیجیے اب دوسرے پیالے کو الٹی طرف سے پہلے پیالے کے منھ کے قریب پکڑیے۔ اب جو کاغذ کا ٹکڑا رہا ہے اس کو جلائیے میز پر رکھے کالر لگے پیالے کے اندر جلتے ہوئے کاغذ کے ٹکڑے کو جلدی سے ڈال دیجیے اور اسی قدر پھرتی سے پہلے پیالے کے منھ کو دوسرے پیالے سے ڈھانپ دیجیے جیسا کہ شکل میں دکھایا گیا ہے ——— خیال رہے گیلا جاذب کاغذ کا کالر

ان دونوں کے درمیان رہے۔ جب جلتا ہوا کاغذ بجھ جائے گا تب آپ اوپر کے پیالے کو الٹی طرف سے پکڑ کر اوپر اٹھائیے شکل ۵۔
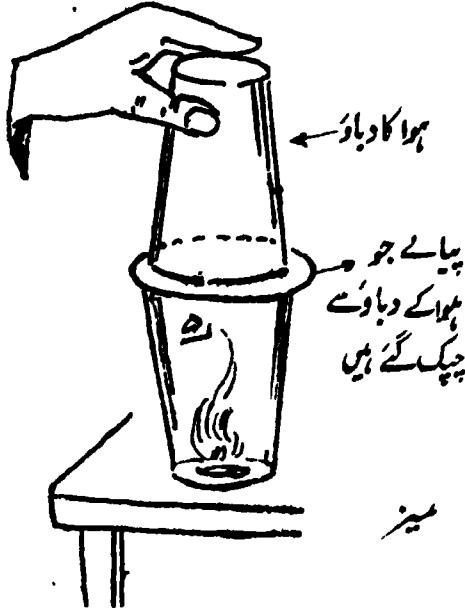
نچلا پیالا بھی ساتھ ہی چلا آئے گا اور گرے گا نہیں، ہے نا کمال! گیلا کالر دراصل دونوں پیالوں کے درمیان مُہر کا کام دیتا ہے اور نہ باہر کی ہوا کو اندر کی طرف جانے دیتا ہے اور نہ اندر کی ہوا کو باہر کی طرف نکلنے دیتا ہے۔ اس طرح پیالوں کے اندر جو سوراخ بنا ہوا ہے وہ پُر نہیں ہو سکتا اور دونوں پیالے مضبوطی سے جمے ہوتے ہیں۔ اس طرح کہ گویا ان دونوں کو گوند لگا کر چپکا دیا گیا ہے۔ ان دونوں پیالوں کو علیحدہ کرنے کے لیے زیادہ زور لگانا پڑتا ہے۔ اس ضمن میں ایک اور واقعہ سنا کر آپ کو حیران کرنے سے پہلے آپ کو بتا دوں کہ ہوا کے دباؤ کو پہچاننے سے پہلے ہوا کو خارج کر کے خلا پیدا کرنے کا پتہ چلا لیا گیا تھا اور اس بات کا اندازہ بھی کر لیا گیا تھا کہ جب کبھی ہوا خارج ہوتی ہے اور

ایک "سوراخ" بتاتی ہے۔ اس "خلا" کو پر کرنے
کے لیے ہمیشہ کچھ نہ کچھ اندر کھنچا چلا جاتا ہے۔ اور
یہ طاقت بہت زیادہ ہوتی ہے۔

آپ نے جو تجربہ کیا اسی طرح کا تجربہ ایک سائنس
داں نے اب سے کوئی ۳۲۵ برس پہلے یعنی ۱۶۵۰ میں
کر کے ایک کثیر مجمع کو حیران کر دیا تھا۔ ان کا نام تھا آٹو فان
گویرکے۔ انھوں نے صرف ۲۲۔۱ انچ قطر کی ایک جیسی
دو پیالیاں دھات میں بنائیں۔ ان دونوں پیالوں کو
علیحدہ کرنے کے لیے ایک ایک پیالی سے آٹھ آٹھ
گھوڑوں کو بندھوا کر زور لگایا تب کہیں جا کر وہ علیحدہ
ہو سکیں۔ ہے نا تعجب کی بات! آپ شاید نہ مانیں،
لیکن ایک تجربہ کو خود آپ نے کیا ہے نا۔ آیئے اب پھر سے
اپنے دوست کو حیرت میں ڈالیں۔

برف کی ڈلی اور اسی خلا کی مدد سے پانی کو اُبال کر!
ارے آپ بھی ہنس پڑے، پانی کو ابالیں اور وہ بھی
برف کی مدد سے! کیسی عجیب بات ہے لیکن ہے سچ،
ایک مضبوط شیشے کا ایسا برتن لیجیے۔
جس کا منہ تنگ ہو تا کہ اس کو کسی ربر کے کارک
سے مضبوطی سے بند کیا جا سکے۔ ایک برف کا ڈلہ
بھی اپنے ساتھ رکھیے۔ برتن کو آدھے سے کم حصے
تک پانی سے بھر لیجیے ـــــــ اب اس کو چولھے
پر چڑھا کر اس قدر گرم کیجیے کہ پانی اُبلنے لگے، کھولنے
لگے۔ اس وقت اس کا درجہ حرارت ۲۱۲ درجہ ڈگری
فارن ہیٹ رہے گا۔ اب پانی بھاپ بن کر اڑنے
لگا۔ یہ بھاپ بلبلوں کی شکل میں پانی کی تہہ سے اوپر
اٹھتی رہے گی۔ پانی کے اوپر برتن میں جو ہوا
رہے گی وہ باہر نکل جائے گی اور اس کی جگہ بھاپ
لے لے گی۔ اب اس برتن کو چولھے پر سے اتار لیجیے
اور اس کے منھ کو اس میں فٹ ہونے والے
کارک سے اچھی طرح بند کر دیجیے۔ لیجیے! اب
کھیل شروع ہوتا ہے۔ اس کو ایک طرف ٹھنڈا
ہونے کے لیے رکھ دیجیے۔ پانی تو اب بھی گرم
ہوگا لیکن اس قدر نہیں کہ وہ ابلنے لگے ـــ اس طرح
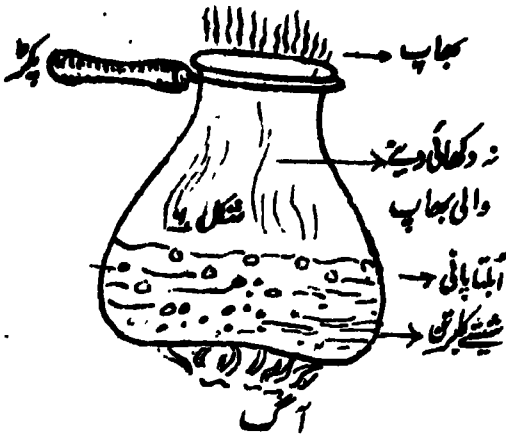
پانی کے اوپر ایک چھوٹا سا خلا سا پیدا ہونے لگے گا
(شکل ۲) ہم اس خلا کو جلد سے جلد بننے میں
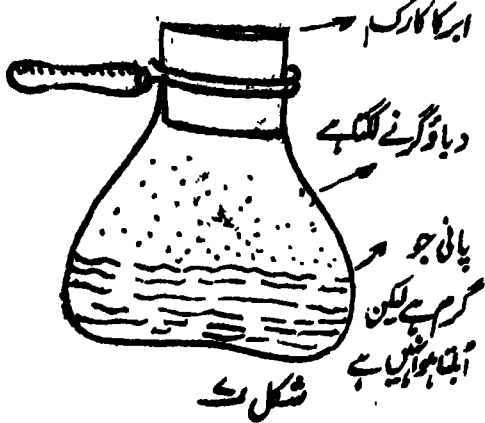
مدد کر سکتے ہیں۔ کس طرح؟ ٹھنڈا ہونے کے عمل
کو تیز کر کے اور یہ آپ یوں کر سکیں گے کہ برتن کو الٹا کر کے
اس کے پیندے پر برف کا ٹکڑا رکھ دیں گے اس طرح

[illegible] کے ساتھ ۔ پانی میں بلبلے اور
اندر کا اندر دباؤ بڑی تیزی کے ساتھ گرنے لگے گا۔
آپ کے دوست کو شاید اندازہ ہو کہ بیرونی ہوا کے دباؤ
سے کم کسی بھی دباؤ کے تحت پانی جب بھی ابلے گا
اس کا درجہ حرارت ۲۱۲ درجہ فارن ہیٹ سے بہت
کم ہوگا ۔ اب چونکہ آپ نے برف کی مدد سے بھاپ
کو پانی میں تبدیل کر لیا ہے ۔ اس لیے خالی جگہ میں جو
برتن کے اندر بچتی ہے ہوا کا دباؤ بہت ہی کم ہوتا ہے
اب آپ اور آپ کے دوست دونوں کو یہ دیکھ کر
تعجب ہوگا ۔ کہ پانی پھر سے ابلنے لگا ہے (شکل ۹)

شکل ۹
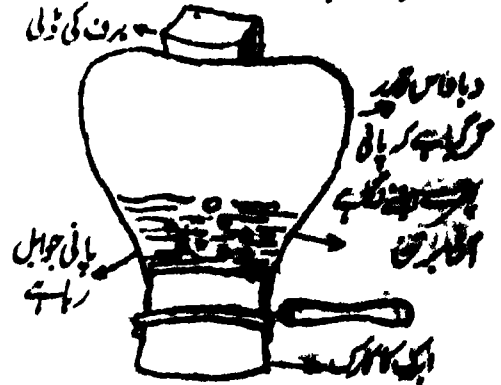
ہاں ذرا خیال رہے برتن کو زیادہ دیر تک
ٹھنڈا ہونے نہ دیجیے ، ورنہ آپ کی اور آپ کے دوست
کی آنکھیں حیرت سے پھٹی کی پھٹی رہ جائیں گی ۔ اندر کا
دباؤ کم ہوتے ہوتے اس قدر کم ہو جائے گا کہ برتن اندر
کی طرف زوردار دھماکے کے ساتھ پچک کر رہ جائے گا ۔
یہ اندر کی طرف ٹوٹ کر رہ جانے والی خصوصیت
تو یہ ہے کہ پٹرول یا کیروسن کا کوئی ٹن کا ڈبہ بھی اندر
کی طرف سکڑ کر رہ جائے گا ۔ اور اس کو دیکھ کر آپ
ہنس دیں گے ۔

●●

بقیہ بہشت کی سیر صفحہ ۳۰ سے

فقیر دیکھا جو کہ پیڑ کے پاس بیٹھا رو رہا تھا ۔ احمد
نے پوچھا بابا تم کیوں رو رہے ہو ۔ بابا بولے
میری بھی تمہاری جیسی ڈبیہ تھی اور وہ کھو گئی
ہے ۔ احمد بولا بابا تم رو مت تم میری ڈبیہ لے لو
میں اچھے اچھے کام کرکے دوسری ڈبیہ بھر لوں گا ۔
بابا نے اس کو بہت پیار کیا ۔ یہ وہی بابا تھے جو
خواب میں آئے تھے ۔ انھوں نے اس کی آنکھوں
پر ہاتھ پھیرا اور اس کی آنکھیں میچ گئیں اس
نے دیکھا کہ جیسا دادی نے بتایا تھا جنت تو
تو اس سے بھی اچھی ہے ۔ اس طرح اس نے
جنت دیکھ لی ۔

★★

جناب سید غلام ربانی (حیدرآباد)

سورج کے بارے میں پرانے خیال

کہنے کو تو ہم کہہ دیتے ہیں کہ سورج مشرق سے
نکلتا ہے اور مغرب میں چھپتا ہے۔ مگر واقعہ یہ ہے
کہ سورج ہمیشہ مشرق سے نہیں نکلتا بلکہ جگہ بدلتا
رہتا ہے۔ کبھی مشرق سے ذرا جنوب کی طرف ہٹ کر
نکلتا ہے اور جنوب مغرب میں چھپتا ہے۔ اس
زمانہ میں دن چھوٹے ہوتے ہیں اور راتیں بڑی۔
کبھی مشرق سے کسی قدر شمال کی طرف ہٹ کر نکلتا
ہے اور شمال مغرب میں چھپتا ہے۔ اس زمانے
میں دن بڑے ہوتے ہیں اور راتیں چھوٹی۔ جگہ
کی ان تبدیلیوں کی وجہ سے خیال ہوا کہ سورج
ایک نہیں بلکہ بارہ ہیں۔ ہندوستان میں پہلے
زمانے کے لوگ یہ سمجھتے تھے کہ سورج بارہ ہیں
اور ہر مہینے کا ایک سورج ہے۔
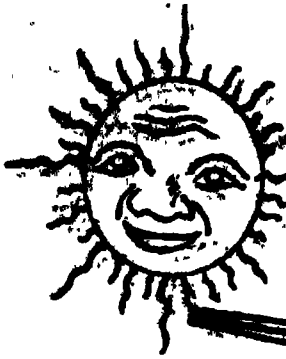
ہزاروں برس پہلے لوگوں کو معلوم نہیں تھا
کہ زمین گول ہے۔ ان کا خیال تھا کہ یہ ایک بہت
بڑا میدان ہے جو ہر طرف پھیلا ہوا ہے۔
وہ حیران تھے کہ سورج دن کو تو نکلتا اور آسمان
پر چلتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ مگر رات کو کہاں چلا
جاتا ہے۔ وہ سمجھتے تھے کہ وہ اترتے اترتے کہیں
دور سمندر میں ڈوب جاتا ہے۔ اس زمانے کے
بعض لوگ تو یہاں تک کہتے تھے کہ جب آفتاب
شام کو سمندر میں ڈوبتا ہے تو ہم کو اس کے
بجھنے کی سنسناہٹ بھی سنائی دیتی ہے۔

اس خیال میں بڑی خرابی یہ تھی کہ جب
وہ شام کو سمندر میں ڈوب کر ٹھنڈا ہو جاتا
ہے تو پھر کس طرح دوسرے دن مشرق میں
اسی تپش سے نکل کر چمکنے لگتا ہے۔ اس معمے
کو کوئی حل نہیں کر سکتا تھا۔

یونان کے لوگ کہتے تھے کہ نہیں صاحب،
جو سورج آج صبح کو پورب میں نکلتا ہے۔ وہ
وہ سورج نہیں ہے جو کل شام کو مغرب میں
ڈوبا تھا۔ بلکہ ایک اور نیا سورج ہے۔ دیوتا
لوگ ہر روز صبح کو بڑی دور مشرق میں ایک نیا
آفتاب چلا دیتے ہیں، پھر وہ دن بھر اپنا

دورہ پورا کرکے مغرب میں مر جاتا ہے۔ پھر رات بھر دیوتا لوگ اس کام میں لگے رہتے ہیں کہ دوسری صبح کے لیے ایک نیا سورج تیار کریں۔

اس خیال پر لوگوں نے اعتراض کیا کہ اس طرح تو ایک بڑا سورج ہر روز ضائع ہو جاتا ہے۔ اس لیے قیاس کیا کہ بڑے بڑے خشکی کے قطعات جو براعظم کہلاتے ہیں، ان کے چاروں طرف ایسے بڑے سمندر پھیلے ہوئے ہیں جن کی کہیں حد نہیں۔ ان کا خیال تھا کہ زمین کے شمال میں بڑے بڑے پہاڑ اور برف ہے۔

ایک دیوتا "ول کن" ہے وہ اس سمندر کا مالک ہے۔ اس کے پاس ایک جہاز ہے جب وہ دیکھتا ہے کہ سورج سمندر میں ڈوبنے کو ہے تو وہ جھٹ اس کو سنبھال لیتا ہے اور اپنے جہاز میں سوار کرکے راتوں رات دوسری طرف پہنچا دیتا ہے۔ چنانچہ جب سورج کی سواری شمال کی راہ سے گزرتی تھی تو اس کی چمک بعض وقت شمالی پہاڑوں پر دکھائی دے جایا کرتی تھی۔ آفتاب کی گردش سمجھانے کے لیے یہ خیال اچھا تو معلوم ہوتا ہے۔ مگر جہازوں کے کپتان کہتے تھے کہ ہم سارے سمندروں میں پھرتے ہیں کہیں "ول کن" اور اس کا جہاز نظر نہیں آیا۔ بلکہ ہم کو تو معلوم ہوتا ہے کہ ہر جگہ سمندر کی سطح جھک کر چمکدار ہو جاتی ہے۔ غرض ان باتوں سے لوگوں کو معلوم ہو گیا کہ زمین ہموار نہیں ہے۔ بلکہ گول کرہ ہے۔ جو آسمان میں ادھر ادھر پھرتا ہے۔ اس نتیجے پر پہنچنے میں دنیا کو ہزاروں برس

●●

محترمہ غوثیہ بیگم (جامعہ نگر)

سات دنوں کی کہانی

سات دنوں کی ہے یہ کہانی
سن لو بھائی جانی
اس کو سن کر ہنس کے کہو گے
آہا یہ ہے کہانی
پیر کو ہم نے کھیر پکائی
کھا گئی اک دیوانی
منگل کے دن مچھلی آئی
لے گئی بلّی کانی
بدھ کے دن جو کھچڑی پکائی
جل گئی سب بن پانی
کالی جمعرات آندھی اٹھی
برسا دھڑ دھڑ پانی
جمعہ کو ترکاری آئی
کھا گئی بکری رانی
ہفتے کی جب باری آئی
آ گئے ابّا جانی
بھر بھر پیٹ اتوار کو کھائی
آہا ہا بریانی

سات دنوں کی اب تو پوری
ہو گئی آہا ہا یہ کہانی

★

جناب محمد ایوب واقف

ہمارے نبیؐ نے ہمارے نبیؐ نے

کیا کس نے آگاہ وحدانیت سے — ملایا ہمیں کس نے انسانیت سے
اٹھایا ہمیں کس نے پسپائیت سے — بچایا ہمیں کس نے شیطانیت سے
ہمارے نبیؐ نے ہمارے نبیؐ نے

زمانے کو سوتے سے کس نے جگایا — سفینے کو ساحل سے کس نے لگایا
مفاسد کو دنیا سے کس نے مٹایا — دیا دین و ایماں کا کس نے جلایا
ہمارے نبیؐ نے ہمارے نبیؐ نے

اخوت کا نعرہ دیا کس نے پہلے — دعائیں دیں کس نے مظالم کے بدلے
سرِ راہِ حق کے کیے کس نے چرچے — بدی پر مسلسل کیے کس نے حملے
ہمارے نبیؐ نے ہمارے نبیؐ نے

غریبوں کو سینے سے کس نے لگایا — یتیموں کی دنیا کو کس نے بسایا
دلوں سے کدورت کو کس نے مٹایا — سبق مہر و الفت کا کس نے پڑھایا
ہمارے نبیؐ نے ہمارے نبیؐ نے

کہا کس نے ہم سب کا خالق خدا ہے — کہا کس نے افضل خدا کی رضا ہے
کہا کس نے نیکی بدی کی جزا ہے — کہا کس نے اسلام دینِ خدا ہے
ہمارے نبی نے ہمارے نبی نے

وشنو پربھاکر

ترجمہ: خلیق انجم اشرفی

لالا جی کے چوہے

(نوٹ: وشنو پربھاکر جی کے اس ڈرامے کی بنیاد انگریزی کی ایک پرانی کہانی ہے جس کا ترجمہ ہندی اور اردو میں ہو چکا ہے۔ اس کہانی کو بنیاد بنا کر اردو میں کئی اور کہانیاں بھی لکھی گئی ہیں اور ایک ڈراما "مرغ آباد کا ڈراما" بھی جو مکتبہ جامعہ کی شائع کردہ "اردو کی پانچویں کتاب" میں شامل ہے۔ پربھاکر جی نے اسے ہندوستانی پس منظر دے کر اور دلچسپ بنا دیا ہے۔ مترجم)

(اسٹیج پر ایک چھوٹے سے شہر کے بازار کا منظر۔ کپڑے کی دکان پر ایک سیٹھ جی بڑی شان سے بیٹھے ہیں۔ لوگ اِدھر اُدھر آجا رہے ہیں۔ ایک لالا جی سیٹھ جی کی دکان پر آتے ہیں)

لالا جی:- رام رام، سیٹھ جی!

سیٹھ جی:- رام، رام، جی! آپ کون ہیں؟ کہاں سے آئے ہیں؟

لالا جی: آپ نے مجھے پہچانا نہیں؟ میں تو اسی شہر کا لالا رام لال ہوں۔ کئی سال پہلے یہاں سے چلا گیا تھا۔

سیٹھ جی: او ہو! آپ ہیں لالا رام لال جی! تبھی تو کہوں آواز کچھ جانی پہچانی سی لگے ہے۔ معاف کرنا، کئی سال میں دیکھا ہے۔ اس لیے پہچان نہیں پایا۔ صحت تو آپ کی اچھی ہے۔ کیا کار بار کرو ہو جی؟

لالا جی:- جی بس یہی بیوپار کر رہا ہوں۔ اب یہیں رہ کر کام دھندا دیکھوں گا۔ میں نے کہا۔ آپ کو کچھ یاد تو ہے نا؟

سیٹھ جی:- یاد؟ کیسی یاد؟ دیکھو جی، میری یادداشت کچھ کمزور ہے۔

لالا جی: کوئی بات نہیں۔ میں تیز کر دوں گا۔ دیکھو جی۔ جب میں جا رہا تھا تو اپنی لوہے کی الماری رکھ گیا تھا۔

سیٹھ جی۔ لیکن اب تو وہ میرے پاس نہیں ہے۔

لالا جی: آپ کے پاس نہیں ہے تو کس کے پاس ہے؟

سیٹھ جی: بات یہ ہے لالا جی کہ اب وہ الماری کسی کے پاس نہیں ہے اُسے تو چوہے کھا گئے۔

لالا جی :- چوہے کھا گئے ؟ لوہے کی الماری کو چوہے کھا گئے ؟

سیٹھ جی : جی ہاں ! کمرے میں رکھ دی تھی۔ ایک دن کھول کر دیکھا تو پتہ لگا چوہوں نے اسے کتر کتر کر چھلنی بنا دیا ہے۔

(لالا رام لال ایک لمحے کچھ سوچتا ہے۔ چہرے پر کئی رنگ آکر گزر جاتے ہے۔ ایک لمبی سانس کھینچتا ہے)

لالا جی :- بنا دیا تو ٹھیک ہے۔ اس میں آپ کا کیا قصور میری قسمت ہی کھوٹی تھی۔ اچھی بات ہے اب اس میں کوئی کیا کر سکتا ہے۔ ہاں سیٹھ جی۔ اب جو ہونا تھا سو ہو گیا۔ دوسری الماری لے لوں گا۔ پہلے ذرا نہا دھو آؤں۔ ایسا کیجیے اپنے بیٹے کو میرے ساتھ بھیج دیجیے۔

سیٹھ جی :- ہاں۔ ہاں، کیوں نہیں۔ میرا بیٹا سو آپ کا بیٹا۔ بچوں کو تو بڑوں کی خدمت کرنی ہی چاہیے (پکار کر) پردیپ ! بیٹا پردیپ ! پردیپ اندر سے آتا ہے) بیٹا۔ یہ تمھارے چاچا جی ہیں ندی پر نہانے جا رہے ہیں۔ تم ان کے ساتھ چلے جاؤ۔ اس کے بعد ساتھ ساتھ ہی آجانا۔ لالا جی دیکھو سمجھو جو آج آپ میرے ساتھ ہی کرنا تکلف کی کوئی بات نہیں۔ سب کچھ آپ کا ہی ہے۔

لالا جی :- اس میں تکلف کی کیا بات ہے سیٹھ جی ! اپنا ہی گھر سمجھا تھا تبھی تو الماری . . . . . رکھ گیا تھا۔ نہا کر یہیں لوٹ آؤں گا۔ آپ بے فکر رہیں۔ اچھا میں چلا۔

(لالا جی اور پردیپ دونوں جاتے ہیں۔ اسٹیج پر اندھیرا ہونے لگتا ہے۔ ایک لمحے کے بعد پھر روشنی ابھرتی ہے اور پہلے والی دکان پر سیٹھ جی بیٹھے دکھائی دیتے ہیں۔ لالا جی آتے ہیں)

لالا جی : لو سیٹھ جی میں تو لوٹ آیا۔

سیٹھ جی : آیئے، آیئے۔ ابھی گھر چلتے ہیں (ادھر ادھر دیکھ کر) لیکن پردیپ کہاں ہے ؟

لالا جی :- معاف کیجیے گا سیٹھ جی ! میں نے بڑی کوشش کی لیکن آپ کے بیٹے کو بچا نہیں سکا۔

سیٹھ جی :- بچا نہیں سکا۔ کیا مطلب ؟ جلدی بتاؤ میرا بیٹا کہاں ہے ؟

لالا جی : کیا بتاؤں سیٹھ جی ! میں تو ندی میں اتر کر نہا رہا تھا کہ اتنے میں ایک باز آیا اور دیکھتے ہی دیکھتے آپ کے بیٹے کو پنجوں میں پھنسا کر آسمان میں اڑ گیا۔

سیٹھ جی :- باز میرے بیٹے کو لے کر اڑ گیا ؟ ارے جھوٹے مکار ! کہیں باز بھی اتنے بڑے لڑکے کو اٹھا کر لے جا سکتا ہے ؟ تو نے اسے کہیں چھپا دیا ہے۔ بھلا چاہتا ہے تو اسے ابھی لوٹا دے نہیں تو میں پنچوں کے پاس جاتا ہوں۔

لالا جی : تم کہیں بھی جا سکتے ہو۔ جو بات تھی وہ میں نے بتا دی۔

سیٹھ جی : میں کہتا ہوں تم سراسر جھوٹ بول رہے ہو۔ کوئی بھی آدمی اس بات پر یقین نہیں کر سکتا۔ تم اتنے بے شرم ہو کر میرے بیٹے کو چھپا کر میرے گھر کھانا کھانے آئے ہو ! کہیں باز بھی آدمی کو اٹھا سکتا ہے۔

لالاجی:- سیٹھ جی۔ اگر چوہے لوہے کی الماری کھا سکتے
ہیں تو باز بھی آدمی کو اٹھا کر لے جا سکتا ہے۔
سیٹھ جی: میں سچ کہتا ہوں۔ تمھاری الماری
چوہے کھا گئے ہیں۔
لالاجی:- تو میں بھی سچ کہتا ہوں۔ تمھارے بیٹے
کو باز اٹھا کر لے گیا ہے۔
سیٹھ جی: یہ نہیں ہو سکتا!
لالاجی:- اگر یہ نہیں ہو سکتا تو پھر چوہے بھی الماری
کو نہیں کھا سکتے
سیٹھ جی: میں ابھی پنچایت میں جا کر تمھاری شکایت
کرتا ہوں۔
لالاجی: ہاں، ہاں، ضرور۔ تمہیں ایسا کرنے کا حق
ہے۔ لیکن میں بھی ساتھ چلوں گا۔ وہیں ہمارا
فیصلہ ہو گا۔
سیٹھ جی:- تو پھر آؤ میرے ساتھ۔
لالاجی: چلو۔
(اسٹیج پر پھر اندھیرا چھانے لگتا ہے۔ ایک لمحے
کے بعد روشنی ابھرتی ہے۔ اس بار اسٹیج
پر پنچایت گھر کا کمرہ ہے جہاں ایک اونچے
سے چبوترے پر پنچ بیٹھے ہیں۔ آس پاس
اور نیچے بہت سے آدمی ہیں۔ لالاجی اور سیٹھ
جی بھی ہیں شور مچ رہا ہے)
سرپنچ: بھائیو۔ خاموش ہو جائیے۔ ہماری
پنچایت میں آج ایک انوکھا مقدمہ آیا ہے
میں سیٹھ جی کو اجازت دیتا ہوں کہ وہ اپنا
دعویٰ بیان کریں۔
سیٹھ جی: پنچو! میں لٹ گیا! لالاجی میرے ساتھ
دھوکا کر رہے ہیں۔
ایک پنچ: وہی تو ہم سننا چاہتے ہیں۔
سیٹھ جی: بات یہ ہے سرپنچ مہاراج کہ یہ لالاجی کئی
سال کے بعد اس شہر میں آئے ہیں۔ انہوں
نے مجھ سے کہا کہ یہ ندی میں نہاتے جا رہے
ہیں میں اپنا بیٹا ان کے ساتھ کر دوں۔ میں
نے ایسا ہی کیا۔ اب یہ لوٹ کر کہتے ہیں کہ
میرے بیٹے کو ندی کے کنارے سے باز اٹھا کر
لے گیا۔ بھلا پنچو! کہیں ایسا ہو سکتا ہے؟
کہیں باز لڑکے کو اٹھا کر لے جا سکتا ہے؟
(شور مچنے لگتا ہے "بڑی عجیب بات ہے"
"لڑکے کو باز کیسے اٹھا کر لے جا سکتا ہے"
"یہ لالاجی جھوٹ بول رہے ہیں")
دوسرا پنچ: ہاں، یہ تو ٹھیک ہے۔ باز لڑکے کو
اٹھا کر نہیں لے جا سکتا۔ ضرور اس میں
کوئی راز ہے۔
سیٹھ جی: جی ہاں، اس نے میرے بیٹے کو کہیں
چھپا دیا ہے۔ یہ جھوٹ بولتا ہے۔
سرپنچ: ٹھہرو سیٹھ جی! (لالاجی سے) کیوں
لالاجی، کیا سچ مچ باز لڑکے کو اٹھا کر
لے گیا؟
لالاجی: پنچو! اگر چوہے لوہے کی الماری کو
کھا سکتے ہیں۔ تو باز بھی لڑکے کو اٹھا کر
لے جا سکتا ہے۔ اس میں حیرت کی کیا
بات ہے!
(پھر حیرت بھری آوازیں ابھرتی ہیں۔
"کیا مطلب؟" "چوہوں نے لوہے کی

کون سی الماری کو کھایا ہے؟" "کہیں چوہے بھی لوہے کی الماری کھا سکتے ہیں؟")

تیسرا پنچ: - آپ کی بات سمجھ میں نہیں آئی لالہ جی! کھول کر بتائیے۔

لالہ جی: بات بہت سیدھی سی ہے۔ پانچ سال پہلے میں اسی شہر میں بیوپار کرتا تھا۔ اس سال اتنا نقصان ہوا کہ میں کنگال ہو گیا۔ تب میں نے دِساور جا کر دھن کمانے کی بات سوچی۔ جاتے وقت میں اپنی لوہے کی الماری ان کے پاس رکھ گیا تھا۔ آج لوٹنے پر جب میں نے ان سے اپنی الماری واپس مانگی تو انہوں نے کہا کہ اسے چوہے کھا گئے ہیں۔ پنچو! آپ ہی بتائیے۔ جب چوہے لوہے کی الماری کھا سکتے ہیں تو باز لڑکے کو اٹھا کر کیوں نہیں لے جا سکتا؟

(پنچایت گھر میں پھر شور مچتا ہے۔ "تو یہ بات ہے" "سیٹھ لوہے کی الماری ہضم کرنا چاہتا ہے۔" "شاباش لالہ جی! اچھا داؤں کھیلا۔")

سرپنچ: خاموش بھائیو! دونوں کے بیان آپ نے سنے۔ معاملہ بالکل صاف ہے۔ باز لڑکے کو اٹھا کر نہیں لے جا سکتا، چوہے بھی لوہے کی الماری کو نہیں کھا سکتے۔ کیوں سیٹھ جی؟

سیٹھ جی: (کانپ کر) جی، جی.... بات ...... یہ ..... ہے ..... ۔

سرپنچ: بات ہمیں معلوم ہے۔ آپ اپنا لڑکا واپس چاہتے ہیں یا ؟

سیٹھ جی: جی، ہاں!

سرپنچ: کیوں لالہ جی! آپ لڑکا واپس کرنے کو تیار ہیں۔

لالہ جی: آپ کا حکم سر آنکھوں پر لیکن ----

سرپنچ: آپ کا مطلب میں سمجھتا ہوں۔ آپ کی الماری آپ کو واپس ملے گی، کیوں سیٹھ جی؟

سیٹھ جی: (روہانسے ہو کر): پنچو! میرا بیٹا واپس دلا دیجیے۔ میں ایک کی جگہ پانچ الماریاں دے دوں گا۔

سرپنچ: تو ہمارا فیصلہ سنیے۔ سیٹھ جی لالہ جی کو ان کی الماری لوٹا دیں اور اپنی بدسلوکی کی ان سے معافی مانگیں۔ اس کے علاوہ لالہ جی کو کاروبار چلانے میں بھی مدد دیں اور لالہ جی ان کا بیٹا انھیں لوٹا دیں۔

(لالہ جی فاتحانہ نظروں سے سیٹھ جی کی طرف دیکھتے ہیں۔ سیٹھ جی سر جھکا لیتے ہیں۔ لوگ پنچ کے اس انصاف کی تعریف کرتے ہیں۔ کچھ ہنستے ہیں) (پردہ گرتا ہے)

جناب مفتون کوٹوی

ہمیں پھر یاد گاندھی جی کی آئی

مسرت کی گھٹا ہر سمت چھائی — خوشی سے زندگی پھر چہچہائی
کرن آشا کی دل میں جگمگائی — دوم تاریخ اکتوبر کی پائی
ہمیں پھر یاد گاندھی جی کی آئی

وہ گاندھی جی سے ہوئی جن کی بدولت — ہمیں حاصل زمانے بھر میں شہرت
چمک اٹھی بہر رنگ اپنی قسمت — بنا ہر دیش باسی، بھائی بھائی
ہمیں پھر یاد گاندھی جی کی آئی

وطن قیدِ غلامی میں تھا اپنا اُسے قیدِ غلامی سے چھڑایا
جما رکھا تھا انگریزوں نے قبضا نجات انگریز سے اس کو دلائی
ہمیں پھر یاد گاندھی جی کی آئی

چکھا کر ہم کو آزادی کی لذّت بتایا یہ ہے نعمت، اک امانت
ہر اک پر اس کی لازم ہے حفاظت حفاظت کی بھی بات ہم کو بتائی
ہمیں پھر یاد گاندھی جی کی آئی

سبق ہم کو اُخوّت کا پڑھایا طریقہ ہم کو الفت کا سکھایا
فلاحِ ملک کا رستہ دکھایا ترقی کی بھی پگڈنڈی دکھائی
ہمیں پھر یاد گاندھی جی کی آئی

ہیں پہلو اپنے جتنے زندگی کے اٹھائے ان سے پردے تیرگی کے
منارے رکھ دیئے ہیں روشنی کے ہر اک الجھن میں کی عقدہ کشائی
ہمیں پھر یاد گاندھی جی کی آئی

نہ اب گاندھی، نہ اب آزاد و نہرو مگر رہبر ہے اب بھی ان کی ہا، ہو
نقوشِ راہ ہیں مضفّوں بھر سو کریں گے رہروؤں کی رہنمائی
ہمیں پھر یاد گاندھی جی کی آئی

حکیم ریحان

شکار ایک گلدار کا

شیر اور چیتے کے شکار کی رونگٹے کھڑے کر دینے والی بے شمار داستانیں سنی اور پڑھی ہیں۔ لیکن جو داستان اس وقت میں آپ کو سنا رہا ہوں۔ وہ ایک گلدار کی یا اکثر بگھے کے شکار کی کہانی ہے۔ شیر یا چیتے کو میں نے اپنے وطن، رو[illegible]سن گڑھ میں بھی بچشم خود نہیں دیکھا۔ لیکن [illegible] بگھے سے تو اس بھر کنڈا کوں فیلڈ [illegible] میں [illegible] سامنا ہوتا ہے اور اسے میں خدا کے فضل [illegible] اس موذی جانور نے میرا بال بھی [illegible]

[illegible] جلد پر جس قدر خوشنا بیل بوٹے [illegible]۔ اسی مناسبت سے اُسے بعض [illegible] گلدار" بھی کہا جاتا ہے۔ گلدار کی دلداری [illegible] نے اسے ایک معاملے میں شیر پر [illegible] ہے۔ [illegible] پشت [illegible] نکل جائے تو نتیجے میں وہ [illegible] لیکن یہ گلدار [illegible] خارپشت کو کھا جاتا ہے

نکل جائے گا اور سرگشتی کرتا پھرے گا.... یعنی کچھ نہیں بگڑتا اس کا!

ایک علاقے میں اسی گلدار نے بڑی تباہی بپا کر رکھی تھی! ایک قیامت تھی جو ٹوٹ پڑتی تھی مویشیوں کو، بچوں کو، یہ گلدار اٹھالے جاتا۔ پتہ نہ چلتا! کہتے ہیں بلی شیر کی خالہ! تو پھر گلدار کی بھی بی بلی اماں ہوئیں۔ رشتہ میں خالہ ہی!۔ شاید اسی رشتے سے یہ گلدار بلی کی چال چل کر شکار کو انتہائی دھوکے سے اپنے قبضے میں کر لیتا ہے۔ لیکن یہ گلدار شاید دنیا بھر کے گلداروں سے بڑھ چڑھ کر تھا۔ لوگ باگ تو بعض دفعہ اُسے کسی بھوت خبیث کی رُوح تک سمجھ بیٹھنے پر مجبور ہوتے۔ ایک اکیلا گلدار اور بیسیوں جیالے اس کے سامنے بیکار!...

علاقے بھر کا ناک میں دم! نہ دن کا چین نہ رات کا آرام! نیند حرام..... لیکن خدا و ند عالم مجھے زیادہ پریشان کب تک دیکھتا رہتا؟ اس کا کرم کہ ایک مونچھیلا، منجھے ہوئے شکاری۔ شکار کے میدان کے پرانے کھلاڑی، کوئی خان صاحب

ادھر آ نکلے! انھوں نے نہایت غور و خوض کے بعد فیصلہ کیا کہ اس گلدار کو آسانی سے ختم نہیں کیا جا سکتا بلکہ اس سے نجات کا بہترین راستہ یہ ہے کہ امریکی طرز سے اس کا شکار کیا جائے۔

ایک جانور کو گلدار نے زخمی کر کے نالے میں چھپا رکھا تھا۔ کھانے نہ پایا تھا۔ لوگوں کی چیخ و پکار اور ہو، ہا سے بھاگ کر گھنے جنگل میں آس ہی پاس کہیں جا چھپا تھا۔ خاں صاحب کی ہدایت کے مطابق لوگ مسلح ہو کر پہرہ دے رہے تھے۔ لیکن گلدار کی غراہٹ آس ہی پاس سے بار بار سنائی دیتی جیسے وہ اپنا شکار نہ کھانے دیے جانے پر سخت احتجاج کر رہا ہو اور احتجاج ہی کے طور پر قریب ہی دھرنا دیے چھپا بیٹھا ہو! خاں صاحب کی ہدایت کے مطابق گلدار کے ذریعہ مار ڈالے جانے والے جانور کی لاش نالے سے نکال کر ایک ایسی جگہ لائی گئی جہاں قریب میں چاروں طرف درخت کھڑے تھے۔ پھر لاش کے چاروں طرف سرسبز تازہ بانسوں کا ایک مضبوط گھیرا بنایا گیا جسے پنجرہ بھی کہا جا سکتا ہے۔ اس پنجرے میں داخلے کے لیے دروازہ بھی بنا دیا گیا۔ داخلے کے دروازے میں موٹے تار کا ایک پھندا بھی ڈال دیا گیا (جیسا پھندا سور کے شکار کے لیے استعمال میں آتا ہے)

پنجرے سے کوئی بیس ہاتھ کے فاصلے پر شیشم کا ایک پرانا درخت کھڑا تھا۔ شیشم ایسا کہ جس کی لکڑی مضبوطی میں بے مثال ہے۔ اسی شیشم کی ۱۰۔۱۲ فٹ بلند شاخوں میں شکاری خاں صاحب کو کھاٹ باندھ کر اسے چاروں طرف سے پتیوں سے چھپا دیا گیا۔ آخر ہر طرف سے خاموشی اور سکون و اطمینان پا کر گلدار اپنے کیے ہوئے شکار کی بھوک پر پنجرے کے باہر کھڑا۔ ادھر ادھر دیکھنے لگا پنجرے کو پنجرے کی شکل میں نہ دیکھ کر بھی وہ ٹھٹکا ضرور.....

لیکن ایک طرف اس کی جھجھک تھی تو دوسری طرف اپنے ادھورے چھوڑے ہوئے شکار کو چٹ کر جانے کی بے قراری! بس پھر کیا تھا آؤ دیکھا نہ تاؤ گھس گیا پنجرے کے اندر...... اور پھر پنجرے کے آہنی پھندے میں وہ مکمل طور پر پھنس چکا تھا۔

اب پنجرے کا داخلی دروازہ بھی خاں صاحب کی ہدایت پر بند کر دیا گیا اور برسوں سے پریشان کرنے والے اپنے اس دشمن کو علاقے والے کونچ کونچ کر مار ڈالنے کے لیے مچلنے لگے لیکن خاں صاحب نے کہا کہ ایک تجربہ اور کر کے دیکھنا ہے اسے اگر مارے بغیر اپنے علاقے سے دور بہت دور جنگلوں میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے بھگا دیا جائے تو خواہ مخواہ اس کی جان لینے سے کیا فائدہ؟

گلدار کے پیروں میں سن کی بٹی مضبوط رسیاں ڈال دی گئیں۔ اور پھر لوگ اس کی بے بسی کا تماشہ دیکھنے لگے۔ پھر جب اس کی ضرورت سے زیادہ تذلیل ہو چکی تو خاں صاحب نے کہا "اب یہ مزید توہین برداشت نہیں کر سکتا۔ اس کے پنجرے کے آس پاس سے آپ لوگ دور چلے جائیں۔"

لوگوں نے ایسا ہی کیا! اور پھر خاں صاحب نے اپنی کھاٹ پہلے ہی لوہے کی مضبوط میخ کی

باقی صفحہ ۲۴ پر

جناب جعفر برنی

دیہات، گاؤں اور قریہ میں عام طور پر کچے کنوئیں سے پانی نکالنے کے لیے ایک بڑے سے چمڑے کے ڈول میں رسّا (برت) استعمال کرتے ہیں جس سے کسان اپنے کھیتوں کو پانی دیتا ہے۔ آبپاشی کا پرانا رواج اکثر مقامات پر آج بھی رائج ہے۔ جہاں بجلی کے کنوئیں (ٹیوب ویل) نہیں پہنچ سکے ہیں۔ اسی (برت) یعنی رسّے کی شکل جیسی لنگور کی دم ہوتی ہے۔ بچّو تم نے دیکھا ہوگا۔ ساون کے مہینے میں دیہات کی عورتیں، چھوٹی چھوٹی لڑکیاں درختوں پر جھولے ڈالنے کے لیے جو رسّا استعمال میں لاتی ہیں وہ اسی قسم کا ہوتا ہے۔ لنگور اپنی دم سے بہت کام لیتا ہے۔ آؤ تمہیں اس دم کی ایک کہانی سُناتے ہیں۔

جانور آدمی کا دشمن ہوتے ہوئے بھی دوست بن کر اپنا حق ادا کرتا ہے۔ بندر کی نسل کا یہ سمجھدار جانور جس کو بوزنا کی تھیوری سے جوڑا جا سکتا ہے۔ بندر اور لنگور ایک ہی قبیل کے جانور ہیں۔ حرکات و سکنات، کھانا، اٹھنا، بیٹھنا، چھلانگ لگانا درختوں پر یا پہاڑ پر بسیرا کرنا اس کا کام ہے۔ اس نسل میں آدمی کی بہت سی صفات پائی جاتی ہیں۔ صرف قوتِ گویائی نہیں ہے۔ گفتگو کے انداز کے علاوہ بندر اور لنگور ہر وہ کام کر سکتا ہے جو ایک انسان کرتا ہے۔

کہتے ہیں رانی کے ترائی والے علاقہ میں راجہ سریندر پال کو جانور پالنے کا بہت شوق تھا۔ پہاڑ کی اس وادی میں ویسے بھی جانور آزادانہ گھومتے ہیں۔ گائے، بھینس، اونٹ، گھوڑا، بھیڑ، بکری، تیتر، بٹیر، جنگلی کتّا، بلّی، بندر اور لنگور مختلف پرندے۔ غرضکہ دوپائے، چوپائے سب ہی اس علاقے کے ساکن ہیں۔ راجہ صاحب کے محل میں رنگ برنگی چڑیوں کے علاوہ ہر قسم کے جانور موجود تھے۔

ایک تالاب میں مچھلیاں، رنگ برنگی لہراتی ہوئی۔ درختوں پر مُور ناچتے ہوئے اور رنگ باغ میں ہرن چوکڑیاں بھرتے ہوئے پھر رہے تھے۔ راجہ صاحب کا محل ایک چڑیا گھر معلوم ہوتا تھا۔ جسے قرب و جوار کے لوگ عجائب خانہ سمجھ کر روز ہی دیکھنے کو آتے!

راجہ صاحب کو شکار کا بڑا شوق تھا۔ وہ جب شکار کھیلنے جاتے اور کسی جانور کا بچہ انھیں نظر آ جاتا تو وہ اسے مارتے نہیں بلکہ اسے پکڑ کر لاتے اور اپنے چڑیا گھر میں پناہ دیتے۔ وہ خاص طور پر ان کی نگرانی رکھتے تھے۔ ان کے اس شوق میں ان کا اکلوتا بیٹا سریش برابر کا شریک تھا۔ وہ نوکروں سے اپنے سامنے تمام جانوروں کو چارہ ڈلواتا اور خود بھی تمام جانوروں کو ڈالتا اور خود ہی تمام جانوروں کی دیکھ بھال کرتا۔ انھیں پانی پلاتا، نہلاتا اور ان کی آواز میں آواز ملاتا۔

مئی، جون کی چھٹیوں میں شہر سے سریش اپنے گاؤں لوٹتا تو اسے ان جانوروں کے ساتھ رہنے کا کافی موقع ملا۔

خاص طور پر اس کی نظر پہاڑی لنگور پر رہتی جو طور طریقوں سے بالکل بچہ معلوم ہوتا۔ سریش کے ساتھ اس کا سلوک بالکل بھائیوں جیسا تھا۔ سریش کے ساتھ دوڑتا، کھیلتا اس کے ساتھ کلیلیں کرتا۔ سریش بھی اسے دل سے پیار کرتا کھانا اور پھل کھلاتا۔

اک روز راجہ صاحب کو یہ دیکھ کر بڑا اچنبھا ہوا کہ سریش اور لنگور ایک ہی مسہری پر ساتھ ساتھ سو رہے ہیں اور لنگور کی لمبی دُم دور پڑی ہے۔ بچو! تمھیں یہ سن کر تعجب ہوگا۔ جس قدر سریش اپنے لنگور کو جس کا نام اس نے کرمو رکھ چھوڑا تھا چاہتا تھا اس سے کہیں زیادہ کرمو اپنے سریش کی خاطر جان قربان کرنے کو تیار رہتا۔ وہ دور پہاڑوں پر نکل جاتا اور پہاڑوں سے نئی نئی چیزیں تازہ خوش رو پھل سریش کے لیے لاتا۔ کبھی سلاجیت بھی لے آتا۔

ایک روز تو کمال ہو گیا کرمو کسی پہاڑ سے ایک قیمتی پتھر اٹھا لایا۔ جس کو لوگ ہیرا کہتے ہیں۔ اس نے لاکر سریش کے قدموں میں ڈال دیا۔ سریش نے اس پتھر کو راجہ صاحب کو دکھایا کہ پتاجی یہ کرمو پہاڑ سے اٹھا لایا ہے۔ یہ کیا چیز ہے۔ راجہ صاحب نے شہر میں اسے جوہری کو دکھایا۔ معلوم ہوا وہ تو بہت قیمتی ہیرا ہے۔ صاف کرنے پر دس ہزار روپے اس کی قیمت ہے۔

ایک روز کی بات ہے سریش پہاڑ پر شکار کھیلنے کے لیے تنہا نکل پڑا۔ راجہ صاحب نے کہا "بیٹا تم اپنے ساتھ شکاری کتوں کو لیجاؤ"۔ سریش کتوں کو ساتھ لیجا رہا تھا۔ تھوڑی دور چلنے کے بعد اس نے دیکھا کہ کرمو پیچھے پیچھے دوڑا آ رہا ہے۔

پہاڑ کے راستے میں ایک جگہ شیرنی اپنے بچوں کے ساتھ بیٹھی کھیل رہی تھی۔ اس نے سوچا ہوگا۔ شاید شکاری میرے بچے کو مارنے آ رہا ہے اس لیے اس نے زور سے آواز نکالی تمام پہاڑ پر ایک زلزلہ سا آ گیا۔ سریش گھبرایا اور پاس ہی کھڑے ایک درخت پر چڑھ گیا۔ کرمو بڑا سمجھدار جانور تھا۔ اس نے سریش سے پہلے پیڑ پر چھلانگ لگا کر ایک درخت کی موٹی سی شاخ کو پکڑ لیا اور اپنی دم لٹکا دی سریش دھیرے دھیرے اس کے سہارے پیڑ کی بہت اونچی شاخ پر جا بیٹھا۔ ادھر شیرنی کی گرجدار آواز نے اس کے نر شیر ببر کو بلا کر جنگل میں ایک خوف کا عالم طاری کر دیا۔

[illegible] اور لٹکی دُم سادھے خاموش پیڑ کے
[illegible] چھپے رہے۔ کافی دیر تک شیر اور شیرنی
اپنے بچوں کو لیے اسی کمین گاہ پر گھومتے رہے
اور جنگل کے تمام جانور ڈر کے مارے دور بھاگتے
ہوئے کسی پہاڑی غار میں جا چھپے، کچھ دیر تک
یہ دونوں شور مچاتے رہے جب کہیں دور تک کوئی
نظر نہ آیا۔ تو دونوں آہستہ آہستہ اپنے بچوں کو
درمیان میں ساتھ لیے کہیں چلے گئے۔ مگر ڈر کے
مارے سر لیش اور کرمو بہت دیر تک پیڑ ہی پہ
انتظار کرتے رہے۔

جب شام کے بعد رات کا جھٹپٹا سا ہونے
لگا تو سر لیش نے بندوق کاندھے پر ڈالی اور کرمو
کی لٹکی ہوئی دُم کے سہارے آہستہ آہستہ پیڑ سے
نیچے اُترنے کو غنیمت سمجھا۔ جب وہ پیڑ سے نیچے
اُتر آیا تو کرمو بھی کود کر نیچے آ گیا۔ اب دونوں نے
بہت جلد خطرہ سے دور بھاگنے کے لیے دوڑ لگائی۔
اُدھر راجہ صاحب کے آدمی تلاش کرتے ہوئے
آ پہنچے اور سر لیش اور کرمو کو دیکھ کر ساتھ محل میں
لے گئے۔

دیکھا بچو ایک جانور نے انسان کی جان
کس طرح بچالی۔

★ مبارک ہیں وہ لوگ جو غریبی میں بھی عقل و
ہوش اور خودداری کو قائم رکھتے ہیں۔

★ مبارک ہیں وہ لوگ جو خطا وار کی خطا معاف
کر دیتے ہیں اور ان کی پیشانی پر بل تک
نہیں آتا۔

بقیہ شکار ایک گلدار کا

ہوئی برچھی نما طویل لکڑی سے گلدار کے سر اور
جسم کو چھیدنا شروع کیا...... گلدار نے آخری
قوت لگا کر چھٹپٹانا شروع کیا۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے
اس نے سن کی رسیوں میں بندھے اپنے پیر کو دانت
سے کاٹ کاٹ کر آزاد کر لیا۔ اور اب داخلے کے
دروازے کو توڑ کر جب باہر نکلنے لگا تو خان
کو خدشہ ہوا کہ شاید یہ درخت پر چھلانگ
لگا دے۔

لیکن ایسا نہیں ہوا بلکہ وہ ہوا جس پر آج
تک اس علاقے کے لوگ انگشت بدنداں ہیں....
گلدار بھاگ گیا! جی ہاں اس آہنی پھندے سمیت
جو اس کے گلے میں پڑ چکا تھا۔ اور ایک زمانہ
گزر گیا، گلدار پھر ادھر بھولے سے بھی کبھی نہ پھٹکا!
لیکن لوگ اکثر یہ سوچا کرتے ہیں۔ آخر وہ اس
آہنی پھندے سے نجات کیسے پا سکا ہوگا...؟
خدا جانے گلدار اب زندہ بھی ہوگا یا مر کھپ گیا
ہوگا۔!!

● اور تم اللہ کی اور اس کے رسول کی
اطاعت کرو، اور آپس میں مت جھگڑو،
ورنہ تم نامراد ہو جاؤگے اور تمھاری ہوا بگڑ
جائے گی۔ اور تم قوت برداشت پیدا کرو
اللہ ایسے لوگوں کا ساتھ دیتا ہے۔

قرآن

● جو بات دشمن سے پوشیدہ رکھنی ہے۔
وہ دوست سے بھی پوشیدہ رکھو۔ (لقمان)

جناب ظفؔر صہبائی

عظمیٰ کے نام بڑے پیار سے

(برادرم عبدالمتین نیاؔز کی عزیز ترین نواسی عظمیٰ اسلمہا کی تیسری سالگرہ پر)

نو شگفتہ گلاب سی عظمیٰ
میری پیاری سی بولتی گڑیا
تیری معصوم بے ریا باتیں
زندگی بخشتی ہیں کتنوں کو
شوخیاں اور شرارتیں تیری
بانٹتی ہیں ہنسی کی سوغاتیں
قہقہوں کی حسین پھلجھڑیاں
تو کسی گھر کا ہے چراغ مگر
میری آنکھوں میں صورتِ مہتاب
جگمگاتی ہے آج برسوں سے
گود میں لے کے بارہا تجھ کو!
اپنے بچپن کے خواب دیکھے ہیں
تیری پیشانی چوم کر میں نے
غم سبھی دل سے نوچ کر میں نے
تیری شادابیوں کے جھرمٹ میں
اپنے دل کی خزاں بھلادی ہے
تو ہوائے بہار کا جھونکا
تو چمن کی شگفتگی کا نصاب

کیا خبر تجھ کو اس چمن سے پرے
زندگی کا اک اور روپ بھی ہے
کنج راحت کی چھاؤں سے آگے
غم کا صحرا ہے گرم دھوپ بھی ہے
درد کی تیز و تند لہریں ہیں
کتنے طوفان ہیں سوالوں کے
دہشتیں خون میں سرایت ہیں
خوف لپٹا ہوا ہے روحوں سے
منتشر ہیں تمام فکر و خیال
سارے اعصاب میں تشنج ہے
منتظر ہیں ہلاکتیں اپنی
خوفناک ایٹموں کی صورت میں

نو شگفتہ گلاب سی عظمیٰ
اپنی معصومیت کی خوشبو دے
اپنی مسکانیں بانٹ دے ہم کو
تاکہ ہم ساری لغزشیں کھو کر
تیرے جیسے عظیم بن جائیں
اپنی سب قہرمانیاں تج کر
بس رحیم و کریم ہم بن جائیں

جناب انجم عباسی

نیا ترانہ

ہم ننھّے مُنّے بچّے ہیں
سب کی آنکھوں کے تارے ہیں
ہنسنا ہنسانا کام ہمارا جگ میں روشن نام ہمارا
علم و ادب، کے متوالے ہیں
سب کی آنکھوں کے تارے ہیں
جھگڑے سے نفرت ہے ہم کو محنت سے رغبت ہے ہم کو
اپنی دھن کے ہم پکّے ہیں
سب کی آنکھوں کے تارے ہیں
سچائی کی راہ چلیں گے طوفانوں سے ہم نہ ڈریں گے
اپنی بات کے ہم سچّے ہیں
سب کی آنکھوں کے تارے ہیں

جناب چودھری میر غیاث الدین (کلیان)

ٹاک یا سیس پینسل کی ایجاد سے قبل۔ لکھنے کے لیے، بانس یا برو کا استعمال کیا جاتا تھا۔ پینسل یہ مفہوم "پین سلس" (PENCILLUS) لیٹن زبان کا ہے۔ جس کے معنی "چھوٹی دم" کے ہیں۔ آغاز میں "سیسے" سے کاغذ پر نشان کندہ کیے جاتے تھے اس لیے بھی سیس پینسل کا مفہوم مشہور رہا۔ حال کی پینسلوں میں ذرہ برابر بھی "سیسے" کا جز نہیں ہے۔ آجکل پینسلوں میں گرافایٹ (GRAPHITE) نام کا ایک مکسچر استعمال کیا جاتا ہے گرافایٹ بھی ایک قسم کا کاربن ہی ہے۔ گرافایٹ کی دو قسمیں ہیں (۱) اسفٹک (CRYSTALLINE) گرافایٹ (۲) غلا (AMORPHUS) گرافایٹ۔

۱۶ ویں صدی کے وسط میں گرافایٹ کی تحقیق ہوئی، جبکہ وہ کان میں تھی۔ کان سے میسر آنے والے گرافایٹ کو لکڑی میں پیوست کرکے اس سے پینسلیں تیار کی جاتی تھیں اس وقت اس کی صرف ایک ہی کان کا پتہ چل سکا تھا۔ اور مزید کانوں کی تحقیق بڑی عرق ریزی سے لوگ کر رہے تھے۔ گرافایٹ کی کان سے چوری نہ ہو۔ اس خیال کے پیش نظر کان میں پانی چھوڑ دیا جاتا تھا۔

۱۹۔ ویں صدی کے آغاز میں گرافایٹ کی مقدار کمیاب ہونا شروع ہو گئی۔ اس کے ساتھ ہی کارخانہ دار اس کے نعم البدل کی تلاش و جستجو میں جٹ گئے۔ اس درمیان پیرس کے ایک شخص نے گرافایٹ میں مٹی ملا پینسلیں بنانا شروع کر دیں۔ اس کامیاب تجربہ سے سخت (HARD) اور نرم (SOFT) پینسلیں بننا شروع ہو گئیں۔ پینسل پر (H-B) لکھا جاتا ہے، جس کا مطلب سخت (HARD) اور کالی (BLACK) کا ہے۔

سیلون میں اب سینفٹک کے روپ میں اچھے سے اچھا اور نیچے سے اونچا گرافایٹ مل رہا ہے۔ لیکن اس سے پینسل تیار کرنے میں بڑی دقتوں کا سامنا کرنا پڑتا۔ اب چلو، بوہیمیاں، بوہیریا، میکسیکو اور کوریا میں یہاں پر (AMORHOUS) کی طرح گرافایٹ ملتا ہے اور اس سے پینسل تیار کرنے میں زحمت نہیں ہوتی۔

گرافائٹ کان سے نکالنے کے بعد اس کا سفوف تیار کیا جاتا ہے۔ اور پھر اس سفوف کی مقدار مٹی میں ملاتے ہیں اور اس مکسچر کو یعنی (گرافائٹ + مٹی) سانچوں میں ڈال کر دباتے ہیں۔ اور اس کو حسب منشاء اشکال دیتے ہیں۔ ان تمام مدارج کے بعد ان کو سکھا کر آنچ دی جاتی ہے پھر مناسب سائز کے ٹکڑے لکڑیوں میں پیوست کر دیے جاتے ہیں۔ اور اس طرح پنسل تیار ہو جاتی ہے۔ پنسلوں کے لیے (CEDAR-WOOD) نام کی لکڑی استعمال کی جاتی ہے۔

رنگ برنگی پنسلیں مٹی اور رنگوں کو ملا کر تیار کی جاتی ہیں۔ اُن کو آنچ بتانا نہیں پڑتا۔ ملائم بنانے کے لیے گرافائٹ اور مٹی کے مرکب میں موم کا استعمال کرنا پڑتا ہے۔

پنسلوں کی اشکال ہوتی ہیں۔ یہ شکلیں ان کے استعمال کے حساب سے طے شدہ ہوتی ہیں۔

مثلاً (۱) کانچ پر لکھنے کی پنسلیں (۲) کپڑے پر لکھنے کی پنسلیں (۳) مصوری کے کام میں استعمال ہونے والی پنسلیں (۴) (COPYING PENCILS) مریضوں کے آنتوں پر لکھنے کے لیے ڈاکٹروں کے استعمال میں آنے والی پنسلیں ہیں، پنسلیں تیار کرنے کے پانچ طریقے ہیں۔ اور ہر کارخانہ دار کا اپنا مخصوص طریقہ ہے۔ جو رجسٹرڈ شدہ ہوتا ہے۔

پیام تعلیم :۔ کو اچھا اور خوبصورت بنانے کا طریقہ۔
پیام تعلیم کے خریدار بنا کر اشاعت بڑھائیں۔

جناب مفتوں کوٹوی

ہمیں چاہیے مثلِ دریا بنیں

یہ دریا جو پیشِ نظر ہے رواں
چلا اپنے منبع کو جب چھوڑ کر
زرا سا تھا نالہ یہ اک تیز رَو
بڑھا اپنے پرجوش یاروں کے ساتھ
تھے قطرے مگر متحد۔ ہم خیال
حقیقت چھپے خواب کے سامنے؟
تھا دریا میں جوش و خروش و جلال
اسی سے ہوئے سبز میدان و باغ
ہوئی اس سے بنجر زمیں لالہ زار
بہت دور تک اس کی لہریں گئیں
کئی نسلیں پائیں گی اس سے فروغ

بہ نرمی رواں ہے بہ گرمی رواں
گزر آیا کوہِ گراں توڑ کر
چلاں جب ہوئی فیض پاشی کی تو
بہم یک دگر اپنا تھامے ننھے ہاتھ
چلے تو لیے تھے جلال و جمال
تھمے کون سیلاب کے سامنے
اسی میں تھا پوشیدہ روئے جمال
جلے اس سے اجڑے گھروں میں چراغ
رُخِ زندگانی پہ آیا نکھار
ہوئی بار ور لاکھوں ایکڑ زمیں
نہیں اس میں کچھ ذرّہ بھر بھی دروغ

رہیں ہم بھی کوشش میں گرمِ عمل
جہاں تک ہو ہم کارِ خدمت کریں
بزرگوں کی عزّت تو چھوٹوں سے پیار

مثال ایسے دریا کی ہے برمحل
اخوت، محبت کی عادت کریں
یہ خو، زندگانی کو دے گی نکھار

جو چاہیں کہ آنکھوں کا تارا بنیں
ہمیں چاہیے مثلِ دریا بنیں

جناب مشرف عالم ذوقی

ہمدردی

"ماں! تم میرے لیے اتنی تکلیف کیوں اٹھا رہی ہو۔ میں اس بار میٹرک کا امتحان دے نہ سکا تو کیا ہوگا؟"

"بیٹے!" ماں کی آنکھوں سے اشک بہہ چلے "تمہارے والد نے مرتے وقت کہا تھا کہ میرے بیٹے کو اچھی تعلیم دلانا، اسے بڑا آدمی بنانا۔ کیا تم اپنے والد کے بنائے ہوئے شیش محل کو توڑنا چاہتے ہو؟"

ماں سسک پڑی ۔۔ "پربھو! میرے بیٹے کے لیے پیسے کا انتظام کہیں سے بھی کر دو۔ تاکہ وہ اپنی فیس بھر سکے، امتحان دے سکے، اس کے والد کا سپنا سچ ثابت ہو سکے"

"مجھ سے غلطی ہو گئی ماں مجھے معاف کر دو۔ میں شہر کوئی کام دیکھنے جا رہا ہوں"

"بھگوان تجھے کوئی اچھا سا کام دلا دے تاکہ تو اپنے پیروں پر کھڑا ہو سکے"

شیام کا دل آج اداس تھا۔ ماں سے کچھ پیسے لے کر وہ شہر کی طرف چل پڑا۔ کتنے اچھے تھے اس کے والد، ہر کسی سے کہتے: دیکھنا میرا شیام ایک دن بڑا آدمی بنے گا"

ماضی کی یادوں میں کھویا شیام آگے بڑھ رہا تھا کہ اس کی نگاہ ایک بڑھیا پر پڑ گئی۔ بڑھیا کے سر پر ایک بڑا سا گٹھر تھا۔ بوڑھاپے کی وجہ سے اس سے چلا نہیں جا رہا تھا۔

شیام کو اس بڑھیا پر دیا آگئی۔ وہ آگے بڑھا اور بڑھیا سے بولا "بوڑھی ماں یہ گٹھری مجھے دے دیجیے میں اسے آپ کے گھر تک پہنچا دیتا ہوں"

بڑھیا نے گٹھری شیام کو دے دی۔

"اللہ تجھے بڑا آدمی بنائے"

بڑھیا کی بات سن کر وہ بہت خوش ہوا۔ پل بھر اسے ایسا احساس ہوا جیسے وہ بہت بڑا آدمی بن گیا ہو۔

"بس یہی ہے میرا گھر گٹھری یہاں رکھ دو"

شیام نے گٹھری وہاں رکھ دی اور بڑھیا سے ہمدردی کے چند بول لے کر اپنی منزل کی طرف چل پڑا۔

کچھ دیر چلنے کے بعد اسے ایسا محسوس ہوا جیسے فضا میں خوشبو کی بھینی بھینی مہک پھیل گئی ہو۔ شیام نے پیچھے کی طرف دیکھا۔

ایک خوبصورت پری ہاتھ میں گلاب کا پھول لیے مسکرا رہی تھی۔ شیام کچھ کہنا ہی چاہ رہا تھا کہ اس نے دیکھا کہ وہ پری اس بڑھیا میں بدل گئی جس کی گٹھڑی اس نے گھر تک پہنچائی تھی۔

"ہاں! میں وہی بڑھیا ہوں جس کی تم نے مدد کی تھی۔ ہمدردی اس دنیا میں سب سے بڑی چیز ہے۔ میں تمہارا پیچھا تمھارے گھر سے کر رہی تھی۔ جب تم کام کی تلاش میں گھر سے روانہ ہو گئے تو میں نے تمھارا امتحان لینا چاہا۔ میں دیکھنا چاہتی تھی کہ تم ہمدرد ہو یا نہیں۔ مگر تم اس امتحان میں کھرے اترے۔"

شیام حیرت سے اس پری کی بات سن رہا تھا۔ اس کا دل بلیوں اچھل رہا تھا۔

پری نے پھر کہا۔ "لو یہ گلاب کا پھول اور گھر واپس جاؤ۔ اس پھول کی ایک پنکھڑی کو توڑنا اور اپنی خواہش ظاہر کرنا، تمھیں من مانگی مراد مل جائے گی۔"

پری غائب ہو گئی۔ شیام حیرت کا مجسمہ بنا دیکھتا رہ گیا۔ آج اسے ہمدردی کی قدر معلوم ہوئی تھی۔ وہ گھر چل پڑا۔

- مبارک ہیں وہ لوگ جو اپنے دشمن کے لیے تباہی کے بجائے ہدایت کی دعا مانگتے ہیں۔
- مبارک ہیں وہ لوگ جو دولت مندی کے نشہ سے مخمور ہو کر اخلاق ہاتھ سے جانے نہیں دیتے۔

بشیر الدین شیر کوٹی

جناب روشن علی قاضی بھیونڈی

چاکلیٹ کیا ہے؟

بچو! چاکلیٹ کا نام سنتے ہی تم ناچنے کودنے لگتے ہو۔ مگر چاکلیٹ کس چیز سے بنتا ہے یہ بھی تم کو معلوم ہے؟

چاکلیٹ ایک درخت سے حاصل ہوتا ہے۔ لیکن اس کو چاکلیٹ کا درخت نہیں کہتے؟

اس درخت کا نام "کوکو" ہے "کوکو" کا درخت بہت گرم ملکوں میں پایا جاتا ہے۔ کوکو کی پھلیاں سیم کی پھلیوں سے تھوڑی بڑی ہوتی ہیں۔ جب پھلیاں اچھی طرح پک جاتی ہیں تو اس کو توڑ لیا جاتا ہے۔ سخت دھوپ میں سکھایا جاتا ہے۔ اچھی طرح خشک ہو جانے پر اس کے بیج نکال لیے جاتے ہیں۔ بیجوں کو بھون لیا جاتا ہے۔ پھر مشین سے باریک آٹے کی طرح پیس لیا جاتا ہے۔ اس کا رنگ کالا ہوتا ہے۔ تم اس کو کھا نہیں سکوگے کیونکہ یہ بہت کڑوا ہوتا ہے۔

اس کے بعد شکر کے شیرے میں دودھ وغیرہ اور دوسری چیزیں ملا کر چاکلیٹ تیار کیا جاتا ہے۔ اس کا مزہ بدل جاتا ہے۔

کیوں بچو! منہ میں پانی تو نہیں آ رہا ہے۔

(مراٹھی سے)

محترمہ نکہت ایوب صدیقی نگینہ

جنّت کی سیر

احمد ایک بھولا بھالا بچّہ تھا۔ وہ اکثر اپنی دادی سے کہانیاں سنا کرتا تھا۔ اور سنتے سنتے سوجاتا تھا۔

ایک دن اس نے اپنی دادی سے کہانی سنانے کے لیے کہا۔ دادی نے اس کو جنّت کی کہانی سنائی کہ جنّت بہت خوبصورت ہے وہاں دودھ کی ندیاں بہتی ہیں۔ پھلوں اور میووں کی وہاں کوئی کمی نہیں۔ احمد کو یہ کہانی بڑی اچھی لگی اور وہ اپنی دادی سے جنّت دیکھنے کی ضد کرنے لگا۔ اس کی دادی نے اس کو سمجھایا کہ جنّت تو مرنے کے بعد دیکھی جاتی ہے۔ لیکن اس کی سمجھ میں بات نہیں آئی اور وہ رونے لگا اور روتے روتے سوگیا۔

خواب میں اس کو ایک آدمی دکھائی دیا کہنے لگا کہ بیٹے تم کیوں رو رہے ہو۔ احمد نے کہا کہ میں تو جنت دیکھوں گا۔ ان بزرگ نے کہا کہ تم اچھے اچھے کام کرو۔ بڑوں کا کہنا مانو، چھوٹوں کو پیار کرو، اسکول میں کبھی غیر حاضر مت رہو، کبھی کسی کو گالی نہ دو۔ کھیلنے کے وقت کھیلو، پڑھنے کے وقت پڑھو، کبھی کسی سے لڑو نہیں تبھی تم جنت دیکھ سکوگے۔ میں تم کو ایک ڈبیہ دوں گا۔ تم اچھے اچھے کاموں سے اس کو بھر لو وہ ڈبیہ روپوں سے بھر جائے گی۔ لیکن یاد رکھو اگر تم نے برے برے کام کیے تو اس ڈبیہ میں سے روپے غائب ہو جائیں گے۔ جب احمد کی آنکھ کھلی تو اس نے اپنے سرہانے ڈبیہ رکھی پائی۔ وہ بہت خوش ہوا اور اس نے اس دن سے نیک کام کرنے شروع کر دیے۔

ایک دن اس نے ڈبیہ کو کھول کر دیکھا تو اس میں ایک روپیہ رکھا تھا۔ وہ بہت خوش ہوا۔ جب وہ اسکول جا رہا تھا ایک فقیر نے اس سے پیسے مانگے وہ فقیر سے کترا کر نکل جانا چاہتا تھا لیکن سامنے سے ماسٹر صاحب آتے دکھائی دیے۔ اس نے ماسٹر کو دیکھ کر جلدی سے اس کو پیسے دے دیے تاکہ ماسٹر صاحب کلاس میں اس کی تعریف کریں جب وہ آیا تو اس نے ڈبیہ کھول کر دیکھی اس میں سے روپیہ غائب تھا۔ رات کو وہی بزرگ آئے انھوں نے کہا کہ تم نے ماسٹر صاحب کو دکھا کر پیسے دیے تھے اس لیے روپیہ غائب ہو گیا۔ اس دن سے اس نے نیک کام کرنے شروع کر دیے۔

ایک دن اس نے دیکھا تو ڈبیہ روپوں سے بھر چکی تھی۔ ایک دن کی بات ہے کہ وہ ڈبیہ کو لے کر جنگل میں گیا۔ وہاں اس نے ایک

باقی صفحہ ۔ پر

جناب محمد عرفان نحف علیمی الہ آبادی

علم کا شوق

آج نہ جانے کیوں شکیل ضرورت سے زیادہ خاموش تھا۔ منھ لٹکائے ہوئے اپنے ڈرائنگ روم کے ایک گوشے میں بیٹھا خیالوں میں گم تھا۔ آج نہ جانے کتنے خیالات اس کے دل میں پیدا ہوئے اور ختم ہو گئے۔ اسی دوران اس کا دوست جاوید کمرہ میں داخل ہوا۔

شکیل کو اداس دیکھ کر اس نے پوچھا اسقدر اداس کیوں ہو؟ کیا میں نے کچھ کہا ہے یا کسی سے لڑائی ہوئی ہے؟ شکیل بھرائی آواز میں بولا۔ نہیں کوئی بات نہیں ہے۔ جاوید نے کہا تم تو ہر وقت مسکراتے رہتے تھے۔ آج کتنے اداس ہو؟ کچھ ضرور ہے جسے تم مجھ سے چھپانا چاہتے ہو۔ شکیل اور جاوید چونکہ ایک دوسرے کے گہرے دوست تھے دونوں کا اٹھنا، بیٹھنا، کھانا، پینا اور اسکول جانا اور پڑھنا سب ایک ساتھ ہوتا تھا۔ اس لیے شکیل اپنا راز جاوید کو بتا ہی دینا چاہتا تھا۔

شکیل نے کہا۔ "کل سے میں تمھارے ساتھ اسکول نہ چل سکوں گا۔ اور اب پڑھ بھی نہ سکوں گا۔ جاوید نے چونک کر کہا کیا بات ہو گئی؟ شکیل نے کہا کہ آج ابا نے کہا ہے کہ پڑھائی بند کردو تھوڑی سی آمدنی میں کھانے پینے کا سامان ہی نہیں ہو پاتا پڑھائی کا خرچ کہاں سے دوں؟ یہ کہہ کر شکیل پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ جاوید نے شکیل کے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔ کہ تم فکر مت کرو۔ اللہ چاہے گا تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔ اپنے ابا سے کہدو کہ وہ تمھیں تعلیم کا خرچ نہ دیا کریں اس کا انتظام میں کرادوں گا۔ شکیل بولا اس طرح میری کون کب تک مدد کرے گا۔

جاوید نے کہا "چلو میرے ساتھ تم کو میں کام سے لگائے دیتا ہوں۔ اسکول چھٹی کے بعد کرلیا

[illegible] مشکل کا حل نکل آئے گا۔ شکیل نے
[illegible] ہے؟"

[illegible] نے کہا چلو میرے ساتھ تھوڑی دور
[illegible] معلوم ہو جائے گا۔ جاوید شکیل کو ساتھ
[illegible] لیا اور ڈاکٹر خان کی کوٹھی تک گیا اور گیٹ
[illegible] "کال بل" کا بٹن دبا دیا۔ گھنٹی بجتے
[illegible] خان کوٹھی سے باہر آئے۔ جاوید نے ادب
سے سلام کیا اور کہا کہ ڈاکٹر ایک آدمی کے زبانی پتہ
چلا ہے کہ ایک ٹیوٹر کی آپ کو ضرورت ہے۔ ڈاکٹر صاحب
نے کہا ہاں بھئی بہت سخت ضرورت ہے جب
آپ کو فرصت ہو آ جائیے۔ جاوید نے کہا۔ ڈاکٹر صاحب
میں تو نہیں پڑھا سکوں گا۔ یہ میرے دوست ہیں
کافی ذہین ہیں۔ پڑھنے میں بھی بہت تیز ہیں۔ والد
صاحب کی مالی حالت کمزور ہونے کی وجہ سے تعلیم
کو بند کر رہے ہے۔ میں نے انھیں آپ کے یہاں ٹیوٹر
کی حیثیت سے کام کرنے کا مشورہ دیا ہے۔

ڈاکٹر صاحب نے کہا ہاں ہاں ٹھیک ہے۔
پڑھائی نہیں چھوڑنا چاہیے۔ پریشانی کے یہ دن تو کسی
نہ کسی طرح گذر ہی جائیں گے۔ لیکن یہ وقت نکل
جانے کے بعد پھر واپس نہ آئے گا۔ اگرچہ تمھارے
لیے تعلیم جاری رکھنا پھولوں کی سیج نہیں کانٹوں
کا [illegible] ہے لیکن پھلوں کو حاصل کرنے کے لیے کانٹوں
[illegible] ہے۔ اس لیے علم حاصل کرنے
[illegible] میں چاہے کتنی مشکلات کیوں نہ آئیں سب
کے ساتھ مقابلہ کرنا چاہیے۔ ڈاکٹر صاحب
نے [illegible] کہا کہ آج سے میں تمھاری
تعلیم کے اخراجات برداشت کروں گا۔

آج سے تم میرے بیٹے ہو جس طرح میرے بچے
کھاتے پیتے ہیں اسی طرح تم بھی کھانا۔ پینا اور پڑھنا
شکیل ڈاکٹر صاحب کی ہمدردی اور محبت بھری باتوں
سے خوش ہوتا ہوا گھر لوٹ آیا اور اپنے ابا کو
بتایا کہ میں نے اپنی پڑھائی کا انتظام کر لیا ہے۔ اس
کے والد نے پوچھا کیسے انتظام ہوا۔ شکیل نے پورا
واقعہ سنایا۔ شکیل کے والد بھی بہت خوش
ہوئے۔

دوسرے دن صبح اٹھ کر شکیل ڈاکٹر صاحب
کے بچوں کو پڑھانے کے لیے چلا گیا۔ دھیرے دھیرے
شکیل نے بی۔ اے کر لیا اور ڈاکٹر صاحب کے
یہاں پڑھاتا بھی رہا۔ شکیل بچوں کو پڑھاتے
پڑھاتے ڈاکٹر صاحب کے گھر والوں سے خوب
گھل مل گیا۔

ڈاکٹر صاحب کی ایک لڑکی تھی جس کا نام
نکہت تھا اسے بھی شکیل پڑھاتا تھا۔ وہ بہت
ہی خوبصورت تھی۔ شکیل اس سے بہت محبت
کرتا تھا اور نکہت بھی شکیل کو دل و جان سے چاہتی
تھی۔

ایک دن نکہت کی بھابی نے نکہت کی ماں
سے کہا کہ اب نکہت جوان ہو چکی ہے اس کی
شادی کر دینا چاہیے۔

نکہت کی ماں نے کہا "دلہن! یہ تو تم
ٹھیک کہتی ہو۔ بس بھی اسے اچھی طرح سمجھتی
ہوں۔ لیکن جانتی ہو کہ آج کل اچھے لڑکوں کا
کال ہے۔ اچھے لڑکے تو چراغ لے کر بھی تلاش
کرنے پر نہیں ملتے۔ اگر کوئی مناسب رشتہ [illegible]

تو شادی کا میں کیا دیر ہے؟ نکہت کے ابو کو تو کوئی
فکر ہی نہیں ہے۔ تم بھی تو نکہت کی بھابی ہو تم ہی کوئی
اچھا لڑکا بتاؤ۔

نکہت کی بھابی بولیں "یہ شکیل صاحب
کیسے رہیں گے؟"

کون شکیل صاحب؟ نکہت کی امی نے پوچھا
"وہی شکیل صاحب جو بچوں کے ٹیوٹر ہیں"
خوب صورت بھی ہیں خوب سیرت بھی ہیں۔ پڑھے
لکھے بھی اور شریف خاندان کے بھی ہیں بھابی نے
بتایا۔

نکہت کی امی نے جواب دیا "یہ بات تو صحیح ہے
مگر شکیل خود بھی غریب ہے اور اس کا گھرانا بھی
غریب ہے۔"

"یہ بات تو ٹھیک ہے مگر شادی کے سلسلے
میں نیکی، شرافت اور اچھے چال چلن کو دیکھنا
چاہیے۔ لڑکے کو اللہ و رسول کے حکموں کا پابند
ہونا چاہیے۔" بھابی نے کہا۔

نکہت کی امی اس بات کو مان گئیں۔ رات کو
قریب ۱۱ بجے جب ڈاکٹر صاحب مطب سے واپس آئے
اور کھانا کھا کے لیٹ گئے تو ماں نے یہ سمجھ کر کہ سب
بچے سو گئے ہیں۔ نکہت کی شادی کی بات چھیڑ دی
لیکن نکہت جاگ رہی تھی۔ وہ لحاف میں منہ چھپائے
ہوئے ساری باتیں سنتی رہی اور دل ہی دل میں
خوش ہو رہی تھی۔ کہ آج اس کی من مانگی مراد بر آئی
ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے کچھ دیر سوچنے کے بعد کہا
کوئی حرج نہیں ہے اگر ان کے والدین راضی ہوں
تو ٹھیک ہے۔ ڈاکٹر صاحب تو پہلے ہی سے شکیل
کی شرافت کا دم بھرتے تھے۔ اب موقع پاکر ان
کی تعریف کرنے لگے۔

کسی طرح رات گزری دوسرے دن صبح شکیل
کی ماں کو بلایا گیا۔ اور کافی دیر تک باتیں ہوتی رہیں
شکیل کی ماں نے کہا دونوں آپ ہی کے بچے ہیں۔
آپ جیسے مناسب سمجھیں کریں مجھے کوئی اعتراض
نہیں ہے۔ شکیل کے گھر والوں کی رضامندی سے
شکیل اور نکہت کی شادی ہو گئی۔ شکیل کو بہت
سا جہیز ملا۔ ڈاکٹر صاحب نے شکیل کو سلامی میں
بیس ہزار روپے ایک کار اور ایک بنگلہ دیا۔ اس
طرح علم کے شوق میں شکیل کو صرف علم ہی نہیں ملا
بلکہ دولت نے بھی اس کے قدم چومے۔

سچ ہے، علم ایک ایسی دولت ہے، جسے
نہ کوئی چرا سکتا ہے اور نہ خرچ کرنے سے کم ہوتی
ہے۔ ہر ایک اس کی قدر کرتا ہے۔ علم کی دولت
دنیا کی ہر دولت سے بڑی ہے۔ اس دولت کو
پانے کی کوشش کرو۔ خوب محنت کرو۔ علم کی دولت
مل جائے تو سمجھو دنیا کی ہر دولت مل گئی۔

جناب محبوب راہی

مادرِ مہربان

زمانہ لاکھ کرے برسہا برس تحقیق
نہیں ملے گا کوئی تجھ سا غمگسار و شفیق

ترے ہی دم سے ہے ہنگامۂ جہاں قائم
ملا ہے تجھ کو مقدر سے منصب تخلیق

دکھائی مجھ کو بھی تو نے یہ جلوہ گاہِ حیات
سکھائے تو نے مجھے زندگی کے طور طریق

مسرتوں کے جو ساتھی تھے مجھ کو چھوڑ گئے
دکھوں میں تو ہی رہی میری دردمند و رفیق

کمی نہیں ہے زمانے میں مہربانوں کی
مگر نہیں ہے کوئی تجھ سا مہربان و خلیق

میں آج جیسا بھی کچھ ہوں تیری بدولت ہوں
بذاتِ خود تھی کہاں مجھ میں اسقدر توفیق

تری شفیق نگاہوں سے کر چکا ہوں میں
ترے خلوصِ فراواں کی بارہا توثیق

جو مامتا ہے مرے واسطے ترے دل میں
نہیں ہے ایسا سمندر کوئی اتھاہ عمیق

مرے لیے ترے قدموں میں ہے بہشت بریں
خدا نے کی ہے تری عظمتوں کی خود تصدیق

وہ رات دن مرے دکھ سکھ کی جو نگہباں ہے
خدا گواہ کہ وہ مادرِ مہرباں ہے

شرارتی

جناب رؤف خیر

ایک اسکول ہے کہ جیل ہے یہ
دن یہ کیسے ڈھکیل بھی لیں گے

یہ ریاضی، یہ ہندی، یہ سائنس
کیسے پاپڑ یہ بیل بھی لیں گے

یہ کتابیں، یہ کاپیاں، ان پر
ہم سیاہی انڈیل بھی لیں گے

ہم کو بندوق بھی اٹھانا ہے
ہم ابھی سے غلیل بھی لیں گے

کھیلنے کودنے کے دن ہیں یہی
کھیلنے دو کہ کھیل بھی لیں گے

بچوں کی کوششیں

"خرگوش کی دُم چھوٹی کیوں؟"

بہت دنوں کا ذکر ہے۔ ایک جنگل میں خرگوش اور لومڑی رہتے تھے۔ اُن دونوں میں بڑی دوستی تھی۔ ساتھ ساتھ کھاتے اور ساتھ ساتھ رہتے تھے۔ خرگوش کو مچھلی کے شکار کا بہت شوق تھا۔ ایک دن خرگوش اور لومڑی دونوں شکار کھیلنے گئے۔ شکار کھیلتے کھیلتے دونوں تھک گئے۔ اور ایک شہتیر پر بیٹھ گئے۔ اور باتیں کرنے لگے۔ تھوڑی دیر کے بعد ایک بڑی مچھلی نے ڈبکی لگائی اور نیچے تیرنے لگی۔ لومڑی کے مُنہ میں پانی آ گیا۔ اُس نے خرگوش سے کہا۔ "بھیّا وہ کتنی موٹی مچھلی ہے"۔ خرگوش نے جب مچھلی کو دیکھا تو وہ کانٹا اور ڈور دیکھنے لگا۔ خرگوش کو کانٹا تو مِل گیا۔ مگر ڈور نہیں ملی۔

خرگوش بولا باندھیں کس سے۔ کچھ دیر سوچنے کے بعد لومڑی کی نظر خرگوش کی دُم پر پڑی۔ لومڑی دل ہی دل میں خرگوش کی دُم سے جلا کرتی تھی۔ کہ اس کی دُم اتنی لمبی کیوں ہے۔

لومڑی نے خرگوش سے کہا۔ "بھیّا تم اپنی دم میں کانٹا باندھ لو"۔

خرگوش بولا۔ "صبح ہی تو میں نے اپنی دُم میں کنگھا کیا تھا۔ تم اپنی دُم میں کیوں نہیں باندھ لیتیں۔ تم ندی کے کنارے بیٹھ جاؤ۔ جب مچھلی آئے تم اٹھ جانا میں مچھلی نکال لوں گا"۔ لومڑی بولی "میری دُم چھوٹی ہے"۔ کچھ دیر کے بعد خرگوش اپنی دُم میں کانٹا بندھوانے کے لیے راضی ہو گیا۔ لومڑی نے کانٹا باندھ دیا۔ خرگوش کو یہ معلوم نہیں تھا۔ کہ پانی میں مچھلی کے سوا اور کچھ بھی ہوتا ہے۔ جب خرگوش ندی کے کنارے بیٹھ گیا۔ تو تھوڑی دیر بعد خرگوش کی دم کو کچھوے نے پکڑ لیا۔ خرگوش چلایا۔ مچھلی آ گئی زور لگاؤ۔ کچھوا دم دبائے بیٹھا رہا۔

لومڑی نے جو دیکھا بولی "یہ تو کچھوا ہے"۔ خرگوش بولا۔ "تم زور تو لگاؤ"۔ جب لومڑی نے زور لگایا۔ تو خرگوش کی دم آدھی کٹ گئی۔

ضیاء حسنین رضوی

آدھی ملاقات

جولائی کا پیام تعلیم پڑھ لیا ہے۔ سرورق اس بار بہت پیارا ہے۔ کھائی چھپائی بھی اچھی ہے۔ کتابت کی غلطیاں معمول سے زیادہ ہیں۔ ایک دلچسپ بھول یہ ہوئی ہے کہ "بچوں سے باتیں" میں تو محترم نیر صاحب کی نظم "استاد صاحب" کا تذکرہ ہے لیکن رسالے میں اس کا کہیں پتا نہیں۔ اپنے محترم بزرگ حسین حسان صاحب (کہ جنھیں مرحوم لکھتے ہوئے آج بھی عجیب سا لگتا ہے) پر انجم قاسمی صاحب کا مضمون پڑھا۔ انجم صاحب کے خلوص کی داد نہ دینا ظلم ہوگا۔ لیکن یہ کہے بغیر نہیں رہا جاتا کہ موصوف نے اپنے جذبات کا اظہار خاصی مشکل اردو میں کیا ہے۔ یہ اردو کم از کم بچے تو نہیں سمجھ سکتے۔ مرحوم ذات جس کے بارے میں یہ مضمون ہے ساری زندگی سادہ اور شیریں زبان لکھتی رہی اور دوسرے لکھنے والوں کو بھی اسی کی ترغیب دیتی رہی۔ مضمون میں دیا گیا شعر بھی موزوں نہیں۔ صحیح شعر میرے خیال میں یوں ہے:

یہ حالت ہوگئی ہے صرف ساقی کے نہ ہونے سے
[illegible]

کہ خم کے خم بھرے رکھے ہیں اور مے خانہ خالی ہے

اس کے علاوہ مضمون کے چوتھے پیراگراف میں "[illegible] پرداخت" کا استعمال بھی درست نہیں یہاں [illegible] کافی تھا۔ انجم صاحب کو میرا مخلصانہ مشورہ ہے کہ اگر وہ بچوں کے لیے لکھنا چاہتے ہیں تو حتی الامکان سادہ اور آسان زبان استعمال کریں۔ کامیاب رہیں گے۔

محترم اسرار ہمدردی سے شرمندہ ہوں کہ چند ماہ پہلے پیام تعلیم کے صفحات میں موصوف نے اس خاکسار کو یاد فرمایا اور میں اپنی پریشانیوں اور مصروفیتوں میں اس طرح گرفتار کہ مکمل ارادے کے باوجود نہ پیام تعلیم کے لیے کچھ لکھ سکا اور نہ ہی محترم کی مشفقانہ یاد فرمائی کا شکریہ ادا کر سکا۔ جولائی کے شمارے میں ان کا مضمون "آریہ بھٹ" دلچسپ بھی ہے اور معلوماتی بھی۔ لیکن مضمون مکمل نہیں ہے اور یہ سراسر کاتب صاحب کی کرم فرمائی لگتی ہے دوسرے معلوماتی مضامین بھی خوب ہیں۔ محترم مہر ورلوی صاحب کا مضمون ایک عرصے سے میرے پاس پڑا تھا اور کاغذات میں اِدھر اُدھر ہو گیا تھا آپ نے بہت اچھا کیا کہ اسے جلد ہی شایع کر دیا۔ میری کوتاہی کی کسی حد تک تلافی ہوگئی۔

کہانیوں میں سچ پوچھیے تو "ننھے بچوں کی کوشش" کے تحت شایع دونوں کہانیاں سب سے زیادہ پسند آئیں۔ ان میں زبان کی سادگی کے ساتھ ہی ساتھ ایک پیغام بھی ہے۔ پیام تعلیم میں شایع ہونے والی سبھی کہانیوں اور مضامین کی زبان اتنی ہی

سادہ اور دل کو گدگدانے والی ہو تو کیا کہنے۔ محترم علوان
کہنکالوی کی کہانی "احسان" دل کو چھوتی ہے انجام
خوب ہے۔ جناب احمد مصطفیٰ خاں کی کہانی "کوشش"
کچھ اکھڑی اکھڑی سی لگتی ہے۔ انھیں ابھی اس سلسلے
میں مزید مشق کی ضرورت لگتی ہے وہ اسی شمارے میں
شائع شدہ مبین صاحب کی کہانی "ہمدردی"
پڑھیں تو یہ کمی خود ان پر واضح ہو جائے گی۔

"شکار کی باتیں" بہت دلچسپ مضمون ہے
اور "پیام تعلیم" کو اتنا دلچسپ مضمون عنایت فرمانے
کے لیے ریحان صاحب ہم سب کے شکریے کے
مستحق ہیں۔

نظمیں اپنی اپنی جگہ سبھی اچھی ہیں لیکن محترمہ
عصمت ریاض کی "لوری" پر مجھے دو اعتراض ہیں
اوّل تو یہ کہ نظم کی تراکیب خوب صورت تو ہیں لیکن
مشکل ہیں۔ لوری میں خصوصاً اتنی مشکل تراکیب نہیں
ہونی چاہییں۔ دوسرے انھوں نے یہ لوری ننھے،
فونی کے لیے لکھی ہے لیکن دوسرے بند کے تیسرے
مصرعے میں اسے "گلزار کی رانی" کہہ کر مخاطب کیا ہے
محترمہ یاسمین بیگم کی نظم "برسات" بہت رواں
رواں ہے۔

مستقل عنوانات "آدھی ملاقات" اور
"اِدھر اُدھر سے" کی غیر موجودگی کھٹکتی ہے۔

خلیق انجم اشرفی

میں پہلی بار آپ کو خط لکھ رہی ہوں۔ میں آپ
سے شکایت کرنا چاہتی تھی کہ آپ "پیام تعلیم"
کو وقت پر ہم کو مہیا کیوں نہیں کرتے۔ مگر اب نہیں
کر سکتی۔ کیونکہ آپ نے اپنے علیل ہونے کا نوٹ
"بچوں کی باتوں" میں دے دیا۔ پڑھ کر افسوس ہوا۔ اللہ تعالیٰ
آپ کو تندرست رکھیں۔ کہ آپ ہم بچوں کو اچھی
اچھی کہانیاں، نظمیں، معلوماتی فیچر مہیا کرتے ہیں۔ ستمبر
کے پرچے میں "بچوں کی باتوں" میں آپ کیا
بھول گئے جو جگہ خالی رہنے دی۔ آپ سے بھول
ہوئی یا کاتب سے۔

ستمبر کے مہینے میں جو کارٹون دیا ہے وہ بہت
دلچسپ ہے۔ بڑا مزا آیا۔ دوسری کہانی "ظالم
بھیڑیا اور جاہل لومڑی" پڑھ کر خوب ہنسی۔ اور
آپ نے جو تصویروں کا سلسلہ شروع کیا ہے۔ اسے
جاری رکھیں بچوں کے لیے یہ دلچسپی کا سبب بنتا ہے
آپ سے میری یہ گزارش ہے کہ آپ اچھی اچھی
کہانیاں ضرور "پیام تعلیم" میں دیا کریں اور مضامین
اچھے ہیں اور معلوماتی ہیں۔ میں امید کرتی ہوں
اکتوبر کا پیام تعلیم آپ وقت پر شائع کریں۔
اور اس میں عید کی نظمیں یا عید پر کوئی اچھا سا
دلچسپ مضمون ضرور شائع کریں۔

شاہین پروین، آشٹی گنج،

"پیام تعلیم" ہر ماہ ملتا رہتا ہے۔
حسان صاحب کے انتقال کے بعد خیال تھا
کہ پرچے کا وہ معیار اور انداز برقرار نہیں رہے گا۔
مگر آپ نے اس میں کوئی تبدیلی نہیں آنے دی اور
قطعی یہ معلوم نہیں ہوتا کہ اس کی ترتیب میں حسان صاحب
کا وجود شامل نہیں ہے۔ اس لحاظ سے آپ یقیناً
مبارک باد کے مستحق ہیں

حسان صاحب کے زمانے میں "پیام تعلیم"
میں میرے کافی مضامین شائع ہوئے لیکن اب

باقی صفحہ

ادھر اُدھر سے

عجائبات

"شاتو مینتش" اس نام کا ایک خوشبودار محل فرانس میں واقع ہے۔ اس محل میں داخل ہوتے ہی ایسا لگتا ہے۔ جیسے کسی نے کستوری بکھیر دی ہو۔ جس کے مہک سے سارا ماحول معطر ہو گیا ہے۔ اس خوشبودار محل کی تعمیر کا پس منظر یہ بتایا جاتا ہے کہ یہ محل نپولین نے اپنی ملکہ جوسیفن کے لیے تعمیر کروایا تھا۔ جب اس کا انتقال ہو گیا اس وقت اس کے سارے جسم پر بے حساب کستوری مل گئی۔ آج تقریباً ڈیڑھ سو برس گذر جانے کے بعد بھی کستوری کی مہک جوں کی توں ہے سیاح یہاں آکر کستوری کی مہک سے معطر ہو جاتے ہیں۔ اور اس عجائب پر سر دھنتے ہیں۔

ع۔ غ۔ احمد۔ پابرہ

"الیکٹرانک بیج"

ماسکو (اے پی۔ ایف) دنیا میں پہلی مرتبہ ایک ایسا تجرباتی پلانٹ بنایا گیا ہے جو بیجوں پر الیکٹرانک عمل کرنے اور اسی طریقے سے ان کی صفائی اور اعلیٰ بیج تیار کرنے کا اہل ہوگا۔ یہ پلانٹ زراعت کی مشین کاری و بجلی کاری کی ماسکو انسٹی ٹیوٹ کے پروفیسر اناطولی باسوف نے تیار کیا ہے۔ یہ پلانٹ ٹکنالوجی پر مبنی ہے۔ بیجوں کی صفائی اور اعلیٰ درجہ کے بیج تیار کرنے کا عمل ساتھ ساتھ موثر طور پر کرتا ہے۔ اس عمل میں بیج بجلی سے "چارج" کیے جاتے ہیں۔ جس سے ان کی حیاتیاتی خصوصیات بڑھ جاتی ہیں۔ اس عمل کے بعد بیج بہت زیادہ پیداوار دینے والے پائے گئے۔

ماہرین کے بموجب یورال زرعی ریسرچ انسٹی ٹیوٹ میں تحقیق و مطالعات سے پتہ چلا کہ الیکٹرانک عمل کیے ہوئے بیج اکھوے سے پھوٹنے کے معاملے میں بہتر ہوتے ہیں۔ ان سے پیداوار زیادہ ہوتی ہے اور سوکھے نیز سردی کا زیادہ مقابلہ کر سکتے ہیں۔ (سائنس کی دنیا)

بقیہ آدھی ملاقات ص ۔ سے

کے انتقال کے بعد کچھ بھجوانے کی طرف طبیعت راغب نہیں ہوتی تھی۔ لیکن ہر ماہ آپ جو "پیام تعلیم" بھجوا دیتے ہیں۔ اس سے بڑی شرمندگی ہوتی ہے اس لیے آج آپ کو کچھ بھجوانے کا تہیہ ہی کر لیا۔ یہ اقبال کی ایک چھوٹی سی نظم پر اظہار خیال ہے توقع ہے کہ آپ کو پسند آئے گا۔ اگر آپ نے پسند کیا تو اقبال کی چند اور مختصر.... نظموں پر بھی اس طرح اظہار خیال کروں گا۔ رشید الدین

پیامِ تعلیم

ماہنامہ

پیامِ تعلیم

نئی دِلّی ۲۵

جلد ۱۲ شمارہ ۱۱

اڈیٹر

ولی شاہجہانپوری

معاون

صفیہ حسان

نومبر ۱۹۷۵ء

قیمت فی پرچہ ۷۰ پیسے

سالانہ چندہ سات روپے

پرنٹر پبلشر سید احمد ولی نے مکتبہ جامعہ لمیٹڈ کے لیے جمال پرنٹنگ پریس دھلی میں چھپوا کر جامعہ نگر نئی دِلّی ۲۵ سے شایع کیا۔

فہرست مضامین

میں نے پہلے ہی کہا تھا کہ چھتری لیتے جاؤ۔
بارش ضرور ہوگی

بچوں سے باتیں

کہدو یہ حسرتوں سے کہیں اور جا بسیں
اتنی جگہ کہاں ہے دلِ داغدار میں

پچھلے پرچے میں ہم نے وعدہ کیا تھا کہ [illegible] کے انعامی مضامین ہم اس شمارے میں شائع کریں گے۔ افسوس کہ بعض مجبوریوں کی وجہ سے یہ مضامین اس شمارے میں جگہ نہ پا سکے۔ ان کے لیے آپ کو دسمبر تک انتظار کرنا پڑے گا۔

اس شمارے میں آپ کو کئی اچھی چیزیں ملیں گی۔

نظموں میں ناوک حمزہ پوری کی "اے میرے اللہ"، محمد ایوب واقف کی "میرے پیارے وطن"، ندیم احمد صاحب کا "نیا عہد" اور جاوید احمد خاں صاحب کی نظم "اصرار" پڑھیے اور لطف اٹھائیے جو باتیں عمل کی ہوں ان پر عمل کرنے کی کوشش کیجیے۔ خصوصاً "نیا عہد" آپ کو کچھ کرنے کی دعوت دیتا ہے۔

نثری مضامین میں مختار احمد صاحب

اکتوبر کا مہینہ بڑی چہل پہل کا مہینہ رہا۔ ۲۔ اکتوبر کو گاندھی جینتی اپنی روایتی شان کے ساتھ منائی گئی۔

اسی ماہ میں حضرت امیر خسروؒ کی ۷۰۰ ویں سالگرہ منائی گئی۔ یہی زمانہ ان کے سالانہ عرس کا بھی تھا جس کو دہلی والے "سترھویں" کہتے ہیں۔ سالگرہ کے موقع پر ایک ڈاک ٹکٹ بھی جاری کیا گیا جس پر امیر خسرو کی تصویر چھپی ہے۔

اسی مہینہ میں آخری مغل شہنشاہ، بہادر شاہ ظفر کی ۲۰۰ ویں سالگرہ منائی گئی اس موقع پر بھی ایک ڈاک ٹکٹ جاری کیا گیا۔ ٹکٹ پر ظفر مرحوم کے یہ دو شعر چھپے ہیں ؎

لگتا نہیں ہے جی مرا اجڑے دیار میں
کس کی بنی ہے عالمِ ناپائیدار میں

منو گلبیر گوری کا مضمون " قرآن غیر مسلموں کی نظر میں " دلچسپ اور معلوماتی ہے۔ اسی طرح ولی احمد تنہا کا مضمون "کبیر" بھی دلچسپ ہے۔

کہانیوں میں خلیق انجم صاحب نے ایک آسامی لوک کہانی " بڈھا، بڑھیا اور سیار" کا ترجمہ کرکے آپ کی دلچسپی میں اضافہ کیا ہے۔ خاص طور پر چھوٹے بچوں کے لیے۔

مس لقا ملک صاحبہ پہلی بار اس بزم میں شریک ہوئی ہیں۔ آپ نے ایک دلچسپ کہانی کے ترجمہ سے اپنی شرکت کا آغاز کیا ہے۔ امید کہ "چیف کی دعوت" آپ سب پسند کریں گے۔ اور یہ بھی کہ مس لقا صاحبہ آیندہ بھی پیام تعلیم کو یاد رکھیں گی۔

محترم محمد امین صاحب جغرافیہ کے استاد ہیں۔ ان کا مضمون خاص طور پر بڑے بچوں کے کام کا ہے۔

بقیہ کہانیاں بھی پڑھ کر آپ محظوظ ہوں گے۔

اس مرتبہ خلیق انجم صاحب نے ایک شکایت کی ہے۔ بات معقول ہے۔ ان کی شکایت سر آنکھوں پر مجھے اس بات کا احساس ہے۔ لیکن میں چاہتا ہوں کہ اسے پیام تعلیم کے شاعروں مضمون نگاروں کی طرف منتقل کرکے اس ذیل میں ان کی مدد طلب کروں۔ بد قسمتی سے میری معروفیتیں مجھے اتنا وقت نہیں دیتیں کہ میں مرحوم حسین حسان صاحب کی طرح نوک پلک درست کرسکوں۔ اس لیے اگر ہمارے مضمون نگار صاحبان اس کا خیال رکھیں گے تو میری بڑی مدد ہوگی۔

بچوں کے لیے لکھنے والوں کی بہت کمی ہے۔ بچوں کے لیے لکھنے والے کتنے ایسے ہیں جو " بڑے ادیب" بن گئے اور اپنا بچپن بھی بھول بیٹھے اور بچوں کے لیے لکھنے کو اپنے لیے کسرشان سمجھنے لگے۔ نئے لکھنے والوں کے بیشتر مضامین اور خود پیام تعلیم کا مطالعہ تو یہی ہے کہ ان کی نوک پلک درست کیے بغیر انھیں شایع نہ کیا جائے۔ لیکن میرے لیے ایسا ممکن نہیں۔ پھر بھی ایک سرسری نظر ڈال لیتا ہوں۔ اب اس کا زیادہ خیال رکھنا ہی پڑے گا۔

ریحان احمد عباسی صاحب کے متعلق اکثر پیامیوں کے خطوط آتے ہیں۔ خوشی کی بات ہے کہ اب انھوں نے وعدہ کیا ہے کہ وہ پیام تعلیم کے لیے ضرور کچھ نہ کچھ لکھتے رہیں گے۔ چنانچہ دسمبر کے شمارے میں ان کی شرکت کو یقینی سمجھنا چاہیے۔

جناب ناوک حمزہ پوری

اے میرے اچھے اللہ

بحر و بر میداں کہسار　　تیرا ہے سارا سنسار
تو ہے سب کا پالنہار　　میں، ہاں میں ہوں اس کا گواہ
اے میرے اچھے اللہ

زیبا تجھ کو سب تعریف　　تیرے لیے ساری توصیف
تو ہے قوی، ہم سب ہیں ضعیف　　مانگتے ہیں ہم تیری پناہ
اے میرے اچھے اللہ

مجھ کو علم کی نعمت بخش　　دولت بھی دے، عزّت بخش
دنیا دین کی راحت بخش　　تو کتنا اچھا ہے، واہ
اے میرے اچھے اللہ

تو ہے میرا، یا معبود　　میں ہوں تیرا، یا معبود
لطف یہ فرما، یا معبود　　دل میں ہو بس تیری چاہ
اے میرے اچھے اللہ

مجھ کو بس یہ خوف ہے آہ　　ہو نہ کہیں جاؤں گمراہ
تجھ پہ بھروسا ہے، واللہ　　مجھ کو دکھانا سیدھی راہ
اے میرے اچھے اللہ

دھرتی گگن میں تیرا راج　　شاہ و گدا تیرے محتاج
رکھ لینا ناوک کی لاج　　کر دے معاف اس کے گناہ
اے میرے اچھے اللہ

★

بڈھا، بڑھیا اور سیار

آسام کی ایک لوک کہانی

[illegible]
ترجمہ
عتیق انجم اشرفی

ایک بڈھا اور اس کی بڑھیا ایک جنگل کے کنارے مزے کی زندگی گزارتے تھے۔ بڈھا کھیتی باڑی کرتا تھا اور بڑھیا گھر کا کام کاج دیکھتی تھی۔

ایک دن بڈھا اروی بونے لگا۔ تو سیاروں کا ایک جتھا آ دھمکا اور اسے گھیر کر بولا "ارے دادا! یہ کیا غضب کر رہے ہو؟ اروی جب اس طرح بوئی جاتی تھی، بوئی جاتی تھی۔ اب تو طریقہ دوسرا ہے۔"

یہ سن کر بڈھے کے کان کھڑے ہو گئے، بولا "نیا طریقہ کیا ہے؟"

ایک سیار بولا "دادا! بابا آدم کے زمانے سے کچی اروی کی گانٹھیں بوئی جاتی ہیں۔ لیکن اب طریقہ یہ ہے کہ پہلے گانٹھوں کو ابال لو پھر انھیں بو دو تو پودے جلدی اگیں گے، زوردار پھلیں گے اور ان میں اروی بہت بیٹھے گی۔ ایسا کرو کہ پہلے اروی ابال لو۔ اس کے بعد پھر اسے پوال میں لپیٹ کر بو دو۔ اچھا ہو کر پوال پر سپاری کے تنے کی چھال بھی لپیٹ دو اور اگر جی چاہے تو اور پوال سے ڈھک دو۔ اس کے بعد گڑھا بنا کر [illegible] پھر دو تو بہت بڑا ہوگا۔ رات بھر میں فصل [illegible] ہو جائے گی۔"

بڈھے نے سوچا — روز نئی نئی ایجادیں ہوتی رہتی ہیں۔ کیا پتہ یہ بھی ایک طریقہ ہو۔ پھر بولا "اچھا، تمھاری بات مان لیتا ہوں!"

اس نے شام کو ساری اروی ابال ڈالی اور رات کو ابلی ہوئی اروی بو دی۔ بڈھا تو سو گیا اور سیاروں نے ابلی ہوئی اروی کی دعوت اڑائی۔ پوال میں لپٹے ہونے کی وجہ سے کسی کے منہ میں مٹی بھی نہیں لگی۔ وہ اروی کھاتے رہے اور بڈھے پر ہنستے رہے۔

دوسرے دن بڈھا صبح سویرے اٹھ کر کھیت پر گیا تو کیا دیکھتا ہے کہ ساری اروی غائب ہے۔ پوال اور سپاری کے پیڑ کی چھال بکھری پڑی ہے۔ بڈھا سمجھ گیا کہ سیار اسے جھانسا دے کر ٹھگ لے گئے ہیں۔

وہ سوچتا رہا، سوچتا رہا، پھر بڑھیا سے بولا "تم میرے جسم پر اچھی طرح گڑ لپوت دو۔ پھر میں لیٹ جاتا ہوں۔ جیوں ہی مجھ پر مکھیاں بھنبھنانے لگیں۔ تم چلا چلا کر رونے لگنا کہ، ہائے تم مجھ کو چھوڑ کر کہاں چلے گئے؟، یہ سن کر سیار آ جائیں گے تم رو رو کر کہنا کہ میں مر گیا اور جب مر ہی گیا تو وہ چاہیں تو مجھے کھا ڈالیں۔ لیکن اس سے پہلے میرے پاس ایک موٹا سا ڈنڈا رکھ دینا اور جیسے ہی سیار مجھے کھانے

کمرے کے اندر گھسیں، کواڑ بند کر دینا۔"

بڑھیا نے ہنسے کے سارے جسم پر گڑ پوت دیا اور جب مکھیاں بھنبھنانے لگیں تو وہ چلا چلا کر اور چھاتی پیٹ پیٹ کر رونے لگی۔ سیاروں نے یہ ماتم سنا تو دوڑے آئے۔ بولے "دادی معاملہ کیا ہے؟" بڑھیا بولی "کیا کہوں! کچھ کہا نہیں جاتا! بڈھا مجھے دھوکہ دے کر چلا گیا۔ ہائے! میں کہاں جاؤں، کیا کروں؟ نہ کوئی ساتھی ہے نہ مردہ ڈھونے والا۔ تم لوگ ہی اسے لے جاؤ اور کھا ڈالو۔"

یہ سن کر سیار بہت خوش ہوئے کہ اروی کھائی سو کھائی اب آدمی کا گوشت بھی کھانے کو ملے گا۔ وہ کسان کی 'لاش' نکالنے کے لیے کمرے میں گھس گئے۔

بڑھیا نے جھٹ باہر سے دروازہ بند کر دیا۔ سیاروں کو دیکھ کر بڈھا اٹھ کھڑا ہوا اور ڈنڈا سنبھال کر ان پر پل پڑا۔ اور اچھی طرح ان کی خبر لی۔ چار سیاروں کے علاوہ باقی وہیں ڈھیر ہو گئے۔ چار کسی طرح بچ نکلے۔

سیار اب بڑھیا کی تاک میں رہنے لگے۔ بڑھیا نے گھر سے نکلنا ہی چھوڑ دیا لیکن کب تک۔ کچھ ہی دنوں میں اوب گئی اور بڈھے سے بولی "میں اپنی بیٹی کے گھر جا رہی ہوں بہت دن ہو گئے اس سے ملے ہوئے۔"

بڈھا بات کاٹ کر بولا "وہ تو ٹھیک ہے لیکن سیار تم سے خار کھائے بیٹھے ہیں۔ ابھی نہ جاؤ تو اچھا ہے۔"

پر بڑھیا بھی ضدی تھی نہ مانی۔ بولی "میں جاؤں گی ضرور چاہے دنیا ادھر سے ادھر ہو جائے۔" اور یہ کہہ کر گھر سے نکل پڑی۔ سیار ایسی تاک لگا بیٹھے تھے۔ ایک سنسان جگہ پر انھوں نے بڑھیا کو گھیر لیا اور کہا "بڑھیا، اب تو کہاں جائے گی۔ ہم لوگ اب تجھے کھا کر ہی مانیں گے۔ بالکل نہیں تو....."

بڑھیا نے جب دیکھا کہ معاملہ خراب ہے تو بولی "ایسی بات ہے تو مجھے کھا لو۔ لیکن مرنے سے پہلے میری خواہش ہے کہ میں اپنی بیٹی سے مل لوں۔ اسے دیکھے ہوئے کتنا زمانہ ہو گیا! لوٹتے وقت تم لوگ مجھے کھا لینا۔"

سیاروں نے کہا "نہ لوٹی تو؟"

بڑھیا بولی "کہیں ایسا بھی ہوتا ہے کہ کوئی ماں بیٹی کے گھر رہ جائے۔ شوہر کے گھر تو لوٹنا ہی ہے۔ میں وعدہ کرتی ہوں کہ اسی راستے اکیلی لوٹوں گی پھر تم جو کرنا چاہو کر لینا۔ مرنے سے پہلے ایک بار بیٹی سے مل تو لوں۔"

سیار مان گئے اور بڑھیا اپنی بیٹی کے گھر پہنچ گئی۔

بیٹی نے ماں کی بڑی آؤ بھگت کی۔ بڑھیا بہت خوش ہوئی۔ لیکن جب اسے سیاروں سے کیے وعدے کا خیال آیا تو وہ اداس ہو گئی۔ اور بیٹی کے پوچھنے پر اسے بتایا کہ وہ اس طرح سیاروں میں پھنس گئی تھی اور ان سے وعدہ کر کے آئی ہے کہ وہ اسی راستے اکیلے لوٹے گی۔ بیٹی بولی "فکر نہ کرو ماں۔ میرے پاس ایک بہت بڑا تونبا ہے۔ تم اس میں گھس جانا اور لڑھکتے

...سے گھس جانا۔ سیاروں کو کچھ پتہ ہی نہیں ملے گا۔"
بڑھیا نے ایسا ہی کیا۔ وہ تونبے کے اندر بیٹھ کر اپنے گھر کی طرف چل دی۔ لیکن جب سیاروں نے ایک تونبے کو اپنے آپ لڑھکتے دیکھا تو لگے سوچنے کہ دال میں کچھ کالا ہے۔ وہ مل کر اسے لتیانے لگے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ تونبا ٹوٹ گیا۔ اور اس کے اندر سے بڑھیا نکل پڑی۔

سیاروں کی باچھیں کھل گئیں۔ بولے "تو بڑھیا تیرے یہ کرم ہیں۔ تو ہم لوگوں کو دھوکا دے کر بھاگ رہی تھی۔ اب پکڑی گئی۔ اب تجھے نہیں چھوڑیں گے اور کھا کر ہی دم لیں گے۔"

بڑھیا بولی: "جب تم لوگوں کی یہی مرضی ہے تو ٹھیک ہے۔ مجھے کھا جاؤ لیکن میں نے اپنی بیٹی کے یہاں ناچ کا ایک نیا اور انوکھا طریقہ سیکھا ہے بس پہلے تم وہ ناچ دیکھ لو، پھر چاہو تو کھا لینا۔"

سیاروں نے سوچا کھانا تو ہے ہی اگر اس سے پہلے کچھ تفریح بھی ہو جائے تو کیا برا ہے بڑھیا کہیں جا نہیں سکتی۔ بولے "اچھا ٹھیک ہے۔ نئے طریقے کا ناچ دکھاؤ۔"

بڑھیا بولی: "میں ناچوں گی تو گاؤں گی بھی۔ اور ایک بات ہے۔ جب میں گاؤں تو تم بھی ساتھ گانے لگنا۔ تمہارے گیت سے مگن ہو کر میں بہت اچھا ناچوں گی۔"

بڑھیا کا گھر دور نہیں تھا۔ اس کے دو کتے تھے۔ لالو اور کالو۔ بڑھیا گاتے ہوئے لالو اور کالو کا نام لے کر چلانے لگی۔ ساتھ میں سیاروں کی آواز۔ بس لالو اور کالو دوڑتے ہوئے پہنچ گئے انہیں دیکھتے ہی سیار ناچ گانا چھوڑ کر بھاگ کھڑے ہوئے اور بڑھیا کتوں کے ساتھ صحیح سلامت گھر پہنچ گئی۔

اس طرح بڑھیا کا وعدہ بھی پورا ہوا اور جان بھی بچ گئی۔

بقیہ کبیر داس صفحہ ۲۴ سے

۲۔ میرا مجھ میں کچھ نہیں جو کچھ ہے سو تیرا
تیرا تجھ کو سونپتے کیا لاگے میرا

میں نے اوپر بیان کیا ہے کہ ہندو انہیں کبیر داس اور مسلمان شاہ کبیر کہتے تھے ۱۵۱۸ء میں مگدھ میں ان کا انتقال ہوا تو تجہیز و تکفین کا جھگڑا کھڑا ہو گیا۔ ہندو کہتے تھے کہ کبیر ہندو ہیں لہٰذا ہم اُن کی تجہیز و تکفین ہندو طریقہ پر کریں گے۔ مسلمان کہتے تھے کہ کبیر مسلمان ہیں اس لیے ہم ان کی تجہیز و تکفین مسلم طریقہ پر کریں گے۔

کہتے ہیں جب ان کی لاش سے چادر اٹھائی گئی تو جسم کے بجائے پھولوں کا ایک ڈھیر ملا۔ جس کا نصف حصہ ہندوؤں نے بنارس لے جا کر نذر آتش کیا اور باقی آدھا حصہ مسلمانوں نے وہیں مگدھ میں دفن کر دیا۔ جہاں ان کا مقبرہ اب بھی مرجع عوام ہے۔ ★★

بے وقوفی کے سوا کیا

★ جو کام اپنے سے نہ ہو سکے اسے دوسروں کے لیے بھی ناممکن تصور کرنا۔

★ بیکاری میں راحت کی توقع رکھنا۔

★ اپنا راز بتا کر پھر اُسے پوشیدہ رکھنے کی سفارش کرنا۔

★ تمام انسانوں کو اپنا ہم خیال بنانے کی کوشش کرنا۔

(بشیر الدین شیر کوٹی)

جناب مختار احمد منو (گلبرگہ)

قرآن مجید غیر مسلموں کی نظر میں

آؤ بچو، قرآن مجید کی نسبت غیر مسلم کے خیالات دیکھیں قرآن مجید ہمارے آخری پیغمبر حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوا۔ اس کا طرز بیان ایسا ہے گویا خدا اپنی مخلوق سے باتیں کر رہا ہے۔

تیرہ سو سال بعد بھی آج تک قرآن مجید کو کروڑوں لوگوں نے زبانی یاد کیا ہے۔ آج تک قرآن مجید کا کوئی بھی لفظ نہ بدلا ہے اور نہ بدلے گا۔ چوبیس گھنٹے دنیا کے ہر گوشے گوشے میں یہ پڑھا جاتا ہے۔ ہمارے ملک میں بھی حافظ قرآن پائے جاتے ہیں۔ یہ نہ صرف زیادہ عمر کے لوگوں کو یاد ہے بلکہ آٹھ دس برس کی عمر کے بچوں کو بھی قرآن زبانی یاد ہے یہ ایک ایسا معجزہ ہے کہ دنیا کا کوئی عقلمند اور سائنس داں اس کا راز نہیں بتا سکتا کہ اتنی بڑی کتاب زبانی یاد ہو جائے اور اس کو یاد رکھیں۔ قرآن کو زبانی یاد کر لینے کے بعد سب لوگ اس کو حافظ صاحب کہتے ہیں۔ اور اس لقب کی مسلمانوں میں بڑی عزت کی جاتی ہے۔ اس لیے ہر شخص کو حافظ بننے کا شوق ہوتا ہے۔

قرآن مجید کا طرز بیان ایک معجزہ ہے۔ کیونکہ اس میں ایک خاص جدت، ندرت اور عظمت پائی جاتی ہے۔ کہیں وہ شاہانہ وقار اور دبدبہ سے مخاطب ہوتا ہے تو کہیں درویشانہ انکسار اور ملائمت سے بات کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج دنیا کی ہر قوم کے لوگ اس کی عظمت کے قائل ہیں۔ آؤ بچو غیر مسلم اہل علم کی نظروں میں قرآن مجید کی عظمت دیکھیں۔

۱۔ مسز سروجنی نائیڈو

مسز سروجنی نائیڈو نے لندن میں تقریر کی۔ "قرآن کریم غیر مسلموں سے بے تعصبی اور رواداری کا سلوک سکھاتا ہے۔ دنیا اس کے اصول کی پیروی سے خوشحال ہو سکتی ہے۔"

۲۔ ڈاکٹر گستاؤلی بان فرانسیسی

لکھتے ہیں کہ قرآن دلوں میں ایسا زندہ اور پُرزور ایمانی جوش پیدا کر دیتا ہے کہ پھر کسی شک کی گنجائش نہیں رہتی۔

۳۔ چیمبرس

انسائیکلوپیڈیا میں محمڈن ازم کے [illegible] لکھا ہے "قرآن نے ظلم، جھوٹ۔ [illegible]

انتقام۔ غیبت۔ طمع۔ فضول خرچی۔ حرام کاری۔ ... اور بدگمانی کی بہت سخت برائی کی ہے۔ ... یہ بھی اس کی بڑی خوبی ہے۔

۴۔ سر ولیم میور صاحب

متعصب انگریز نے لکھا ہے: "قرآن نے فطرت اور کائنات کی دلیلوں سے خدا کو سب سے اعلیٰ ہستی ثابت کیا ہے اور انسانوں کو خدا کی اطاعت اور شکر گذاری پر جھکا دیا ہے"

۵۔ الکیس لیورزون

فرانسیسی فلاسفر لکھتا ہے: "قرآن روشن اور پُر حکمت کتاب ہے۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ وہ ایسے شخص پر نازل ہوا ہے جو سچا نبی تھا اور خدا نے اس کو بھیجا تھا۔"

۶۔ مورخ ڈاکٹر گبن

لکھتے ہیں "قرآن وحدانیت کا سچا گواہ ہے ایک موحد فلسفی اگر کوئی مذہب قبول کر سکتا ہے تو وہ اسلام ہے غرض سارے جہان میں قرآن کی نظیر نہیں مل سکتی ہے"

۷۔ کونٹ ہنری دی کاسٹری

اپنی کتاب الاسلام میں لکھتے ہیں: "قرآن کو دیکھ کر عقل حیرت میں ہے۔ اس قسم کا کلام اس شخص کی زبان سے کیونکر ادا ہوا۔ جو بالکل امی تھا۔"

۸۔ پروفیسر کارلائل

لکھتے ہیں۔ "میرے نزدیک قرآن میں خلوص اور سچائی کا وصف ہر پہلو سے موجود ہے اور سچ یہ ہے کہ اگر کوئی خوبی پیدا ہو سکتی ہے تو اسی سے ہو سکتی ہے"

۹۔ ڈیون پورٹ

اپنی کتاب "محمد اور قرآن" میں لکھتے ہیں "قرآن مسلمانوں کا مشترکہ قانون ہے۔ معاشرتی، ملکی، تجارتی، فوجی، عدالتی، تعزیری سب معاملات اس میں ہیں۔ پھر بھی یہ ایک مذہبی کتاب ہے۔ اس نے ہر چیز کو باقاعدہ بنادیا ہے۔

۱۰۔ ریونڈ آر میکسویل کنگ

اپنی تقریر دینِ اسلام میں کہتے ہیں "قرآن الہامات کا مجموعہ ہے۔ اس میں اسلام کے اصول و قوانین۔ اخلاق کی تعلیم اور روزمرہ کے کاروبار کی نسبت ہدایت ہیں۔ اس لحاظ سے اسلام کو عیسائیت پر فوقیت ہے کہ اس کی مذہبی تعلیم اور قانون علیحدہ چیزیں نہیں ہیں۔

۱۱۔ ڈاکٹر جانسن

لکھتے ہیں "قرآن کے مطالب ایسے مناسب وقت اور عام فہم ہیں کہ تمام دنیا ان کو آسانی سے قبول کر سکتی ہے۔"

۱۲- پادری ریونڈجی۔ ایم راڈویل

لکھتے ہیں " قرآن کی تعلیم نے بت پرستی مٹائی۔ جنات اور مادیات کا شرک مٹایا۔ اللہ کی عبادت قایم کی۔ لڑکیوں کے قتل کی رسم نیست و نابود کر دی۔"

۱۲- پروفیسر ایڈورڈ مونٹی

اپنی کتاب میں لکھتے ہیں " عقیدۂ اسلام کو مجملاً یوں بیان کیا جا سکتا ہے۔ توحید و رسالت کا یقین اور خدا اور آخرت پر ایمان یہ ہی دونوں اصول اسلامی عقیدہ کی بنیاد ہیں۔"

۱۳- پروفیسر رنلڈ اے نکلسن

لکھتے ہیں " قرآن کے اثر سے عربی زبان تمام اسلامی دنیا کی مشترک زبان بن گئی اور قرآن نے دختر کشی کا خاتمہ کیا۔"

۱۴- جان جاک ریسک

مشہور جرمن فلاسفر لکھتا ہے " جب قرآن پیغمبر کی زبان سے منکر سنتے تھے تو بے تاب ہو کر سجدہ میں گر پڑتے اور مسلمان ہو جاتے تھے۔"

۱۵- اے۔ جی۔ ویلنز

مشہور مورخ کہتا ہے " قرآن نے مسلمانوں کو مواخات کے بندھن میں باندھ رکھا ہے جو نسل رنگ اور زبان کے فرق کے پابند نہیں ہیں۔"

۱۶- بابا نانک صاحب

جنم ساکھی کلاں ۱۷۳ میں فرماتے ہیں " توریت زبور۔ انجیل۔ اور وید وغیرہ تمام پڑھ کر دیکھ لیے قرآن شریف قابلِ قبول اور اطمینانِ قلب کی کتاب نظر آئی۔"

نانک صاحب پھر ایک جگہ ارشاد کرتے ہیں کہ " اگر سچ پوچھو تو سچی اور ایمان کی کتاب جس کی تلاوت سے دل باغ باغ ہو جاتا ہے۔ قرآن شریف ہی ہے۔"

۱۷- مہاتما گاندھی جی

اپنی کتاب میں لکھا ہے " قرآن کو الہامی کتاب تسلیم کر لینے میں ذرہ برابر تامل نہیں ہے۔"

۱۸- سر ایڈورڈ ڈینسن راس سی۔ آئی۔ ای

لکھتے ہیں " قرآن شریف اس بات کا مستحق ہے کہ یورپ کے گوشہ گوشہ میں پڑھا جائے۔"

۱۹- مسٹر ارنلڈ وہائٹ

لکھتے ہیں کہ " قرآن نے مسلمانوں کو جنگ بھی سکھائی اور ہمدردی اور خیرات اور فیاضی بھی۔"

۲۰- ڈاکٹر جارٹن

لکھتے ہیں " قرآن کا طرزِ تحریر دل آویز ہے۔ رواں ہے ــــ مختصر اور جامع ہے ...

اکثر بہت شاندار طریقہ سے کرتا ہے۔"

۲۱۔ گاڈفرے ہگینس

لکھتے ہیں کہ " قرآن غریب آدمی کا دوست ہے اور غمخوار ہے۔ بڑے آدمیوں کی ناانصافی کی ہر جگہ مذمت کرتا ہے۔"

۲۲۔ تھیوڈور نون لڈیکے

لکھتے ہیں " قرآن لوگوں کو تحریک و ترغیب کے ذریعہ معبودانِ باطل سے پھیر کر ایک خدا کی طرف لاتا ہے۔"

۲۳۔ مسٹر سٹین لی لین پول :-

لکھتے ہیں " قرآن میں سب کچھ موجود ہے جو ایک بڑے مذہب میں ہونا چاہیے اور جو ایک بزرگ انسان (پیغمبرؐ) میں خالص طور سے موجود تھا۔"

۲۴۔ مسٹر بھوپندر ناتھ باسو

لکھتے ہیں۔ " تیرہ سو برس کے بعد بھی قرآن کی تعلیمات کا یہ اثر موجود ہے کہ ایک خاکروب بھی مسلمان ہونے کے بعد بڑے بڑے خاندانی مسلمان کی برابری کا دعویٰ کر سکتا ہے۔

۲۵۔ نیئر الیسٹ (لندن کا اخبار)

لکھتا ہے کہ " اگر ہم قرآن کی فضیلت اور حسن و خوبی سے انکار کریں تو ہم عقل و دانش سے بیگانہ ہوں گے۔"

سید محمد شفیع تمنا کلکتوی

میرا پیغام

دن رہے رات رہے صبح رہے شام رہے | میرے اللہ میرے لب پہ ترا نام رہے
دیتا جاؤں میں جہاں بھر کو محبت کا پیام | نفرتوں سے کبھی مجھ کو نہ کوئی کام رہے
بن کے کردار کا غازی میں دکھاؤں سب کو | یا خدا میرا یہ ارمان خوش انجام رہے
خوب جی بھر کے کروں قوم وطن کی خدمت | کام ہر ایک کے آؤں یہ مرا کام رہے

مژدۂ خلد تمناؔ کوئی دیتا ہے تو دے
میرا پیغام فقط علم کا پیغام رہے

جناب ہنر کارواری

دعا

طوفانِ شور و شر میں ہم کو سنبھال یارب
کم سن ہیں بے خبر ہیں ہم نونہال یارب

نفرت کا بیج ہر اک دل سے نکال یارب
سانچے میں تو محبت کے سب کو ڈھال یارب

چھائے نہ دل پہ گردِ رنج و ملال یارب
خوشیاں ہمیں میسر ہوں لازوال یارب

ہم سب ہیں تیرے بندے لیکن بھٹک گئے ہیں
رستہ دکھا دے سیدھا اے لایزال یارب

رستہ دکھا تو ان کا جن پر کرم ہے تیرا
عقبیٰ میں سرخرو ہوں ہم نونہال یارب

تعلیم میں ہمارا ہو بے نظیر مکتب
مکتب کے سارے بچے ہوں بے مثال یارب

صدق و خلوص سے ہم تیری کریں عبادت
توفیق دے، رہے بس تیرا خیال یارب

غنچے ہیں نو شگفتہ ہم تیرے گلستاں کے
دولت سے علم کی تو کر مالا مال یارب

خدمت میں دوسروں کی کٹ جائے عمر ساری
خدمت کی زندگی ہو یہ بے مثال یارب

یہ ہے دعا ہنر کی مل جائے سب کو منزل
آسان کر دے رستہ جو ہے محال یارب

از بھیشم ساہنی

ترجمہ
محترمہ مہ لقا ملکہ

چیف کی دعوت

آج مسٹر شام ناتھ کے گھر چیف کی دعوت تھی شام ناتھ اور ان کی بیگم کو پسینہ پونچھنے کی فرصت نہ تھی۔ بیگم ڈریسنگ گون پہنے، الجھے ہوئے بالوں کا جوڑا بنائے، منہ پر پھیلی ہوئی سرخی اور پاوڈر کو بھوئے ہوئے، اور مسٹر شام ناتھ سگریٹ پہ سگریٹ پھونکتے ہوئے، چیزوں کی فہرست ہاتھ میں تھامے، ایک کمرے سے دوسرے کمرے میں آجا رہے تھے۔

آخر پانچ بجتے بجتے تیاری مکمل ہونے لگی۔ کرسیاں، میز، تپائیاں، نیپکن، پھول، سب برآمدے میں پہنچ گئے۔ ڈرنک کا انتظام بیٹھک میں کر دیا گیا۔ اب گھر کا فالتو سامان الماریوں کے پیچھے اور پلنگوں کے نیچے چھپایا جانے لگا۔ تبھی شام ناتھ کے سامنے یکایک ایک اڑچن کھڑی ہو گئی۔۔۔۔

ماں کا کیا ہو گا؟

اس بات کی طرف نہ ان کا اور نہ ان کی چابق بیگم کا دھیان گیا تھا۔ مسٹر شام ناتھ بیگم کی طرف گھوم کر انگریزی میں بولے۔

"ماں کا کیا ہو گا؟"

بیگم کام کرتے کرتے ٹھہر گئیں اور تھوڑی دیر تک سوچنے کے بعد بولیں۔ "انھیں پچھواڑے ان کی سہیلی کے گھر بھیج دو۔ رات بھر بے شک وہیں رہیں۔ کل آجائیں۔"

شام ناتھ سگریٹ منہ میں رکھے، سکڑی آنکھوں سے بیگم کے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے پل بھر سوچتے رہے، پھر سر ہلا کر بولے۔

"نہیں، میں نہیں چاہتا کہ اس بڑھیا کا آنا جانا یہاں پھر سے شروع ہو۔ پہلے ہی بڑی مشکل سے بند کیا تھا۔ ماں سے کہیں کہ جلدی ہی کھانا کھا کر شام کو ہی اپنی کوٹھری میں چلی جائیں۔ مہمان کہیں آٹھ بجے آئیں گے۔ اس سے پہلے ہی اپنے کام سے نپٹ لیں۔"

تجویز ٹھیک تھی۔ دونوں کو پسند آئی۔ مگر پھر اچانک بیگم بول اٹھیں۔ "جو وہ سو گئیں اور نیند میں خراٹے لینے لگیں، تو؟ ساتھ ہی تو برآمدہ ہے، جہاں لوگ کھانا کھائیں گے۔"

"تو انھیں کہہ دیں گے کہ اندر سے دروازہ بند کر لیں۔ میں باہر سے تالا لگا دوں گا۔ یا ماں سے کہہ دیتا ہوں کہ اندر جا کر سوئیں نہیں، بیٹھی

رہیں، اور کیا؟"

"اور جو سو گئیں تو؟ ڈنر کا کیا معلوم، کب تک چلے؟ کیا معلوم، کب تک چلے؟ گیارہ گیارہ بجے تک تو تم لوگ ڈرنک ہی کرتے رہتے ہو۔"

شام ناتھ کچھ جھینپ اُٹھے، ہاتھ جھٹکتے ہوئے بولے۔ "اچھی بھلی یہ بھائی کے پاس جا رہی تھیں۔ تم نے یوں ہی خود اچھا بننے کے لیے بیچ میں ٹانگ اڑا دی۔"

"واہ! تم ماں اور بیٹے کی باتوں میں، میں کیوں بری بنتی؟ تم جانو اور وہ جانیں۔"

مسٹر شام ناتھ چپ رہے۔ یہ موقع بحث کا نہ تھا، مسئلہ کا حل ڈھونڈنے کا تھا۔ انھوں نے گھوم کر ماں کی کوٹھری کی طرف دیکھا۔ کوٹھری کا دروازہ برآمدے میں کھلتا تھا۔ برآمدے کی طرف دیکھتے ہوئے جھٹ سے بولے۔ "میں نے سوچ لیا ہے۔" اور انھیں قدموں سے ماں کی کوٹھری کے باہر جا کھڑے ہوئے۔ ماں دیوار کے ساتھ ایک چوکی پر بیٹھی ہوئی دوپٹے میں منھ سر لپیٹے مالا جپ رہی تھیں۔ صبح سے تیاری ہوتے دیکھ کر ماں کا بھی دل دھڑک رہا تھا۔ بیٹے کے دفتر کا بڑا صاحب گھر پر آرہا ہے سارا کام خوبی سے ہو جائے۔

"ماں، آج تم کھانا جلدی کھا لینا۔ مہمان لوگ ساڑھے سات بجے آجائیں گے۔" ماں نے دھیرے سے منھ پر سے دوپٹہ ہٹایا اور بیٹے کو دیکھتے ہوئے کہا۔ "آج مجھے کھانا نہیں کھانا ہے۔ بیٹا تم جانتے ہو، ماس مچھلی بنے تو میں کچھ نہیں کھاتی۔"

"جیسے بھی ہو، اپنے کام سے جلدی نپٹ لینا۔"

"اچھا بیٹا۔"

"اور ماں، ہم لوگ پہلے بیٹھک میں بیٹھیں گے۔ اتنی دیر تم برآمدے میں بیٹھنا۔ پھر جب ہم یہاں آجائیں تو تم غسل خانے کے راستے بیٹھک میں چلی جانا۔"

ماں ہکّا بکّا ہو کر بیٹے کا چہرہ دیکھنے لگی۔ پھر آہستہ سے بولیں۔ "اچھا بیٹا۔"

"اور ماں، آج جلدی سو نہیں جانا۔ تمھارے خراٹوں کی آواز دور تک جاتی ہے۔"

ماں شرمندگی کی آواز میں بولیں۔ "کیا کروں، بیٹا، میرے بس کی بات نہیں ہے۔ جب سے بیماری سے اٹھی ہوں، ناک سے سانس نہیں لے سکتی ہوں۔"

مسٹر شام ناتھ نے انتظام تو کر دیا، پھر بھی ان کی ادھیڑ بن ختم نہیں ہوئی۔ جو چیف اچانک ادھر آنکلا، تو؟ آٹھ دس مہمان ہوں گے، دیسی افسر، ان کی بیویاں ہوں گی۔ کوئی بھی غسل خانے کی طرف آسکتا ہے۔ افسوس اور غصّہ میں وہ سر کھجلانے لگے۔ ایک کرسی کو اٹھا کر برآمدے میں رکھتے ہوئے بولے۔ "آؤ ماں، اس پر ذرا بیٹھو تو۔"

ماں مالا سنبھالتی، پلّا ٹھیک کرتی ہوئی اٹھیں اور دھیرے سے کرسی پر آکر بیٹھ گئیں۔

"یوں نہیں، ماں، ٹانگیں اوپر چڑھا کر نہیں بیٹھتے۔ یہ کھاٹ نہیں ہے۔"

"ماں نے ٹانگیں نیچے اتار لیں۔"

"اور خدا کے واسطے ننگے پاؤں نہیں گھومنا۔ نہ ہی وہ کھڑاؤں پہن کر سامنے آنا۔ کسی دن میں وہ کھڑاؤں اٹھا کر باہر پھینک دوں گا۔"

ماں چپ رہیں
"کپڑے کون سے پہنوگی ماں؟"
"جو ہیں، وہی پہنوں گی بیٹا! جو کہو،
پہن لوں"
مسٹر شام ناتھ سگریٹ منہ میں رکھے
پھر ادھ کھلی آنکھوں سے ماں کی طرف دیکھنے
لگے اور ماں کے کپڑوں کے بارے میں سوچنے
لگے۔ شام ناتھ ہر بات میں ترتیب چاہتے تھے۔
گھر کا انتظام ان کے اپنے ہاتھ میں تھا۔ کھونٹیاں
کمروں میں کہاں لگائی جائیں، بستر کہاں پر بچھیں،
کس رنگ کے پردے لگائے جائیں۔ بیگم۔
بیگم کون سی ساڑی پہنیں، میز کس سائز کی ہو...
شام ناتھ کو فکر تھی کہ اگر چیف کا سامنا ماں سے ہو گیا
تو کہیں شرمندہ نہ ہونا پڑے۔ ماں کو سر سے پاؤں
تک دیکھتے ہوئے بولے "تم سفید قمیص اور سفید
شلوار پہن لو، ماں! پہن کے آؤ تو، ذرا دیکھوں!"
ماں خاموشی سے اٹھیں اور اپنی کوٹھری میں
کپڑے پہننے چلی گئیں۔
"یہ ماں کا جھمیلا ہی رہے گا!" انھوں نے پھر
انگریزی میں اپنی بیوی سے کہا "کوئی ڈھنگ کی بات
ہو، تو بھی کوئی کہے۔ اگر کہیں کوئی الٹی سیدھی بات
ہو گئی، چیف کو برا لگا، تو سارا مزہ جاتا رہے گا!"
ماں سفید قمیص اور سفید شلوار پہن کر باہر نکلیں
چھوٹا سا قد، سفید کپڑوں میں لپٹا چھوٹا سا سوکھا
ہوا جسم، دھندلی آنکھیں، صرف سر کے آدھے
جھڑے ہوئے بال پلّے کی اوٹ میں چھپ سکے
تھے۔ پہلے سے کچھ ہی کم بدصورت نظر آ رہی تھیں۔

"چلو، ٹھیک ہے۔ کوئی چوڑیاں وڑیاں ہوں،
تو وہ بھی پہن لو۔ کوئی حرج نہیں!"
"چوڑیاں کہاں سے لاؤں، بیٹا؟ تم تو
جانتے ہو، سب زیور تمھاری پڑھائی میں بک
گئے۔"
یہ جملہ شام ناتھ کو تیر کی طرح لگا۔ تنک کر
بولے۔ "یہ کون سا راگ چھیڑ دیا، ماں! سیدھا
کہہ دو، نہیں ہیں زیور، بس! اس سے پڑھائی
وڑھائی کا کیا تعلق ہے؟ جو زیور بکا تو کچھ بن کر
ہی آیا ہوں، نرا لنڈورا تو نہیں لوٹ آیا۔ جتنا
دیا تھا، اس سے دوگنا لے لینا!"
"میری زبان جل جائے، بیٹا، تم سے
زیور لوں گی؟ میرے منہ سے یوں ہی نکل گیا۔
جو ہوتے، تو لاکھ بار پہنتی۔"

ساڑھے پانچ بج چکے تھے۔ ابھی مسٹر شام
ناتھ کو خود بھی نہا دھو کر تیار ہونا تھا۔ بیگم کب
کی اپنے کمرے میں جا چکی تھیں۔ شام ناتھ جاتے
ہوئے ایک بار پھر ماں کو ہدایت کرتے گئے۔
"ماں، روز کی طرح گم سم بن کر نہیں بیٹھی رہنا۔
اگر صاحب ادھر آ نکلیں اور کوئی بات پوچھیں،
تو ٹھیک طرح سے بات کا جواب دینا۔"
"میں نہ پڑھی، نہ لکھی، بیٹا، میں کیا بات
کروں گی! تم کہہ دینا، ماں ان پڑھ ہے، کچھ
جانتی سمجھتی نہیں! وہ نہیں پوچھے گا۔"
سات بجتے بجتے ماں کا دل دھک دھک
کرنے لگا۔ اگر چیف سامنے آ گیا اور اس نے

کچھ پوچھا، تو وہ کیا جواب دے گی؟ انگریزی کو تو دور سے ہی دیکھ کر وہ گھبرا اٹھتی تھی، یہ تو امریکی ہے۔ نہ معلوم، کیا پوچھے؟ میں کیا کہوں گی؟ ماں کا جی چاہا کہ چپ چاپ پچھواڑے بیوہ سہیلی کے گھر چلی جائے۔ مگر بیٹے کے حکم کو کیسے ٹال سکتی تھی۔ چپ چاپ کرسی پر سے ٹانگیں لٹکائے وہیں بیٹھی رہی۔

ایک کامیاب پارٹی وہ ہے جس میں ڈرنک کامیابی سے چل جائے شیام ناتھ کی پارٹی کامیابی کی بلندیاں چومنے لگی۔ بات چیت اسی رو میں بہہ رہی تھی، جس رو میں گلاس بھرے جا رہے تھے۔ کہیں کوئی رکاوٹ نہیں تھی۔ کوئی الجھن نہ تھی صاحب کو وسکی پسند آئی تھی۔ میم صاحب کو پردے پسند آئے تھے۔ صوفہ کور کا ڈیزائن پسند آیا تھا۔ کمرے کی سجاوٹ پسند آئی تھی۔ اس سے بڑھ کر کیا چاہیے؟ صاحب تو ڈرنک کے دوسرے دور میں ہی چٹکلے اور کہانیاں کہنے لگ گئے تھے۔ دفتر میں جتنا رعب رکھتے تھے یہاں پر اتنے ہی دوست پرور ہو رہے تھے اور ان کی میڈم، کالا گون پہنے گلے میں سفید موتیوں کا ہار سینٹ اور پاؤڈر کی مہک سے بھرپور، کمرے میں بیٹھی سبھی دیسی عورتوں کی توجہ اور تعریف کا مرکز بنی ہوئی تھی۔ بات بات پر ہنستی، بات بات پر سر ہلاتی۔ اور شام ناتھ کی بیگم سے تو ایسے باتیں کر رہی تھیں، جیسے ان کی پرانی سہیلی ہوں۔ اور اسی رو میں پیتے پلاتے ساڑھے دس بج گئے۔ وقت گزرتا ہوا معلوم ہی نہ ہوا۔ آخر سب لوگ اپنے اپنے گلاسوں میں سے آخری گھونٹ پی کر کھانا کھانے کے لیے اٹھے اور بیٹھک سے باہر نکلے۔ آگے آگے شام ناتھ راستہ دکھاتے ہوئے، پیچھے چیف اور دوسرے مہمان۔

برآمدے میں پہونچتے ہی شام ناتھ اچانک ٹھٹھک گئے۔ جو منظر انھوں نے دیکھا، اس سے ان کی ٹانگیں لڑکھڑا گئیں اور پل بھر میں سارا نشہ ہرن ہونے لگا۔ برآمدے میں عین کوٹھری کے باہر ماں اپنی کرسی پر جیوں کی تیوں بیٹھی تھیں، مگر دونوں پاؤں کرسی کی سیٹ پر رکھے ہوئے اور سر دائیں سے بائیں، اور بائیں سے دائیں جھول رہا تھا اور منہ سے لگاتار خراٹوں کی آوازیں آ رہی تھیں۔ جب سر کچھ دیر کے لیے ٹیڑھا ہو کر ایک طرف کو تھم جاتا تو خراٹے اور بھی گہرے ہو جاتے اور پھر جب جھٹکے سے نیند ٹوٹتی تو سر پھر دائیں سے بائیں جھولنے لگتا پلا سر سے کھسک گیا تھا اور ماں کے جھڑے ہوئے بال، آدھے گنجے سر پر ادھر ادھر بکھر رہے تھے۔

دیکھتے ہی شام ناتھ برہم ہو گئے۔ جی چاہا کہ ماں کو دھکا دے کر اٹھا دیں اور انھیں کوٹھری میں دھکیل دیں مگر ایسا کرنا ممکن نہ تھا، چیف اور باقی مہمان پاس کھڑے تھے۔ ماں کو دیکھتے ہی دیسی افسروں کی بیویاں ہنس دیں کہ اتنے میں چیف نے آہستہ سے کہا۔ "پوور ڈیئر"

ماں بڑبڑا کر اٹھ بیٹھیں۔ سامنے کھڑے

[illegible] لوگوں کو دیکھ کر ایسی گھبرائیں کہ کچھ کہتے نہ بنا۔ جھٹ [illegible] سے پلا سر پر کھسکتی ہوئی کھڑی ہو گئیں اور زمین کو دیکھنے لگیں۔ ان کے پاؤں لڑکھڑانے لگے اور ہاتھوں کی انگلیاں تھر تھر کانپنے لگیں۔

"ماں تم جا کر سو جاؤ، تم کیوں اتنی دیر تک جاگ رہی تھیں؟" اور کھسیائی نظروں سے شام ناتھ چیف کے منہ کی طرف دیکھنے لگے۔

چیف کے چہرے پر مسکراہٹ تھی۔ وہ وہیں کھڑے کھڑے بولے "نمستے"

ماں نے جھجکتے ہوئے، اپنے میں سمٹتے ہوئے دونوں ہاتھ جوڑے، مگر ایک ہاتھ دوپٹے کے اندر مالا کو پکڑے ہوئے تھا۔ دوسرا باہر، ٹھیک طرح سے نمستے بھی نہ کر پائیں۔ شام ناتھ اس پر بھی خفیف ہوئے۔

اتنے میں چیف نے اپنا دایاں ہاتھ ملانے کے لیے ماں کے آگے کر دیا۔ ماں اور بھی گھبرا اٹھیں۔

"ماں، ہاتھ ملاؤ"

لیکن ہاتھ کیسے ملائیں؟ دائیں ہاتھ میں تو مالا تھی۔ گھبراہٹ میں ماں نے بایاں ہاتھ ہی صاحب کے دائیں ہاتھ میں رکھ دیا۔ شام ناتھ دل ہی دل میں جل اٹھے۔ دیسی افسروں کی بیویاں کھِل کھِلا کر ہنس پڑیں۔

"یوں نہیں ماں! تم تو جانتی ہو، دایاں ہاتھ ملایا جاتا ہے۔ دایاں ہاتھ ملاؤ"

مگر تب تک چیف ماں کا بایاں ہاتھ ہی بار بار ہلا کر کہہ رہے تھے "ہاؤ ڈو یو ڈو؟"

"کہو، میں ٹھیک ہوں، خیریت سے ہوں"

ماں کچھ بڑبڑائی۔

"ماں کہتی ہے، میں ٹھیک ہوں۔" کہو ماں، ہاؤ ڈو یو ڈو؟"

ماں ہولے سے سمٹتے ہوئے بولیں۔ "ہو ڈو ڈو۔"

ایک بار پھر قہقہہ ہونے لگا۔ صاحب نے موقع سنبھال لیا تھا۔ لوگ ہنسنے لگے تھے۔ شام ناتھ کے دل کا افسوس بھی کچھ کم ہونے لگا تھا۔

صاحب اپنے ہاتھ میں ماں کا ہاتھ ابھی پکڑے ہوئے تھے اور ماں سکڑی جا رہی تھیں۔ صاحب کے منہ سے شراب کی بو آ رہی تھی۔

شام ناتھ انگریزی میں بولے "میری ماں گاؤں کی رہنے والی ہیں۔ عمر بھر گاؤں میں رہی ہیں۔ اس لیے آپ سے شرماتی ہیں"

صاحب اس پر خوش نظر آئے۔ بولے۔ "سچ مجھے گاؤں کے لوگ بہت پسند ہیں۔ تب تو تمھاری ماں گاؤں کے گیت اور ناچ بھی جانتی ہوں گی؟"

چیف خوشی سے سر ہلاتے ہوئے ماں کو ٹکٹکی باندھے دیکھنے لگے۔

"ماں، صاحب کہتے ہیں، کوئی گانا سناؤ۔ کوئی پرانا گیت۔ تمھیں تو کتنے ہی یاد ہوں گے"

ماں آہستہ سے بولیں: "میں کیا گاؤں گی بیٹا! میں نے کب گایا ہے؟"

"واہ ماں! مہمان کا کہا بھی کوئی ٹالتا ہے؟ صاحب نے اتنے شوق سے کہا ہے۔ نہیں گاؤ گی تو صاحب برا مانیں گے"

"میں کیا گاؤں، بیٹا، مجھے کیا آتا ہے؟"

"واہ! کوئی بڑھیا ٹپہ سنا دو۔ دو پتر اناراں دے...."

دیسی افسروں اور ان کی بیویوں نے اس تجویز پر تالیاں پیٹیں۔ ماں کبھی بیٹے کے چہرے کو دیکھتیں کبھی پاس کھڑی بہو کے چہرے پر۔ اتنے میں بیٹے نے سنجیدہ اور حکمیہ لہجہ میں کہا "ماں!"

اس کے بعد ہاں یا نہ کا سوال ہی نہ اٹھتا تھا۔ ماں بیٹھ گئیں اور کمزور اور کانپتی آواز میں ایک پرانا شادی کا گیت گانے لگیں۔

ہریانی مائیں ہریانی بہنیں
ہریاتیں بھاگی بھریا ہے

دیسی عورتیں کھل کھلا کر ہنس اٹھیں۔ یہ مصرعے گا کر ماں چپ ہو گئیں۔ برآمدہ تالیوں سے گونج اٹھا۔ صاحب تالیاں پیٹنا بند ہی نہ کرتے تھے۔ شام ناتھ کی جھینپ خوشی اور فخر میں بدل گئی تھی۔ ماں نے پارٹی میں نیا رنگ بھر دیا تھا۔

تالیاں تھمنے پر صاحب بولے۔ "پنجاب کے گاؤں کی دستکاری کیا ہے؟"

شام ناتھ خوشی میں جھوم رہے۔ بولے "او جی، بہت کچھ، صاحب! میں آپ کو ایک سیٹ ان چیزوں کا تحفہ میں پیش کروں گا۔ آپ انھیں دیکھ کر خوش ہوں گے۔"

مگر صاحب نے سر ہلا کر انگریزی میں پھر پوچھا "نہیں، میں دوکانوں کی چیز نہیں مانگتا۔ پنجابیوں کے گھروں میں کیا بنتا ہے، عورتیں خود کیا بناتی ہیں؟"

شام ناتھ کچھ سوچتے ہوئے "لڑکیاں گڑیاں بناتی ہیں، عورتیں پھول کاریاں بناتی ہیں۔"

"پھول کاری کیا؟"

شام ناتھ پھلکاری کا مطلب سمجھانے کی ناکام کوشش کرنے کے بعد ماں سے بولے "کیوں ماں، کوئی پرانی پھول کاری گھر میں ہے؟"

ماں چپ چاپ اندر گئیں اور اپنی پرانی پھول کاری اٹھا لائیں۔

صاحب بڑے اشتیاق سے پھول کاری دیکھنے لگے۔ پرانی پھول کاری تھی۔ جگہ جگہ سے اس کے تاگے ٹوٹ رہے تھے اور کپڑا پھٹنے لگا تھا۔ صاحب کی دلچسپی دیکھ کر شام ناتھ بولے۔ "یہ پھٹی ہوئی ہے، صاحب، میں آپ کو نئی بنوا دوں گا۔ ماں بنا دیں گی۔ کیوں؟ ماں، صاحب کو پھول کاری بہت پسند ہیں، انھیں ایسی ہی ایک پھول کاری بنا دوگی نا؟"

ماں چپ رہیں۔ پھر ڈرتے ڈرتے دھیرے سے بولیں۔ "اب میری نظر کہاں ہے، بیٹا۔ بوڑھی آنکھیں کیا دیکھیں گی؟"

مگر ماں کا جملہ بیچ میں کاٹتے ہوئے شام ناتھ صاحب سے بولے۔ "وہ ضرور بنا دیں گی۔ آپ اسے دیکھ کر خوش ہوں گے۔"

صاحب نے سر ہلایا۔ شکریہ ادا کیا اور آہستہ آہستہ جھومتے ہوئے کھانے کی میز کی طرف بڑھ گئے۔ باقی مہمان بھی ان کے پیچھے پیچھے ہو لیے۔

جب مہمان بیٹھ گئے اور ماں پر سے

آنکھیں ہٹ گئیں تو ماں آہستہ سے کرسی پر اٹھیں، سب سے نظریں بچاتی ہوئی اپنی کوٹھری میں چلی گئیں۔

مگر کوٹھری میں بیٹھنے کی دیر تھی کہ آنکھیں چھل چھل بہنے لگیں۔ وہ دوپٹے سے بار بار انھیں پونچھتیں، لیکن وہ بار بار امڈ آتے، جیسے برسوں کا باندھ توڑ کر امڈ آئے ہوں۔ ماں نے بہتیرا دل کو سمجھایا، ہاتھ جوڑے بھگوان کا نام لیا، بیٹے کو جیتے رہنے کی دعا کی، بار بار آنکھیں بند کیں، مگر آنسو برسات کے پانی کی طرح گویا تھمنے میں ہی نہ آتے تھے۔

آدھی رات کا وقت ہوگا۔ مہمان کھانا کھا کر ایک ایک کر کے جا چکے تھے۔ ماں دیوار سے ہٹ کر بیٹھیں، آنکھیں پھاڑے دیوار کو دیکھے جا رہی تھیں۔ گھر کے ماحول میں تناؤ ڈھیلا پڑ چکا تھا۔ محلے کی خاموشی شام ناتھ کے گھر پر بھی چھا چکی تھی۔ صرف رسوئی میں پلیٹوں کے کھنکنے کی آواز آ رہی تھی۔ تبھی اچانک ماں کی کوٹھری کا دروازہ زور سے کھٹکنے لگا۔

"ماں! دروازہ کھولو۔"

ماں کا دل بیٹھ گیا۔ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھیں۔ کیا مجھ سے پھر کوئی غلطی ہو گئی ہے۔ ماں کتنی دیر سے اپنے آپ کو کوس رہی تھیں کہ انھیں نیند آ گئی، کیوں وہ اونگھنے لگیں۔ کیا بیٹے نے ابھی تک معاف نہیں کیا۔ ماں اٹھیں۔ کانپتے ہاتھوں سے دروازہ کھول دیا۔

دروازہ کھلتے ہی شام ناتھ جھومتے ہوئے آگے بڑھ آئے اور ماں کو گود میں بھر لیا۔

"اوہ، امی! تم نے تو آج رنگ لا دیا!... صاحب تم سے اتنا خوش ہوا کہ کیا کہوں! اوہ امی! امی!!"

ماں کی آنکھوں میں پھر آنسو آ گئے۔ انھیں پونچھتے ہوئے آہستہ سے بولیں۔ "بیٹا، تم مجھے ہردوار بھیج دو۔ میں کب سے کہہ رہی ہوں۔"

شام ناتھ کا جھومنا یکایک بند ہو گیا اور ان کی پیشانی پر پھر تناؤ کے بل پڑنے لگے۔ ان کی باہیں ماں کے جسم پر سے ہٹ گئیں۔

"کیا کہا ماں؟ یہ کون سا راگ تم نے پھر چھیڑ دیا؟"

شام ناتھ کا غصہ بڑھنے لگا تھا۔ بولتے گئے "تم مجھے بدنام کرنا چاہتی ہو تاکہ دنیا کہے کہ بیٹا ماں کو اپنے پاس نہ رکھ سکا۔"

"نہیں بیٹا! اب تم اپنی بہو کے ساتھ جیسا جی چاہے رہو۔ میں نے اپنا کھا پہن لیا۔ اب یہاں کیا کروں گی؟ جو تھوڑے دن زندگانی کے باقی ہیں۔ بھگوان کا نام لوں گی۔ تم مجھے ہردوار بھیج دو!"

"تم چلی جاؤ گی، تو پھول کاری کون بنائے گا؟ صاحب سے تمھارے سامنے ہی پھول کاری دینے کا اقرار کیا ہے!"

"میری آنکھیں اب نہیں ہیں بیٹا، جو پھول کاری بنا سکوں۔ تم کہیں اور سے بنوا لو۔ بنی بنائی لے لو!"

"ماں، تم مجھے دھوکا دے کر یوں چلی جاؤ گی؟ میرا بنتا کام بگڑ جائے گا۔ جانتی

نہیں، صاحب خوش ہوں گے، تو مجھے ترقی ملے گی۔"

ماں چپ ہوگئیں۔ پھر بیٹے کے منہ کی طرف دیکھتے ہوئے بولیں۔

"کیا تیری ترقی ہوگی؟ کیا صاحب تیری ترقی کر دے گا؟ کیا اس نے کچھ کہا ہے؟"

"کہا نہیں، مگر دیکھتی نہیں ہو۔ کتنا خوش ہوگیا ہے۔ کہتا تھا۔ جب تیری ماں پھول کاری بنانا شروع کریں گی تو میں دیکھنے آؤں گا کہ کیسے بناتی ہیں۔ جو صاحب خوش ہوگیا، تو مجھے اس سے بڑی نوکری بھی مل سکتی ہے۔ میں بڑا افسر بھی بن سکتا ہوں۔"

ماں کے چہرے کا رنگ بدلنے لگا۔ دھیرے دھیرے ان کا جھریوں بھرا شتہ کھلنے لگا۔ آنکھ میں ہلکی ہلکی چمک آنے لگی۔

"تو تیری ترقی ہوگی، بیٹا؟"

"ترقی یوں ہی ہو جائے گی؟ صاحب کو خوش رکھوں گا، تو کچھ کرے گا۔ ورنہ اس کی خدمت کرنے والے اور تھوڑے ہیں؟"

"تو میں بنا دوں گی، بیٹا، جیسے بن پڑے گا، بنا دوں گی۔"

اور ماں دل ہی دل میں بیٹے کے شاندار مستقبل کی دعائیں کرنے لگیں اور مسٹر شام ناتھ "اب سو جاؤ، ماں"، کہتے ہوئے کچھ لڑکھڑاتے ہوئے اپنے کمرے کی طرف گھوم گئے۔

★

جناب جوہر نوری آروی

چھٹی

صبح ہوئی اور ہوا اُجالا
اُٹھ گیا لڑکا پڑھنے والا
پڑھتے پڑھتے وقت ہوا جب
کھا پی کر اسکول گیا تب
دن بھر ہم نے خوب پڑھا ہے
محنت سے سر گھوم رہا ہے
چھٹی اب ہے ہونے والی
خوب بجائیں گے ہم تالی
آؤ ہم سب مل کر کھیلیں
کھیلیں اور جی بھر کر کھیلیں
گیند سے جس دم دل بھر جائے
ہاکی کی تب باری آئے
اب سب سے جب فرصت پائیں
مل جل کر پھر سیر کو جائیں
چل پھر کر جب گھر پر آئیں
پڑھنے میں پھر سب لگ جائیں
لیکن ہے یہ بات سمجھ کی
کھیل کی عادت کب ہے اچھی
پڑھنا جب ہو خوب پڑھو تم
کھیل میں بھی آگے ہی رہو تم
وقت یہ جو کرنا ہے کر لو
پڑھو لکھو یا کھیلو کودو

جناب ندیم احمد

آؤ! ہم لوگ یہ کریں پیماں
علم جب سیکھ لیں تو دنیا میں
علم سے روشنی کریں پیدا
شہر آباد کر دیں صحرا میں

رشکِ جنت بنادیں دنیا کو
ایسی دنیا کہ جس میں جنگ نہ ہو
یوں بنائیں نئی طرح کا گھر
جس میں رہنا کسی کو ننگ نہ ہو

کوئی افسردہ دل نہ ہو ہرگز
زندگی سے نہ ہو کوئی بیزار
رہے آپس میں میل جول ایسا
روز بڑھتا رہے دلوں میں پیار

دل ہو آزاد، عقل ہو آزاد
مل کے باہم بڑھیں زمانے میں
ہر طرف آرزو کے پھول کھلیں
روشنی ہو ہر آشیانے میں

زندہ رہنے کا گر سکھائیں ہم
دکھ اگر ہو، تو بانٹ لیں دل سے
جس سے پیدا کوئی خرابی ہو
ایسی باتوں کو چھانٹ دیں دل سے

آؤ! ہم لوگ یہ کریں پیماں
علم جب سیکھ لیں تو دنیا میں
علم سے روشنی کریں پیدا
شہر آباد کر دیں صحرا میں

جناب ولی احمد تنہا (گلبرگوی)

کبیر داس - شاہ کبیر

ایک ہی نام

یہ کہنا دشوار ہے کہ حضرت کبیر کی پیدائش کب ہوئی کیونکہ ان کے زمانے کے متعلق اختلاف رائے پایا جاتا ہے۔ ان کے حقیقی والدین کون تھے کیا کرتے تھے یہ آج تک معلوم نہیں ہو سکا۔ کبیر بنارس کے رہنے والے تھے۔ مولانا نیاز فتحپوری مرحوم نے حضرت کبیر کے متعلق لکھا ہے کہ وہ ایک مسلمان پارچہ باف کے متبنیٰ (گود لیا ہوا بچہ) یا فرزند (لیا ہوا بچہ) تھے۔ بعد میں وہ راما نند دشنوی کے مرید ہو گئے۔ اس کا علم بالکل نہیں کہ ان کے والدین کون تھے لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کے والدین کا بہت کم سنی میں انتقال ہو گیا ہوگا اور مسلمان پارچہ باف نے جو غالباً پڑوسی رہا ہوگا اور خود صاحب اولاد نہ ہوگا، انہیں متبنیٰ کر لیا ہوگا۔

چونکہ اس دور میں تعلیم عام نہیں تھی، پیشہ ور لوگ اپنے بچوں کو تعلیم نہیں دلاتے تھے اس لیے کبیر بھی تعلیم حاصل نہ کر سکے۔ انھوں نے پیشہ پارچہ بافی اختیار کر لیا۔ کبیر بڑے کشادہ دل اور وسیع الاخلاق انسان تھے۔

ہندو مذہب کے لوگ انھیں ہندو مانتے تھے اور مسلمان انھیں مسلم سمجھتے تھے۔ حضرت کبیر ہندو مذہب، اسلام اور دیگر مذاہب کی بھی قدر کرتے تھے وہ اخلاق کی بلندی اور روحانیت کو اصل مذہب قرار دیتے تھے وہ انسانیت کا پرچار کرتے تھے۔ حضرت کبیر بڑے آزاد خیال صوفی (درویش) تھے۔ وہ قرآن اور وید دونوں کا احترام کرتے تھے وہ کسی خاص مذہب کے پابند نہیں تھے ان کے اطراف ہمیشہ مختلف مذاہب کے لوگ جمع رہتے تھے۔ کبیر چونکہ پڑھے لکھے نہیں تھے اس لیے بہت ہی سادہ زبان میں لوگوں کو درسِ انسانیت دیتے تھے۔ انداز بیان اور زبان سادہ ہونے کی وجہ سے عوام ان سے بہت ہی متاثر ہوئے۔ کبیر کے ماننے والوں کو "کبیر پنتھی" کہتے ہیں۔ کبیر کے دوہے

بہت مشہور ہیں:-

اُن کے ماننے والوں میں ہندو اور مسلمان دونوں مذہب کے لوگ تھے ہندو انھیں کبیرداس اور مسلمان شاہ کبیر کہتے ہیں۔ انہیں ظاہر داری بالکل پسند نہ تھی انھوں نے معرفت الٰہی پر خوب نظمیں لکھی ہیں۔ وہ اسلام سے زیادہ متاثر تھے۔ انھوں نے ایک نظم میں حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعریف کس انداز میں کی ہے ملاحظہ فرمایئے۔

عدد نکالو ہر چیز کا چوگن کر لو وائے
دو لگا کے پچگن کر لو بیس کا بھاگ لگائے
باقی بچے کے نوگن کر لو دو اس میں اور ملائے
کہت کبیر سنو سادھو بھیا نام محمدؐ آئے

یعنی کسی بھی شے (لفظ) کے حروف کے اعداد جمع کیجیے پھر اُس عدد کو چار سے ضرب دیجیے ضرب دینے پر حاصل ہونے والے عدد میں دو ملا لیجیے پھر اُس کے بعد پانچ سے ضرب دینے پر حاصل ہونے والے عدد کو بیس سے تقسیم کیجیے تقسیم کرنے کے بعد باقی بچنے والے عدد کو ۹ سے ضرب دیجیے نو سے ضرب دینے پر حاصل ہونے والے عدد میں پھر دو ملا دیجیے پھر کہت کبیر دیکھیے آخر میں نام محمدؐ (حروف کے اعداد کا مجموعہ ۹۲) آئیگا

ا ب ج د ہ و ز ح ط ی
۱ ۲ ۳ ۴ ۵ ۶ ۷ ۸ ۹ ۱۰

ک ل م ن س ع ف ص
۲۰ ۳۰ ۴۰ ۵۰ ۶۰ ۷۰ ۸۰ ۹۰

ق ر ش ت ث خ ذ ض
۱۰۰ ۲۰۰ ۳۰۰ ۴۰۰ ۵۰۰ ۶۰۰ ۷۰۰ ۸۰۰

ظ غ
۹۰۰ ۱۰۰۰

۱۔ مثال کے طور پر ایک لفظ "قلم" لیجیے اور اس لفظ کے حروف کے اعداد جمع کیجیے

ق ل م
۱۰۰ ۳۰ ۴۰ } ۱۷۰

جملہ ۱۷۰ اب اس عدد کو چار سے ضرب دیجیے

× ۴
۶۸۰ اس میں دو جمع کیجیے

+ ۲
۶۸۲ اس عدد کو ۵ سے ضرب دیجیے

× ۵
۱۷۰) ۳۴۱۰ (۲۰ اس عدد کو ۲۰ سے تقسیم کیجیے

۲۰
۱۴۱
۱۴۰
۱۰ باقی اس عدد کو ۹ سے ضرب دیجیے

× ۹
۹۰ اس میں دو جمع کیجیے

۲
۹۲ یہ عدد "محمدؐ" کے جملہ حروف کے اعداد کا مجموعہ ہے۔

اب حضرت محمدؐ کے حروف کے اعداد جمع کر کے دیکھیے۔

م ح م د
۴۰ ۸ ۴۰ ۴ } ۹۲

کبیر چونکہ صوفی منش انسان تھے اس لیے اُن کے کلام میں عارفانہ رنگ جھلکتا ہے۔

کہتے ہیں :- ۱۔ رہنا نہیں دیس بیگانا ہے
یہ سنسار[1] کاگد[1] کی پڑیا ہے
بوند پڑے گھل جاتا ہے

[1] دنیا کاغذ

باقی صفحہ

جناب ارمغان ساحل سہسرامی

حاسد کی شکست

وہ ہسپتال کی آہنی چارپائی پر بےہوش پڑا تھا۔

اس کے جسم کے کافی حصے زخمی ہو چکے تھے۔ پاس ہی خالد کھڑا تھا۔ اور اس کی آنکھوں میں آنسو تیر رہے تھے۔ وہاں ڈاکٹر اور چند لوگ بھی موجود تھے، اسے ہوش میں لانے کی پوری کوشش کی جا رہی تھی اس کے جسم میں طاقت لانے کے لیے گلوکوز کا پانی چڑھایا جا رہا تھا۔ بوتل کا آدھے سے زیادہ پانی ختم ہو چکا تھا۔ بوتل اسٹینڈ کے سہارے اُلٹی لٹکی ہوئی تھی، اور ربر کے ٹیوب کے ذریعہ اس بوتل سے پانی نکل کر سوئی سے ہوتا ہوا اس کے جسم میں داخل ہو رہا تھا۔ جب بوتل کا پانی ختم ہو گیا۔ ڈاکٹر نے اُس کے ہاتھ سے سوئی فوراً نکال لی اور اس کے چند ہی لمحہ بعد اس کو ہوش آگیا، اور اس نے آہستہ سے کروٹ بدل کر آنکھیں کھول دیں۔ ڈاکٹر نے اسے تسلی دی۔ وہ آرام کرنے کو چلا گیا کچھ دیر بعد وہاں سے باقی لوگ بھی چلے گئے۔ خالد اب تک اس کے پاس کھڑا تھا۔ اور بڑے غور سے اسے دیکھ رہا تھا۔ اس نے اشارے سے خالد کو بیٹھنے کے لیے کہا۔ اور وہ آہستہ سے اس کی چارپائی پر بیٹھ گیا۔ مگر اب تک وہ بڑے غور سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اسے غور سے اپنی جانب دیکھتے ہوئے پاکر...... وہ کچھ گھبرایا اور بڑے نرم لہجے میں بولا — "کیوں بھئی خالد مجھے اتنا غور سے کیوں دیکھ رہے ہو؟

"نہیں کچھ نہیں یونہی"

"یونہی — یونہی کیا؟ کچھ تو ہے جس کی پردہ داری ہے"

"دراصل میں تمہاری طرف دیکھتا ہوا یہ سوچ رہا ہوں کہ وہ چہرا جو قدرت کا حسین شاہکار تھا، آج کس بری طرح حادثہ کا شکار ہوا ہے"

خالد! اسے حادثہ نہیں سزا کہو — سزا!!

"سزا؟" اس نے حیرت انگیز لہجہ میں کہا!

"ہاں میرے دوست! میں کیے کی سزا بھگت رہا ہوں"

"تم نے کیا کیا تھا"

"قدرت کا خوب مذاق اڑایا تھا۔"

"مذاق ؟ — میں کچھ نہیں سمجھا۔ کیا مطلب؟"

"یہ ایک لمبی داستان ہے۔"

"کیا تم مجھے نہیں سنا سکتے ؟"

"سنا سکتا ہوں!"

"تو پھر سناؤ!"

"اچھا تو سنو!

جب میں نویں درجہ میں اوّل آیا۔ تو میں نے سوچ لیا تھا کہ میں سب سے بڑا ہوں مجھے سارے لڑکوں میں برتری اور فوقیت بھی حاصل تھی۔ کیوں کہ اب میں اپنے کلاس کا مانیٹر بھی بن چکا تھا۔ میں لڑکوں پر خوب دھاک جماتا اور سب میں اپنے آپ کو اچھا تصوّر کرنے لگا۔ کیوں کہ اس وقت میرے مقابل کوئی لڑکا نہ تھا۔

لیکن ہمیشہ یوں نہیں ہوتا۔ ایک اور لڑکے کا داخلہ ہوا۔ جس کا نام راشد تھا۔ نام تو ضرور خوبصورت تھا مگر وہ اتنا بدصورت تھا کہ میں اس پر اپنی نظر بھی نہیں ڈالنا چاہتا تھا۔ اس کے موٹے اور بھدّے ہونٹ اور باہر نکلے ہوئے دانت مجھے قطعی نہیں بھاتے تھے۔ میں اسے نیچ سمجھتا اور اسے بھوت ہی تصوّر کرتا تھا۔ اور اس کے بدصورت ہونے کا خوب مذاق اڑاتا تھا۔ مگر وہ پڑھنے میں اس قدر تیز تھا کہ چند ہی دن بعد وہ میرے مقابل کھڑا ہوگیا۔ اور کچھ ہی دنوں کے بعد وہ ماسٹروں کی نظروں میں سما گیا۔ قریب قریب سب ماسٹر اس کی عقلمندی پر خوش تھے۔ اور ماسٹروں کے سامنے اس بدصورت لڑکے کے آگے اب میری کوئی عزّت نہ تھی۔

"مگر یہ مجھ سے کب دیکھا جاتا۔ میں دل میں یہی سوچا کہ میرا مقابلہ یہ بھوت کرے! خوبصورتی میں بھی میں کسی سے کم نہیں ہوں۔ میں اسے ہرگز نہیں دیکھنا چاہتا تھا دل میں یہی سوچا کرتا تھا کہ یہ میری نظروں سے دور ہو جاتا اور پھر اپنے کلاس میں میرا ہی راج ہوتا۔"

اس کا گلا خشک ہوگیا اور چند لمحے کے لیے خاموش ہوگیا۔ اس نے اشارے سے خالد سے پانی مانگا۔ خالد نے ہاتھ بڑھا کر میز پر سے پانی بھرا گلاس اٹھایا اور اسے اپنے ہاتھ کا سہارا دے کر تھوڑا اٹھایا، اور اس کے ہاتھ میں وہ گلاس دے دیا۔ اس نے دو چار گھونٹ پانی کے حلق سے اتارے۔ پھر خالد نے اس کے ہاتھ سے گلاس لے کر آہستہ سے اسے لٹا دیا چند لمحے تک آرام کرنے کے بعد خالد نے پوچھا

"اس کے آگے کیا ہوا؟"

ہاں! تو پھر اس کے لیے میرے دل میں نفرت اور دشمنی کا جذبہ بڑی تیزی کے ساتھ ابھرنے لگا کہ یہ عذابِ جاں میرے مقابل کہاں سے آگیا۔ کبھی کبھی تو اسے دیکھ کر بخار چڑھ جاتا تھا۔ کہ یہ بھوت مرتا بھی نہیں ہے اور میں دانت پیس کر رہ جاتا تھا۔

نتیجہ تو اس وقت معلوم ہوا کہ ششماہی امتحان میں وہ فرسٹ اور میں سکنڈ آیا یہ بات تو میرے لیے بڑے شرم کی تھی۔ میں یہ ہرگز نہیں چاہتا کہ کوئی بھی اس کی عزّت کرے اور میں اسے بہت

تیکھی تیکھی باتیں بول جاتا تھا۔ مگر وہ میری کسی
بھی بات کا جواب نہ دیتا۔ نہ ایک لفظ ہی بولتا۔
برابر وہ صبر ہی کرکے رہ جاتا تھا۔ میں برابر اس
کے خلاف زہر اگلتا رہا۔ اسی طرح دن گزرتے
گئے اور دیکھتے دیکھتے سالانہ امتحان کا وقت
بھی آ ہی گیا۔

"میرے اسکول کی عمارت پختہ تھی اور
دو منزلہ۔ جب سیٹ چسپاں کی گئی تو میری سیٹ
اوپر والے کمرے میں تھی اور کل ہی سے امتحان
شروع تھا۔ جب چھ مضامین کے امتحان گزر
گئے تو میری پوری امید بندھ گئی کہ اب میرے سوا
کون فرسٹ آئے گا۔ دیکھا جائے گا کہ بھوت
میرا مقابلہ کیسے کرتا ہے۔ کیونکہ میرا پیپر امید
سے بھی زیادہ اچھا گذرا تھا۔ اور جب ساتواں
پرچہ بھی بہت اچھا گذرا تو میں کافی خوش ہوا۔
میں خوشی میں کھویا ہوا مستانہ چال سے سیڑھی
کی راہ سے نیچے اتر رہا تھا۔ ابھی مشکل سے
دو سیڑھی اترا تھا کہ اچانک اسی وقت میرا
پاؤں پھسل گیا۔ پھر کیا ہوا۔ اس کا مجھے کوئی
علم نہ ہوا۔ خدا واقعی بہت بڑا انصاف والا
ہے۔ میری بڑی بات اس سے برداشت نہ ہو سکی۔
میں نے واقعی اس لڑکے کے ساتھ بہت بڑا
جرم کیا تھا۔ جس کی سزا آج میں ہسپتال کی آہنی
چارپائی پر پڑا بھگت رہا ہوں۔"

جناب محمد منور مسعودی

بے موقع بات

ایک بار ایک لومڑی کہیں جا رہی تھی کہ راستے
میں اس نے ایک مرغ کو دیکھا چگ رہا تھا، لومڑی
مرغ کے پاس گئی اسے سلام کیا اور چاپلوسی کے انداز
میں کہنے لگی تمہارا باپ (مرغ) بہت ہی خوش آواز
تھا۔ میں اکثر یہاں سے گزرا کرتی، اس کی میٹھی
آواز سنتی تھی جس سے میرا دل خوش ہو جاتا تھا۔

مرغ بولا: میں بھی آواز میں اپنے باپ سے
کم نہیں۔ یہ کہتے ہی اپنی آنکھیں بند کرلیں پر پھڑ
پھڑائے اور اذان دینا شروع کر دی۔ لومڑی اس موقع
کے انتظار میں تھی، ایکدم مرغ پر جھپٹ پڑی اور اسے پکڑ لیا
اتنے میں گاؤں کے کتوں کو پتا چلا اور لومڑی کا پیچھا کرنے لگے کتے
کو آتے ہوئے دیکھ کر مرغ کو ایک تدبیر سوجھی۔ اس نے لومڑی سے کہا۔
"اگر تم کتوں کے چنگل سے بچنا چاہتی ہو تو چلاؤ اور کہو کہ یہ
مرغ تمہارے گاؤں کا نہیں بلکہ کسی دوسرے گاؤں کا ہے۔"
لومڑی مرغ کے فریب میں آگئی اور جو نہی کچھ کہنے کے لیے
اپنا منہ کھولا مرغ اس کے منہ سے نکل بھاگا۔ لومڑی
مرغ کی طرف دیکھتی رہ گئی اور کہنے لگی: "لعنت
ہو ایسے منہ پر جو بے موقع کھلتا ہے۔"

مرغ اس کی بات سن رہا تھا۔ ایک دم بولا۔
"لعنت ہو ان آنکھوں پر جو بے موقع بند
ہو جائیں۔"

(فارسی سے ترجمہ)

میرے پیارے وطن میرے پیارے وطن

جناب محمد ایوب واقف، ایم اے

بدھ کے گیان کی جوت تجھ کو ملی تیرے آنگن میں چشتی کی محفل سجی
تلسی و سور نے دی تجھے طرفگی بابا نانک نے بخشی تجھے آگہی
طور تیرا ادب پیارا تیرا چلن
میرے پیارے وطن میرے پیارے وطن

ہیر کا پیار تیری امر شان ہے بالپن کرشن جی کا تیری آن ہے
تیری سیتا پہ دھرتی کا ابھیمان ہے تیرے در کا ہمالہ نگہبان ہے
شان تیری اجنتا الورا کا فن
میرے پیارے وطن میرے پیارے وطن

خوشنمائی میں مشہور ہیں تیرے محل[1] کتنا اکسیر ہے تیری گنگا کا جل[3]
تیرے باغات میں رنگا رنگ پھول پھل فخر ہندوستاں تیرے ارجن کا بل
جو ہر و گیانندھی ہیں سبھی تیرے للن[4]
میرے پیارے وطن میرے پیارے وطن

جھومتی گاتی فصلوں کی رعنائیاں حسن آمیز کشمیر کی وادیاں
شہر سے دور گاؤں کی پگڈنڈیاں کوہساروں کی پرکیف انگڑائیاں
تیرے ماتھے پہ گنگ و جمن کی پھبن
میرے پیارے وطن میرے پیارے وطن

تیری شام اودھ حسن کا اک جہاں تیری صبح بنارس سا منظر کہاں
تاج تیرا ہے اس پریم کا اک نشاں تیرے گھاٹوں کناروں کا رنگین سماں
کتنے البیلے ہیں تیرے دشت و دمن
میرے پیارے وطن میرے پیارے وطن

منہ اندھیرے موذن نے دی وہ اذاں بج اٹھیں مندروں کی وہ سب گھنٹیاں
وہ شروع ہو گیا پادری کا بیاں وہ بندھا خوب آتشکدے کا سماں
تجھ پہ رحمت خدا کی ہو سایہ فگن
میرے پیارے وطن میرے پیارے وطن

[1] محل [2] نسخہ [3] پانی [4] اولاد

جناب محمد امین - ایم - اے

بڑے لڑکوں کے لیے

ترقی کرنے اور پیداوار بڑھانے کی انتہا

تاریک اور خوش آئند مستقبل کی پیشین گوئیاں کرنے والوں میں بحث و تکرار

کیا تم نے ایڈورڈ گولڈ اسمتھ کا نام سُنا ہے؟ وہ ایک انگریز ہیں۔ اور انگلستان میں سائنس کی ایک میگزین کے اڈیٹر ہیں۔ انھوں نے تحقیق اور چھان بین کے بعد اپنا ایک خاص نظریہ قائم کیا ہے۔ کیا تم کو ان کے خیالات جاننے سے دلچسپی ہے؟ لیکن ایک بات یاد رکھو کہ اگر انھیں اپنا نقطۂ نظر پیش کرنے کا موقعہ دیا جائے تو ہو سکتا ہے کہ ان کی باتیں سُن کر تم خوف محسوس کرو بلکہ تمھارے رونگٹے بھی کھڑے ہو جائیں تو تعجب نہیں۔ وہ صاف صاف یہ کہتے ہیں کہ مغربی دنیا کا صنعتی نظام ترقی کی انتہا کو پہنچ چکا ہے اور اب وہ دن دور نہیں کہ اس کے وارے نیارے ہو جائیں گے۔ آثار صاف دکھائی دے رہے ہیں کہ اپنی بلندی پر پہنچنے کے بعد صنعتی نظام میں تنزل پیدا ہو رہا ہے اور جب اس کی تباہی اور زوال کا سلسلہ شروع ہوگا تو اس کے ساتھ ساتھ وبائیں بھی پھیلیں گی اور زبردست قسم کے قحط اور خشک سالی بھی ان کو آگھیرے گی۔ یاد رکھو کہ یہ مصیبتیں اور بلائیں ایسی ویسی نہیں ہوں گی کہ وہ رُک جائیں گی بلکہ جب یہ نازل ہوں گی تو ایسا محسوس ہوگا کہ خدا کا قہر بن کر نازل ہوگئی ہیں۔

گولڈ اسمتھ ایک زبردست قسم کے ماہر فن ہیں۔ ان کو یقین ہے اور پورا پورا اعتقاد کہ موجودہ نظام کی ترقی کی جو رفتار ہے۔ اسے قائم رکھنا بہت مشکل ہے۔ سائنس اور ٹکنالوجی کی جو لوگ اندھا دھن تقلید کرتے ہیں انھوں نے معاملے کو اور بگاڑ رکھا ہے۔ وہ اب بھی یہ سمجھتے ہیں کہ ہم دنیا کے ہر مسئلہ کو سائنس اور ٹکنالوجی کی مدد سے حل کر سکتے ہیں، حالانکہ عملی طور سے تجربے کی روشنی میں اگر دیکھا جائے تو ان کے خیالات صحیح نہیں ہیں۔ جو سچی بات ہے، وہ یہ کہ صنعت و حرفت کا جو نظام ہے وہ ایسا فرسودہ ہو چکا ہے کہ اُسے کسی صورت سے بچایا ہی نہیں جا سکتا۔

جہاں تک کہ فضا کو پراگندہ کرنے کا سوال ہے گولڈ اسمتھ صاحب یہ فرماتے ہیں کہ سائنس دانوں کا دعویٰ ہے کہ وہ اس مسئلہ کو کامیابی

ساتھ حل کر سکتے ہیں لیکن یہ سراسر ان کی بھول ہے۔ فضا کی پراگندگی کو ختم کرنا یا اس کی کثافت کو دور کرنا ناممکن سا ہے۔ البتہ زیادہ سے زیادہ یہی کہا جا سکتا ہے کہ پراگندہ ہونے والی ہوا کو ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کر دیا جائے۔ یعنی جن چمنیوں سے دھواں نکلتا ہے ان کو اور اونچا کر دیا جائے تاکہ دھوئیں کے ساتھ کی گندھک بجائے اس کے کہ انگلستان پر گرے اسکنڈی نیویا کے ملکوں (ناروے، سویڈن اور ڈنمارک وغیرہ) پر اڑ کر پہنچ جائے۔

سوال یہ ہے کہ صنعتی ممالک میں دھوئیں کے ساتھ نکلنے والی کتنی گیسوں کو آپ کنٹرول کریں گے۔ بہرحال انگلستان اس سلسلے میں جدوجہد کر رہا ہے۔ وہ فضا کو صاف ستھری رکھنے کے متعلق ایک بل پاس کر رہا ہے۔ خیال یہ ہے کہ اس بل کے بعد لندن میں دھواں کم ہوگا اور آس پاس کے دیہاتوں میں زیادہ ہوگا اگرچہ لندن میں جو بارش ہوتی وہ بہت زہریلی ہوتی ہے یا اس میں ہزاروں گنا تیزاب ہوتا ہے۔

ماحول یا فضا کو پراگندہ کرنے کے خطرے

پہلے دھواں اتنا مضر نہیں تھا بلکہ یہ گیسوں کو روکتا تھا۔ خصوصاً نائٹروجن اکسائڈ اور گندھک کو جو زیادہ تر کارخانوں کی چمنیوں سے نکلتی تھیں اور ان کو زہریلی گیس بننے نہیں دیتا تھا۔ اب کارخانوں کی تعداد بہت بڑھ جانے کی وجہ سے چمنیوں کی تعداد ان گنت ہو گئی ہے۔ پھر دھواں اب خشک قسم کا دھواں نہیں رہا بلکہ اس کے اندر بہت ساری گیسیں ملی رہتی ہیں۔ چمنیوں کی تعداد بڑھنے کے ساتھ ساتھ موٹریں اور کاریں بھی بڑھتی جا رہی ہیں۔ یہ بھی فضا کو پراگندہ کرتی ہیں اور ان کا دھواں اور گیس نقصان دہ ہوتا ہے۔ ٹرک، موٹروں اور کاروں سے زہریلی گیسیں زیادہ نکلتی ہیں جو عموماً فصلوں کے لیے مضر ہوتی ہیں اور پھر ظاہر ہے کہ انسانوں کے لیے بھی یقیناً مضر ہوں گی۔

خود ہمارے دارالسلطنت دہلی میں فضا کے متعلق کیا صورت حال ہے۔ کیوں نہ سرسری طور سے اس کا جائزہ لیا جائے۔ کیا تم کو معلوم ہے کہ دہلی میں ایک پاور ہاؤس ہے جس کا نام اندرپرست پاور ہاؤس ہے۔ اتفاق سے یہ شہر کے بیچوں بیچ واقع ہے۔ اس پاور ہاؤس میں بجلی بنانے کے لیے روزانہ ۲۴۰۰ ٹن کوئلہ جلایا جاتا ہے۔ اس کی وجہ سے پاور ہاؤس کی چمنیوں میں سے دھواں نکلتا ہے اور اس دھوئیں کے ساتھ ساتھ گندھک اور دوسری گیسیں بہت بھاری مقدار میں خارج ہوتی رہتی ہیں۔ یہ فضا میں بکھرتی رہتی ہیں اور اسے پراگندہ اور آلودہ کرتی ہیں۔ جو شہری پاور ہاؤس سے دو کلومیٹر کے اندر اندر رہتے ہیں ان کے اوپر اور ان کے گھروں کی چھتوں پر کوئلے اور کوئلے کی راکھوں کی ایک پتلی سی تہہ بیٹھ جاتی ہے۔ خارج ہونے والی گیسیں بھی خطرناک ہوتی ہیں خصوصاً مہلک امراض کے لیے اور پھیپھڑوں کے لیے پاور ہاؤس کا دھواں سانس کے ذریعے اگر کوئی اندر کھینچ لے تو اس کے اندر بھری ہوئی گندھک پھیپھڑے کو بے انتہا نقصان پہنچاتی ہے۔

دہلی میں کار، ٹرک، بس اور اسکوٹر وغیرہ کی تعداد بھی بڑھتی جارہی ہے۔ ان کا جو سلنڈر سے اکزھاسٹ فیوم یعنی دھواں نکلتا ہے۔ وہ ہوا میں گندگی پھیلاتا ہے۔ دھوئیں کے ساتھ ساتھ جو گیس خارج ہوتی ہیں وہ پودوں کے لیے تو مضر ہوتی ہی ہیں۔ ہماری آنکھوں کے لیے بڑی خطرناک ہوتی ہیں۔ راستے میں چلتے چلتے کبھی کبھی آنکھ میں آنسو آجاتے ہیں اور انسان بڑی گھبراہٹ محسوس کرتا ہے۔ یہ کیا ہے اور یہ کس چیز کی علامت ہے؟ یہی کہ ہماری فضا مکدر ہورہی ہے اور تھوڑے بہت اس کے اثرات ظاہر ہونے لگے ہیں۔ صرف یہی نہیں بلکہ ہوا میں سے موٹر کاروں کا دھواں اور اس کی گیس آکسیجن کو ختم کردیتی ہیں۔ اس طرح نازک پودے سوکھ جاتے ہیں اور کاربن ڈائی اکسائڈ استعمال کرنے کی ان کی جو صلاحیت ہے پودے جس کی وجہ سے بڑھتے ہیں۔ پھلتے پھولتے ہیں وہ ختم ہوجاتی ہے۔ سمجھو کر فوٹو سن تھیسس کا کام نہیں کرپاتے۔

دہلی کی فضا کو اگر آلودگی سے بچانا ہے تو پاور ہاؤس اور کارخانوں کی جو چمنیاں ہیں ان کے اندر سے دھواں صاف کرنے کا مکمل انتظام ہونا چاہیے۔ کاروں اور دوسری موٹروں کو بھی چیک کرنے کی ضرورت ہے تاکہ ان کا دھواں تنگ نہ کرے اور لائسنس دینے کے وقت اس بات کا خیال رکھا جائے کہ جن گاڑیوں سے دھواں بہت زیادہ خارج ہوتا ہے ان کو دوبارہ لائسنس نہ دیا جائے۔

بہرحال اس خبر سے ہمت بڑھتی ہے کہ بین الاقوامی ادارہ یو۔این۔او نے دنیا کے ماحول کو پراگندہ ہونے سے بچانے کے لیے پروگرام بنایا ہے۔ اس پروگرام کا تیسرا جلسہ ۵ جون ۱۹۸۰ء کو نیروبی میں منعقد ہوا تھا۔ اس موقع پر اس کے ڈائرکٹر مارس اسٹرانگ نے کہا کہ دنیا میں ۵۵ ملک ایسے ہیں جو اپنے ماحول کو صاف ستھرا رکھنے کے لیے کوئی نہ کوئی کارروائی کررہے ہیں۔ اپنی رپورٹ میں مسٹر اسٹرانگ نے یہ بھی فرمایا کہ ان دنوں دنیا کی کل آبادی ۴۰۱ ارب ۴۰ کروڑ سے زیادہ ہے اور یہ اس صدی کے آخیر تک بڑھ کر ۶ ارب ۵۰ کروڑ تک پہنچ جائے گی۔ اگر ابھی سے دنیا کے ماحول اور اس کی فضا کو پراگندگی سے نہ بچایا گیا تو آنے والی نسلوں کے لیے خوشگوار زندگی گزارنا تو درکنار زندہ رہنا مشکل ہوجائے گا۔ انھوں نے یہ فرمایا کہ چالیس سال کے اندر اندر آبادی دوگنا ہونے کے ساتھ ساتھ کارخانوں اور صنعتوں کی تعداد تین گنا بڑھ جائے گی۔ اس طرح دھواں، گیس اور زہریلے مادے زیادہ خارج ہوں گے اور آلودگی کا مسئلہ سنگین ہونے کا اندیشہ ہے ضرورت اس بات کی ہے کہ دنیا کے سارے ممالک باہمی تعاون سے کام کریں اور ایک دوسرے کے تجربے سے پورا پورا فائدہ اٹھانے کی کوشش کریں۔

★

جناب جمال الدین عمر بمبئی

لالچ کی سزا

چندا نگری میں کریم اور رحیم نامی دو کسان رہتے تھے۔ ان کے کھیت ایک دوسرے کے قریب تھے۔ اسی لیے دونوں میں گہری دوستی تھی۔

ایک سال بارش نہیں ہوئی۔ تمام کھیت سوکھ گئے اناج ملنا بند ہو گیا۔ رحیم نے سوچا بارش کے امکانات اب ختم ہو گئے ہیں۔ اس لیے اس نے کریم سے کہا کیوں نہ ہم ندی سے پانی لا کر کھیت کی سینچائی کریں۔ یہ تجویز کریم کو پسند آئی اور دونوں مل کر ندی سے پانی لا کر اپنے اپنے کھیتوں کی سینچائی کرنے لگے۔ اس طرح ان کے کھیت پھر سے ہرے ہو گئے اور فصل بڑھنا شروع ہوئی۔ چند ہی مہینوں میں فصل تیار ہو گئی۔ گاؤں میں قحط پڑا ہوا تھا۔ اس لیے انہیں چوری ہونے کا خطرہ بھی تھا۔ اس لیے دونوں نے فیصلہ کیا کہ کھیت میں ایک جھونپڑی ڈال لی جائے۔ اور ہر رات ہم میں سے ایک آدمی کھیت کی رکھوالی کرے، اس طرح کھیت کی رکھوالی شروع ہو گئی۔

کہتے ہیں جب مال و دولت نظروں کے سامنے ہوتی ہے تو انسان کے دل میں حرص بھی جنم لیتا ہے۔ اناج پہلے سے دگنی قیمت میں فروخت ہو رہا تھا۔ اس لیے اس کے دل میں بھی لالچ نے جنم لیا اس نے سوچا! "مجھے یہ سب اناج مل جائے تو میں گاؤں کا سب سے بڑا مالدار آدمی بن جاؤں گا"۔ یہ سوچتے سوچتے اس کے ذہن میں ایک ترکیب آئی کہ وہ رحیم کو کل رات جبکہ وہ کھیت کی رکھوالی کر رہا ہوگا آ کر قتل کر دے گا۔

دوسرے دن کریم، رحیم کو قتل کرنے کے لیے جس وقت گھر سے نکلا اسی وقت اس کا بیٹا ریاض جو کہ پڑوس کے گاؤں سے واپس آ رہا تھا جھونپڑی کے قریب پہنچا اور سوچنے لگا "آگے گھنا جنگل ہے اس لیے اسی کھیت میں سو جاؤں گا اور صبح گھر چلا جاؤں گا۔ یہ سوچ کر وہ جھونپڑی میں گیا۔ اتفاق دیکھیے کہ اسی دن رحیم کی طبیعت خراب ہو گئی اور وہ کھیت پر نہیں آیا ریاض نے جھونپڑی خالی دیکھ کر سوچا کسی خاص وجہ سے رحیم چچا نہیں آئے ہوں گے چنانچہ وہ بستر لگا کر سو گیا۔

باقی صفحہ ۴۴ پر

جناب نثار احمد انجم قاسمی

آپ کیا بننا چاہتے ہیں؟

بچو! کبھی تم نے سوچا ہے کہ ابھی تم مڈل کلاس میں ہو پھر ہائر سیکنڈری پاس کرو گے اور پھر رفتہ رفتہ ترقی کی منزلیں طے کرتے ہی چلے جاؤ گے آخر میں ایک دن اللہ تعالیٰ تمھیں ایسے بلند درجے پر پہنچا دے گا کہ تمھاری زندگی پھلے پھولے گی۔ ابھی جس طرح دوسروں کی آنکھوں کا نور اور دل کا سرور ہو اسی طرح آگے چل کر تمھیں قوم کے معمار اور رہبر بھی بننا ہے۔ اب جتنے آزاد نظر آتے ہو آگے چل کر اتنی ہی ذمہ داریاں ہوں گی۔ اب مستقبل کی باگ ڈور تمھارے ہی ہاتھوں میں ہے۔ تو کیا کبھی اپنے مستقبل کا فیصلہ بھی کیا ہے۔ "کہ تمھیں کیا بننا چاہیے" تاکہ تم سے ملک و قوم کو زیادہ سے زیادہ فائدہ پہنچے اور ملک و قوم کی خدمت کا شرف حاصل کر سکو کہ رہتی دنیا تک نیک نام چھوڑ جاؤ۔

آؤ تمھیں ایک سچا واقعہ سنائیں جس سے تمھیں اپنے مستقبل کے فیصلے میں مدد مل سکے گی۔

ایک دن ماسٹر صاحب پڑھانے کے موڈ میں نہیں تھے اور نہ ہی بچے پڑھنے کو تیار۔

اچانک ماسٹر صاحب نے سب بچوں کو کلاس میں متوجہ کرکے پوچھا۔ "اچھا بچو تم بڑے ہو کر کیا بننا چاہتے ہو۔" اور یہ ہدایت کر دی کہ ہر ایک جواب دینے میں آزاد ہے۔ جس کے دل میں جو کچھ ہو بلا جھجک کہہ دے۔

سب سے پہلے احمد نے بیان کرنا شروع کیا۔ جو سب سے چھوٹا تھا۔ "میں ریل کا ڈرائیور بننا چاہتا ہوں تاکہ سیر و تفریح مفت ہی کیا کروں"۔ عبدالرحمٰن نے جھٹ سے احمد کی بات کاٹ کر کہا۔ "ریل ڈرائیور بہت گرمی اور تھکن میں رہتا ہے"۔

"میرا خیال یہ ہے کہ جہاز کا کپتان بنوں تاکہ قدرتی مناظر سے لطف اندوز ہو سکوں"۔

ابراہیم پہلے سے ہی جواب سوچے ہوئے تھا وہ بولا۔ "جہاز کا کپتان اور اس کی کشتی غرقاب کے خطرے رہتے ہیں۔" "میرا ارادہ تو ڈاکٹر بننے کا ہے۔ تاکہ لوگوں کی خدمت کروں اور محتاجوں کو مفت دوا بھی دوں۔ نیز اپنی صحت کی بھی حفاظت کروں"۔

عبدالرحمٰن کو اس کی بات بہت ناگوار لگی کہنے لگا "اس زمانے میں تو کشتی غرق نہیں ہوتی بلکہ اس کے خلاف میں نے دیکھا ہے کہ طبیب لوگ

رہ جاتے ہیں۔"

قاسم بڑی شدت سے اپنی باری کا انتظار کر رہا تھا۔ اس نے اظہار کرنا شروع کیا کہ "مجھے تو دنیا کے کسی عجوبے سے دلچسپی نہیں ہے ہاں مجھے ایک کسان بننا چاہیے۔ تاکہ محنت کر کے عوام کی خدمت کروں۔"

اسی طرح حامد نے کاریگر اور سلیمان نے تاجر بننے کی آرزو ظاہر کی۔

عبدالکریم سوچ ہی رہا تھا کہ اس کی باری آگئی بولا "مجھے بہت بڑا رئیس بننے کی تمنا ہے عمدہ عمدہ لباس، مختلف قسم کے کھانے اور رہنے کو شاندار محل ہو۔" اسی طرح اس نے روانی میں کتنی ہی خواہشات کا اظہار کر دیا اور جب اس نے سر اٹھایا تو سبھی حاضرین ہنسی سے بے قابو ہو رہے تھے۔ تب وہ بھی شرمندہ ہو گیا۔ پروگرام کے خاتمہ پر محمد نے عالم بننے کی تمنا ظاہر کی تاکہ اس کے ذریعے دنیا میں اچھی باتیں پھیلیں اور برائی کا خاتمہ ہو۔

ماسٹر صاحب بچوں کے خیالات سنتے سنتے اکتا گئے تھے اور وقت بھی کافی ہو گیا تھا۔ لہٰذا انھوں نے عزیز طلباء کے لیے خیر و خوبی کی دعا پر مجلس برخاست کر دی۔

اتنے سارے افکار و خیالات تم نے سن لیے اچھا اب بتاؤ کہ تم نے کیا بننے کی آرزو دل میں سنبھالی ہے؟

★

بقیہ لالچ کی سزا صفحہ ۲۲ سے

کچھ ہی دیر بعد کریم رحیم کو قتل کرنے کی نیت سے دبے پاؤں جھونپڑی میں داخل ہوا لالچ میں وہ اتنا اندھا ہو گیا تھا کہ اس نے یہ نہیں دیکھا کہ کون سو رہا ہے؟ بے تحاشہ وار کر دیا۔ ایک دل دوز چیخ فضا میں گونجی اور چند ہی لمحوں میں مقتول تڑپ تڑپ کر سرد ہو گیا۔

صبح جب کریم اٹھا تو سب سے پہلے اس کی نظر رحیم پر گئی۔ رحیم کو دیکھتے ہی اس کے حیرت کی انتہا نہ رہی۔ اور وہ خود ہی کہہ اٹھا تو پھر رات کو جھونپڑی میں کون تھا؟

اس سوال کا جواب پانے کے لیے وہ سیدھا کھیت پر گیا۔ اور اپنے بیٹے کی لاش دیکھ کر سر پیٹ لیا۔

★★

بقیہ غلطی کا احساس صفحہ ۳۸ سے

رکھ کر شفقت کے ساتھ بولے "خدا کا شکر ہے کہ تمھیں اپنی غلطی کا احساس تو ہوا۔ تم لوگ اپنی سزا بھگت چکے ہو۔ پھر معافی کیسی؟ اور ہاں! تم سب مجھے اب پہلے سے زیادہ عزیز ہو۔"

بچوں نے دیکھا مولوی صاحب کی آنکھوں سے خوشی کے آنسو ٹپک پڑے۔ اور دھرتی میں جذب ہو گئے۔

★★

★ اللہ کی یاد ہی سے سکونِ قلب میسر ہو سکتا ہے۔

جناب جاوید احمد خاں

(ایک بچّے کا اپنی ماں سے اصرار)

اب علم کی دنیا میں، اے ماں مجھے جانے دو
اُمید کی کلیوں کو کھلنے دو کھلانے دو
اب شوق ابھرنے دو، اب ذوق بڑھانے دو
اِس دل کو جگانے دو
اے ماں مجھے جانے دو

اے ماں مجھے جانے دو، دنیا کی بہاروں میں
کیا رنگ جھلکتا ہے پھولوں میں، شراروں میں
انسان کے سینوں میں اور چاند ستاروں میں
آنکھوں کو اُٹھانے دو
اے ماں مجھے جانے دو

بازو میں بھی طاقت ہے، دل میں نئے ارماں ہیں
رگ رگ میں نئے جذبے اور منزلیں آساں ہیں
قدموں میں روانی ہے، ارماں ہیں کہ طوفاں ہیں
قدموں کو بڑھانے دو
اے ماں مجھے جانے دو

وہ کون سی خوبی اک انسان کے اندر ہے
مٹ جائے تو مٹی ہے، اٹھ جائے تو گوہر ہے
رک جائے تو قطرہ ہے، بڑھ جائے تو ساگر ہے
اس بھید کو پانے دو
اے ماں مجھے جانے دو

فطرت نے حسین منظر ہر سمت بنایا ہے
پھولوں سے بسایا ہے تاروں سے سجایا ہے
غنچوں کو زباں دے کر بھی راز چھپایا ہے
اس راز کو پانے دو
اے ماں مجھے جانے دو

میں سیکھ کے سب باتیں اک روز جب آؤں گا
پھر سب کو زمانے کی ہر چیز بتاؤں گا
اور علم کے پرچم کو دنیا میں اُٹھاؤں گا
پہلے مجھے جانے دو
اے ماں مجھے جانے دو

غلطی کا احساس

سید احمد عقیل

چار پانچ گاؤں کے بیچ ہی تو مدرسہ تھا۔ اس کی بھی حالت خستہ تھی۔ لیکن وہاں کے مولوی صاحب بڑے قابل تھے بڑے رعب دار تھے۔ میلی چیکٹ شیروانی پہنتے اور بچوں کو صاف رہنے کی تاکید کرتے کسی بھی لڑکے کے جسم پر میل دیکھ لیتے تو اپنے سونٹے سے اس کی چمڑی ادھیڑ ڈالتے۔ کوئی بھی دل گردے والا ایسا لڑکا نہ تھا جو مولوی صاحب کے حکم کے خلاف چوں بھی کر سکے۔

مگر ادھر کچھ دنوں سے شہر کی ہوا کھایا ہوا، ایک لڑکا آیا ہوا تھا۔ اظفر۔ بڑا تیز طرار تھا۔ پڑھنے میں بھی اور کھیلنے میں بھی۔ مولوی صاحب اسے دیکھتے تو خوشی سے ان کی بوڑھی آنکھیں چمکنے لگتیں اور جسم لرزنے لگتا۔ جیسے خوشی کا آتش فشاں ان کے جسم سے پھوٹ پڑنا چاہتا ہو۔

گاؤں سے ڈیڑھ دو میل کی دوری پر ایک اونچا پہاڑ تھا۔ بڑا ہی خوبصورت۔ قدرت کی صناعی کا عظیم نمونہ۔ اس کی سرسبز وادیوں کو دیکھ کر آنکھوں میں عجیب سا سکون بھر جاتا اور دل میں ایک عجیب سی امنگ کی لہر رینگ جاتی۔

اظفر نے مدرسے کے کچھ لڑکوں کے ساتھ اسی پہاڑ کی ہری ہری وادیوں میں جانے کا منصوبہ بنایا۔ پکنک کے لیے۔ لیکن مولوی صاحب چھٹی منظور کرتے ہی نہیں تھے۔ پکنک کی بات سن کر وہ بہت ناراض ہوئے اور تاکید کی۔

"خبردار! امتحان کا وقت بہت قریب آ پہنچا ہے امتحان کی کٹھن گھڑیاں گزر جائیں تو خوب عیش کر لینا۔"

مدرسے میں امتحان کا لفظ سن کر خاموشی چھا گئی۔ جیسے امتحان کسی خونخوار بھاڑ کھانے والے شیر کے مترادف ہو۔ کچھ لڑکوں نے پکنک کے ارادے کو دل سے باہر نکال پھینکا۔ مگر چھٹی کی گھنٹی بجی تو اظفر نے باہر نکل کر انہیں دلاسا دیا — "ہمیں چھٹی ضرور ملے گی۔ چھٹی کے لیے سر میں بھیجے کی ضرورت ہے۔ بھیجے کی!"

اظفر جانتا تھا کہ جاڑے کا یہ سہانا موسم پھر ایک سال سے قبل آنے والا نہیں۔ یہ خوشی جو حاصل ہونے والی ہے اسے دفن نہیں ہونا چاہیے۔ اور امتحان کوئی خونخوار جانور تھوڑے ہی ہے۔ امتحان تو قابلیت کی جانچ ہے اور ان بچوں نے تو شروع سے ہی اپنے سبق کو پڑھ

خوب کے ساتھ یاد کر لیا تھا۔ پھر امتحان سے ڈر لگتا
کیسا۔؟

بدھ کے روز پکنک کو جانے کا پروگرام تھا۔
اتوار کے روز انھیں دن بھر کا سارا کام کرنا پڑتا
تھا اس لیے اُس روز وہ سب عیش نہیں کر سکتے
تھے، گلچھرّے نہیں اڑا سکتے تھے۔

منگل کا دن آ پہنچا۔ لڑکوں کے دل میں بے چینی
سما گئی ان کے دل میں نراشا بھر گئی۔ چہرے پژمردہ
سے لگنے لگے۔ اچانک اظفر چلّایا "ہرّا! مل گئی
چھٹی، مل گئی!"

اور اپنے دوستوں کو اس نے اپنا منصوبہ
بتایا تو وہ سب خوشی سے اُچھل پڑے۔ کچھ
بچوں نے کلکاریاں بھرنی شروع کر دیں۔

بدھ کے روز سویرے سویرے اظفر اور
ناصر اپنے اپنے گھر سے ایک ایک گلاس خالص
دودھ لے کر مولوی صاحب کے گھر پہنچے۔ مولوی
صاحب نے یہ دیکھا تو اُن کے لب پھیل گئے،
آنکھیں سکڑ گئیں اور چہرے سے مسرت پھوٹنے
لگی۔

دونوں بچوں کے جاتے ہی انھوں نے دونوں
گلاس خالی کر ڈالے۔ اپنے کو موت کے فرشتوں
سے دور رکھنا اور لمبی زندگی جینا کون نہیں
چاہتا؟

لیکن کچھ ہی دیر بعد مولوی صاحب کا
پیٹ بجنے لگا۔ ان کی سمجھ میں یہی آیا کہ خالص
دودھ پی جانے کی وجہ سے ایسا ہو رہا ہے۔
لیکن اصلیت کچھ اور تھی اظفر نے دودھ میں
پسا ہوا جمال گوٹے کا بیج ملا ڈالا تھا۔ ہاں!
تو ان کی حالت فوراً ڈھیلی پڑ گئی اور ایک ہاتھ
میں لوٹا لیے، دوسرے ہاتھ سے پیٹ پکڑے
ہوئے دوڑ پڑے رفع حاجت کے لیے پھر
پے بہ پے دوڑتے دوڑتے نڈھال ہو گئے
مدرسہ میں انھوں نے یہ اعلان کروا دیا کہ آج
چھٹی رہے گی کیونکہ ان کی طبیعت اچانک خراب
ہو گئی ہے۔

لڑکے یہی تو چاہتے تھے۔ یہ خبر سن کر انھوں
نے جھٹ پٹ اپنے سارے سامان، جو پہلے
سے ہی تیار کر لیے گئے تھے، کاندھے پر لادے
اور ان کا قافلہ خوبصورت پہاڑی کی طرف چل پڑا۔

وہاں انھوں نے خوب اچھل کود مچائی۔ پہاڑ
کے قریب بہتی ندی کنارے ندی میں خوب سیر ہو کر
نہایا اور پھر تھوڑا جلا ہوا پلاؤ اور گوشت
(جس میں نمک زیادہ ہو گیا تھا) کھایا۔ کھیر بھی
تھوڑی پھیکی پھیکی سی تھی۔ لیکن اپنے ہاتھ
کے بنائے کھانے میں کچھ اور ہی لذت ملتی ہے۔

واپسی میں وہ لوگ جب اپنے گاؤں کی
حد پہ قدم رکھ رہے تھے۔ سورج کا سرخ گولا
کہیں دور چلا گیا تھا۔ رات کی سیاہی آسمان میں
جال کی طرح چھانے لگی تھی دور میدانوں میں"
کھیتوں میں، اونچے اونچے گنوّں اور ہرے
ہرے دھان کے پودوں کے اوپر اور
کھلیانوں میں کہرا کسی سفید پتلی چادر کی طرح
نظر آ رہا تھا۔ سرد ہوا کے جھونکے کچھ تیزی کا
سے چلنے لگے تھے لیکن بچوں کے اندر پھرتی

...دن کی گرمی نے سردی کے احساس کو ...دیا تھا۔

گاؤں میں پہنچتے ہی انھیں کسی نے بتایا کہ مولوی صاحب کی حالت کافی خراب ہو گئی ہے۔ اور انھوں نے کھاٹ پکڑلی ہے۔ سبھی بچوں کے دل میں عجیب سا خوف سما گیا۔ آخر غلطی تو انھیں کی تھی۔

سبھی بچے فوراً مولوی صاحب کے گھر پہنچے۔ ان کی حالت سچ مچ غیر تھی۔ آنکھیں اپنے گڑھے میں کچھ اور نیچے چلی گئی تھیں۔ آنکھوں کی چمک نہ جانے کہاں غائب ہو گئی تھی۔ جسم سست پڑ گیا تھا۔ اظفر نے اپنی کرتوت کا یہ نتیجہ دیکھا تو اس کا دل شرمندگی اور خوف سے دہل گیا۔ اس نے اپنے ساتھیوں کو ان کی خدمت کرنے اور ہر طرح سے آرام پہنچانے کی ہدایت کی۔

پاس ہی ڈیڑھ فرلانگ کی دوری پر ایک گاؤں تھا "ہمایاں پور"۔ وہاں ہومیو پیتھی کے ایک ڈاکٹر صاحب رہتے تھے۔ وقت پر گاؤں والوں کے کام آجاتے تھے کیونکہ شہر بہت دور تھا اور وہاں سے ڈاکٹر یہاں آ نہیں سکتا تھا۔ اظفر نے اس وقت انہیں ڈاکٹر صاحب کی مدد لینا چاہی۔ راستہ خطرناک تھا۔ لیکن اظفر کا دل ہمت اور عزم کے جذبے سے بھرا کسی مضبوط چہار دیواری کی طرح تھا۔ وہ تھوڑا بھی وقت گنوانا نہیں چاہتا تھا۔ فوراً اپنے ایک ساتھی ناصر کو لے کر ہاتھ میں ایک پتلی سی چھڑی لیے چل پڑا۔ کھیتوں ... پر تیزی سے دونوں چلے جا رہے تھے۔ اسی گاؤں کی طرف جہاں ایک مسیحا رہتا تھا۔

ڈاکٹر صاحب ایک رحم دل انسان تھے۔ بچوں کے ساتھ وہ فوراً چل پڑے۔ مولوی صاحب کے گھر پہنچ کر ان کو جانچا ٹٹولا۔ دوا دی، دلاسا دیا اور چلتے بنے۔ لڑکوں سے پیسے تک نہیں لیے حالانکہ لڑکوں نے زبردستی کچھ روپے دینے چاہے تھے۔

پورے ہفتے تک سبھی بچوں نے مولوی صاحب کی خوب خدمت کی۔ ان کو طرح طرح آرام پہنچایا۔ اظفر نے اپنے ابو سے کہہ کر مولوی صاحب کے لیے آدھ سیر دودھ بھی جاری کروا دیا۔ دھیرے دھیرے مولوی صاحب پہلے سے کہیں بہتر حالت میں آگئے وہ ان بچوں کی خدمت سے بڑے خوش تھے۔ سویرے سویرے نماز کے بعد وہ ان کے لیے خدا سے دعائیں کرتے۔

آخر ایک دن جب مولوی صاحب بڑے خوش و خرم نظر آرہے تھے، اظفر اپنے ساتھیوں کے ساتھ ان کے گھر پہنچا اور پوری بات بتائی۔ پھوٹ پھوٹ کر اپنی غلطی پر رویا اور معافی مانگی۔ اس کے سارے ساتھی بھی سر جھکائے اپنی غلطی پر شرمندہ بت کی طرح خاموش کھڑے تھے۔ کمرے میں صرف اظفر کی سسکیاں سنائی پڑ رہی تھیں۔ مولوی صاحب کی بوڑھی آنکھیں ان بچوں کی حالت پر بھر آئیں۔ دل پسیج گیا وہ اظفر کے قریب آئے اور اس کے سر پر ہاتھ

باقی صفحہ ... پر

آدھی ملاقات

لیجئے آسام کی ایک دلچسپ لوک کہانی حاضر ہے " بڈھا، بڑھیا اور ہتیار" امید ہے کہ پسند آئے گی۔ یہ خاص طور سے چھوٹے پیامیوں کی دلچسپی کی چیز ہے۔ اگلی بار ایک ڈراما حاضر کروں گا۔

پیام تعلیم ۹۔ اکتوبر کو لایا۔ پڑھ لیا ہے۔ اس بار کا شمارہ بڑا رنگا رنگ ہے۔ سائنسی مضمون بھی ہے معلوماتی بھی۔ کہانیاں بھی ہیں ڈراما بھی اور شکایات بھی، نظمیں بھی ہیں اور تینوں مستقل عنوانات "آدھی ملاقات"، "بچوں کی کوششیں" اور "ادھر ادھر سے" بھی بھر موقع کی مناسبت سے عید اور گاندھی جی کے بارے میں بھی نظمیں موجود ہیں۔

محترم خالد عرفان صاحب کا مضمون بہت عمدہ ہے، دلچسپ اور سادہ انداز بیان۔ دلکش اور آسان زبان اور کھیل کھیل میں سائنس کے اصول سمجھانے کا انوکھا انداز۔ ان سب خوبیوں نے ان کے مضمون کو صحیح معنوں میں بچوں کا مضمون بنا دیا۔ محترم غلام ربانی صاحب کا مضمون "سورج کے بارے میں" بہت دلچسپ اور معلوماتی ہے۔ "گلدار کے شکار کی داستان (ظہیر نیازی صاحب) بھی بڑی انوکھی اور سنسنی خیز ہے۔

ایک بات البتہ میں کئی مہینوں سے محسوس کر رہا ہوں وہ یہ کہ مضمونوں کہانیوں اور خصوصاً نظموں کی زبان مشکل سے مشکل تر ہوتی جا رہی ہے اس شمارے میں شامل تین چار نظمیں بہت مشکل زبان میں ہیں۔ بچوں سے یہ امید نہیں کی جا سکتی کہ وہ یہ زبان بغیر استاد یا والدین کی مدد کے سمجھ لیں گے۔ ذرا اس طرف توجہ دیجیے۔

محمد ایوب واقف صاحب کی نظم "ہمارے نبی نے ہمارے نبی نے" کے پہلے بند میں لفظ "پسپائیت" غلط ہے "پسپا" سے "پسپائی" ہے نہ کہ "پسپائیت" اسی طرح محمد عرفان صاحب کی کہانی "علم کا شوق" دلچسپ و سبق آموز ہے۔ لیکن اس میں ایک بنیادی غلطی یہ ہے کہ شکیل کو اتنا غریب دکھلانے کے باوجود کہ وہ اپنی تعلیم جاری نہیں رکھ سکتا "ڈرائینگ روم" میں بیٹھا دکھایا گیا ہے۔ اس کے بجائے "بیٹھک" یا "کمرے" کا لفظ ہوتا تو بہتر تھا۔ امید ہے کہ عرفان صاحب آئندہ اس بات کا خیال رکھیں گے۔

انجم اشرفی

اکتوبر کا شمارہ بہت جلد مل گیا۔ اس بار نظموں کا حصہ کافی نکھرا ہوا پایا۔ خصوصاً عید مبارک، ہمارے نبی نے، یاد گاندھی، ہمیں چاہیے، عظمی کے نام، مادر مہربان، بڑی اچھی اور کامیاب نظمیں ہیں۔ نثری مضامین میں محترم خالد عرفان صاحب کا سائنسی مضمون

[illegible] ایک اور مضمون میں
[illegible] بھی ہماری معلومات میں خاصہ اضافہ کرتا ہے۔
[illegible] خلیق انجم اشرفی صاحب کا ڈرامہ "لالچی کے
[illegible] " کہانیوں کا سرتاج کہا جا سکتا ہے۔ میں
نے [illegible] میں یہ کہانی " جیسے کو تیسا " کے عنوان
سے ماہنامہ " بچوں کی دنیا " لاہور میں پڑھی تھی۔
[illegible] رسالے کا با تصویر ہو جانا ایک نیک فال ہے
[illegible] اس کے اندر چٹکلوں کی کمی شدت سے محسوس
کی جا رہی ہے۔

میری کہانی " احسان " کے بارے میں پیامی
دوستوں کی رائے جان کر مسرت ہوئی۔ ان سطور
کے ذریعے ان دوستوں تک میرا شکریہ پہنچا دینے
کی زحمت گوارا فرمائیں۔

عادل کھلگانوی

اکتوبر ۱۹۷۷ء کا " پیام تعلیم " ملا۔ شکر گذار ہوا۔
اپنی ناچیز تخلیق نظم " عید مبارک " پر توجہ کے لیے بھی
احسان مند۔

آپ کی ادارت میں آنے کے بعد سے " پیام تعلیم "
بہت نکھرتا جا رہا ہے۔ بچے اور بڑے دونوں ہی اسے
کمال دلچسپی سے پڑھتے اور پسند کرتے ہیں۔ تازہ شمارے
میں سید غلام ربانی صاحب اور خالد عرفان صاحب
کے معلوماتی مضامین خاصی اہمیت رکھتے ہیں۔ خلیق انجم
صاحب کی مترجم کہانی " لالچی کے چوہے " دلچسپ
ہونے کے علاوہ زبان و ادب کے اعتبار سے بھی
[illegible] کے جذبات و احساسات کے عین مطابق ہے
[illegible] صاحب کی طرز تحریر بڑی شگفتہ ہوتی ہے۔
[illegible] شمارے میں منظومات کا حصہ بھی بڑا

قیمتی اور دلکش ہے۔ اساتذہ کے علاوہ محبوب
راہی کی نظم " مادر مہربان " ایک اچھی اور کامیاب
تخلیق ہے۔ لیکن بچوں کے ہلکے پھلکے " ادب " سے
ہٹ کر ہے۔ نظم کا عنوان " شفیق ماں " زیادہ
پرکشش ہوتا۔ " سات دنوں کی کہانی " میں خورشید
بیگم کوئی زیادہ دلکشی نہیں پیدا کر سکیں ہیں۔ نظر
ثانی کی ضرورت تھی۔

مجموعی طور پر " پیام تعلیم " ہر لحاظ سے قابلِ قدر
اور لائق مطالعہ ماہنامہ ہے۔ اس ماہ کا سرورق بھی
بڑا خوبصورت ہے۔ ان تمام اوصاف کے پیش نظر
آپ کی ادارت و آراستگی کی داد نہ دینا بڑی
ناانصافی ہوگی۔ ؎

کون کہہ سکتا ہے اس شکل کو پائندہ نہیں

شوکت پردیسی

پیام تعلیم
جلد (12) شمارہ نمبر ۱۲
12 (12)

ماہنامہ

جلد: ۱۲ شمارہ ۱۲

ایڈیٹر:-
ولی شاہجہانپوری

معاون:-
صفیہ حسان

دسمبر ۱۹۷۵ء

قیمت فی پرچہ: ۷۰ پیسے
سالانہ چندہ: سات روپے

فہرست مضامین

پرنٹر پبلشر سید احمد ولی نے مکتبہ جامعہ لمیٹڈ کے لیے جمال پرنٹنگ پریس دہلی ۶ میں چھپوا کر جامعہ نگر نئی دہلی ۲۵ سے شائع کیا۔

مگر مجھے میرا وزن کیسے معلوم ہوگا؟
کل وزن کو تین سے تقسیم کر لینا

بچّوں سے باتیں

نومبر کے مہینے کی چودہ تاریخ پنڈت جواہر لال نہرو کی پیدائش کا دن ہے۔ پنڈت نہرو کو بچّوں سے بڑی محبّت تھی۔ اس لیے اس تاریخ کو یومِ اطفال بھی منایا جاتا ہے۔ چنانچہ اس سال بھی پنڈت جی کا ۸۶ واں یومِ پیدائش اسی تاریخ کو بڑی دھوم دھام سے منایا گیا۔

تقریب کی شروعات صبح صبح نہرو جی کی سمادھی "شانتی وَن" پر صدرِ جمہوریہ جناب فخرالدین علی احمد، نائب صدر شری دی، ڈی جتی، وزیرِ اعظم شریمتی اندرا گاندھی اور تقریباً تین ہزار اسکولی بچّوں کی حاضری سے ہوئی جنہوں نے سمادھی پر پھول چڑھائے اور تین ہزار گلاب کے پودے لگائے۔

شام کو تین مورتی میں جہاں پنڈت نہرو رہا کرتے تھے، بچّوں نے کلچرل پروگرام پیش کیے۔ یہاں بھی وزیرِ اعظم نے شرکت کی۔

اسی مہینے کی ۲۹ر تاریخ کو پنڈت نہرو کی صاحبزادی، وزیرِ اعظم شریمتی اندرا گاندھی بھی ۵۸ برس کی ہوگئیں۔ وزیرِ اعظم نے اپنی سالگرہ سکم کے شہر گنگٹاک میں منائی۔

۱۵ر اگست سے متعلق انعامی مضمون اس شمارے میں پڑھیے۔ افسوس ہے کہ اس موضوع پر بہت کم مضمون ملے۔ انعام پانے کے لایق مضمون تو نہیں، مس شاداں پرویز کی ایک تقریر موصول ہوئی جو انھوں نے یومِ آزادی پر اپنے اسکول میں کی تھی۔ شاداں ذاکر حسین ماڈل ہایر سکینڈری اسکول علی گڑھ میں آٹھویں جماعت کی طالبہ ہیں۔

اس اسکول کا افتتاح ۲۶ر جنوری ۱۹۷۳ء کو کرنل سیّد بشیر حسین زیدی، سابق وائس چانسلر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی نے فرمایا تھا۔ اس وقت اس میں صرف ۴۲ طالب علم تھے۔ بانیانِ اسکول کی لگن اور اچھے تعلیمی نظام کی بدولت اس نے مختصر سی مدّت میں اتنی ترقی کر لی کہ اب طالب علموں کی تعداد سات سو تک پہنچ گئی ہے۔ اساتذہ کی تعداد ۲۵ ہے۔

نواب رحمت اللہ خاں شیروانی نے پانچ ہزار مربع گز زمین بطورِ عطیہ عنایت فرمائی تھی جس پر اسکول کی اپنی عمارت بن رہی ہے۔

سب تر زیادہ تر علی گڑھ کے مخیر حضرات کے عطیات سے ہو رہا ہے۔ ضرورت ہے کہ اہل خیر حضرات اس اسکول کو کالج میں تبدیل کر دیں۔ ڈاکٹر صاحب مرحوم کی اس سے بہتر یادگار نہیں ہو سکتی۔ دوسرا مضمون بنگلور کے محمود پاشا نے بھیجا تھا۔ یہ خود بھی طالب علم ہیں۔

اس لیے ہم نے انہیں بھی پانچ روپے کا انعام دینا طے کیا۔ دونوں کو انعام کی رقم منی آرڈر کے ذریعہ بھیج دی گئی۔

اس شمارے میں جناب محمد شفیع الدین نیر کی نظم "اچھے شہری" پڑھیے۔ نیر صاحب کی سب سے بڑی خوبی یہی ہے کہ وہ بچوں کی زبان میں ہی انہیں کچھ نہ کچھ کرنے کی دعوت دیتے ہیں مگر اس طرح کہ نصیحت کا کڑوا گھونٹ نہ معلوم ہو بلکہ لذیذ ٹافی اور چاکلیٹ کا مزا لے کر بچے اسے پڑھیں اور خود بھی اچھا شہری بننے کی کوشش کریں۔

ہمیں اعتراف ہے کہ اس مرتبہ نظموں کا حصہ کمزور ہے۔ یعنی ان کی تعداد کم ہے۔ لیکن جو نظمیں ہیں وہ بھی اپنی جگہ بہت خوب ہیں اور آپ انہیں یقیناً پسند کریں گے۔

حصہ نثر میں سید نظر برنی کا معلوماتی مضمون "سیفٹی لائٹ" پڑھنے اور پسند کرنے کی چیز ہے۔

آج بھی بچوں کو یہی بتایا جاتا ہے کہ چاند کے اندر بڑھیا بیٹھی چرخہ کات رہی ہے۔ آپ روس کی کہانی پڑھ کر دیکھیے کہ چاند میں ننھی لڑکی بیٹھی ہے یا بڑھیا۔

ریحان احمد عباسی صاحب کا شکریہ ادا کیجیے کہ انہوں نے اپنا وعدہ پورا کر دیا اور دلچسپ کہانی "کالے بھوت" عنایت کی پڑھیے اور لطف لیجیے۔

محمد امین صاحب کی کہانی "کنواں جس سے بکریاں نکلتی ہیں" بھی بڑی دلچسپ ہے۔ ان کے علاوہ بھی تمام کہانیاں پڑھ کر ضرور خوش ہوں گے۔

جناب محمد شفیع الدین نیّر

اچھے شہری

جو لوگ بھی مل کر رہتے ہیں، وہ سب شہری کہلاتے ہیں
یہ شہری آپس میں مِل جُل کر اپنے کام چلاتے ہیں
شہر کے یہ رہنے والے، آزاد بھی ہیں، پابند بھی ہیں
خوش حال بھی ہیں، بدحال بھی ہیں، غمگین بھی ہیں، خورسند بھی ہیں

قانون کی پابندی کرنا یہ اپنا فرض سمجھتے ہیں
امن اور اماں کی دولت کو جنتا کا قرض سمجھتے ہیں
دُکھ درد کے ساتھی بنتے ہیں اور وقت پہ یہ کام آتے ہیں
جو لوگ شرارت کرتے ہیں، وہ سب ان سے گھبراتے ہیں

ان لوگوں ہی کی کوشش سے جنتا کی بھلائی ہوتی ہے
ان لوگوں ہی کی برکت سے مسرور خدائی ہوتی ہے
ہے اچھا شہری صرف وہی، جو اچھا پیشہ کرتا ہے
بہتر سے بہتر کام کرے، بس اس خواہش پر مرتا ہے

ان پیشہ وروں کی کوشش سے دنیا کی گاڑی چلتی ہے
ان سب ہی لوگوں کی محنت، راحت کے لعل اُگلتی ہے
مِل جُل کر رہنے سے باہم ہم اُلفت کا دم بھرتے ہیں
مِل جُل کر ہی رہنے سے ہم، آپس میں اعانت کرتے ہیں

ہر ہر شہری کے دل میں ہو احساس اپنی خودداری کا
ورنہ وہ شہر کے ماتھے پر ٹیکا ہے ذلّت و خواری کا
نیّر یہ تمنّا ہو اپنی، ہم اچھے شہری بن جائیں
ہم خدمت کر کے دنیا میں، فردوس کا منظر دکھلائیں

جناب سید نظر برنی

سیٹلائٹ ٹیلی ویژن

بچو! اس سال پندرہ اگست کے دن تم نے پردھان منتری شریمتی اندرا گاندھی کو ٹیلی ویژن پر تقریر کرتے دیکھا ہوگا۔ ان کی یہ تقریر صرف دہلی میں ہی نہیں دکھائی گئی۔ بلکہ اسے سیٹلائٹ ٹیلی ویژن کے ذریعہ ملک کے کئی اور صوبوں کے ہزاروں گاؤوں میں دکھایا گیا جسے لاکھوں آدمیوں اور بچوں نے بڑے شوق کے ساتھ دیکھا۔ سیٹلائٹ ٹیلی ویژن کا یہ تجربہ بے حد کامیاب ثابت ہوا ہے۔ آؤ اس کے بارے میں کچھ اہم معلومات جاننے کی کوشش کریں۔

ٹیلی ویژن کا مقصد جہاں تفریح ہوتا ہے، وہاں اس کا مقصد تعلیمی بھی ہے۔ ۱۹۵۹ء سے ٹیلی ویژن ہمارے دیس میں قائم ہے۔ ۱۹۷۰ء میں دہلی میں ایک کانفرنس ہوئی تھی جس میں غور کیا گیا تھا کہ سماج میں تبدیلیاں لانے اور قوم کے درمیان میل ملاپ بڑھانے کے لئے ٹیلی ویژن کہاں تک اپنا رول ادا کر سکتا ہے۔ اسے ایک مؤثر ذریعہ کے طور پر استعمال کرنے، اسکولوں کے اندر اور باہر اس کے فائدوں کو عام کرنے، ابتدائی تعلیم اور بالغوں کی تعلیم کا کام انجام دینے کے لئے ٹیلی ویژن کی خدمات حاصل کی گئیں۔ چنانچہ ملک کے دور دور کے حصوں میں سائنس ٹیکنالوجی، کھیتی، صحت، خاندانی منصوبہ بندی وغیرہ کے بارے میں ضروری معلومات فراہم کرنے کے لیے سیٹلائٹ ٹیلی ویژن شروع کیا گیا ہے۔ سیٹلائٹ ٹیلی ویژن میں جس مصنوعی سیارہ کا استعمال ہوتا ہے وہ اے۔ ٹی۔ ایس کہلاتا ہے۔ امریکہ کا یہ سیارہ وہاں کی NASA (نیشنل ایروناٹیکل اینڈ اسپیس ایڈمنسٹریشن) نامی تنظیم نے ہمارے ملک کو ایک سال کے لیے بطور قرض دیا ہے۔ تعلیمی مقصد کے لئے سیٹلائٹ ٹیلی ویژن کے استعمال کے تجربہ کے لیے فی الحال چھ صوبوں کو چنا گیا ہے۔ ان ریاستوں میں راجستھان، بہار، اڑیسہ، مدھیہ پردیش،

آندھرا، اور کرناٹک شامل ہیں۔ ان ریاستوں میں جن ضلعوں میں یہ تجربہ کیا جارہا ہے۔ ان کے نام یہ ہیں:

راجستھان میں جے پور، کوٹہ، سوائی مادھوپور، بہار میں چمپارن، دربھنگہ، مظفرپور، سہسرام، اڑلیسہ میں دھن کنال، پھول بنی، سمبل پور، مدھیہ پردیش میں بلاسپور، درگ، رائے پور، آندھرا پردیش میں حیدرآباد، کرنول، میڈک، محبوب نگر، کرناٹک میں بیجاپور، گلبرگہ، رائے پور، ان تمام ضلعوں میں دو ہزار چار سو گاؤں کے لوگوں کو ٹیلی ویژن دیکھنے کا موقع ملتا ہے۔

آل انڈیا ریڈیو اور خلائی تحقیق کی قومی تنظیم اس تجربہ کی کامیابی کے لیے تمام زمینی ذمہ داریوں کو پورا کر رہے ہیں احمدآباد اور دہلی میں دو زمینی اسٹیشن قائم کیے گئے ہیں جو کہ سیٹلائٹ سے نشر ہونے والے سگنلوں کو وصول کرتے ہیں اور جو زمینی اسٹیشنوں سے نشر ہونے والے سگنلوں کو سیٹلائٹ تک پہنچاتے ہیں۔

بچو! اس سیٹلائٹ ٹیلی ویژن سے مخصوص پروگرام نشر کیے جاتے ہیں۔ پروگراموں کی تیاری اس طرح کی جاتی ہے کہ وہ دو مختلف زبانوں والے ایسے علاقوں میں مشترکہ طور پر استعمال ہوسکیں۔ جن کے کھیتی کے، سماجی اور مالی حالات ایک سے ہوتے ہیں۔ مثال کے طور پر اڑلیسہ کے سمبل پور ضلع میں اڑیہ بولی جاتی ہے اور مدھیہ پردیش کے رائے پور ضلع میں ہندی بولی جاتی ہے تو ان دونوں ضلعوں کے لیے ایک ہی پروگرام پیش کیا جاتا ہے۔ اسی طرح دوسرے ضلعوں میں بھی ایسا ہوتا ہے

ٹیلی ویژن کے اس نئے تجربہ کا مرکزی نشانہ پرائمری اسکول کے طالب علم ہیں۔ یہ بات تم جانتے ہو کہ ہمارے ملک کے گاؤں میں جو پرائمری اسکول ہوتے ہیں ان میں کوئی دل کشی اور چمک دمک نہیں ہوتی۔ بعض علاقوں میں ایسے اسکولوں کی تعداد کم نہیں جہاں سارا کام ایک ہی ٹیچر انجام دیتا ہے۔ گاؤں کے پرائمری اسکول میں پڑھنے والے بچوں میں سے بہت کم ایسے ہوتے ہیں جو اوپر کی کلاسوں میں بھی اپنی پڑھائی جاری رکھتے ہیں۔ زیادہ تر بچے اپنی پڑھائی چھوڑ کر گھریلو کاموں میں لگ جاتے ہیں۔ ایسی صورت میں ٹیلی ویژن کی ذمہ داریاں بڑھ جاتی ہیں اس لیے اس تجربہ کے تحت پرائمری اور پرائمری سے پہلی سطح کے بچوں یعنی پانچ سال اور بارہ سال کے درمیان کی عمر کے بچوں پر زیادہ توجہ دی گئی ہے

سائنس اور ٹیکنالوجی کی جو اس زمانے میں اہمیت ہے۔ اس پر روشنی ڈالنے کی ضرورت نہیں۔ ٹیلی ویژن کے ذریعہ ایسے پروگراموں کو پیش کر کے ہندوستان کے بچوں میں بھی سائنس اور ٹیکنالوجی کو سیکھنے اور سمجھنے کا شوق پیدا کیا جاسکتا ہے۔ بچوں کا گرد و پیش ہی ان کے لیے سائنس کی لیبوریٹری سے کم نہیں۔ چنانچہ بچوں کو ان کے ماحول کے بارے میں خود اس ماحول کے ذریعہ ہی بتانے کی کوشش کرنی چاہیے مثلاً آپ گاؤں کے تالاب کو ہی لیجیے اس تالاب

کے ذریعہ بچوں کو پانی کے اجناس، پانی کی کثافت، تیرنے اور ڈوبنے کے اُصول، لہروں کا بننا اور اسی طرح کی دوسری باتیں سمجھائی جاسکتی ہیں۔ اسی طرح گاؤں کے ٹوا کیے کی بائیسکل کی مدد سے بچوں کو ہوا کے دباؤ، ہوا بھرنے کے پمپ وغیرہ جیسے معاملوں کے بارے میں بتایا جاسکتا ہے۔

سیٹلائٹ ٹیلی ویژن کھیتی اور آب پاشی کے بارے میں خصوصی پروگرام پیش کرتا ہے۔ ان پروگراموں کے ذریعہ کسانوں، خاص طور سے چھوٹے کسانوں کو کھیتی باڑی کے مختلف ڈھنگوں سے واقف کرایا جاتا ہے۔ پودوں کی بیماری اور نقصان پہنچانے والے کیڑے مکوڑوں، کیمیاوی کھادوں کے استعمال، موسم کے بارے میں پیشین گوئیاں اور بازار کے بھاؤوں وغیرہ کے بارے میں کسانوں کو معلومات کرائی جاتی ہیں۔

تعلیمی مقصد کے لیے سیٹلائٹ ٹیلی ویژن کا استعمال ایک تجرباتی پروجیکٹ ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ ایک سال کے تجربہ سے ہم کیا سیکھتے ہیں۔ اور ملک کی کھیتی باڑی، سینچائی کی کمیاں دور کرنے اور تعلیم کے میدانوں میں ہمیں کس حد تک کامیابی حاصل ہوتی ہے۔

★ ★ ★

لطیفہ

ماں: جاوید تم سر پر اینڈے کیوں رکھے پھر رہے ہو؟

جاوید: امی جان، ماسٹر صاحب نے کہا تھا دماغ پر زور دیا کرو۔ سب کچھ آجائیگا۔

عادل کھلگانوی

یہ بَلا کیا ہے؟

(روحِ غالب سے معذرت کے ساتھ)

دلِ ناداں تجھے ہوا کیا ہے
کھیل کی فکر کے سوا کیا ہے

وہ ہمیں بے وفا سمجھتے ہیں
جو نہیں جانتے وفا کیا ہے

وہ پڑھائیں مجھے تو میں نہ پڑھوں
یا الٰہی یہ ماجرا کیا ہے

کیسی ہوا پڑھائی سائنس کی
ابر کیا چیز ہے ہوا کیا ہے

ہم نے مانا کہ کچھ نہیں غالب
پھر بھی میسٹر کی یہ بَلا کیا ہے

علم کیا امتحان سے ہے آتا؟
پھر یہ ہنگامہ اے خدا کیا ہے

بس سہولت سے پاس کر جائیں
اور اس کے سوا صدا کیا ہے

کب سے عرضی لیے کھڑے ہیں ہم
کاش پوچھو کہ مدعا کیا ہے

قاعدہ ہو معاف کر دینا
میں نہیں جانتا سزا کیا ہے

پھر وہی دل کی دھڑکنیں عادل
اس مرض کی بھلا دوا کیا ہے

جناب محمد امین

ایتھوپیا کی سرزمین سے
کہانی نمبر ۱

کنواں جس سے بکریاں نکلتی ہیں

ٹیگرے صوبہ کے شمالی علاقے میں ایک آدمی رہتا تھا۔ اس کا نام اوہاریا تھا۔ ایک دن وہ سفر پر روانہ ہوا۔ چلتے چلتے پہاڑ پر وہ ایک ایسی جگہ پہنچا، جہاں اُجڑا ہوا ایک گھر تھا۔ اسے بھوک لگ رہی تھی اور وہ تھک بھی گیا تھا۔ اس نے سوچا تھوڑی دیر یہاں آرام کرلوں۔ اور انجرا (تف کی بنی ہوئی نان) کھالوں، پھر آگے چلوں، چناں چہ اس نے کھانا کھا کر آرام کیا۔ تھوڑی دیر کے بعد اب چلنے کو تیار ہوا کہ اتنے میں اس نے ایک بکری کی آواز سُنی۔ اس نے کان لگا کر سُن گن لی۔ لیکن ٹھیک سے اندازہ نہ ہو سکا۔ آواز پھر آئی۔ پاس میں ایک ڈھلا ہوا پُرانا کنواں تھا جاکر کنوئیں میں جھانکا۔ دیکھا تو بکری وہاں کھڑی تھی اور کنواں خشک تھا۔ غریب پیاسی تھی۔ پانی کی تلاش میں پھر رہی ہوگی۔ اور اتفاقیہ کنوئیں میں جا پڑی ہوگی۔

اوہاریا کی باچھیں کھِل گئیں۔ بولا "قسمت ہو تو ایسی!" جھٹ وہ کنوئیں میں اُتر گیا۔ بکری کے گلے میں رسّی باندھی اور باہر آکر اسے اُوپر گھسیٹنا شروع کیا۔

ٹھیک اسی وقت کتا مانا نام کا ایک تاجر وہاں سے گزرا۔ اس کے ساتھ تین اونٹوں پر غلے کی بوریاں لدی ہوئی تھیں۔ اوہاریا کو اس چٹیل میدان میں دیکھ کر وہ خوش ہوا اس نے پوچھا کہ "پیاس لگی ہے کیا پینے کا پانی مل جائے گا۔"

"پانی ہوتا تو بھلا کون انکار کرتا" اوہاریا نے جواب دیا "یہ بدقسمتی سے ایسا کنواں ہے۔ جس میں سے بکریاں نکلتی ہیں۔" "بکریاں نکلتی ہیں کنوئیں میں سے؟" کتا مانا نے حیرانی سے پوچھا

"تم کیا سمجھے ہو؟ بھائی یہ ایسا کنواں ہے جو بکریاں پیدا کرتا ہے سمجھے؟" اوہاریا نے اس پہ رُعب جمایا۔ اسی دوران اس نے رسّی اُوپر کھینچ لی اور بکری سامنے آگئی۔

"یہ تو بڑی حیرت کی بات ہے" کتا مانا نے کہا "پہلے ایسی بات میں نے کہیں نہیں سُنی۔"

تم ٹھیک کہتے ہیں اوہاریا نے کہا "ایسے کنویں عام نہیں ہوتے ۔"

"آخر اس کی کرامت کیا ہے ؟" تاجر نے اپنی حیرت دور کرنے کے لئے پوچھا ۔

"اس کی ترکیب بڑی سیدھی ہے" اوہاریا نے اطمینان سے کہا ۔ "شام ہوتے ہی بکری کے سینگ کا ایک جوڑا اس میں پھینک دو ۔ صبح جاکر دیکھوگے تو تمہیں سینگ کی جگہ پر ایک بکری ملے گی ۔ اس کے بعد رسّی سے باندھ کر اسے اوپر نکال لینا ۔"

"یہ تو کمال ہی ہوگیا !" کنا مانے تعجب سے کہا ۔ "کاش کہ یہ کنواں مجھے مل جائے ۔"

"ظاہر ہے ایسے کنویں کو پاکر بھلا کون چھوڑے گا ۔" اوہاریا نے چالاکی سے کہا ۔ بکری کو اس نے آزاد کردیا اور وہ اِدھر اُدھر چوکڑی بھرنے لگی ۔ "ایسے کنویں کو کوئی خریدنا بھی چاہے تو اتنا آسان نہیں ۔"

"لیکن ، ہاں دیکھو میں ایک بات سوچ رہا ہوں ۔" کنا مانے کہا "میں دولت مند آدمی نہیں ہوں لیکن تم بیچنا چاہو تو میں غلّے کی چھ بوریاں دینے کو تیار ہوں ۔"

اوہاریا کھِل کھلاکر ہنس پڑا ۔ "بکریوں کی تعداد دیکھتے ہوئے یہ کوئی خاص دام نہیں" ۔ اس نے کہا ۔

"اچھا تو سنو ۔ میں بارہ کی بارہ ساری بوریاں دینے کو تیار ہوں جو میرے اونٹوں پر لدی ہیں" کنا مانے فکر مند ہوکر کہا ۔

اوہاریا نے مسکراکر سر ہلادیا ۔ "ہفتے میں سات بکریاں" گویا کہ وہ اپنے آپ باتیں کر رہا ہو "مہینے تیس اور سال میں تین سو پینسٹھ ۔۔۔۔۔"

اب کنا ما کو بڑا لالچ آیا ۔ اس نے کہا "میرے اونٹوں کو تو دیکھو کتنے تیز اور جوان ہیں ۔ میں نے ابھی حال ہی میں انہیں کرن (ایریٹریا صوبے کا ایک شہر) میں خریدا ہے ۔ کیا ان سے اچھے اونٹ کہیں اور مل سکتے ہیں اچھا تم نہیں مانتے تو چلو میں بارہ بوریوں کے علاوہ اپنے تینوں اونٹ بھی دینے کو تیار ہوں میں تم کو اس سے زیادہ دے دیتا لیکن یہی میری کُل پُونجی ہے ، تم کہو تو میں قسم کھانے کو تیار ہوں ۔"

اوہاریا نے سوچ کر کہا "تم نے جب اسے خریدنا طے ہی کر لیا ہے تو لو میں تمہیں دے ہی دیتا ہوں ۔" کنا ما کو دے کر اونٹ کی پیٹھ سے نیچے اُترا اور خوش ہوکر اس نے اوہاریا کو گلے سے لگا لیا ۔

"خدا کرے کہ تم ہزار برس تک زندہ رہو" اس نے دُعا دی "اور تم خوب پھلو ، پھولو اور ترقی کرو ۔" "بہت خوب ! بہت خوب" اوہاریا نے کہا ۔ اونٹوں کی طرف دیکھ کر اس نے پھر کہا "خدا پہلے ہی سے مجھ پر کیا کم مہربان ہے" مع غلّے کی بوریوں کے تینوں اونٹ اس نے سنبھال لیے ۔ ساتھ میں بکری اور کچھ چیزیں اور لے کر وہ چلنے کو تیار ہوگیا ۔ "جانے سے پہلے اپنا نام تو بتاتے جاؤ ۔" کنا مانے دریافت کیا ۔

"لوگ مجھے یہ کہہ کر پکارتے ہیں کہ میں کہاں ناچوں" اور ہاریا نے جواب دیا اس کے بعد فوراً وہ وہاں سے روانہ ہو کر جنوب کی طرف چلتا بنا۔ کنا ما کنویں کے پاس جم کر بیٹھ گیا۔

کنا ما کو جلدی پڑی تھی کہ کنویں سے بکریاں اسے کب ملیں گی، شام ہوتے ہی اس نے بکری کے دو سینگ اس میں ڈال دیے اور قریب کے ایک گھر میں سو گیا۔ صبح تڑکے وہ بھاگ کر کنویں کی طرف آیا کہ اپنی پہلی بکری کو نکال لے۔ اطمینان کرنے کے لیے کنویں میں اس نے پہلے جھانک کر دیکھا۔ لیکن وہاں پُرانے سینگوں کے علاوہ کچھ بھی نہیں تھا۔ اس کے پیر تلے کی زمین نکلتی نظر آئی۔

اس دھوکہ پر ابھی اس کو یقین نہیں آیا۔ "شاید مجھ سے کوئی غلطی ہو گئی" اس نے دل ہی دل میں سوچا۔ شام کو اس نے دو سینگ اور پھینکے صبح کو بے چینی سے بکری نکالنے پہنچا لیکن کنویں میں بکری ندارد۔ اب تو اسے فکر ہونے لگی، ڈھونڈ ڈھانڈ کر بکری کے وہ سارے سینگ لے آیا۔ ڈھیروں اس نے کنویں میں ڈال دیے رات میں کنویں کے پاس ہی دھرنا دیے وہ بیٹھا رہا اور چیخ چیخ کر کہتا رہا:

"بکریوں کنویں میں تم ہو؟ بکریوں کنویں میں تم ہو؟"

لیکن بات کچھ بنی نہیں۔ جب مایوسی پہ مایوسی ہوئی تو کنا ما کو غصہ آیا اور وہ غمگین ہو گیا۔ اسے احساس ہونے لگا کہ لالچ کے چکر میں پڑ کر وہ دھوکہ کھا گیا۔ بجز اس کے اب کوئی چارہ نہیں تھا کہ وہ جائے اور ہاریا آدمی کو تلاش کرے جو اس کے اونٹ اور غلے کی بوریاں لے کر بھاگ گیا ہے۔

تاجر جنوب کی طرف چل پڑا، اور ہاریا کے نقشِ قدم پر۔ شام کو وہ ایک گاؤں میں پہنچا اس گاؤں کے چوراہے پر بہت سے آدمی جمع تھے۔ سب کو مخاطب کر کے اس نے پوچھا "کیا آپ لوگ "میں کہاں ناچوں" کو جانتے ہیں؟"

"کیوں، اس میں بھلا پوچھنے کی کیا بات ہے، تم جہاں چاہو ناچو" لوگوں نے جواب دیا۔ جہاں تم کھڑے ہو چاہو تو وہیں ناچنا شروع کر دو" سب نے مل کر اس کی ہمت بڑھانے کے لیے تالیاں بجانی شروع کر دیں اور ساتھ میں گانا بھی۔

"نہیں یہ بات نہیں" اس نے کہا "میں جاننا چاہتا ہوں کہ آپ لوگ 'میں کہاں ناچوں' کو جانتے ہیں"۔ "ناچنا ہے تو چلو یہیں ناچو" سب نے کہا۔ کنا ما کو اس بات پر بڑا طیش آیا کہ یہ لوگ اس کا مذاق اُڑاتے ہیں۔ لہٰذا مایوس ہو کر وہ آگے چل پڑا۔ سڑک کے کنارے اس نے سو کر رات بسر کی۔ دوسرے دن وہ ایک اور گاؤں میں پہنچا۔ بازار میں جا کر اس نے زور زور سے چیخ کر کہا کہ کیا کوئی جانتا ہے کہ "میں کہاں ناچوں؟" منٹوں میں اس کے ارد گرد بھیڑ جمع ہو گئی اور سب نے اس سے کہا "یہیں ناچو" ہر طرف سے تالیاں بجنے لگیں۔ ایک آدمی ڈھولک

[illegible] آیا۔ اور سب کو انتظار کرنے لگا کہ ناچ شروع کرتا ہے۔ گھبرا کر وہ گاؤں سے بھاگا۔ تیسرے گاؤں میں پہنچ کر اس نے وہی بات پھر کہی۔ سب نے مل کر تالیاں بجائیں اور اس سے ناچنے کا تقاضا کیا۔ غرض یہی دُرگت ہر گاؤں میں ہوئی۔ جہاں جاتا لوگ اس کے پیچھے پڑ جاتے۔ ظاہر ہے اب مایوسی کے علاوہ اور کیا چارہ تھا۔ وہ انتہائی غمگین ہو گیا اور سوچنے لگا کہ اگر یہی حال رہا تو کہیں وہ پاگل نہ ہو جائے۔ آخر کار ضلع کے سردار کے گاؤں میں پہنچا۔ یہاں بھی لوگوں نے اس کا اسی انداز سے استقبال کیا۔ یہ خبر اُڑتے اڑتے سردار کے پاس بھی پہنچی۔ اس نے اسے بلوایا۔ "یہ تم نے کیا بخواس لگا رکھی ہے؟" سردار نے اس سے پوچھا "تم خود کہتے ہو کہ میں کہاں ناچوں اور پھر ناچتے بھی نہیں۔ آخر یہ کیا مذاق ہے؟"

اپنے غم اور غصہ کو پی کر اس نے آپ بیتی کہہ سنائی۔ سردار نے ہمدردی سے اس کی باتیں سُنیں۔ سردار کو یاد آیا کہ قریب ہی کے ایک گاؤں میں اوہاریا نام کا ایک آدمی آ کر آباد ہوا ہے۔ علاوہ اس کے پاس تین اونٹ اور غلّہ کی بارہ بوریاں تھیں۔ "یہاں اطمینان سے بیٹھو اور آرام کرو۔" سردار نے کہا "میں اس مسئلہ کا حل ڈھونڈھوں گا۔" پھر اس نے اوہاریا کے پاس قاصد بھیجا۔ ہدایت کے مطابق قاصد نے کہا۔ "سردار کے گھر پر ایک آدمی تم سے ملنے کا انتظار کر رہا ہے۔ اس کا نام ہے "مجھے کیا کرنا چاہیے" سردار نے تم کو فوراً بلایا ہے۔" اوہاریا بھاگتا ہوا وہاں پہنچا۔ سردار نے اس سے پوچھا "کیا بات ہے؟"

"حضور آپ جانتے ہیں کہ مجھے کیا کرنا چاہیے" اوہاریا نے جواب دیا۔ "ہاں میں جانتا ہوں تمہیں کیا کرنا چاہیے" سردار نے حکم دیا۔ "کناما تاجر کے تین اونٹ اور غلّہ کی بارہ بوریاں ابھی تمہیں واپس کرنی ہیں۔" یہ سُن کر اوہاریا چت گر پڑا اور بے حد شرمندہ ہوا۔ اس نے بلا کسی چون و چرا کے سب سامان لوٹا دیا۔

کناما بے حد خوش ہوا۔ اس نے اپنا سارا سامان سنبھال لیا۔ اور سب لے کر چلتا بنا۔ جب وہ بازار سے گزرا تو اسے دیکھ کر لوگ چیخے "ناچو! یہاں ناچو!" اور اب کی بار وہ اتنا خوش تھا کہ اس نے واقعی ناچ ناچ کر خوب تماشے دکھلائے۔

(صفحہ ۲۸ کا بقایا)

ہوئے خرگوش کو نگرانی کا حکم دیا۔ لیکن اسی وقت یاک آ پہنچے۔ خرگوش خوف کے مارے لومڑی کے پیچھے چھپ کر کھڑا ہو گیا۔ لومڑی نے مشفقانہ انداز میں کہا "میاں ڈرنے کی کوئی بات نہیں، مجھے دیکھتے رہو۔"

مگر کچھ دیکھنے کی نوبت ہی نہ آئی۔ ایک یاک نے جھپٹ کر لومڑی کو اپنے نکیلے سینگوں پر اُٹھا لیا اور دیوار سے ٹکر ماری۔ سینگ لومڑی کے جسم کے آر پار ہو گئے۔

خرگوش بڑی مشکل سے اپنی جان بچا کر بھاگ سکا۔

پیکر تھانوی

اقبالؒ

ڈاکٹر اقبال مرحوم کی زندگی میں یوں تو بہت سارے واقعات پیش آئے، جن میں ذیل کا واقعہ نہایت ہی اہم ہے لیکن تاریخ اسے نہ جانے کیوں دُہرا نہ سکی، اور آج بہت ہی کم لوگ اس اہم واقعہ سے واقف ہیں۔

اقبال مرحوم کی شخصیت کسی تعارف کی محتاج نہ تھی۔ بھارت کا ہر معمولی تعلیم یافتہ شخص بھی آپ کی ذات شریف سے بخوبی واقف تھا جہاں آپ قانون کے ایک ڈاکٹر تھے وہاں ایک بہت بڑے فلاسفر بھی تھے۔ جہاں آپ ایک علامہ تھے وہاں ایک شاعرِ اعظم بھی۔ آپ دنیا کے اُن چند مایۂ ناز شعراء میں سے تھے جن کا شمار صرف انگلیوں پر کیا جا سکتا ہے۔

یہ وہ زمانہ تھا جب علامہ اقبال کی دو تصنیفیں (بالِ جبریل اور بانگِ درا) منظرِ عام پر آکر عوام میں بے حد مقبول ہو چکی تھیں اور آپ کا شہرہ گھر گھر تھا۔ اس وقت ہمارا وطن حکومتِ برطانیہ کے زیرِ تسلط تھا۔ جب اقبال کی شہرت ان کے کانوں سے ٹکرائی تو انہوں نے ترجموں کے ذریعہ مذکورہ بالا تصنیفوں کا مطالعہ شروع کیا تو اُنہیں شکسپیر جیسا ایک عظیم فلاسفر بھی اقبال کے مدِ مقابل پھیکا پھیکا سا لگنے لگا اور ایک ہندوستانی کے اس طرح کے بلند اور وسیع خیالات اہلِ برطانیہ کے لیے سامانِ حسد بن کر رہ گئے۔

یوں تو اقبال مرحوم اپنے اعلیٰ تعلیمی دور میں انگلستان میں چمک چکے تھے جب آپ نے وہاں ڈاکٹری کی سند لے کر اچھی نمایاں کامیابی حاصل کر کے اپنی اعلیٰ شہرت کے پرچم لہرائے تھے مگر اقبال کی قدم قدم پر بڑھتی ہوئی یہ شہرت اہلِ برطانیہ کو ایک آنکھ نہ بھائی اور وہ آپ کی ہتک کرنے پر کمربستہ ہو گئے۔

آئے دن ان میں اس تجویز ناقص پر چرچے ہونے شروع ہوئے ان کی خفیہ میٹنگ منعقد ہونے لگی اس زمانے کے اُردو داں عیسائی جو خصوصاً ان کے فادر (عیسائی عالم) کہلاتے تھے میٹنگ میں مدعو کیے گئے اس طرح چند اور بھی اُردو داں ہستیاں انہیں حاصل ہوئیں۔ اس کے

علاوہ ہندوستان اور دیگر ممالک سے اُردو دان شعراء بھی معقول معاوضے پر بلائے گئے اور پھر ایک بار ان تمام کی موجودگی میں ایک اجتماع ہوا جس میں تمام شعراء سے مخاطب ہو کر یہ درخواست کی گئی "ہر شاعر ایک ایسا مصرع کہے جو عیسائی مذہب کی شان سے متعلق ہو اور جس میں مذہب اسلام پر طنز ہو۔ گویا انہیں نہایت رازدارانہ طریقے پر اس سے آگاہ کر دیا گیا۔

دن ہفتوں میں اور ہفتے مہینوں میں تبدیل ہو گئے مگر کسی کو خاطر خواہ کامیابی حاصل نہ ہو سکی حالانکہ اس دوران چند شعراء نے اچھے سے اچھے مصرعے بھی پیش کیے لیکن وہ کمیٹی کے ممبران کو پسند نہ آئے۔ کیونکہ اقبال کی ذہانت سے وہ پوری طرح واقف تھے اس لیے مزید کوشش کی جانے لگی اور شعراء کو بار بار طبع آزمائی کا موقع دیا گیا۔ کئی بار شعراء نے اپنے کہے ہوئے مصرعے پیش کیے لیکن انہیں کامیابی نصیب نہ ہو سکی۔ کہتے ہیں کہ متواتر چار پانچ ماہ کی کوششوں کے بعد کسی شاعر نے اپنا ذیل کا ایک مصرع پیش کیا۔

ع "دینِ احمدؐ کا گھٹے دینِ مسیحا بڑھ جائے"

اور اس مصرعے کو ہر کسی نے پسند کیا کیونکہ اس مصرعے سے ان کا اپنا دلی مقصد حاصل ہو رہا تھا یہ تمام کارروائی نہایت ہی خفیہ رکھی گئی۔

دوسرے ہی روز ایک فرضی کمیٹی وجود میں آئی اور اس کمیٹی کی جانب سے لندن میں ایک عظیم اردو مشاعرے کا اعلان کیا گیا۔ بھارت سے چند معزز مہمان بھی مدعو کیے گئے۔ مگر اقبال کو خاص طور سے دعوت دی گئی تھی اور آپ نے بھی اس دعوت کو بخوشی قبول فرمایا تھا۔

وقتِ مقررہ پر اقبال اپنے چند ساتھیوں کے ساتھ لندن روانہ ہو گئے۔ لندن کے ہوائی اڈے پر بظاہر تو اقبال اور اُن کے ساتھیوں کا پُر جوش خیر مقدم ہوا اور ایک عالی شان بنگلہ میں ان کا قیام رہا۔ اسی دوران بہت سے لندن کے مسلم حضرات نے اقبال سے شرفِ ملاقات بھی حاصل کیا۔ مشاعرے کے آغاز سے کچھ دیر پہلے مشاعرہ کمیٹی کے چند لوگ آکر اقبال اور ان کے ساتھیوں کو اُس عالی شان ہال کی طرف لے گئے جہاں پر مشاعرہ ہونا قرار پایا تھا۔ جب وہ لوگ ہال کے صدر دروازے پر پہنچے تو وہاں اور بھی معزز عیسائی ہستیاں اقبال کے استقبال کے لیے پہلے ہی سے حاضر تھیں۔ عین اسی وقت کسی شخص نے آگے بڑھ کر کہا۔ جناب اقبال صاحب اگر عذر نہ ہو تو شعر مکمل کیجیے۔ یہ مصرع حضور کی گرہ کا محتاج ہے! اقبال نے جو نظر اٹھا کر دیکھا تو ہال کے صدر دروازے پر لٹکے سیاہ تختے پر — "دینِ احمدؐ کا گھٹے دینِ مسیحا بڑھ جائے" لکھا ہوا پایا۔ مگر اقبال جیسی نڈر اور حاضر جواب ہستی اس طرح کے اچانک ہونے والے حملے سے مرعوب ہونے والوں میں سے نہ تھی۔ آپ نے جھٹ فرمایا صاحبان۔ آپ کا یہ مصرع میرے اولی مصرعے کا ثانی ہے۔ یہ سن کر لوگ اقبال کا منہ تکنے لگے۔ تھوڑا کافی اونچا

تھا اس لئے فوراً سیڑھی پیش کی گئی دوسرے شخص نے جو ہاتھ میں چاک تھامے ہوئے تھا چاک پیش کیا آپ نے فوراً چاک ہاتھ میں تھام لیا اور اپنے رب العزت کا نام لے کر سیڑھی پر چڑھ کر لکھ دیا

ع گر براقِ نبوی سے خرِ عیسا بڑھ جائے
دینِ احمد کا گھٹے دینِ مسیحا بڑھ جائے

دیکھنے والے اُردو دانوں پر سکتے کا عالم طاری ہو گیا۔ تمام مخالفین کو منہ کی کھانی پڑی۔ اور سارا ہجوم دیکھتے کا دیکھتا رہ گیا۔ مشاعرہ کے بانی مبانی لاپتہ ہو کر رہ گئے۔

اس طرح اقبال نے شاعروں کی چند مہینوں کی مسلسل کوششوں کو دو منٹ میں خاک میں ملا کر رکھ دیا اور تمام اہلِ برطانیہ کو اور دیگر تمام تماشائیوں کو اپنی قابلیت اور اعلیٰ ذہانت کا ثبوت دے کر اسلام کی لاج رکھ لی اسی لیے مرحوم فرما گئے ہیں۔

ع مدعی لاکھ بُرا چاہے تو کیا ہوتا ہے
وہی ہوتا ہے جو منظورِ خدا ہوتا ہے

از مغان ساحل سہسرامی

چندا ماموں

دور گگن پر کیوں رہتے ہو
پیارا اشارا کیوں کرتے ہو
دل کو میرے مت تڑپاؤ
چندا ماموں پاس تو آؤ

ندی کنارے ابھی کھڑا ہوں
اس میں تم کو دیکھ رہا ہوں
غوطہ پانی میں مت کھاؤ
چندا ماموں پاس تو آؤ

تنہا شب میں کیوں چلتے ہو
مجھ کو ساتھ میں اپنے لے لو
چھوڑ کے ہرگز تم مت جاؤ
چندا ماموں پاس تو آؤ

بڑھ کر تم کو کیسے چھولوں
ساتھ تمہارے جھولا جھولوں
آؤ میرا من بہلاؤ
چندا ماموں پاس تو آؤ

جناب ریحان احمد عباسی

کالے بھوت

آج جو کہانی میں سُنا رہا ہوں، وہ امروہہ کی ایک مشہور سماجی و سیاسی شخصیت جناب مزمل اللہ خاں صاحب کی آپ بیتی ہے۔ مزمل خاں صاحب کا شمار نہ صرف اپنے ضلع مراد آباد، بلکہ یوپی (اُتر پردیش) کے نامور شکاریوں میں ہوتا ہے۔ اس واقعہ کو بیتے ہوئے، یوں تو دو سال کے قریب ہو چکے ہیں، لیکن اُس پریشانی اور طویل سسپنس کی وجہ سے جو بارہ گھنٹے تک پوری شکار پارٹی کو انتہائی خوف ناک اندیشوں اور شدید ذہنی اُلجھنوں میں مُبتلا کیے رہا، آج بھی یہ واقعہ خاں صاحب اور اُن کے ساتھیوں کو اس طرح یاد ہے جیسے کل ہی کی بات ہو۔

یہ ان دنوں کی بات ہے جب سردیوں کا موسم شروع ہو رہا تھا۔ دن کے وقت ابھی گرم کپڑے پہننے کی ضرورت نہیں پڑ رہی تھی، البتہ شام ہوتے ہی اور خاص طور سے رات میں جب برفیلے پہاڑوں کی طرف سے ٹھنڈی ہوائیں چلنا شروع ہو جاتیں تو سردی بڑھ جانے پر بغیر اوڑھے لپیٹے باہر نکلنے کو جی نہ چاہتا تھا۔ ایسے نرم گرم موسم میں خاں صاحب نے چھ سات شکاری ساتھیوں کے ساتھ ہمالیہ کی ترائی میں پھیلے ہوئے اُس گھنے محفوظ جنگل (ریزرو فاریسٹ) میں کیمپ لگائے ہوئے تھے جو یوپی کے ایک مشہور پہاڑی قصبے کوٹ دوار کے شمال مشرق میں واقع ہے اور جہاں جنگلی مرغ، تیتر، چیتل، سانبھر، پاڑہ اور کاکڑ وغیرہ کے علاوہ لکڑ بھگے، گلدار، ریچھ اور شیر جیسے درندوں سے لے کر ہاتھی تک ہر قسم کے جانور بکثرت ملتے ہیں۔

اس طرح کے محفوظ جنگل میں شکار کھیلنے کے لیے پہلے سے منظوری یا پرمٹ حاصل کرنے کی ضرورت ہوا کرتی ہے۔ اور پرمٹ لینے والا صرف وہی اور اتنے جانور شکار کر سکتا ہے، جو اُس کے پرمٹ میں درج ہوں یا جن کے شکار کی اُسے اجازت ملی ہو۔

ایک بات اور، اگر پرمٹ لینے والا چاہے تو کچھ زائد فیس جمع کروانے کے بعد وہ اپنے دوست شکاریوں کو بھی اپنے پرمٹ کا حصّہ دار بنا سکتا ہے۔ لیکن پرمٹ میں شکاریوں کی تعداد بڑھ جانے سے شکار کیے جانے والے جانوروں کی تعداد میں اضافہ نہیں ہوتا۔ بلکہ مجموعی طور پر

پرمٹ کے مقررہ ایّام میں صرف اتنے ہی جانوروں اور پرندوں کے شکار کی اجازت ہوتی ہے، جو اصل پرمٹ میں درج ہوں۔

ریزرو فاریسٹ میں شکار کی اسی قانونی رعایت کی بنیاد پر خاں صاحب نے اپنے ایک دوست کو بھی اپنے پرمٹ میں شریک کر لیا۔ اُن کے یہ دوست یوں تو بندوقوں والے تھے اور کبھی کبھی شکار کی غرض سے یار دوستوں کے ساتھ اِدھر اُدھر جاتے بھی تھے، لیکن یا تو ان کے ہاتھ کی لکیریں شکار والی بنی ہی نہ تھیں یا اگر ایک آدھ لکیر تھی بھی تو یقیناً بہت ہلکی ہوگی کیونکہ ان کے ہاتھ شکار کم اور شرمندگی زیادہ آتی اور اس طرح وہ ہمیشہ دوستوں کے مذاق کا نشانہ بنے رہتے۔ ان کے شکاری پن کا اندازہ اسی سے لگ سکتا ہے کہ اس گھنے جنگل میں بھی جہاں قدم قدم پر جنگلی جانوروں اور پرندوں سے سامنا ہوتا تھا، وہاں بھی وہ پانچ چھ دن کی مسلسل جدوجہد اور دن دن بھر گھومتے رہنے کے باوجود اِسکور بورڈ پر اپنے نام کے سامنے کچھ بھی نہ لکھا سکے تھے۔

آخر روز روز کے مذاق اور طعنوں سے تنگ آکر وہ ایک دن یہ عہد کر کے نکلے کہ جب تک میں کچھ شکار نہ کر لوں گا، واپس کیمپ میں نہیں آؤں گا۔ اُس دن شکار کو جاتے وقت انہوں نے اپنے ساتھ صرف ایک آدمی لیا اور وہ تھا جنگل کا چوکیدار۔ چوکیدار کو ساتھ رکھنے کا فیصلہ انہوں نے کافی غور و خوض کے بعد کیا تھا۔ دراصل اُن کا ارادہ جنگل میں کافی دُور جا کر شکار کھیلنے کا تھا، اس لیے انہیں ایک ایسے ساتھی کی ضرورت بھی تھی جو جنگل کے راستوں سے خوب اچھی واقف ہو۔

غرض بڑے حوصلوں، امیدوں اور توقعات کے ساتھ جب وہ دونوں جنگل میں داخل ہوئے تو دن کے دس بج رہے تھے اور پیڑوں سے چھننے والی دُھوپ بڑا دل فریب منظر پیش کر رہی تھی۔ اس قدرتی منظر سے لطف اندوز ہوتے ہوئے جب وہ اپنی دُھن میں کافی آگے بڑھ گئے تو انہیں کچھ ہوش آیا۔ چلتے چلتے اب تھکن بھی محسوس ہونے لگی تھی اس لیے وہ وہیں بیٹھ گئے۔ ابھی وہاں بیٹھے کچھ زیادہ دیر نہ ہوئی تھی کہ انہیں اپنے پیچھے جھاڑوں میں سوکھے پتّوں پر کسی چیز کے چلنے کی آواز سنائی دی جو یقیناً کسی جانور کی ہو سکتی تھی۔

شکار کو اتنے قریب پا کر خوشی کے مارے ان کے ہاتھ پیر پھُولنے لگے۔ رائفل میں کارتوس پہلے ہی ڈال لیے گئے تھے۔ اس لیے وہ تیار ہو کر بیٹھ گئے۔ آواز کی طرف کان لگانے سے ایسا محسوس ہوا جیسے وہ جانور جھاڑیوں سے کچھ توڑ توڑ کر کھا رہا ہے۔ فوراً خیال ہوا کہ کوئی ہرن ورن ہوگا لیکن کچھ دیر بعد جب ایسا لگا کہ پنجوں سے زمین کھرچنے کی کوشش بھی ہو رہی ہے تو ان کی طبیعت گھبرائی کہ کہیں کوئی درندہ تو اِدھر نہیں آگیا۔ وہاں سے بھاگنے کا موقع نہ تھا۔ اس لیے آوازوں کی بنیاد پر یہ سمجھنے کی کوشش کرنے لگے کہ وہ کیا ہو سکتا ہے، ہرن، لگڑ بھگّا یا کچھ اور؟ کہ اتنی دیر میں کوئی بیس پچیس گز کے فاصلے پر اُس نے خود ہی انہیں اپنی صورت دکھادی وہ بڑے بڑے گھنے کالے بالوں والا ایک

ست ٹکم تھا جو پچھلے پیروں سے بیرا اور اُن
کی مدد میں کھود کھود کر کھاتا پھر رہا تھا۔ ریچھ کو دیکھتے
ہی ان کا سانس اوپر کا اوپر اور نیچے کا نیچے ہی تو رہ گیا
لیکن جب کافی دیر تک بیٹھے رہنے کے باوجود اس کی طرف
سے کوئی خطرے کی بات محسوس نہ ہوئی اور اُسے برابر
اپنے کام میں مصروف پایا تو اُن کی بھی ہمت بندھی
اور ان کے دل میں یہ خیال کروٹیں لینے لگا کہ کیوں
نہ ریچھ کا ہی شکار کر لوں۔ پرمٹ میں ایک ریچھ
بھی دیا تھا۔ اس لیے اس کے مارنے میں حرج بھی
نہ تھا۔ انہوں نے سوچا کہ اتنا اچھا اور عمدہ موقع
پھر شاید نہ ملے۔ کیونکہ ریچھ اتنا قریب ہے کہ ایک
ہی گولی اُسے ٹھنڈا کر دے گی اور اس طرح نہ صرف
پرانے داغ دھبے دور ہو جائیں گے بلکہ میں پوری
شکار پارٹی کا ہیرو بھی بن جاؤں گا۔

ریچھ کے شکار کا فیصلہ کرنے کے بعد انہوں نے
جلدی سے رائفل کو چلانے کی پوزیشن میں کیا اور
اپنے حساب سے خوب اطمینان کا نشانہ لے کر گولی
چلا دی ایک زوردار دھماکے کی آواز ہوئی اور
دوسرے ہی لمحے کسی کے بہت زور سے چیخنے کی
آواز بھی۔ یہ آواز بالکل ایسی تھی جیسے کوئی عورت
یا بچہ شدید چوٹ لگ جانے کی وجہ سے ایک دم
چیخ پڑا ہو اس لیے ایک دفعہ تو یہ گھبرا ہی گئے کہ
گولی کسی عورت یا بچے کے تو نہیں لگ گئی لیکن جب
اپنی آنکھوں کے سامنے ریچھ کو ہی انسانوں کی
طرح روتے اور چیختے چلاتے دیکھا تو ان کی
حیرت کی انتہا نہ رہی۔ اب نہیں کہا جا سکتا کہ یہ
ان کا تھا یا نشانے کی خرابی، گولی بجائے سینے یا
سر پر لگنے کے ٹانگ میں لگ گئی تھی اور ہڈی ٹوٹ
جانے کی وجہ سے ریچھ جو اصل میں ایک مادہ
ریچھنی تھی۔ بری طرح چیخنے چلانے پر مجبور ہو گئی تھی۔
ریچھنی کو انسانوں کی طرح روتے چلاتے دیکھ کر
وہ اس بری طرح بوکھلائے کہ دوسرا فائر بھی نہ
کر سکے۔ ریچھ کو روتے ہوئے مشکل سے ایک دو منٹ
ہی گزرے ہوں گے کہ اس کی آواز پر وہاں ایک
اور ریچھ آ گیا۔ ریچھ کے بھاگ کر آنے اور بار بار
پچھلے پیروں پر کھڑے ہو کر اِدھر اُدھر دیکھنے سے
صاف معلوم ہوتا تھا کہ وہ معاملے کی تہ تک پہنچ
چکا ہے اور اُسے دشمن کی تلاش ہے

انہوں نے جو یہ نئی صورتِ حال دیکھی تو ضبط
کا یارا نہ رہا اور بے اختیار چوکیدار کو آواز دیتے
ہوئے وہاں سے بھاگ کھڑے ہوئے۔ ریچھ نے
اب اُنہیں اچھی طرح دیکھ لیا تھا۔ اس لیے وہ بھی
غصے میں بھڑ بھڑ، کی آوازیں نکالتا ہوا ان کے پیچھے
لپکا۔ اب یہ آگے آگے اور ریچھ پیچھے پیچھے بھاگتے
بھاگتے انہیں محسوس ہوا کہ پیچھا کرنے والا ایک نہیں
بلکہ دو ریچھ ہیں اور وہ آہستہ آہستہ ان کے قریب
آتے جا رہے ہیں۔ انہوں نے بھاگتے بھاگتے
رائفل بھری اور ایک جگہ اچانک رُک کر ریچھوں
کی طرف ہوائی فائر کر دیا تاکہ وہ ڈر کر بھاگ
جائیں۔ ریچھ اس فائر سے ٹھٹھکے ضرور، لیکن رُکے
نہیں یہ پھر بھاگے اور کچھ دور نکلنے کے بعد انہوں نے
ایک بار پھر ہوائی فائر کر کے اُنہیں روکنے کی
کوشش کی، لیکن نتیجہ اس بار بھی اُمید کے خلاف
نکلا اور ساتھ ہی ان پر یہ بھی انکشاف ہوا کہ چوکیدار

ان کے ساتھ نہیں، بہرحال وہ اس انجان جنگل میں اکیلے رہ گئے ہیں اور دوسرے یہ کہ اب وہ کسے بجائے تین ریچھ ان کا پیچھا کر رہے ہیں۔

اس دن جب شام کے اندھیرے پھیل جانے کے باوجود وہ دونوں واپس نہ آئے تو ساتھیوں کو تشویش ہوئی کہ کہاں رہ گئے۔ اس کے بعد ایک دو گھنٹے اس اُمید میں گزر گئے کہ ممکن ہے اب آتے ہوں لیکن جب انتظار کرتے کرتے رات کے نو بج گئے، تو سب لوگ پریشان ہو اُٹھے، فوراً ہی دو الگ الگ پارٹیاں بنا کر جنگل کی طرف روانہ کی گئیں کہ وہ اُنھیں تلاش کریں، لیکن دُور دور تک کوئی سُراغ نہ ملا، زور زور سے آوازیں دی گئیں اور ہوائی فائر بھی کیے گئے لیکن ان کی طرف سے کوئی جواب نہ ملا، اب آدھی رات گزر چکی تھی۔ اس لیے ڈھونڈھنے والے تھک ہار کر کیمپ واپس آگئے۔

اُس رات پوری شکار پارٹی ایک منٹ کے لیے بھی نہ سو سکی۔ سب کے دلوں میں بُرے بُرے اندیشے پیدا ہو رہے تھے، اس لیے ایسے میں نیند آتی بھی کیسے۔ آخر جیسے تیسے رات کٹی، جلدی جلدی اُلٹا سیدھا ناشتہ کیا گیا۔ اور سب لوگ ایک بار پھر اُنھیں تلاش کرنے کے لیے نکل پڑے۔ ابھی کیمپ سے دو تین سو گز دور گئے ہوں گے کہ کیا دیکھتے ہیں کھوئے ہوئے شکاری لنگڑاتے ہوئے چلے آرہے ہیں، کپڑے پھٹے ہوئے چہرے اور ہاتھ پیروں پر جگہ جگہ کانٹے لگنے کے نشان، سردی سے کانپتے ہوئے، منہ پر ہوائیاں اُڑی ہوئی ——

دیکھتے ہی سب لوگ ان کی طرف دوڑ پڑے اور سوالوں کی بوچھار شروع ہو گئی۔ کہاں تھے؟ کیا ہوا؟ چوکیدار کہاں ہے؟

کیمپ واپس آنے پر جب وہ جواب دینے کے قابل ہوئے تو معلوم ہوا کہ ریچھوں نے اُنھیں کافی دور تک رپٹایا تھا۔ ریچھ شاید ان کی تکا بوٹی ہی کر ڈالتے لیکن کچھ تو اپنی چُندھی آنکھوں کی وجہ سے اور کچھ ان ہوائی فائروں کی وجہ سے جو وہ بار بار کرتے رہے، ریچھ واپس چلے جانے پر مجبور ہو گئے۔ ریچھوں کے چلے جانے کے بعد اُنھوں نے کیمپ پہنچنے کی بہت کوشش کی لیکن اندھیرا پھیل جانے کی وجہ سے وہ کامیاب نہ ہو سکے۔ وہ رات سردی میں ٹھٹھرتے کپکپاتے بڑی بے آرامی کی حالت میں ایک پیڑ پر بیٹھے رہے۔ کچھ دیر بعد چوکیدار بھی واپس آگیا۔ اس کی کہانی اور حالت بھی ان سے مختلف نہ تھی۔

شوکت پردیسی

ٹلّو کی ٹافی!

ٹلّو مگن تھے اپنی چھت پر
دیکھ رہے تھے اندر باہر
اتنے میں آیا کوّا اُڑ کر
ٹلّو کی ٹافی لے گیا کوّا!
رہ گئے ٹلّو ہاتھ بڑھا کے

ٹلّو کو آئی ایسی رُلائی!!
دینے لگے سب لوگ دہائی
پھر بھی وہ ٹافی ہاتھ نہ آئی
ٹلّو کی ٹافی لے گیا کوّا!
رہ گئے ٹلّو ہاتھ بڑھا کے

ڈھونڈھ کے آخر سو گئے ٹلّو!
سپنوں کی نگری میں کھو گئے ٹلّو!
اُمّی سے راضی بھی ہو گئے ٹلّو!
ٹلّو کی ٹافی لے گیا کوّا!
رہ گئے ٹلّو ہاتھ بڑھا کے

ضیا ھانی

ایکتا کا گیت

مہ و انجم فلک سے توڑ لاؤ
سجاؤ دامنِ ہستی سجاؤ
سراپا شمع بن کر جگمگاؤ
مٹاؤ تیرگیِ شب مٹاؤ
جوانو! ایکتا کا گیت گاؤ

یہ ہے وہ وقت جاں پر کھیل جاؤ
بھنور میں ڈوبتی کشتی بچاؤ
سرِ ساحل تماشہ دیکھتے ہو؟
تمہیں کیا ہو گیا ہے ناخداؤ
جوانو! ایکتا کا گیت گاؤ

دیوالی عید کا یار و ملن ہے
ملو دل سے گلے اور مسکراؤ
ہمیں پُرکھوں سے یہ ورثہ ملا ہے
ہر اک تہوار سب مل کر مناؤ
جوانو! ایکتا کا گیت گاؤ

(ایک کرغیز کہانی)

چاند اور ننھّی لڑکی

یہ تو کسی کو یقین کے ساتھ نہیں معلوم کہ ایسا ہوا تھا یا نہیں، مگر کہتے ہیں کہ کسی زمانے میں ایک ننھّی سی یتیم بچّی تھی، اس کے ماں باپ مر گئے تھے اور اس کے لیے بس صرف ایک اونٹ چھوڑ گئے تھے۔

اس نے اونٹ کو بیچ کر اپنے لیے کپڑے بنائے اور روٹی خریدی۔ آخر جب وہ کپڑے بھی پھٹ کر تار تار ہو گئے اور روٹی بھی ختم ہو گئی تو وہ اپنے ایک دُور کے رشتہ دار کے یہاں مدد مانگنے گئی۔ وہ رشتہ دار ایک امیر آدمی تھا مگر تھا بہت کنجوس اور اس کی بیوی اس سے بھی زیادہ بدمزاج اور کنجوس تھی۔ ان دونوں نے بچّی کو اپنی خدمت کے لیے رکھ لیا۔

اب وہ یتیم بچّی رات دن محنت کرتی لیکن

لاتی، آگ سلگاتی، پورتا (گول جسم) میں جھاڑو بہارو دیتی، گائے دوہتی اور پانی بھر کے لاتی۔ اوپر سے وہ امیر اور اس کی بیوی ہمیشہ اس کو پھٹکارتے اور بڑی بے دردی سے مارتے رہتے۔

بے چاری لڑکی نے نہ جانے کتنے آنسو بہا دیے ہوں گے۔

ایک رات بڑی سردی تھی مگر امیر اور اس کی بیوی نے لڑکی کو دریا پر سے دو بالٹی پانی بھر کے لانے کو کہا اور بالٹیوں کے ساتھ اسے ایک گنڈاسا دیا کہ اس سے دریا پر جمی برف کاٹ کر نیچے سے پانی نکال کے لائے۔

لڑکی دریا پر پہنچی، بڑی مشکل سے اس نے برف میں چھید کیا، دونوں بالٹیوں میں پانی بھرا اور گھر واپس چلی۔ سردی اتنی تھی کہ اسے لگ رہا تھا جیسے اس کا دل جم کر رک جائے گا اور انگلیاں تو خیر بالکل سن ہو ہی گئی تھیں۔

تھکن کے مارے وہ ٹھوکر کھا کر گر پڑی، پانی بہہ گیا۔ اب اس میں اتنا دم بھی نہ تھا کہ پھر دریا پر جاتی اور یہ بھی ڈر لگ رہا تھا کہ اگر خالی ہاتھ گھر پہنچی تو وہ دونوں میاں بیوی مارتے مارتے بے دم کر دیں گے۔

وہ کھڑی روتی رہی، سردی کے مارے دہن کے گالوں پر بہتی ہوئے آنسوؤں کی بوندیں برف ہو گرتے ہی ننھے ننھے اولے بنتی جا رہی تھیں۔

ننھی بچی کا دل تڑپ رہا تھا کہ کوئی اسکی فریاد سنے۔ کسی سے وہ اپنی بدنصیبی کا حال کہے مگر دور دور تک کوئی متنفس نہ تھا۔ کیونکہ سب ہی جان دار اپنے اپنے بسیروں اپنے اپنے گرم گھروں میں چھپے بیٹھے تھے۔

البتہ اس کے آنسوؤں کو چاند نے دیکھا کہ وہ کھلے آسمان پر ادھر سے اُدھر تیر رہا تھا اور ایسا لگا کہ چاند کو اس پر ترس آیا۔ بچی کھڑی رہی اور برف کی تہ موٹی ہوتی گئی۔

پھر جب اس سے اور برداشت نہ ہو سکا تو اس نے چاند کی طرف نگاہیں اُٹھا کر التجا کی۔ "مجھ پر ترس کھا، مجھے اپنے ساتھ لیتا چل۔ جب سے امی ابا مرے مجھ سے کسی نے پیار کا ایک لفظ بھی نہیں کہا۔ امیر اور اس کی بیوی مجھ کو گالیاں دیتے ہیں۔ مارتے ہیں۔ ہائے اس دنیا میں کسی کو مجھ پر رحم نہیں آتا۔"

چاند یہ الفاظ سن کر فوراً اُترا اور لڑکی کے پیروں میں آ گرا لیکن ننھی لڑکی کی یہ فریاد سورج نے بھی سن لی تھی اور جیسے ہی چاند نیچے آیا، سورج بھی لڑھکتا ہوا زمین پر آ کر چاند کے برابر میں رک گیا۔ اسے وہ بچی بہت پیاری لگی اور وہ بالکل نہیں چاہتا تھا کہ چاند کو اسے لے جانے دے مگر چاند نے اس کی خوشامد کرنی شروع کی "بڑے بھائی سورج دیکھو نا، تم تو دنیا کی ہر چیز میں جان ڈال دیتے ہو، تمہاری کرنیں پڑتے ہی پتیوں، پودوں میں زندگی آ جاتی ہے۔ تم اتنے بڑے دل والے ہو، پھر مجھے اس ننھی یتیم بچی کو لے جانے دو نا۔ تم تو دن بھر آسمان پر راج کرتے ہو۔ نیچے دنیا میں ہونے والے سب دلچسپ تماشے

دیکھ سکتے ہو، میں تو چاڈوں کی سنسان راتوں میں، اکیلا اور خاموش، آسمان بھر کا سفر طے کرتا ہوں کیونکہ زندگی والی ہر چیز تو چھپ جاتی ہے، اور پودے تو برف سے ڈھک جاتے ہیں، تو سورج بھائی تم از کم اس بچّی کو ہی میرے ساتھ رہنے دو۔ چاند کی باتوں پر سورج کا دل بھر آیا اور اس نے چاند کی بات مان لی۔

چاند نے ننھی یتیم بچّی کو بڑے پیار سے "چوما" اپنے سینے سے لگایا اور پھر اس کی بالٹیاں اٹھائیں اور سب کچھ لے کر آسمان کی طرف اُڑ گیا۔

ذرا کبھی چاند کو غور سے دیکھنا۔ مگر رات کا کہر صاف ہو۔ تو تمہیں وہ ننھی بچّی وہاں دکھائی دے گی۔ اس کے کندھوں پر رکھی وہ بہنگی بھی نظر آئے گی۔ جس کے سروں پر بالٹیاں رکھی ہوئی ہیں۔

ننھی بچّی کو چاند سے بہت ہی پیار ہو گیا ہے اور چاند بھی اس ننھی سی یتیم بچّی کو بہت چاہتا ہے ۔۔۔ اور اب وہ دونوں ہمیشہ ساتھ ساتھ آسمان پر تیرتے ہیں۔

(بشکریہ سوویت دیس)

(بقایا صفحہ ۳۳)

سے کوئی پانچ میل دور تھا۔ اتنا چلنے کے بعد ایک چھوٹا سا کھیت پاکر سپہ سالار آگ بگولا ہو گیا۔

"یہ کھیت تو اُس سے بہت ہی چھوٹا ہے اور دور بھی، تم ہمیں یہاں کیوں لے آئے؟" کسان نے بڑے سکون اور اطمینان سے جواب دیا: "حضور! آپ کو جو تکلیف اٹھانی پڑی اُس کا مجھے بے حد افسوس ہے۔ لیکن آپ ناراض نہ ہوں۔ یہ میرا کھیت ہے۔ پہلے والا میرا نہیں تھا۔ یہی وجہ ہے کہ میں آپ لوگوں کو یہاں لے آیا ہوں۔"

سپہ سالار کی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی۔ اس کا غصّہ شرمندگی میں تبدیل ہو چکا تھا۔ وہ شرم کے مارے کسان کی طرف آنکھ اُٹھا کر بھی نہ دیکھ سکا۔ چند منٹ بعد اُس نے دھیمی آواز میں اپنے ساتھیوں سے کہا: "اس کھیت سے اناج مت کاٹو، ہم کسی دوسرے کھیت میں جائیں گے۔"

(انگریزی سے آزاد ترجمہ)

جناب جمال الدین (شاہجہانپوری)

عہدِ قدیم کے عجیب جانور

لاکھوں سال قبل ہماری دنیا میں جو جانور پائے جاتے تھے ان کی شکلیں بہت عجیب و غریب اور بے ڈھنگی ہوتی تھیں۔ ابھی انسان اس دنیا میں نہیں آیا تھا اس لیے دنیا پر انہیں جانوروں کی حکمرانی تھی۔ ان کا قد اتنا لمبا تھا کہ خدا کی پناہ ان کے سامنے تو ہاتھی بھی ننھا منا جانور نظر آتا تھا۔ یہ جانور زمانے کا ساتھ نہ دے سکے۔ اور رفتہ رفتہ ختم ہوتے گئے لیکن ان کی نسل ختم نہ ہوئی۔ اس لیے ماہرین کا خیال ہے کہ اس دنیا میں جو بڑے بڑے جانور پائے جاتے ہیں ان کا خاندان انہیں جانوروں سے ملتا ہے۔

پرانے زمانے کے جانوروں کے متعلق جاننے کا بہت بڑا ذریعہ ہڈیوں کے وہ ڈھانچے ہیں جو ماہرین کو مختلف جگہوں سے کھدائی کے بعد دستیاب ہوئے ہیں۔

ٹوسل نام کا ایک جانور آج سے بیس کروڑ سال پہلے اس دنیا میں موجود تھا۔ اس طرح ایک اور جانور کے ڈھانچے ملے ہیں جس کی شکل وصورت قدیم زمانے کے مسلح سپاہی سے ملتی جلتی تھی اور حیرت کی بات یہ ہے کہ یہ جانور آج بھی امریکہ کے ساحلوں پر پایا جاتا ہے۔ اس کی کھال بڑی فائدہ مند ثابت ہوئی ہے۔ ماہرین اس کا پاؤڈر تیار کرتے ہیں۔ اور پھر اسے کھاد کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔

ایسے جانوروں میں ایک اور عجیب وغریب

جانور کا نام "کوئیلا کانتھ مچھلی" ہے۔ ماہرین کا خیال ہی میں اس کی ایک قسم ملی ہے۔ ۱۹۳۸ء میں جنوبی افریقہ کے ماہی گیروں نے اسے پہلی مرتبہ پکڑا۔ خیال ہے کہ اس قسم کی مچھلی تیس کروڑ سال قبل سکاٹ لینڈ کے قریب کے سمندر میں پائی جاتی تھی۔

اگر ۴۰۰ فٹ سے ۱۲۰۰ فٹ سطح سمندر سے نیچے پائی جانے والی "کوئیلا کانتھ" کا شکار کیا جائے تو اس کا رنگ بھورا ہوگا لیکن یہی مچھلی جب سطح سمندر پر لائی جائے تو اس کا رنگ فوراً بدل جاتا ہے اس کا ذائقہ انتہائی کڑوا ہوتا ہے یہی وجہ ہے کہ اس مچھلی کی نسل پرانے زمانے سے محفوظ چلی آ رہی ہے۔

ماہی گیر اس کا شکار نہیں کرتے ایک اندازے کے مطابق گذشتہ بیس سال میں ایسی درجن بھر مچھلیوں کا شکار کیا گیا۔

نیوزی لینڈ میں کیوی پائی جاتی ہے۔ اس کی تصویر آپ نے پالش کی ڈبیوں پر ہوگی۔ "کیوی" صرف نیوزی لینڈ میں پائی جاتی ہے، اس لیے اسے نیوزی لینڈ کا قومی نشان سمجھا جاتا ہے۔ اگر آپ اس کو دور سے چلتا ہوا دیکھیں تو معلوم ہوتا ہے کہ جیسے کوئی بالوں والی گیند لڑھکتی ہوئی جا رہی ہے۔

"کیوی" کی دم نہیں ہوتی۔ یہ اپنی لمبی چونچ سے نرم نرم زمین کھود کر کیڑے مکوڑوں کا شکار کرتی ہے۔ "کیوی" بہت شرمیلا جانور واقع ہوا ہے۔ اُلّو کی طرح صرف رات کی تاریکی میں باہر نکلتا ہے۔ حالانکہ وہ دن کی روشنی میں بھی بخوبی دیکھ سکتا ہے۔ جب وہ چلتا ہے تو اس کے منہ سے "کیوی کیوی" کی تیز آواز نکلتی ہے۔ اس لئے اسے کیوی کہا جاتا ہے۔ اس کے انڈے اس کے جسم کے باہر ہوتے ہیں اور کافی وزنی ہوتے ہیں۔

آسٹریلیا کے ایک اور جانور "پلاٹی پس" کا شمار بھی قدیم جانوروں میں ہوتا ہے اس کا منہ بطخ کی مانند اور کھال خچر کی طرح ہوتی ہے۔ پانی کے اندر رہنے والا یہ جانور کیڑے مکوڑوں اور مچھلیوں کو بڑی رغبت کے ساتھ کھاتا ہے مادہ "پلاٹی پس" اپنے انڈوں کو پیٹ کی ایک تہہ میں لیے پھرتی ہے، اس کے پیٹ کو چلتا پھرتا گھونسلا کہا جا سکتا ہے۔

افریقہ کے جنگلوں میں ایک جانور "اوکاپی" رہتا ہے، جسے لوگ پُراسرار جانور کہتے ہیں۔ شکاریوں نے اسے پکڑنے کی بہت کوششیں کی تھیں لیکن وہ کامیاب نہ ہوئے۔

اس کا قد گائے کے برابر، سر زرافہ جیسا اور گردن کچھوے کی مانند ہوتی ہے۔ "اوکاپی" کو پہلی مرتبہ ۱۹۰۰ء میں پکڑا گیا تھا رنگ جسم زرافہ سے ملتا جلتا ہوتا ہے۔ جس کا ڈھانچہ ہالینڈ کے فیلس اوماک میوزیم میں محفوظ ہے۔ اس کا شکار دوبارہ اب تک کیوں نہیں کیا گیا اس کی کئی وجوہ ہیں۔ اوّل تو یہ کہ یہ جانور بہت خطرناک ہوتا ہے اس کے سونگھنے کی حس اتنی تیز ہوتی ہے کہ دور سے شکاری کی بو پا لیتا ہے اور دوسرے یہ کہ یہ کانگو کے جنگلوں میں رہتا ہے جہاں شکاری بہت کم جانے کی جرأت کرتے ہیں۔

مناظر عاشق ہرگانوی

چالاک لومڑی

(تبت کی لوک کہانی)

ایک لومڑی تھی۔ کہیں جا رہی تھی کہ راہ میں اسے ایک شیر ملا۔ شیر بھوکا تھا لومڑی کو دیکھتے ہی بولا "میں تمہیں کھاؤں گا"۔

لومڑی بہت سٹپٹائی۔ لیکن جلدی سے بولی "شیر بادشاہ! میری جان بخشی کرو۔ بھلا میرے جیسے ذرا سے جانور کو کھانے سے تمہارا کب پیٹ بھرے گا۔

شیر غرایا "لیکن میں سخت بھوکا ہوں"۔

لومڑی نے چکنی چپڑی باتیں شروع کیں۔ "آپ بھوکے رہ جائیں یہ تو بڑی بری بات ہوگی، پھر تو مجھے کچھ تلاش کرنا چاہیے آپ کے کھانے کے لیے"۔

شیر نے منہ پھاڑ کر پوچھا "کیا شے ہوگی وہ؟"

"پہاڑیوں کے پیچھے ایک غار میں بہت سے یاک (سانڈ) رہتے ہیں۔ ان سے موٹا تازہ شکار آپ کو نہیں ملے گا۔ ہاں یہ اور بات ہے کہ آپ ڈر جائیں"۔ لومڑی نے چالاکی سے آنکھیں جھپکاتے ہوئے کہا۔

غصے سے شیر کا چہرہ تمتما اٹھا اور مونچھوں کے بال کھڑے ہو گئے۔ اس نے ایک زہر خند کے ساتھ لومڑی کو گھورتے ہوئے کہا "میں اور ڈر

بھاؤں! کون ہے مجھے ڈرانے والا؟ کدھر ہے وہ؟ مجھے فوراً وہاں لے چل۔"

لومڑی شیر کو لے کر غار کی طرف چل پڑی۔ وہاں پہنچی تو غار خالی تھا۔ پاک کہیں باہر گئے تھے۔ شیر غار میں دھرنا مار کر بیٹھ گیا اور لومڑی کو اس نے حکم دیا کہ باہر بیٹھ کر سانڈوں کے آنے کی راہ تکتی رہے۔ ذرا دیر نہ گزری تھی کہ لومڑی بھاگی بھاگی اندر پہنچی اور ہانپتے ہوئے بولی "شیر بادشاہ! آرہے ہیں وہ! بڑے طاقتور ہیں، ہمت نہ ہارنا۔"

شیر غرایا "میرے جبڑے کیا بڑے نہیں ہیں؟" اتنا کہہ کر اس نے اپنا منہ پھاڑا۔ پھر بولا "کیا سمجھتی ہے تو، دیکھا ہے مجھے کبھی؟ نہیں دیکھا ہے تو آج اور ابھی دیکھنا ہے۔"

لومڑی تو شیر کی چاپلوسی کر ہی رہی تھی۔ جھٹ بولی "ہاں! ہاں! کیوں نہیں۔ آپ کے جبڑے تو غار کی طرح مہیب اور چٹان کی طرح سخت ہیں اور تن و توش کی نہ پوچھیے کیا بات ہے واہ۔"

شیر نے خوش ہو کر لومڑی کو حکم دیا کہ باہر نکل کر دیکھے، کیا پاک قریب آ گئے ہیں۔ لومڑی باہر گئی اور الٹے پاؤں ہانپتی کانپتی واپس ہوئی "جی ہاں بالکل پاس آ گئے ہیں۔"

شیر نے اسے سامنے سے ہٹ جانے کا حکم دیا اور انگڑائیاں لے کر اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کی کمر چست تھی۔ دُم کھڑی ہوئی۔ نگاہیں غار کے دہانے پر جم کر رہ گئیں، جوں ہی پہلا پاک غار میں داخل ہوا، شیر نے جھپٹ کر اس کی گردن دبوچی اور اپنا پنجہ جما دیا۔ دوسرے پاک ڈر کر بھاگ گئے۔ شیر نے مزے سے اپنا شکار چٹ کیا۔ اور غرور سے دُم ہلائے، مونچھوں کو تاؤ دیتا جھاڑیوں میں گم ہو گیا

اِدھر لومڑی نے بھی بچا کھچا شکار کھا پی کر جنگل کی راہ لی۔

راستے میں اسے ایک خرگوش ملا۔ لومڑی نے سوچا کیوں نہ خرگوش پر دھونس جمائی جائے جس طرح شیر نے اس کے دل پر اپنی ہیبت کا سکہ جمایا تھا۔ اسی کی نقل کرتی ہوئی لومڑی خرگوش سے بولی "دیکھا ہے مجھے؟" اور اس نے اپنے جسم کو پھلایا "خوف آیا تمہیں میرا جبڑا دیکھ کر"

خرگوش سمجھ گیا کہ لومڑی خواہ مخواہ اپنی طاقت پر پھولی ہوئی ہے۔ اسے سزا ضرور ملنی چاہیے۔ وہ اطمینان سے بولا "ٹھیک ہے، تمہارا منہ میرے منہ سے بڑا ہے، لیکن تم اتنی شور ما تو نہیں لگتیں مجھے۔"

لومڑی آسانی سے ہار ماننے والی نہ تھی۔ ڈینگ مارتے ہوئے بولی "لیکن مجھے جنگلی سانڈوں کو پچھاڑتے ہوئے دیکھو گے تب یہ بات نہیں کہو گے۔"

خرگوش نے انجانے بن کر کہا "اچھا! یقین نہیں آتا۔"

اور تب لومڑی خرگوش کو جنگلی پاک کے پاس لے گئی اور شیر کو جس طرح تمکنت سے غار میں بیٹھے دیکھا تھا اسی طرح بڑے ٹھسّے سے خود بھی جا بیٹھی اور بے رُعب آواز میں گرجی

(باقی ص۱۲ پر)

شیر خاں رنگیلا

سچی عید

احمد ایک غریب آدمی ہے۔ اس کے
کاندھوں پر ایک بیوی اور تین بچوں کا بوجھ ہے،
پہلے وہ فٹ پاتھ پر پھل بیچا کرتا تھا لیکن ایک
دن میونسپلٹی نے لائسنس نہ ہونے کی وجہ سے
اس کے تمام پھل ضبط کر لیے۔ تب سے وہ
ایک مہینے تک بے کار پھرتا رہا۔ اس نے نوکری
کے لئے ہر جگہ دروازے کھٹکھٹائے۔ لیکن ناکامی
اس کا منہ چڑا رہی تھی۔ اس کی بے روزگاری کی
وجہ سے گھر کی حالت بہت ہی خراب ہو چکی تھی،
یہاں تک کہ فاقے کی نوبت آ گئی تھی۔ آخر ایک
دوست کے توسط سے احمد کو سیٹھ عبداللہ کے
یہاں چپراسی کی نوکری مل گئی۔

عید سر پر آ چکی ہے گھر میں روپے نہیں ہیں
نوکری ملے ابھی ایک ہی ہفتہ ہوا ہے۔ تنخواہ کو
تین ہفتے باقی ہیں۔ بیوی اور بچوں کے لیے نئے
کپڑے خریدنے ہیں۔

احمد نے لوگوں سے قرض مانگا مگر ناکامی ہوئی۔

عید کو اب صرف دو ہی دن باقی ہیں۔ آخر
احمد نے ہمت کرکے سیٹھ عبداللہ سے اپنی غریبی
کا رونا رو ہی دیا۔ سیٹھ عبداللہ کافی رحم دل آدمی
تھے۔ انہوں نے اسے روپے لینے کے لیے کل بلایا
...... اور آج وہ روپے لئے اپنے گھر کی
طرف جا رہا تھا۔ اس کا دل خوشیوں سے لبریز
تھا۔ اس کے انگ انگ سے مسرت کا اظہار ہو رہا
تھا۔

محلہ رنگ برنگے قمقموں سے جگمگا رہا تھا۔
ہر ایک عید کی تیاریوں میں مصروف ہے۔

"ارے بیٹا احمد چاند دکھ گیا۔ کل عید ہے۔"
سلطان چچا نے حقے کا دم مارتے ہوئے آواز
لگائی۔

"مبارک ہو چچا" احمد نے انہیں مبارک باد
دی۔ اور گھر کی طرف چل پڑا۔

احمد کے گھر میں داخل ہوتے ہی بچے اس سے
لپٹ گئے۔ اور نئے کپڑوں کے لیے ضد کرنے
لگے۔

احمد کی بیوی نے چائے کی کیتلی چولہے پر سے
اتارتے ہوئے پوچھا۔

"آپ سیٹھ صاحب کے پاس گئے تھے۔ انہوں نے

مدد کی"

"مدد کیا یہی کم ہے بیگم کہ انہوں نے مہینہ بھر کی تنخواہ ایک ہفتہ میں ہی دے دی"

"اللہ ان کا بھلا کرے" احمد کی بیوی نے ہاتھ اٹھا کر انہیں دعائیں دیں۔

"دیکھو بیگم! میں ابھی تم سب کے لیے کپڑے لینے جا رہا ہوں۔ ساتھ ہی میوے بھی لیتا آؤں گا"

"پہلے آپ چائے تو پیتے جائیے" احمد کی بیوی نے چائے کی پیالی دیتے ہوئے کہا۔

"اچھا لاؤ بیگم"

احمد نے چائے کی پیالی لے لی اور ایک گھونٹ میں ہی چائے کی پیالی خالی کرتے ہوئے بازار کی طرف چل پڑا۔

بازار بھی آج بجلی کے قمقموں سے جگمگا رہا تھا۔ لوگوں کی بھیڑ جوق در جوق بڑھتی ہی جا رہی تھی۔ احمد بھی لوگوں میں شامل ہو گیا۔ وہ ہر دوکان پر رک کر وہاں کی چیزیں دیکھتا اور پسند نہ آنے پر آگے بڑھ جاتا۔ آخر اس نے اچھے داموں پر تمام ضرورت کی چیزیں خرید لیں، اور گھر جانے کے لیے فٹ پاتھ پار ہی کر رہا تھا کہ اس کی نظر ایک طرف اٹھ گئی۔ جہاں یتیم خانے کے بہت سے چھوٹے چھوٹے معصوم بچے ہاتھوں میں پوسٹر لیے اور جھولی پسارے کھڑے تھے۔ ان پوسٹروں پر لکھا تھا۔

"ان یتیم اور غریب بچوں کی مدد کیجیے۔ انہیں بھی عید کی خوشیوں میں شریک ہونے کا موقع دیں"

احمد کے قدم غیر ارادی طور پر اس طرف اٹھ گئے اور اس نے تمام خریدی ہوئی چیزیں ان کی جھولی میں ڈال دیں اور گھر جانے والی سڑک کی طرف چل پڑا۔

آج اس کا دل انجانی مسرت سے چہک رہا تھا۔ جتنی خوشی اسے سامان خرید کر نہیں ہو رہی تھی۔ اس سے کئی گنا زیادہ خوشی ان یتیموں کو سامان دے کر ہو رہی تھی۔

لطیفہ:۔

استاد: جنت اور دوزخ کے بارے میں بتانے کے بعد) جو بچے جنت جانا چاہتے ہیں وہ اپنا ہاتھ اٹھا دیں۔

بچے (ایک ساتھ ہاتھ اٹھا کر) ہم سب تیار ہیں۔

استاد۔ کیوں پروین: تم نے ہاتھ کیوں نہیں اٹھایا؟

پروین:۔ چاہتی تو میں بھی ہوں مگر امی جان نے کہا تھا کہ اگر اسکول سے سیدھے گھر نہیں آئی تو ٹانگیں توڑ دوں گی۔

م۔ا۔ بے نام

نصیب اپنا اپنا

قدیم زمانہ کی بات ہے کہ سندھ نگر میں ایک راجہ راج کرتا تھا جس کا نام بیربل تھا۔ راجہ بہت گھمنڈی تھا۔ وہ اس بھول میں تھا کہ وہی سب کو روزی دیتا ہے اور وہی بھگوان ہے۔ راجہ کی سات لڑکیاں تھیں۔ وہ ان سے بہت پیار کرتا تھا۔ ایک دن راجہ نے ساتوں لڑکیوں کو دربار میں طلب کیا۔ سب آکر ادب سے دربار میں بیٹھ گئیں۔ راجہ نے سب سے پہلے اپنی بڑی لڑکی کو اپنے سامنے بلایا۔ اور بولا "بیٹی... آج میں تم سے ایک سوال کا جواب چاہتا ہوں؟"

"فرمائیے ابا جان..." بیٹی نے بڑے ادب سے کہا۔

"بیٹی تم کس کا دیا ہوا رزق کھاتی ہو۔"

"ابا جان آپ کا دیا ہوا۔"

راجہ یہ جواب سن کر بہت خوش ہوا اور اسے انعام دے کر رخصت کیا۔ یہی سوال راجہ نے اپنی دوسری لڑکی کے سامنے رکھا۔ اس نے بھی وہی جواب دیا۔ اس طرح راجہ کی چھ بیٹیوں کا ایک ہی جواب تھا۔ جب راجہ نے یہی سوال اپنی سب سے چھوٹی بیٹی سے پوچھا تو اس نے جواب دیا۔ "ابا جان میں اپنے نصیب کا رزق کھاتی ہوں۔" راجہ کو اس سے ایسے جواب کی توقع نہ تھی۔ اس لیے وہ غصہ سے آگ بگولا ہو گیا۔ اس سے پہلے کہ راجہ کا غصہ جوالا مکھی بن کر پھٹے ایک فقیر کی صدا آئی۔ راجہ نے فوراً اس فقیر کو دربار میں طلب کیا۔ دربار میں موت کی سی خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ ہر ایک کے دل کی دھڑکنیں بڑھ گئیں تھیں۔ ہر ایک راجہ کے غصہ سے ڈرتا تھا اور اپنی شامت سمجھتا تھا۔ نہ جانے یہ غصہ کس پر پھٹ پڑے۔

"جا۔ اسے لے جا۔۔!" راجہ نے اپنی چھوٹی لڑکی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اس نوعمر فقیر سے کہا۔ جو کہ ایک طرف سر جھکائے کھڑا تھا۔ شاید فقیر بھی راجہ کے غصہ کو جانتا تھا۔ اسلئے چپ چاپ چھوٹی شہزادی کو لے کر نکل گیا۔ کسی میں بھی اتنی ہمت نہ تھی کہ راجہ کو ایسا قدم اٹھانے

...رو کتا۔

رات دن آپس میں آنکھ مچولی کھیلتے رہے ...اس طرح دو سال کا طویل عرصہ اس حادثہ کو پیش آئے گزر گیا۔ راجہ نے اپنی بیٹی کی یاد بالکل اپنے دل سے نکال دی۔ ایک دن راجہ کو ایک دعوت نامہ (جنم دن کا) وصول ہوا۔ "ابھاگن شہزادی" راجہ بھیجنے والے کا نام پڑھکر سوچ میں پڑ گئے۔ پتہ جڑسے غائب تھا۔ اپنے وزیر سے پوچھنے پر بھی انکار میں جواب ملا۔ راجہ نے فوراً اپنے مخبروں کو روانہ کیا۔ مخبروں کے بیان پر راجہ کو یقین نہیں آرہا تھا۔ "کون ایسا ہے جس نے انجانے جنگل میں اتنا خوبصورت محل دیکھتے ہی دیکھتے کھڑا کروا دیا؟ کون ایسی ہستی ہے جس نے صرف جنم دن پر سارے شہر کو دعوت دے ڈالی ہے۔ کیا کوئی اس سے بھی بڑا اس سرزمین پر آدھمکا ہے۔؟" کئی سوال یک بیک راجہ کے دماغ میں قلابازیاں کھانے لگے اور خلاف توقع غصہ کے بجائے اس دن کا بے چینی سے انتظار کرنے لگا۔

جلد ہی دعوت کا دن بھی آن پہونچا۔ راجہ جب اپنے وزیر کے ساتھ وہاں پہونچا تو محل کی خوبصورتی و سجاوٹ دیکھ کر دنگ رہ گیا۔ ...کو ایک خوب صورت اور بہت ہی کشادہ ...بٹھایا گیا۔ ہال کی رونق دیکھنے سے ہی تعلق ...تھی قیمتی شمع دان اور جھاڑ فانوس چھت ...سے لٹک رہے تھے فرش پر دبیز قالین بچھے ...تھے جنم دن کی ساری رسم ختم ہونے کے بعد دعوت شروع ہوئی۔ دعوت میں تمام دنیا کی نعمتیں تھیں۔ سب کو چاندی کی پلیٹوں میں اور راجہ کو سونے کی تشتری میں کھلایا گیا۔ سب سے اپنی اپنی پلیٹیں ساتھ لے جانے کے لئے بھی کہہ دیا گیا۔ اس حکم پر راجہ کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ اور حسد بڑھنے لگا۔ دعوت ختم ہونے پر راجہ کو ایک خوب صورت کنیز نے پان پیش کیا۔ پان کھاتے ہی راجہ کو ایک لمحہ کے لئے اپنی چھوٹی لڑکی یاد آگئی۔ کیوں کہ وہ بھی بالکل اسی طرح کا پان لگاتی تھی۔

"کیا ابھاگن شہزادی وہی تو نہیں ہے!" ایک لمحہ کے لئے راجہ کے خیال نے زور پکڑا۔ لیکن فوراً ہی راجہ نے اس خیال کو جھٹک دیا۔ اسے تو میں نے فقیر کے ہاتھ سونپ دیا تھا۔

اسی وقت ایک کنیز نے راجہ کو رقعہ دیا جسے پڑھ کر راجہ اندر محل میں تشریف لے گئے۔ خوبصورت کنیزوں نے ان کا استقبال کیا۔

"آداب ابا جان" ایک حسین خوب صورت آواز ایک گوشہ میں پڑے پردے کے پیچھے سے ابھری۔ راجہ سکتے کے عالم میں رہ گیا۔ "تشریف رکھئے ابا جان ـــــ میں نے سب یہ آپ کو مطمئن کرنے کے لئے کیا ہے۔" راجہ کی سمجھ میں اب پوری بات آگئی تھی۔ اس نے شرم سے گردن جھکالی۔ "اس وقت جو کچھ میں ہوں یہ سب میرا نصیب ہے جو کہ خدا نے مجھ کو دیا ہے۔"

اس کے بعد شہزادی نے کہا ـــ "آپ سے بچھڑنے کا مجھے بہت دکھ ہوا۔ لیکن

ساتھ میں لو بھی بھی ہوئی کہ میں نے اپنے دل سے سچا جواب دیا۔ میں تو آپ سے التجا کرنے کو بھی لیکن پھر اسے اپنا نصیب سمجھ کر چُپ چاپ اُس فقیر کے ساتھ چلی گئی۔ میرے محسن نے میرے منع کرنے پر بھیک مانگنا ترک کر دیا اور لکڑی بیچ کر میرا اور اپنا پیٹ پالنے لگا۔ اس کے منع کرنے پر بھی میں اس کے کام میں پورا پورا اتھاؤ دینے لگی۔ شہزادی نے ایک گہری سانس لی۔

" ایک دن جب وہ پیڑ کی جڑ کاٹ رہا تھا اسکی کلہاڑی ایک پتھر سے ٹکرا گئی۔ پتھر ہٹانے پر ہم دونوں کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ پتھر کے نیچے ایک بہت بڑا گڑھا گنیوں اور اشرفیوں سے بھرا پڑا تھا۔ میں اس خزانہ کو خدا کی نعمت سمجھ کر اپنے جھونپڑے میں لے آئی۔ اور اس کا نتیجہ اب آپ کے سامنے ہے۔" شہزادی کی خاموشی ہو گئی۔

راجہ اس کے سامنے ٹھیک اسی طرح سر جھکائے بیٹھا تھا مانو کوئی مجرم جیل کی چہار دیواری میں بیٹھا اپنے کئے پر پچھتا رہا ہو۔

" میں اپنی اس جرأت کے لئے معافی چاہتی ہوں ابا جان" شہزادی کی ہچکیاں شروع ہو گئیں۔

" نہیں... نہیں... بیٹی..." راجہ نے سر اُٹھایا اس کی آنکھیں اشکوں سے بھری ہوئی تھیں۔ گنہگار میں ہوں بیٹی۔ معافی کا حق دار میں ہوں بیٹی..." راجہ کا گلا رندھ گیا

★
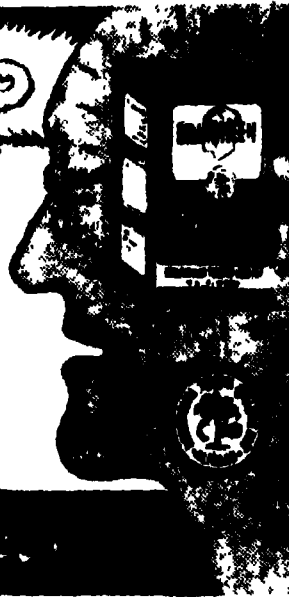
"یہ میرا کھیت ہے"

ایک بار مراٹھا فوج کے سردار باجی راؤ پیشوا نے مالوہ پر چڑھائی کی اور وہاں کئی جنگوں میں کامیابیاں حاصل کیں۔ اس کے باوجود اس کی فوج خوش نہیں تھی کیونکہ وہ اُنہیں کھانے کیلئے کافی غذا مہیا نہیں کر پاتا تھا۔

ایک دن اس نے اپنی فوج کے ایک سپہ سالار کو بلایا اور حکم دیا کہ وہ اپنے ساتھ سو بہترین جوانوں کو لے کر گاؤں میں جائے اور وہاں کے کھیتوں میں سے گیہوں کاٹ کر چھاؤنی میں لے آئے۔

سپہ سالار حکم کی تعمیل میں سو جوانوں کو لے کر روانہ ہوا۔ راستے میں اُنہیں ایک کسان ملا۔ اس سے اُنہوں نے قریب ترین کے کھیت میں لے چلنے کو کہا۔ کسان اُنہیں ایک بہت بڑے کھیت پر لے گیا۔ جسے دیکھ کر وہ بہت خوش ہوئے۔

سپہ سالار نے حکم دیا: "اناج کاٹ کر بوروں میں بھر دو۔"

یہ سننا تھا کہ کسان آگے بڑھا۔ "جناب عالی! یہاں نہیں۔ ہم دوسرے کھیت میں جائیں گے۔"

اور سپہ سالار اور جوان اس کے ساتھ دوسرے کھیت کے لئے روانہ ہوئے جو اس کھیت سے کافی دُور تھا۔ وہاں پہنچ کر کسان نے سپہ سالار سے مخاطب ہو کر کہا:

"لیجیے ہم صحیح کھیت پر آ پہنچے ہیں۔ جتنا اناج چاہیں آپ کے آدمی اس کھیت میں سے کاٹ کر لے جا سکتے ہیں۔"

یہ کھیت بہت چھوٹا اور پہلے والے کھیت

باقی صفحے پر

یوم آزادی

اگست کے شمارے میں ہم نے اعلان کیا تھا کہ یوم آزادی کی تقریب پر جو طالب علم سب سے اچھی رپورٹ بھیجے گا اس کو پانچ روپیہ کا نقد انعام دیا جائے گا۔ یہ دیکھ کر افسوس ہوا کہ صرف دو بچوں نے یہ رپورٹیں بھیجیں۔ ان میں بھی رپورٹ ایک ہی ہے۔ شاداں پرویز نے اپنی وہ تقریر بھیجی جو ۱۵ اگست کو اپنے اسکول کے جلسے میں پڑھی تھی۔ اپنی اپنی جگہ دونوں اچھی ہیں اس لئے ہم نے فیصلہ کیا ہے کہ دونوں کو پانچ پانچ روپے کے انعام دیے جائیں۔ یہ رقم دونوں کو منی آرڈر کے ذریعہ بھیجی جا رہی ہے۔ (ایڈیٹر)

جناب صدر۔

آج سے اٹھائیس سال پہلے ہمارا دیش آزاد ہوا گویا اٹھائیس سال سے ہمارے دیش میں ہمارا راج ہے۔ اٹھاون کروڑ ہندوستانیوں کا راج ہے۔ ہم نے اپنے بڑوں سے سنا ہے کہ انگریزوں کے زمانے میں ہمارے دیش کی بہت خراب حالت تھی۔ ہم مزدوری کرتے تھے اور بھوکے رہتے تھے۔ کھیتی کرتے تھے اور اناج کو ترستے تھے۔ بیمار ہوتے تھے اور ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مرتے تھے۔ نہ پڑھنے کے لیے اسکول تھے نہ رہنے کے لیے گھر۔ بہت برا حال تھا۔ ہماری دولت سے انگریز اپنے ملک میں دولت بھرتے تھے۔ ہمارا ملک کنگال ہو چکا تھا اور [illegible] بدحال ہو رہا تھا۔

جب ۱۹۴۷ء میں مہاتما گاندھی جواہر لال نہرو اور اُن کے اَن گنت ساتھیوں نے ہندوستان کو آزاد کرایا اور انگریزوں سے پیچھا چھڑایا تو ہمارے دیس کی حالت بہت خراب تھی۔ لیکن ہمارے نیتاؤں نے قوم کو محنت کرنا سکھایا اور بہت جلد ہمارا دیس اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے کے لائق ہو گیا۔ کہتے ہیں کہ پہلے ہمارے دیس میں انجن سے لے کر سوئی تک باہر سے آتی تھی۔ لیکن آج ہمارا دیس اپنے استعمال کی ضروری چیزیں خود بنا لیتا ہے۔ محنت کبھی بے کار نہیں جاتی۔ ہم نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے ابھی ۱۹۷۲ء کی بات ہے گویا پرسوں ترسوں کی، مجھے یاد ہے کہ جب ہمارا اسکول کھلا تھا، ہمارے پاس لوا صاحب

... [illegible] تھی۔ مجھے یاد ہے کہ ہماری پڑھائی
نواب صاحب کے ہال میں ہوتی تھی۔ کل دو تین
... میں نواب صاحب[1] اور تہمینہ آپا بھی ہم کو
پڑھاتے تھے۔ پھر اس کے اگلے سال ہم لوگ
یہاں آگئے۔ یہاں کچھ کمرے بن گئے تھے۔ ہر
کلاس کے لیے الگ الگ کمروں کا انتظام نہیں
تھا۔ ہم لوگ میدان میں بیٹھتے تھے۔ ہمارے پرانے
ساتھی گواہی دیں گے کہ جب ڈھول کا جھونکا آتا
تھا تو ہم سب ڈھول میں اَٹ جاتے تھے۔ ہماری
بہت اچھی اُستانی مسز شہناز خاں کی بُری حالت
ہو جاتی تھی۔ عائشہ میڈم کی شکل پہچانی نہیں جاتی
تھی۔ شگفتہ میڈم بولتے بولتے چُپ ہو جاتی تھیں
اور پھر جب ہم گھر پہنچتے تو امی کی ڈانٹ الگ پڑتی
"اسکول پڑھنے گئی تھی یا گدھے کی طرح ڈھول
میں لوٹ کر آرہی ہو" ہمیں سچ مچ بڑا مزا آتا۔
... کو بھی لوٹنے میں بھی کیا مزا آئے گا۔
... یہاں پچھلے دو سال کے اندر کتنے بہت سے
... بن گئے ہیں اور ابھی بنتے ہی چلے جا رہے ہیں
... میں محنت تو کرنی ہی پڑتی ہے۔ وقت بھی
... بھی اُٹھانی پڑتی ہے تو اچھے اور
... شاید اسی تکلیف سے ہوتے ہیں۔ لیکن
... مزیدار ہوتا ہے۔

... حال ہمارے دیس کا ہے۔ یہاں بھی
... ذاکر حسین ماڈل اسکول کی طرح کام
... ہے۔ پہلے یہاں بھی اُڑتی ڈھول اُڑتی تھی

یہاں پر بھی میدانوں میں بیٹھنا پڑتا تھا لیکن اب
دھیرے دھیرے ہم دیس کے رہنے والے اپنی
منزل پر پہنچ رہے ہیں۔ میں جب بھی ذاکر حسین
ماڈل اسکول کو بنتے دیکھتی ہوں تو مجھے یہ خیال
آتا ہے کہ سارا دیس ایک بڑا ذاکر حسین ماڈل
اسکول ہے۔ جس روز پہلی بار ہمارے کمروں میں
پنکھے لگے اور ان سے ہوا نکلی تو ہمیں کتنا مزا آیا!
جیسے سچ مچ پہلی بار ہوا چلی ہو! ابھی تھوڑے دن
پہلے میں نے ایک مضمون پڑھا تھا۔ مضمون ڈاکٹر
ذاکر حسین کا ہے۔ جس کا نام "ہمارا دیس"
ہے۔ اُنہوں نے ایک بڑی اچھی بات لکھی ہے۔ آپ
بھی سُنیے ــــ

"ہمیں اپنے دیس کی بڑائی اور عزت کو
بڑھانا ہے۔ ہمارا دیس بڑا ہوگا تو ہم بھی بڑے
ہوں گے۔ ہمارے دیس کی عزت ہوگی تو ہماری
عزت ہوگی۔ لیکن اس کے لیے بڑی محنت کی ضرورت
ہے۔ یہ محنت ہمیں کھیتوں میں کرنی ہے۔ یہ کام
سخت ہے اور بہت سخت۔ لیکن اپنے دیس
کو خوش حال بنانے کا یہی طریقہ ہے۔ ہمارے
دیس میں لوگ سُکھی کم ہیں اور دُکھی زیادہ اسی
لیے پنڈت جواہر لال نہرو کا قول تھا آرام حرام ہے۔
آئیے ہم سب اپنی محنت سے اس قول کو سچا
کر دکھائیں گے۔ ہم مُلک کو خوش حال اور دیس
واسیوں کو نہال کر دیں گے۔

آج پندرہ اگست کا دن ہمارے اس عہد

[1] ... رحمت اللہ خاں شیروانی آف ... بیگم پورسلہ نواب رحمت اللہ خاں شیروانی کی بیٹی

کو دہرانے کا دن ہے۔ آئیے سب عہد کریں کہ ساتھ کام کریں گے۔ اور ضرورت مندوں کی مدد کریں گے۔

(جے ہند)

شاداب پرویز متعلم جماعت ہشتم
ذاکر حسین ماڈل اسکول۔ علی گڑھ

پندرہ اگست ۱۹۷۵ء کی تقریب

ہر سال کی طرح اس سال بھی ہمارے اسکول میں پندرہ اگست کی تقریب پورے جوش وخروش سے منائی گئی۔ اس تقریب کی تیاریاں ماہ اگست کے شروع سے ہی مختلف کھیلوں اور ادبی مقابلوں سے ہونے لگتی ہیں انعام پانے والوں کی فہرست چودہ اگست تک مکمل ہو جاتی ہے۔

پندرہ اگست کے دن اعلان کے مطابق تمام بچے صبح کے ٹھیک پونے سات بجے اسکول کے صحن میں جمع ہو گئے۔ ہمارے ہیڈ ماسٹر جناب عبدالمجید آئیکل نے سات بجے ریڈیو لگا دیا۔ ٹھیک سات بجکر پانچ منٹ پر لال قلعہ دہلی میں ہونے والی یوم آزادی کی تقریب کا آنکھوں دیکھا حال آل انڈیا ریڈیو سے نشر ہونے لگا۔ تمام بچے اور اساتذہ خاموشی سے اس پروگرام کو سوا آٹھ بجے تک سنتے رہے۔ جس میں وزیر اعظم اندرا گاندھی کی تقریر تقریباً آدھ گھنٹہ جاری رہی اس کے فوراً بعد بچوں کو قطاروں میں کھڑا کیا گیا سب سے آگے کھڑے سعید کے ہاتھوں میں قومی جھنڈا تھا کر یہ جلوس یوم آزادی کا زندہ باد کے نعرے لگاتا ہوا گاؤں کا گشت کرکے جلسہ گاہ میں پہنچا۔ جہاں گاؤں کے بہت سے لوگ پہلے ہی سے جمع تھے۔

صدر مدرس نے قومی جھنڈا لہرایا جس کے ساتھ ہی تمام ہاتھ جھنڈے کو سلامی کے لیے اٹھ گئے۔ اور زبانوں سے "جنا گنا منا" کی آوازیں بلند ہوئیں۔ قومی ترانہ کے بعد تمام حاضرین اپنی اپنی جگہ خاموشی سے بیٹھ گئے۔ جلسہ گاہ لوگوں سے کھچا کھچ بھری ہوئی تھی۔ پروگرام کے مطابق تلاوت قرآن پاک اور حمد ونعت کی محفل گرم ہوئی۔ بچوں اور اساتذہ نے "ہندوستان آزادی سے پہلے اور آزادی کے بعد" جیسے موضوعات پر تقریریں کیں۔ فینسی ڈریس کا رنگارنگ پروگرام بڑا پُر لطف رہا۔

اس کے بعد کھیلوں اور دوسرے ادبی مقابلوں میں انعام پانے والوں کو انعامات تقسیم کیے گئے۔ ساتھیوں نے خوش ہو ہو کر تالیاں بجائیں۔ اس تقریب میں ایک ہم ہی غیر انعام یافتہ تھے اور ان انعام یافتہ ساتھیوں کی خوش قسمتی پر رشک کر رہے تھے۔

صدر مدرس نے سب کا شکریہ ادا کیا قومی ترانے کے بعد شیرینی تقسیم کی گئی۔ اس طرح ہمارے آزاد بھارت کا ۲۹ واں یوم آزادی کا جشن بخیر وخوبی اختتام کو پہنچا۔ اس وقت تک جمعہ کی نماز کا وقت ہو رہا تھا ہم سب نے ایک ساتھ نماز جمعہ ادا کی۔

محبوب پاشا

آدھی ملاقات

ستمبر ۱۹۷۵ء کے "پیام تعلیم" میں رشید الدین صاحب کا مضمون "ابوالعلا معری" نظر سے گزرا. یہ بڑی اچھی کوشش ہے. اقبال نے بہت سارے واقعات، موضوعات، اور عنوانات پر نظمیں لکھی ہیں. بچوں کے لیے اس طرح کے تعارفی و تشریحی مضامین بہت ہی کارآمد ثابت ہوتے ہیں. اگر یہ مختصر سی نظم پوری کی پوری مضمون کے ابتدا میں تحریر کردی جاتی تو زیادہ بہتر تھا کیونکہ اس سے ان لوگوں کو بھی اس نظم کے سمجھنے میں مدد ملتی جنھوں نے کہ ابھی تک اسے پڑھا نہ ہوگا۔
ابوالعلا معری کے بارے میں معلومات بھی مجھے بہت زیادہ تشنہ لگی۔

ابوالعلا معرّی کا نام احمد بن عبداللہ بن سلیمان تھا. وہ شام کے ایک مقام معرۃ النعمان میں ۳۶۳ھ مطابق ۹۷۳ء میں پیدا ہوئے اور اس جگہ کے تعلق سے معرّی کہلائے. چار سال کی عمر میں اُنہیں چیچک نکل آئی اور بدقسمتی سے اس بیماری کی وجہ سے آنکھیں ضائع ہوگئیں اور وہ اندھے ہوگئے لیکن حافظہ ایسا پایا تھا کہ جو کچھ وہ سن لیتے اُنہیں یاد ہوجاتا۔

ابوالعلا معری نے چالیس (۴۰) اکتالیس (۴۱) سال کی عمر میں گوشت کھانا ترک کردیا اور زندگی کے آخری پینتالیس (۴۵) سال اُنہوں نے اس کو ہاتھ نہیں لگایا. ان کا انتقال چھیاسی (۸۶) سال کی عمر میں ۴۴۹ھ (۱۰۵۷ء) میں ہوگیا۔

رشید الدین صاحب نے لکھا ہے: "اس کے قصائد کا مجموعہ 'لوازم' کے نام سے مشہور ہے." جہاں تک میری معلومات کا تعلق ہے ابوالعلا معرّی کے رسالے کا نام "لزوم مالا یلزم" ہے جو مختصراً "لزومیات" کہلاتا ہے لیکن اقبال نے وزنِ بحر کی مناسبت سے اسے "لزومات" لکھا ہے۔

کہنے لگا وہ صاحبِ غفران و لزومات

نظم کے آخری شعر

(تقدیر کے قاضی کا یہ فتویٰ ہے ازل سے
ہے جرمِ ضعیفی کی سزا مرگِ مفاجات)

کے بارے میں یہ کہنا کہ "یہ شعر اتنا مشہور ہوا کہ اس نے اردو میں ضرب المثل کی حیثیت اختیار کرلی ہے." بہت زیادہ مبالغہ ہوگا۔

(سلیمان ظفر)

اکتوبر کا "پیام تعلیم" ملا۔ سرورق بہت ہی خوب صورت تھا۔ نظمیں بہت ہی پسند آئیں خاص کر "عید مبارک" "ہمارے نبی نے" "ہمیں پھر یاد گاندھی جی کی آئی" "مادر مہربان" بہت پسند آئیں۔ ڈراما لالہ جی کے چوہے بہت خوب تھا۔ وکی بھائی! آپ نے اس بار ایک نایاب شاہکار "کیا آپ ہوا میں سوراخ کر سکتے ہیں" شائع کر کے کمال کر دیا۔

اب جناب اسرار ندوی صاحب اور ریحان احمد عباسی صاحب خاموش کیوں ہیں؟

کہانیوں میں اس بار خرگوش کی دُم، لنگور کی دُم اور علم کا شوق وغیرہ بہت پسند آئیں۔

اب آپ نے تصویروں کا سلسلہ شروع کیا ہے۔ یہ طریقہ بہت ہی اچھا ہے اسے جاری رکھیے گا ختم نہ کیجیے گا۔ ادھر اُدھر سے بھی بہت معلومات ہے۔ پیام تعلیم کے لیے میری ایک رائے یہ ہے کہ اس میں ہر ایک پرچے میں کوئی چھوٹی سی جاسوسی کہانی ضرور ہونی چاہیے۔ اور لطیفہ کے لیے ایک الگ کالم ہونا چاہیے جو ہر شمارے میں ہو۔ اور کارٹون ایک کے بجائے ایک سے زیادہ ہونے چاہئیں۔ اور ہاں پیام تعلیم میں ایک انعامی مقابلہ اور قلمی دوستی کلب کی بے حد کمی محسوس ہوتی ہے۔

ویسے پیام تعلیم بہت ہی مفید رسالہ ہے۔ میں نے بہت کچھ باتیں پیام تعلیم ہی سے سیکھی ہیں۔

ایک بات اور یاد آئی! اور وہ یہ ہے کہ پیام تعلیم کے ہر شمارے میں اگر ممکن ہو تو ایک شکاریات کی کہانی بھی ہو۔

ریحان احمد عباسی صاحب کی کہانی "شکار کی باتیں" اسی کمی کو پورا کر رہی تھی لیکن اب ایسی کوئی سلسلہ وار کہانی نہیں ہے۔ برائے مہربانی کوئی شکاریات کی کہانی قسط وار شروع کیجیے۔

مسعود ظہیر نقوی

میں نے اس دن تو یہ آپ سے عرض کیا تھا کہ شاید اس بار وعدہ پورا نہ کر سکوں، لیکن کسی نہ کسی طرح وقت نکال کر ایک ڈرامے کا ترجمہ کر ہی لیا ہے۔ عنوان ہے "چالاک سیارہ" چھوٹے پیامیوں کے مطلب کی چیز ہے۔ امید ہے کہ پسند آئے گا۔ دسمبر کے پیام تعلیم میں تو شاید اب شریک نہ ہو سکے۔ اس لئے نئے سال کا تحفہ سمجھ کر قبول فرمایئے اور پیامیوں کو پیش کر دیجیے۔

نومبر کا پیام تعلیم پڑھ لیا ہے۔ مشفقانہ حوصلہ افزائی کے لیے محترم شوکت پردیسی صاحب اور محترم عادل لہکگانوی صاحب کا مشکور ہوں۔ میری خوش قسمتی ہے کہ ان بزرگوں کو میری تخلیقات و تراجم پسند آتے ہیں۔ محترمہ لقا ملکہ نے محترم ہیشم ساہنی صاحب کی بہت ہی اثر انگیز کہانی کا بڑا خوب صورت ترجمہ کیا ہے۔ وہ اس خوب صورت کہانی کے انتخاب اور اسے پیامیوں کے لیے پیش کرنے

مبارکباد کے مستحق ہیں۔ سوئٹزرلینڈ ملا تو اس
کے مصنف محترم بھیشم ساہنی) سے پیامیوں
کو متعارف کرائیں گا۔ سید احمد عقیل صاحب
کی کہانی "غلطی کا احساس" بھی بڑی سبق آموز
کہانی ہے۔ محترم ناوک حمزہ پوری کی دعائیہ نظم
خوب ہے۔ ایک بچّے کے جذبات و احساسات
اور اس کی خواہشات کی اچھی ترجمانی ہے۔
ندیم احمد صاحب کی نظم " نیا عہد اور جاوید خاں
صاحب کی "اصرار" بھی مجھے بہت اچھی لگی۔ محترم
علا الدین صاحب کا مضمون بڑے پیامیوں کیلیے
بہت معلومات افزا ہے۔ جناب جوہر نوری کی نظم
"چھپّی" کافی آسان زبان میں ہے اور اسی لیے
زیادہ اچھی لگی۔ انجم قاسمی صاحب کی کوشش
"آپ کیا بننا چاہتے ہیں؟" اچھی ہے لیکن افسوس
ہے کہ انہوں نے میرے پُر خلوص مشورے پر بالکل
عمل نہیں کیا اور آسان زبان لکھنے کی طرف بالکل
توجہ نہیں کی۔ نتیجہ یہ ہے کہ ایک اچھا مضمون مشکل
زبان اور غلطیوں کا شکار ہو کر رہ گیا۔ صرف ایک
مثال پیش کروں گا۔ صحیح استعمال ہے "تم نے کیا
بننے کی دل میں ٹھانی ہے؟" یا زیادہ سیدھے
الفاظ میں یوں کہیے "تم کیا بننا چاہتے ہو؟" انجم
صاحب نے لکھا ہے "تم نے کیا بننے کی آرزو دل
میں ٹھانی ہے؟" آرزو دل میں ٹھانی نہیں جاتی۔
صاحب کو ایک بار پھر یہ مشورہ دوں گا کہ
آسان زبان لکھنے کی کوشش کریں اور الفاظ
صحیح استعمال کرنے کی بھی۔
حبیب صاحب کی خدمت میں سلام عرض
خلیق انجم اشرفی